تفسیر مظہری

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی

[illegible]

مولانا سید عبدالدائم الجلالی

دار الاشاعت [illegible]

تفسیر مظہری

جلد ہفتم

سورۂ اسرائیل سے سورۂ انبیاء تک
پارہ ۱۵ تا پارہ ۱۷ کا نصف رکوع ۷ تک

تالیف
حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ
تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات
مولانا سید عبد الدائم الجلالی
رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر
دار الاشاعت
اردو بازار کراچی ۱
فون ۲۱۳۷۶۸

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی

طباعت : ۱۹۹۹ء خلیل پریس کراچی۔

ضخامت : صفحات در ۶ جلد

ملنے کے پتے

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 26۔نابھہ روڈ لاہور
کشمیر بک ڈپو۔چینوٹ بازار فیصل آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
مکتبہ رحمانیہ ۱۸ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم

پندرھواں پارہ شروع

......سورۂ بنی اسرائیل......

اس سورۃ میں ایک سو گیارہ آیات ہیں۔ آیت وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ سے آٹھ آیات تک مدنی ہیں، باقی پوری سورۃ مکی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبْحٰنَ پاک ہے یا میں اللہ کی پاکی کا اقرار کرتا ہوں یا اللہ کے پاک ہونے کا تم اقرار کرو۔

سُبْحٰنَ اصل میں اسم مصدر ہے بمعنی تسبیح کے، تسبیح کا معنی ہے پاک جاننا اور پاکی کا اقرار کرنا۔ کبھی اللہ کے نام کے طور پر بھی مستعمل ہوتا ہے، یعنی اللہ سبحان (پاک) ہے۔ سُبْحَانَ اگرچہ اسم مصدر ہے۔ لیکن بجائے فعل کے استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کا فعل ذکر ہی نہیں کیا جاتا۔ کلام کے آغاز میں لانے سے اس بات پر تنبیہ کرنی ہے کہ اس کے بعد جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر اللہ کے سوا کسی کو قدرت نہیں۔ کبھی سبحان کو بطور تعجب کے بھی بولا جاتا ہے (جیسے کہتے ہیں سبحان اللہ)

الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ وہ جو رات کو لے گیا اپنے خاص بندے (یعنی محمد ﷺ) کو۔

لَيْلًا رات کو۔ اسراء کا معنی ہی رات کو لے جانا ہے اس کے بعد لَیْلًا کو بصورت نکرہ ذکر کرنے سے وقت کی کمی کی طرف اشارہ ہے (یعنی رات کے قلیل ترین وقت میں)۔

مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حرمت والی مسجد (یعنی کعبہ) سے۔ صحیحین میں حضرت انسؓ کی وساطت سے حضرت مالک بن صعصعہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں مسجد حرام کے اندر غنود اور بیداری کی درمیانی حالت میں تھا (نہ سو رہا تھا نہ جاگ رہا تھا) کہ جبرئیل میرے پاس براق لے کر آئے۔ دوسری روایت میں ہے میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا (یعنی نیند کی حالت میں تھا) کہ ایک آنے والا میرے پاس آیا۔ سورۂ والنجم کی تفسیر میں ہم نے اس کی تفصیل کردی ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ حضور ﷺ حضرت ام ہانی کے مکان میں تھے وہیں سے معراج ہوئی تھی اس روایت پر مسجد حرام سے مراد (کعبہ یا حطیم نہ ہوگا بلکہ) حرم ہوگا۔ حرم کو مسجد حرام اس لئے فرمایا کہ سارا حرم مسجد ہے یا یہ وجہ ہے کہ مسجد حرام حرم میں واقع ہے حرم مسجد حرام کو محیط ہے۔ معراج کو جانے کے وقت رسول اللہ ﷺ کا کعبہ میں ہونا حضرت انسؓ کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے جو صحیحین میں مذکور ہے اور حضرت انسؓ نے حضرت ابوذرؓ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں مکہ میں تھا کہ (کعبہ کی چھت میں) میرے لئے شگاف کر دیا گیا، یہ حدیث بھی ہم نے سورۂ والنجم کی تفسیر میں ذکر کر دی

ابو یعلیٰ نے مسند اور طبرانی نے الکبیر میں بیان کیا ہے کہ جب حضور ﷺ کو معراج ہوئی اس رات کو آپ حضرت ام ہانی کے مکان میں تھے اور اسی رات میں فوراً آپ واپس آ گئے تھے اور ام ہانی سے معراج کی کیفیت بیان فرمائی تھی اور فرمایا تھا کہ پیغمبروں کو ______ متشکل (یعنی مجسم) کر کے میرے سامنے لایا گیا اور میں نے ان کو نماز پڑھائی پھر صبح کو حضور ﷺ مسجد میں آئے اور قریش کو اطلاع دی۔ لوگوں نے ناممکن سمجھ کر تعجب کیا اور بعض مسلمان بھی مرتد ہو گئے۔ کچھ لوگ دوڑے ہوئے حضرت ابو بکرؓ کے پاس پہنچے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، اگر انہوں نے ایسا فرمایا ہے تو سچ فرمایا ہے۔ لوگوں نے کہا، کیا ان کی ایسی باتوں کو بھی آپ سچ جانتے ہیں۔ فرمایا، میں تو اس سے بھی زیادہ دور کی باتوں کی ان کے متعلق تصدیق کرتا ہوں (جبرئیل کا آنا اور اللہ کی طرف سے قرآن لانا اور وقتاً فوقتاً نازل ہو کر وحی لانا تو اس سے بھی زیادہ دور کی باتیں ہیں اور میں ان تمام باتوں میں ان کو سچا جانتا ہوں اور ایمان لایا ہوں) حضرت ابو بکرؓ کو اسی تصدیق کی وجہ سے صدیق کا لقب مل گیا، کچھ لوگ بیت المقدس جا چکے تھے اور وہاں کے حالات سے واقف تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بیت المقدس کے متعلق دریافت کیا، فوراً حضور ﷺ کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے گئے اور آپ بیت المقدس کو سامنے دیکھ کر حالات بیان کرنے لگے، لوگوں نے کہا، کیفیت تو آپ نے ٹھیک بیان کی اب آپ ہمارے قافلہ کے متعلق بتائیے (کہ وہ کہاں ہے) آپ ﷺ نے ان کو اونٹوں کی تعداد اور اونٹوں پر جو مال تھا اس کی کیفیت بتا دی اور فرمایا، فلاں دن طلوع آفتاب کے وقت قافلہ آ پہنچے گا اور آگے آگے خاکستری رنگ کا اونٹ ہوگا، لوگ دوڑتے ہوئے پہاڑ کے درے میں پہنچے قافلہ آتا ہوا مل گیا اور ویسا ہی ملا جیسا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا پھر بھی ایمان نہ لائے اور بولے یہ تو محض کھلا ہوا جادو ہے۔

میں کہتا ہوں معراج کا واقعہ دو مرتبہ ہوا ایک بار حطیم سے اور دوسری بار حضرت ام ہانی کے مکان سے۔ دونوں حدیثیں اپنی جگہ صحیح ہیں دونوں میں کوئی اختلاف نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مقاتل نے کہا شب معراج ہجرت سے ایک سال پہلے ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں ایک بار رجب کے مہینے میں معراج ہوئی اور دوسری بار ماہ رمضان میں۔

اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک۔ اقصیٰ (انتہائی۔ آخری۔ پرے کے کنارے کی) کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مسجد حرام سے بیت المقدس سے پرے بھی کوئی مسجد نہ تھی۔ رات میں مسجد اقصیٰ تک پہنچنے پر قریش کو تعجب ہوا، مسجد اقصیٰ بہت دور تھی ان کی نظر میں اتنی لمبی مسافت طے کر کے رات ہی میں واپس آ جانا ناممکن تھا۔

بیضاوی نے لکھا ہے بیت المقدس تک آن کی آن میں رسول اللہ ﷺ کا پہنچ جانا ناممکن تھا۔ آفتاب کے دونوں کناروں کے درمیان کی مسافت زمین کے دونوں کناروں کے درمیان کی مسافت سے کچھ اوپر ایک سو ساٹھ گنا زائد ہے اور ایک سیکنڈ میں آفتاب کا نچلا کنارہ بالائی کنارے کے مقام تک پہنچ جاتا ہے اور یہ امر علم کلام میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ تمام اجسام میں اعراض کو قبول کرنے کی صلاحیت ایک جیسی ہے پھر کیا محال ہے کہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے بدن یا بدنی قوتوں میں آفتاب جیسی یا اس سے بھی زیادہ تیز حرکت پیدا کر دی ہو، جب سرعت حرکت ممکن بلکہ بعض اجسام میں واقع ہے تو اللہ کے لئے ناممکن نہیں کہ جو کچھ اور جیسا کچھ چاہے پیدا کر دے۔ رہا تعجب تو وہ معجزات پر ہوا ہی کرتا ہے وہ معجزہ ہی کیا جس پر تعجب نہ ہو۔

الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ وہ جس کے ماحول کو ہم نے برکت والا بنا دیا ہے، یعنی بکثرت دریا، نہریں درخت اور پھل پیدا کر دیئے ہیں۔ مجاہد نے بیان کیا مبارک ہونے کا یہ معنی ہے کہ اس سرزمین کو اللہ نے انبیاء کی قرارگاہ اور منزل وحی بنایا تھا اور قیامت کے دن لوگوں کا حشر وہیں سے ہوگا۔

لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا تاکہ ہم اس بندہ کو اپنی قدرت کی کچھ عجیب نشانیاں دکھا دیں۔ چالیس دن کی مسافت کو رات کے قلیل ترین وقت میں طے کرانا پھر بیت المقدس سے آسمانوں تک لے جانا انبیاء کو مجسم بنا کر دکھانا پھر ان کی امامت کرانا اور ان کے علاوہ دوسرے عجائبات قدرت کی سیر کرانا یہ سب کچھ اللہ کی وہ آیات تھیں جن کا مشاہدہ کرانا مقصود تھا۔

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ① بے شک اللہ (نبی کی دعا اور کلام کو) خوب سننے والا اور آپ کے احوال و افعال کو خوب دیکھنے والا ہے۔ اور تاریکی شب میں آپ کی حفاظت کرنے والا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں کہ شب معراج میں رسول اللہ ﷺ کا جسم مبارک غائب نہیں ہوا بلکہ روح مبارک کو لے جایا گیا تھا، یعنی معراج خواب میں ہوئی اس کی تائید حضرت انس بن مالک کے اس بیان سے ہوتی ہے جو بخاری نے نقل کیا ہے۔ جس رات کو رسول اللہ ﷺ کو (مسجد کعبہ) سے معراج کے لئے لے جایا گیا (اس کی صورت یہ ہوئی کہ) حضور ﷺ مسجد حرام میں سو رہے تھے اور یہ واقعہ وحی آنے سے پہلے کا ہے کہ تین شخص آئے اول شخص نے کہا وہ کونسا ہے۔ درمیان والا بولا وہ سب سے بہتر ہے۔ تیسرے نے کہا، تو جو سب سے افضل ہے اسی کو لے لو۔ یہ رات یونہی گزر گئی (کوئی اور واقعہ نہیں ہوا) دوسری رات ہوئی تو آپ کی آنکھیں سو رہی تھیں دل نہیں سو رہا تھا انبیاء کی حالت ہی یہ ہوتی ہے کہ آنکھیں سوتی ہیں دل بیدار ہوتا ہے وہی تینوں شخص آئے بات کچھ نہیں کی اور رسول اللہ ﷺ کو اٹھا کر لے گئے اور لے جا کر زمزم کے پاس رکھ دیا۔ جبرئیل نے آپ ﷺ کا سینہ ہنسلی کے گڑھے سے ناف تک چاک کیا اور اندرون صدر کو زمزم کے پانی سے دھویا (اور پھر اس میں ایمان و علم بھر دیا اور آسمان دنیا میں پہنچے تو وہاں سے دو دریا نکلتے دیکھے جبرئیل نے کہا یہ نیل و فرات دونوں کا سرچشمہ یہاں ہے۔ پھر جبرئیل آپ ﷺ کو آسمان میں لے چلے وہاں ایک اور دریا دیکھا جس پر موتی اور زبرجد کا محل بنا ہوا تھا، دریا میں ہاتھ مارا تو وہ یکدم خالص مشک بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا جبرئیل یہ کیا ہے۔ جبرئیل نے کہا یہ کوثر ہے، جو اللہ نے آپ کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ حضرت انسؓ نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا، پھر آپ ﷺ کو ساتویں آسمان تک لے جایا گیا۔ موسیٰؑ نے کہا اے رب میرا تو گمان بھی نہ تھا کہ کسی کو مجھ پر بلندی حاصل ہوگی۔ پھر آپ کو اور اوپر لے جایا گیا، جس کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں، یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے اور اللہ جبار رب العزت کا قرب حاصل ہو گیا۔ رب العزت کچھ نیچے آیا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے فاصلے کے بقدر یا اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا اور ہر رات دن میں پچاس نمازیں فرض کئے جانے کی کیفیت بتائی اور موسیٰؑ نے کہا آپ کی امت سے اس کی ادائیگی نہ ہو سکے گی غرض موسیٰؑ بار بار لوٹا کر آپ کو رب العزت کے پاس بھیجتے رہے یہاں تک کہ پانچ نمازیں رہ گئیں لیکن موسیٰؑ نے پھر بھی رک کر کہا محمد ﷺ! میں نے اپنی قوم بنی اسرائیل پر اس سے کم کا بہت تجربہ کیا ہے لیکن وہ اس سے بھی عاجز رہے اور ادائیگی کو چھوڑ بیٹھے اور آپ کی امت تو بنی اسرائیل کے مقابلے میں جسم و دل اور گوش و چشم کے اعتبار سے بہت کمزور ہے آپ اپنے رب کے پاس لوٹ کر جائیے (اور تخفیف کی درخواست کیجئے) تاکہ وہ تخفیف کر دے۔ حضرت موسیٰؑ نے جتنی مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو درخواست تخفیف کی تلقین کی ہر بار آپ جبرئیل کی طرف مشورہ طلب نظر سے دیکھتے تھے اور جبرئیل اس کو نامناسب نہیں خیال کرتے تھے آخر پانچویں مرتبہ میں جب رسول اللہ ﷺ نے دعا تخفیف کی اور عرض کیا اے رب میری امت کے بدن بھی کمزور ہیں اور دل بھی اور گوش و نظر بھی تو ہمارے لئے اپنے حکم میں تخفیف فرما دے تو اللہ نے فرمایا، میرے ہاں حکم نہیں بدلا جاتا جیسے میں نے لوح محفوظ میں فرض کر دیا ہے وہی قائم رہے گا ہر نیکی کا ثواب دس گونہ مقرر ہے پس لوح محفوظ میں یہ پچاس نمازیں ہیں مگر تمہارے لئے پانچ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر رسول اللہ ﷺ سے کہا آپ پھر اپنے رب کے پاس لوٹ جائیں اور تخفیف کی درخواست کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں نے بار بار اتنی مرتبہ آمد و رفت کی کہ اب مجھے اپنے رب سے تخفیف کا سوال کرتے شرم آتی ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد آپ جب بیدار ہوئے تو مسجد حرام میں ہی تھے۔

مسلم کی روایت میں جو فَاسْتَيْقَظَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے الفاظ آئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا معراجی واقعہ خواب کا تھا۔ لیکن صحیح متواتر احادیث سے ثابت ہے اور اسی پر اجماع بھی ہے کہ آیت سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا میں شب معراج مراد ہے اور معراج بیداری کی حالت میں ہوئی تھی اور جسمانی ہوئی تھی یعنی مع جسم کے رسول اللہ ﷺ کو لے جایا گیا تھا اگر خواب میں ہوتی تو قریش کو تعجب اور انکار ہی کیوں ہوتا خواب میں سیر آسمانی ہونا یا مسجد اقصیٰ تک جانا

قابلِ تعجب چیز نہیں۔

ہمارے شیخ امام نے بیان کیا کہ بعض علماء حدیث کا قول ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سوائے حدیث مذکور کے اور کوئی ایسی حدیث نہیں، جس سے منامی معراج کا ثبوت ملتا ہو صرف یہی ایک حدیث ہے جس سے خواب کے اندر معراج ہونے کا ثبوت ملتا ہے لیکن اس روایت کا مدار شریک بن عبداللہ پر ہے اور شریک منکر الحدیث ہے، اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جس معراج کا اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے وہ تو وحی آنے سے پہلے واقع ہوئی تھی اور جس معراج کا آیت میں ذکر ہے (اور جو جسمانی طور پر بیداری میں ہوئی تھی) وہ آغاز وحی سے بارہ سال کے بعد یعنی ہجرت سے ایک سال پہلے ہوئی تھی، حقیقت میں آغاز وحی سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے خواب میں معراج کا واقعہ دیکھا تھا پھر اس کو محقق کرنے کے لئے ہجرت سے ایک سال پہلے اللہ نے بیداری کی حالت میں آپ کو معراج کرادی جس طرح حدیبیہ کے سال یعنی ۶ھ میں آپ کو فتح مکہ دکھائی گئی تھی پھر ۸ھ میں عالم ظاہر میں مکہ کی فتح عنایت کردی گئی۔

بغوی نے لکھا ہے جب معراج سے واپسی میں رسول اللہ ﷺ مقام ذی طوی میں پہنچے تو فرمایا جبرئیل! میری قوم والے اس کی تصدیق نہیں کریں گے۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا ابوبکرؓ آپ کی تصدیق کریں گے اور وہ بڑے سچے ہیں۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس رات کو مجھے (معراج میں) لے جایا گیا اس کی صبح کو میں مکہ میں بیٹھا اپنے متعلق سوچ رہا تھا اور سمجھا ہوا تھا کہ میری قوم والے مجھے جھوٹا قرار دیں گے، ایک گوشہ میں الگ تھلگ غمگین بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں اس طرف سے ابوجہل کا گذر ہوا اور مذاق کے لہجے میں اس نے کہا (کیسے بیٹھے ہو) کیا کوئی نئی چیز حاصل کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں مجھے آج رات لے جایا گیا تھا۔ ابوجہل نے کہا، کہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بیت المقدس کو۔ ابوجہل بولا پھر صبح ہوئی تو تم ہمارے سامنے موجود ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ ابوجہل انکار نہ کر سکا اس کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بات اسی پر نہ پڑے۔ کہنے لگا تم نے جو بات میرے سامنے بیان کی ہے کیا اپنی قوم والوں کے سامنے بھی بیان کر دو گے، حضور نے فرمایا، ہاں ابوجہل نے پکار کر کہا اے گروہ کعب بن لوی یہاں آؤ، آواز پر لوگ ٹوٹ پڑے اور رسول اللہ ﷺ اور ابوجہل کے پاس آپہنچے، ابوجہل بولا اب تم نے جو کچھ مجھ سے بیان کیا تھا اپنی قوم سے بھی بیان کرو۔ حضور ﷺ نے فرمایا، ہاں مجھے آج رات لے جایا گیا، لوگوں نے پوچھا کہاں فرمایا بیت المقدس کو۔ لوگوں نے کہا پھر صبح کو تم ہمارے سامنے بھی ہو۔ فرمایا ہاں۔ یہ سنتے ہی کچھ لوگ مذاق سے تالیاں بجانے لگے اور کچھ لوگوں نے تعجب سے اپنا سر پکڑ لیا اور کچھ لوگ جو ایمان لا چکے تھے اور حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق کر چکے تھے، اسلام سے پھر گئے اور ایک مشرک دوڑا دوڑا حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا اب آپ کا اپنے ساتھی کے متعلق کیا خیال ہے، وہ تو کہہ رہا ہے کہ رات مجھے بیت المقدس کو لے جایا گیا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا، کہ انہوں نے ایسا کہا ہے۔ لوگوں نے کہا ہاں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اگر انہوں نے ایسا کہا ہے تو سچ کہا ہے۔ لوگوں نے کہا کیا آپ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ رات میں بیت المقدس کو چلے بھی گئے اور صبح سے پہلے آ بھی گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا، میں تو ان کی اس سے بھی بڑی بات کی تصدیق کرتا ہوں ان کے پاس جو صبح شام آسمان سے خبریں آتی ہیں میں تو ان کی تصدیق کرتا ہوں۔ حضرت ابوبکر کو صدیق اسی لئے کہا جانے لگا (کہ آپ نے بے تامل معراج کی تصدیق کردی اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو بھی آپ نے بے تامل مان لیا تھا) راوی کا بیان ہے کہ ان لوگوں میں بعض لوگ ایسے تھے جو بیت المقدس جاچکے تھے انہوں نے کہا کیا آپ ہمارے سامنے بیت المقدس کا بیان کر سکتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے بیت المقدس کی کیفیت بیان کرنی شروع کی اور برابر بیان کرتا رہا یہاں تک کہ بعض حالات کا مجھ پر اشتباہ ہو گیا تو فوراً (نظروں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے گئے اور) بیت المقدس میری نظروں کے سامنے آگیا اور عقیل کے گھر سے بھی ورے لاکر اس کو رکھ دیا گیا اور میں مسجد کو اپنی نظر سے دیکھ دیکھ کر بیان کرنے لگا، وہ لوگ کہنے لگے بے شک بیت المقدس کی جو حالت تم نے بیان کی ہے وہ صحیح ہے۔ پھر بولے محمد ﷺ! ہمارے قافلے

کی کچھ خبر بھی بیان کرو۔ ہمارے لئے وہ بہت ہی اہم ہے، تم نے اس کو کہیں دیکھا تھا، فرمایا ہاں فلاں قافلے کی صورت مقام روحاء میں میری نظر کے سامنے آئی تھی۔ اس کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا، لوگ اس کی تلاش میں تھے، ان کے پڑاؤ (فرودگاہ) پر ایک پیالہ میں پانی رکھا تھا۔ مجھے پیاس لگی تھی، میں نے وہ پانی پی لیا اور پیالہ کو اس کی سابق جگہ پر رکھ دیا، تم اس قافلے والوں سے دریافت کرنا کہ جب وہ اپنے پڑاؤ پر واپس آئے تھے تو ان کو پیالہ میں پانی ملا تھا۔ لوگوں نے کہا یہ ایک نشانی ہے، جو فیصلہ کن ہے۔ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا فلاں قبیلہ والوں کے قافلے کی طرف سے گزرا تھا، فلاں فلاں دو آدمی ایک اونٹ پر سوار تھے۔ یہ واقعہ مقام ذی مر کا ہے، مجھے دیکھ کر اونٹ ان دونوں سواروں سمیت بدکا تھا ان دونوں شخصوں سے دریافت کر لینا لوگوں نے کہا یہ بھی صداقت کو جانچنے کی ایک نشانی ہے۔ لوگوں نے پوچھا اچھا ہمارے اونٹوں کی تفصیل اور ان کی حالت کے متعلق کچھ بتاؤ فرمایا مقام تنعیم میں میں اونٹوں کی طرف سے گزرا تھا لوگوں نے کہا ان کی گنتی کیا تھی، سامان جو ان پر لدا ہوا تھا وہ کیا تھا ان کی ہیئت کیا تھی۔ فرمایا اس وقت تو مجھے ان باتوں کی طرف توجہ نہ تھی پھر مقام حزورہ میں وہ مکمل شکل کے ساتھ اپنے سامان اور ہیئت اور سواروں کے ساتھ میرے سامنے آ کھڑے ہوئے ان کی ہیئت ایسی ایسی تھی اور فلاں فلاں لوگ ان کے ساتھ تھے اور ایک خاکستری رنگ کا اونٹ ان کے آگے آگے تھا جس پر دو بوریاں سلی ہوئی لدی ہوئی تھیں۔ طلوع آفتاب کے وقت وہ قافلہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ لوگوں نے کہا یہ بھی سچائی جانچنے کی ایک نشانی ہے۔ اس گفتگو کے بعد وہ لوگ فوراً دوڑتے ہوئے گھاٹی پر پہنچے اور کہنے لگے خدا کی قسم محمد ﷺ نے واقعہ تو واضح طور پر بیان کر دیا ہے، اس کے بعد کداء (مکہ کے باہر ایک پتھریلی زمین یا پہاڑی تھی) پر پہنچے اور وہیں بیٹھ کر طلوع آفتاب کا انتظار کرنے لگے تاکہ اگر قافلہ نہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ کو جھوٹا قرار دے سکیں۔ انتظار ہی میں تھے کہ کسی نے اچانک کہا یہ آفتاب نکل آیا اور فوراً دوسرا آدمی بولا، اور یہ اونٹ بھی سامنے آ گئے جن کے آگے آگے خاکستری رنگ کا اونٹ ہے اور فلاں فلاں لوگ قافلے میں موجود ہیں یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد وہ لوگ ایمان نہیں لائے اور کہنے لگے یہ بلاشبہ کھلا ہوا جادو ہے۔

مسلم نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ میں حجر اسود کے پاس موجود تھا اور قریش میرے رات کے جانے کے متعلق دریافت کر رہے تھے، انہوں نے بیت المقدس کے متعلق بھی مجھ سے پوچھا تھا جو مجھے یاد نہ تھا اور اس کی وجہ سے مجھے ایسی بے چینی ہوئی تھی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ لیکن اس وقت اللہ بیت المقدس کو اٹھا کر میرے سامنے لے آیا (یعنی درمیانی پردے ہٹ گئے اور بیت المقدس مجھے سامنے نظر آنے لگا) اب جو سوال بھی مجھ سے کرتے تھے، میں دیکھ کر اس کو بتا دیتا تھا۔ میں نے انبیاء کی جماعت کے ساتھ بھی اپنے آپ کو دیکھا تھا میں نے دیکھا کہ موسیٰ کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ چھریرے بدن کے گھونگھریالے بالوں والے شخص تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قبیلہ شنوءہ کا کوئی آدمی ہو ان کی مشابہت عروہ بن مسعود ثقفی میں سب سے زیادہ ہے، میں نے ابراہیم کو بھی کھڑے نماز پڑھتے دیکھا۔ ابراہیم کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والا تمہارا ساتھی ہے (یعنی میں.....) پھر نماز کا وقت آ گیا تو میں نے انبیاء کی امامت کی نماز سے فارغ ہوا تو کسی کہنے والے نے کہا، محمد ﷺ! یہ مالک داروغہ دوزخ ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے مالک کی طرف منہ موڑ کر دیکھا تو انہوں نے ہی مجھے پہلے سلام کیا۔

بخاری نے صحیح میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس رات کو مجھے معراج میں لے جایا گیا، میری ملاقات موسیٰؑ سے ہوئی وہ چھریرے بدن کے گھونگھریالے بالوں والے آدمی تھے معلوم ہوتا تھا کہ قبیلہ شنوءہ کے کوئی آدمی ہیں۔ عیسیٰؑ سے بھی میری ملاقات ہوئی وہ درمیانی قد کے گٹھے بدن کے سرخ رنگ والے آدمی تھے معلوم ہوتا کہ ابھی حمام سے نکل کر آئے ہیں۔ میں نے ابراہیم کو بھی دیکھا ابراہیم کی نسل میں سب سے زیادہ ان سے مشابہت رکھنے والا میں ہوں۔ میرے سامنے دو برتن لائے گئے ایک میں دودھ تھا دوسرے میں شراب۔ پھر مجھ سے کہا گیا ان دونوں میں جو نسا چاہو لے لو۔ میں نے دودھ لے کر پی لیا۔ اس شخص نے (یعنی جس شخص نے انتخاب کا اختیار دیا تھا) کہا تم کو فطرت کی راہ پر ڈال دیا گیا یا یہ کہا کہ تم نے فطرت کو

پالیا اگر شراب کو لے لیتے تو تمہاری امت گمراہ ہو جاتی۔

ہم نے سورۂ والنجم میں ساتوں آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ کی سیر کا واقعہ مفصل لکھ دیا ہے (تفصیل وہاں دیکھی جائے)۔

وَاٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ۝۲

اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب یعنی توریت عطا کی اور اس کو یعنی موسیٰؑ کو یا توریت کو بنی اسرائیل کے لئے راہنما بنایا کہ میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ قرار دینا، وکیل نہ بنانا یعنی میرے سوا کسی دوسرے کو رب نہ قرار دینا جس پر تم بھروسہ کرلو اور تمام امور کو اس کے سپرد کردو (مراد یہ کہ کسی کو میرے سوا اپنا کارساز مالک و مختار نہ ماننا)

ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اے وہ لوگو جو اولاد ہو ان لوگوں کی جن کو نوح کے ساتھ (کشتی میں) ہم نے سوار کیا تھا۔

اس فقرہ میں وہ احسان و انعام یاد دلایا ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل کے اسلاف و اجداد پر کیا تھا کہ حضرت نوحؑ کی معیت میں کشتی میں ان کو سوار کرا کے ڈوبنے سے محفوظ رکھا تھا۔

اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳ نوحؑ بلاشبہ بڑا شکر گزار بندہ تھا۔ ابن مردویہ نے ابو فاطمہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نوح جو بھی چھوٹا بڑا کام کرتے تھے بسم اللہ و الحمد للہ کہہ لیا کرتے تھے۔ اسی لئے اللہ نے ان کو عبد شکور فرمایا جب آپ کچھ کھاتے پیتے یا کوئی کپڑا پہنتے تو اللہ کا شکر ادا کرتے۔ یہ موخر الذکر اثر حضرت سعد بن مسعود ثقفی کا ہے جو ابن جریر اور طبرانی نے بیان کیا ہے۔ اللہ نے اس جملہ میں اداء شکر کی ترغیب دی ہے کہ تم نوح کے ساتھیوں کی نسل سے ہو اور نوح بڑا شکر گزار بندہ تھا کہ اللہ نے اس کے ساتھ والوں کو بھی اس کی معیت میں محفوظ رکھا تھا (اگر وہ محفوظ نہ رکھے جاتے تو تم کہاں سے آتے ان کو محفوظ رکھنا درحقیقت تم پر اللہ کا احسان ہے جس کا شکر کرنا تم پر لازم ہے)۔

وَقَضَیْنَاۤ اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِیْرًا ۝۴

اور صاف کہہ سنایا ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (توریت) میں کہ تم ملک میں دوبارہ ضرور خرابی کرو گے اور چڑھ جاؤ گے بری طرح چڑھنا۔

اَلْکِتَاب سے مراد توریت اور اَلْاَرْض سے مراد ملک شام ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور قتادہ نے فرمایا اِلٰی بمعنی عَلٰی ہے اور اَلْکِتَاب سے مراد ہے لوح محفوظ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کے لئے یہ بات لوح محفوظ میں لکھ دی تھی، قطعی فیصلہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ فساد برپا کرو گے۔ پہلا بگاڑ اس وقت ہوا جب بنی اسرائیل نے توریت کے احکام چھوڑ دیئے، ممنوعات کو اختیار کیا اور حضرت شعیا بن مضیا کو شہید کر دیا اور دوسرا فساد اس وقت کیا جب انہوں نے حضرت زکریا اور حضرت یحییٰؑ کو شہید کر دیا اور حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ بعض علماء نے کہا پہلا فساد حضرت زکریا کا قتل تھا اور دوسرا فساد تھا حضرت یحییٰ کا قتل اور حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنے کا ارادہ۔ علو سے مراد ہے اللہ کی اطاعت سے سرکشی کرنا اور لوگوں پر ظلم کرنا۔ یعنی اللہ کی اطاعت سے بہت بڑھ چڑھ کر سرکشی کرو گے اور لوگوں پر بڑے ظلم کرو گے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا پس جب پہلے فساد کی سزا کا مقررہ وعدہ آگیا یعنی پہلے فساد کی سزا کا وقت آگیا۔

بَعَثْنَا عَلَیْكُمْ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ ؕ

تو ہم نے اپنے کچھ بندوں کو تم پر مسلط کر دیا جو لڑائی میں بڑے طاقتور تھے اور وہ تمہاری بستیوں کے اندر تمہاری جستجو میں گھس پڑے۔

عِبَادًا لَّنَا سے مراد ہیں نینوای کے رہنے والے (سنجاریب اور اس کے ساتھی) سعید بن جبیر کا یہی قول ہے۔ قتادہ نے کہا جالوت اور اس کا لشکر مراد ہے۔ یہ جالوت وہی تھا جس کو حضرت داؤدؑ نے قتل کیا۔ ابن اسحٰق کے نزدیک بخت نصر بابلی مراد

ہے۔ بغوی نے لکھا ہے یہی قول زیادہ ظاہر ہے۔
جَاسُوْا یعنی تم کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنے کے لئے وہ تمہارے گھروں میں گھس پڑے۔ زجاج نے کہا جوش کا معنی ہے کسی چیز کی انتہائی کوشش کے ساتھ جستجو کرنا۔ فراء نے کہا جَاسُوْا کا یہ معنی ہے کہ انہوں نے گھروں کے اندر تم کو قتل کیا۔
وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝ اور (تمہاری سزا کا) وعدہ پورا ہونا ہی تھا یعنی سزا لامحالہ دی جانی تھی سو دے دی گئی۔
ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ پھر ہم نے پھیر دی ان پر تمہاری باری اور تم کو طاقت عطا کر دی کثیر مال اور بیٹے دے کر اور تمہاری جماعت بہت بڑی کر دی۔
اَلْكَرَّةَ یعنی سلطنت اور طاقت۔ عَلَيْهِمْ یعنی ان لوگوں پر جن کو تم پر مسلط کیا تھا۔ بیضاوی نے اس کی تفصیل اس طرح لکھی ہے کہ بہمن بن اسفندیار جب اپنے دادا گشتاسپ بن لہراسپ کی جگہ شاہ ایران ہوا تو اللہ نے اس کے دل میں بنی اسرائیل کے لئے کچھ رحم پیدا کر دیا اس نے تمام اسرائیلیوں کو قید سے رہا کر کے ملک شام کو بھیج دیا اور حضرت دانیال کو سب کا سردار بنا دیا یہ لوگ شام کو چلے گئے اور بخت نصر کی فوج پر انہوں نے تسلط پالیا، حضرت داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔
جب شام پر ان کا تسلط ہو گیا تو انہوں نے ملک کو پہلے سے زیادہ فروغ دیا۔ ان کی تعداد بھی خوب بڑھ گئی اور دولت بھی فراواں ہو گئی۔
نفیر ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اپنے کسی آدمی کے ساتھ دشمن کی طرف مارچ کرتے ہیں۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ نفیر نفر کی جمع ہے جیسے عبید عبد کی۔ نفر اس جماعت کو کہتے ہیں جو دشمن سے مقابلہ کے لئے نکلتی ہے۔
اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (ہم نے کہہ دیا کہ) اگر بھلائی کرو گے تو اپنے لئے بھلائی کرو گے (یعنی اگر اللہ کے احکام پر چلو گے تو خود تمہارے لئے سود مند ہوگا ثواب پاؤ گے اللہ کو تو تمہاری اطاعت سے کوئی فائدہ نہیں اور اگر برائی کرو گے تب بھی اپنی جانوں کے لئے برائی کرو گے خود ہی سزا پاؤ گے اپنا نقصان کرو گے اللہ کا کچھ ضرر نہ ہوگا۔
فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ پھر جب پچھلی مرتبہ (کی سزا) کا وعدہ (مقررہ وقت) آپہنچا (تو ہم نے کچھ لوگوں کو مسلط کر دیا) کہ وہ تمہارے چہروں کو اداس کر دیں اور مسجد (بیت المقدس اور اس کے اطراف) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلی مرتبہ گھسے تھے اور جس مقام پر غلبہ پائیں اس کو کامل طور پر تباہ کر دیں۔
لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ سے یہ مراد ہے کہ تمہارے چہروں کی ایسی حالت کر دیں جس سے برائی اور خرابی کے آثار واضح طور پر نمایاں ہوں۔
بغوی نے لکھا ہے کہ اللہ نے ایرانیوں اور رومیوں کو اور خردوش ڈیٹس کو بنی اسرائیل پر مسلط کر دیا۔ حملہ کرنے والوں نے بنی اسرائیل کو قتل کیا قید کیا اور جلا وطن کیا اس طرح دوبارہ بنی اسرائیل تباہ ہو گئے۔
مَا عَلَوْا جس جگہ پر غلبہ پائیں یا جتنی مدت غالب رہیں۔
بغوی نے محمد بن اسحاق کا بیان نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل برابر نافرمانیاں اور گناہ کرتے رہتے تھے اور اللہ ان سے درگزر فرماتا تھا اور اپنے احسانات سے نوازتا رہتا تھا گناہوں کی پاداش میں سب سے پہلے جو مصیبت لانا پر آئی وہ تھی جس کا اظہار اللہ نے اپنے پیغمبر موسیٰؑ کی زبان سے کرا دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ ہوا جس کا نام صدیقہ تھا اس زمانہ میں اللہ کی طرف سے یہ ضابطہ جاری تھا کہ بادشاہ کو ہدایت کرنے اور سیدھے راستے پر چلانے کے لئے اس کے ساتھ اللہ ایک پیغمبر کو بھی مبعوث فرما دیا

کرتا تھا، ان پیغمبروں پر کوئی جدید کتاب نازل نہیں ہوتی تھی، بلکہ توریت کے احکام پر چلنے کی ہدایت ہر پیغمبر کرتا تھا۔ صدیقہ بادشاہ ہوا تو اس کی راہنمائی کے لئے اللہ نے شعیا بن امصیا کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا، شعیا کی بعثت حضرت زکریا و یحییٰ سے پہلے تھی شعیا نے ہی حضرت موسیٰ اور حضرت محمد ﷺ کی بشارت دی تھی اور کہا تھا، اے یروشلم تجھے بشارت ہو اب تیرے پاس ایک گدھے پر سوار ہونے والا اور دوسرا اشتر سوار آئے گا۔

غرض مدت تک صدیقہ بیت المقدس اور بنی اسرائیل کا بادشاہ رہا جب اس کا دور حکومت ختم ہونے کا وقت آگیا تو اللہ نے سخاریب شاہ بابل کو (عراق سے) بھیج دیا سخاریب کے ساتھ چھ لاکھ جھنڈے تھے، سخاریب چلا چلا بیت المقدس کے اطراف تک پہنچ گیا۔ اس زمانہ میں صدیقہ کی پنڈلی میں پھوڑا تھا، شعیا نبی نے صدیقہ سے کہا، اے شاہ اسرائیل سخاریب شاہ بابل چھ لاکھ پھریرے لڑاتا آپہنچا لوگ ڈر کے مارے بھاگ گئے تو ہوشیار ہو جا، صدیقہ کو یہ بات سن کر بڑی فکر ہوئی، کہنے لگا اے اللہ کے نبی کیا آپ کے پاس اللہ کی طرف سے اس واقعہ کے متعلق کوئی وحی آئی ہے کہ ہمارا اور سخاریب کا فیصلہ کیا ہوگا، حضرت شعیا نے فرمایا، وحی تو کوئی نہیں آئی، یہ کہہ رہے تھے کہ شعیا کے پاس وحی آگئی اور حکم ملا کہ شاہ اسرائیل کے پاس جا کر اس کو حکم دے دو کہ تیرا وقت آگیا ہے اب تو اپنے گھر والوں میں سے جس کو چاہے وصیت کر دے اور اپنا جانشین بنا دے، حضرت شعیا نے صدیقہ سے جا کر کہہ دیا کہ اللہ کی طرف سے میرے پاس وحی آئی ہے جس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تجھ سے کہہ دوں کہ تیرے مرنے کا وقت آگیا ہے اب تو جو کچھ وصیت کرنا ہو کر دے اور اپنے گھر والوں میں سے جس کو چاہے اپنی جگہ بادشاہ بنا دے۔ صدیقہ یہ پیام سن کر قبلہ رو ہو کر نماز کو کھڑا ہو گیا دعا کی اور اللہ کے سامنے رویا اور زاری کی اور خلوص قلب کے ساتھ گڑگڑا کر عرض کیا۔

اے اللہ! رب الارباب، اے تمام معبودوں کے معبود، اے وہ ذات جو تمام عیوب سے پاک اور تمام نقائص سے مبرا ہے، اے رحمان، اے مہربانی کرنے والے جس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند اے اللہ میں نے جو کام کئے جو عمل مجھ سے ہوئے اور بنی اسرائیل پر انصاف کے ساتھ میں نے جو حکومت کی وہ سب کچھ تیری توفیق سے ہوا تو مجھ سے زیادہ اس سے واقف ہے میرا ظاہر و باطن تیرے سامنے ہے مجھ پر رحم فرما، صدیقہ اللہ کا نیک بندہ تھا اللہ نے اس کی دعا قبول فرمائی اور شعیا کے پاس وحی بھیجی کہ جا کر صدیقہ سے کہہ دو اللہ نے تیری دعا قبول کر لی تجھ پر رحم فرمایا، تجھے تیرے دشمن سخاریب سے نجات دے دی اور تیری میعاد زندگی پندرہ سال بڑھا دی، شعیا نے آ کر صدیقہ کو یہ پیام پہنچا دیا۔ یہ سنتے ہی صدیقہ کے دل سے دشمن کا خوف جاتا رہا، رنج و فکر دور ہو گیا اور سجدے میں گر کر اس نے دعا کی، اے میرے اور میرے باپ دادا کے معبود میں تجھے ہی سجدہ کرتا ہوں، تیری پاکی کا اقرار کرتا ہوں، تجھے بڑا جانتا ہوں تیری تعظیم کرتا ہوں تو ہی جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے نکال لیتا ہے تو ظاہر و باطن کو جانتا ہے تو ہی اول تو ہی آخر تو ہی ظاہر اور تو ہی پوشیدہ ہے تو ہی رحم کرتا اور بے قراروں کی دعا قبول کرتا ہے تو نے ہی میری دعا قبول فرمائی اور میری زاری پر رحم کیا جب سر اٹھایا تو اللہ نے شعیا نبی کے پاس وحی بھیجی بادشاہ صدیقہ سے کہہ دو کہ اپنے خادموں میں کسی کو حکم دے کر انجیر کا پانی منگوا کر اپنے پھوڑے پر لگائے، اللہ صبح تک شفا دے دے گا۔ صدیقہ نے حکم کی تعمیل کی اور اللہ نے اس کو تندرست کر دیا۔

بادشاہ نے حضرت شعیا سے عرض کیا اپنے رب سے یہ دعا کر دیجئے کہ اللہ ہم کو بتا دے ہمارے اس دشمن کا کیا ہو گا اللہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا۔

اللہ نے شعیا سے فرمایا بادشاہ سے کہہ دو کہ میں نے تمہارے دشمن کو تم سے روک دیا اور تم کو اس سے بچا لیا، صبح تک سب مر جائیں گے صرف سخاریب اور اس کے پانچ اہل کار بچیں گے تم ان کو پکڑ لینا صبح ہوئی تو کسی پکارنے والے نے چیخ کر شہر کے دروازے پر کہا اے بنی اسرائیل کے بادشاہ اللہ نے تیرا کام پورا کر دیا تیرے دشمن کو تباہ کر دیا، باہر نکل کر دیکھ لے، سخاریب اپنے ساتھیوں سمیت ہلاک ہو گیا، بادشاہ باہر نکلا، مردوں میں سخاریب کو تلاش کر لیا گیا مگر اس کی لاش نہیں ملی، بادشاہ نے اس کی

طلب میں آدمی دوڑائے آخر اس دوڑ دھوپ نے ایک غار میں سنحاریب کو اس کے پانچ اہلکاروں کو جا پکڑا ان میں بخت نصر بھی تھا سب کو زنجیروں میں باندھ کر صدیقہ کے پاس لے آئے فوراً بادشاہ سجدہ میں گر پڑا اور طلوع آفتاب کے بعد سے عصر تک سجدہ میں پڑا رہا پھر سنحاریب سے کہا، تم نے دیکھا ہمارے رب نے تمہارے ساتھ کیا کیا تم بے خبر تھے اور اس نے اپنی طاقت سے تم کو قتل کر دیا، سنحاریب نے کہا مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ تمہارا رب تمہاری مدد کرے گا اور تم پر رحمت نازل فرمائے گا اپنے ملک سے نکلنے سے پہلے ہی مجھے اس کی اطلاع مل چکی تھی مگر میں نے صحیح رہنما کا کہنا نہیں مانا میری کم عقلی نے مجھے اس بد بختی میں مبتلا کر دیا اگر میں راہنما کی بات سن لیتا یا سمجھ سے کام لے لیتا تو تم سے جنگ ہی نہیں کرتا (تم پر چڑھائی نہ کرتا) صدیقہ نے کہا اللہ رب العزت کا شکر ہے کہ اس نے جس سے چاہا تم کو تباہ کرا دیا (اب جو تم اور تمہارے پانچ ساتھی بچ گئے ہیں تو یہ نہ سمجھنا کہ اللہ کے نزدیک تمہاری کوئی عزت ہے کہ اس نے تم کو باقی رکھا) اس نے تجھے اور تیرے ساتھیوں کو صرف اس لئے باقی رکھا ہے کہ دنیا میں تمہاری بد نصیبی اور آخرت میں تمہارا عذاب بڑھ جائے اور ہمارے رب نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا ہے اس کی اطلاع ان لوگوں کو بھی جا کر دے دو جو تمہارے ساتھ یہاں نہیں آئے اور اپنے پیچھے والوں کو بھی ہمارے رب کے عذاب سے ڈرا دو، اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں ... تم سب کو قتل کر دیتا تیرا اور تیرے ساتھیوں کا خون اللہ کے نزدیک چچڑی کے خون سے بھی حقیر ہے اگر میں قتل کر دیتا تو میرے رب کو پرواہ بھی نہ ہوتی پھر کوتوال نے شاہ اسرائیل کے حکم سے ان لوگوں کی گردنوں میں زنجیریں ڈال کر ستر روز تک بیت المقدس اور ایلیا کے گرد اگرد پھرایا ... ان میں سے ہر شخص کو روزانہ جو کی دو روٹیاں کھانے کو دی جاتی تھیں، سنحاریب نے شاہ اسرائیل سے کہا تم جو سلوک ہمارے ساتھ کر رہے ہو اس سے تو قتل ہو جانا ہی بہتر ہے شاہ اسرائیل نے ان کو قتل خانہ کو بھجوا دیا اس کے بعد اللہ نے حضرت شعیا کے پاس وحی بھیجی کہ بادشاہ سے جا کر کہہ دو کہ سنحاریب کو اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دے تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ان سے پرے ہیں جا کر ڈرائیں، بادشاہ کو چاہیے کہ سنحاریب اور اس کے ساتھیوں کی عزت کرے اور عزت کے ساتھ سوار کر کے ان کے ملک کو بھیج دے۔ شعیا نے بادشاہ کو اللہ کا یہ حکم پہنچا دیا اور بادشاہ نے حکم کی تعمیل کی۔ سنحاریب ساتھیوں سمیت بابل پہنچ گیا اور لوگوں کو جمع کر کے اپنے لشکر کی حالت بتائی کاہنوں اور نجومیوں نے کہا بادشاہ سلامت ہم تو آپ کو پہلے ہی بنی اسرائیل کے خدا کی خبر اور ان کے نبی کی کیفیت اور نبی کے پاس جو ان کے خدا کی طرف سے وحی آنے والی تھی، اس کی اطلاع دے چکے تھے مگر آپ نے ہمارا کہنا نہ مانا بنی اسرائیل ایسی امت ہے کہ ان کا رب ان کے ساتھ ہے اور ان کے رب کی موجودگی میں کوئی ان سے لڑ نہیں سکتا۔ سنحاریب کا واقعہ اس کی قوم کو ڈرانے کے لئے ہوا تھا، اللہ نے اس واقعہ سے ان کو کافی نصیحت کر دی، اس کے بعد سنحاریب سات برس زندہ رہا پھر مر گیا اور مرنے سے پہلے اس نے اپنا جانشین اپنے پوتے بخت نصر کو بنا دیا بخت نصر اپنے دادا کے راستہ پر چلا اور وہی کام کئے جو اس کے دادا نے کئے تھے اور سترہ سال حکومت کی۔ صدیقہ کے مرنے کے بعد بنی اسرائیل کی حکومت بگڑ گئی قوم میں گڑبڑ ہو گئی باہم حکومت کے لئے دوڑ شروع ہو گئی اور آپس میں خوب کشت و خون ہوا شعیا موجود تھے مگر ان کی نصیحت کوئی نہیں مانتا تھا جب قوم کی ابتری یہاں تک پہنچ گئی تو اللہ نے شعیا کے پاس وحی بھیجی تم اپنی قوم کے سامنے کھڑے ہو کر خطبہ دو میں تمہاری زبان پر اپنی وحی جاری کر دوں گا (جو کچھ میں بولنا چاہوں گا وہ تمہاری زبان پر آجائے گا) شعیا قوم کو خطاب کرنے کھڑے ہو گئے اور اللہ نے ان کی زبان پر یہ الفاظ وحی جاری کر دیے، اے آسمان سن لے اور اے زمین تو بھی کان ادھر لگا اللہ بنی اسرائیل کی حالت بیان کرنا چاہتا ہے ان کو اللہ نے اپنی نعمتیں دے کر پرورش کیا اپنے لئے ان کو منتخب کر لیا اپنی طرف سے خصوصی عزت عطا کی اور سب لوگوں پر ان کو برتری عنایت فرمائی یہ لوگ بھٹکی ہوئی بکریوں کی طرح تھے جن کا کوئی نگراں نگہبان نہ تھا اللہ نے ان منتشر بکریوں کو یکجا کیا۔ بھٹکی ہوئی بکریوں کو جمع کیا اور شکستہ کو جوڑا بیمار کو تندرست کر دیا، لاغر کو فربہی عطا کی اور فربہ کی فربہی کی حفاظت کی اللہ نے جب ان کے ساتھ یہ سلوک کیا تو یہ مغرور ہو گئے اور آپس میں ٹکرانے اور ایک دوسرے کے سینگ مارنے لگے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا یہاں تک کہ ان میں کوئی بھی ایسا صحیح الحال شخص نہ رہا کہ کوئی شکستہ اعضاء والا اس کی پناہ میں آجاتا ہلاکت کو اس خطاکار امت

کے لئے جس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی موت کہاں سے آرہی ہے مقدر کردیا (یعنی یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ان کی قوی موت کے اسباب کیا ہیں) اونٹ کو اپنا وطن یاد آتا ہے تو وہ وطن کو لوٹ آتا ہے۔ گدھے کو اپنی کھرلی یاد آتی ہے جس سے وہ پیٹ بھرا کرتا تھا تو وہ کھرلی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ بیل کو جب سبزہ زار یاد آتا ہے جس کو کھا کر وہ موٹا ہوا تھا تو وہ سبزہ زار کی طرف آجاتا ہے لیکن یہ قوم جو عقل و دانش والے ہیں، بیل نہیں ہیں گدھے نہیں ہیں اس کے باوجود ان کو معلوم نہیں کہ ان کی موت کہاں سے آرہی ہے۔ میں ان کی ایک مثال بیان کرتا ہوں تم ان سے کہہ دو کہ ایک ویران زمین تھی جو مدت تک ویران پڑی رہی۔ بے آب و گیاہ تھی اس میں کوئی عمارت نہ تھی لیکن اس کا مالک ایک صاحب قدرت اور حکمت والا شخص تھا، مالک نے اس زمین کو آباد کرنے کی طرف توجہ کی اس نے پسند نہیں کیا کہ لوگ کہیں کہ اس زمین کا مالک قوت رکھتا ہے پھر بھی اس نے زمین کو ویران رکھ چھوڑا ہے یا یہ کہیں کہ اس کا مالک حکمت و دانش رکھتا ہے اس کے باوجود زمین کو اس نے برباد کر دیا ہے یہ خیال کر کے اس نے زمین کی چار دیواری بنائی اندر ایک مضبوط محل تیار کیا، نہریں جاری کیں، زیتون، انار، کھجور اور رنگ برنگ کے پھلوں کے درخت بوئے اور ایک عقلمند باہمت طاقتور امانت دار محافظ کی نگرانی میں اس زمین کو دے دیا جب درختوں میں شگوفے نکلے تو ناکارہ شگوفے نکلے لوگ کہنے لگے یہ زمین خراب ہے مناسب یہ ہے کہ اس کی دیواریں گرا دی جائیں محل کو ڈھا دیا جائے، نہریں پاٹ دی جائیں، نہروں کے دہانے بند کر دیئے جائیں درختوں کو جلا دیا جائے اور جیسے پہلے زمین بنجر و ویران تھی ویسی ہی کر دی جائے۔ تم ان سے کہہ دو کہ (ہر چہار سمت کی) دیوار میرا دین ہے، محل میری شریعت ہے، نہر میری کتاب ہے، نگران زمین میرا پیغمبر ہے اور درخت تم لوگ ہو اور ناکارہ شگوفے جو درختوں سے برآمد ہو رہے ہیں وہ تمہارے ناپاک اعمال ہیں جو فیصلہ تم نے اپنے لئے کیا ہے وہی فیصلہ میں نے تمہارے لئے جاری کر دیا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو میں نے ان کے حالات کو سمجھانے کے لئے بیان کی ہے۔ یہ گائے بکریاں ذبح کر کے میری قربت چاہتے ہیں حالانکہ یہ گوشت نہ مجھے پہنچتا ہے نہ میں اسے کھاتا ہوں، ان کو اس بات کی دعوت دی جا رہی ہے کہ تقویٰ اختیار کریں اور جس کو قتل کرنا میں نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل کرنے سے باز رہیں اور اس طرح میرا تقرب حاصل کریں مگر ان کے ہاتھ خون ناحق سے رنگین ہیں اور کپڑے ناجائز خوں ریزی سے آلودہ ہیں۔ یہ لوگ میرے لئے مکان یعنی مسجدیں پختہ بناتے ہیں ان کے اندرونی حصوں کو پاک بھی رکھتے ہیں مگر اپنے دلوں کو ناپاک اور جسموں کو گندہ اور میلا رکھتے ہیں مسجدوں میں پردے لگاتے اور ان کو آراستہ کرتے ہیں مگر اپنی عقلوں کو ویران اور اخلاق کو تباہ کرتے ہیں مجھے ان مسجدوں کے پختہ کرنے کی کیا حاجت ہے میں تو ان میں رہتا نہیں اور ان میں پردے لٹکانے کی مجھے کیا ضرورت ہے، میں تو ان کے اندر آتا نہیں، میں نے مسجدیں بلند کرنے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ وہاں میری یاد کی جائے اور میری پاکی بیان کی جائے۔

یہ لوگ کہتے ہیں ہم روزے رکھتے ہیں لیکن ہمارے روزے اوپر نہیں اٹھائے جاتے، ہم نمازیں پڑھتے ہیں یہ ہماری نمازیں نور نہیں پیدا کرتیں، ہم خیرات کرتے ہیں مگر ہمارے صدقات ہم کو پاک نہیں کرتے، ہم گدھوں کی آوازوں کی طرح چیخ چیخ کر دعا کرتے ہیں اور بھیڑیوں کی آوازوں کی طرح دہاڑیں مار کر روتے ہیں مگر ہماری کوئی چیز قبول نہیں کی جاتی۔

تم ان سے دریافت کرو۔ دعا قبول کرنے سے مجھے کون سی چیز روکتی ہے کیا میں سب سے زیادہ سننے والا سب سے بڑھ کر دیکھنے والا اور قریب ترین جواب دینے والا اور ارحم الراحمین نہیں ہوں، میں ان کے روزوں کو کس طرح اوپر اٹھاؤں جب کہ روزوں میں یہ جھوٹ بولتے ہیں اور لقمہ حرام کھاتے ہیں۔ میں ان کی نمازوں میں نور کیسے پیدا کروں جب کہ ان کے دل میرے دشمنوں اور میرے مخالفوں اور میری قائم کی ہوئی حدود کو توڑنے والوں کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ ان کے صدقات میرے ہاں کیسے بار آور ہوں وہ تو پرایا مال صدقہ میں دیتے ہیں، میں تو خیرات کا اجر ان لوگوں کو دیتا ہوں جو معصوم اہل خیر ہوں۔ میں ان کی دعائیں کیسے قبول کر سکتا ہوں۔ ان کی دعا تو صرف قول بے عمل ہوتی ہے (کہتے ہیں عمل کچھ نہیں کرتے) ان کا عمل قول سے بہت دور ہوتا ہے میں تو دعا اس کی قبول کرتا ہوں جو صاحب اطمینان اور نرم دل ہو اور میں اس کی بات سنتا ہوں جو سوال سے

بخشنے والا مسکین ہو، میری رضامندی کی نشانی مسکینوں کی رضامندی ہے۔

جب یہ لوگ میرا کلام سنتے ہیں اور میرا پیام تم ان کو پہنچاتے ہو تو کہتے ہیں یہ بنائی ہوئی باتیں اور وہی پارینہ قصے ہیں جو باپ دادا سے ہم سنتے چلے آئے ہیں اور جادوگر وکاہن جیسے الفاظ کا جوڑ لگاتے ہیں ویسا ہی یہ بھی جوڑا ہوا کلام ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ایسا کلام ہم بھی پیش کر سکتے ہیں۔ شیطان ہمارے پاس بھی وحی لاتے ہیں اگر ہم چاہیں تو شیطانوں کی وحی کی وجہ سے ہم بھی غیب سے واقف ہو جائیں۔ سنو۔

میں نے جس روز آسمان وزمین کو پیدا کیا تھا اسی روز ایک فیصلہ قیامت ہونے کا کر دیا تھا اور اپنے اوپر اس فیصلہ کو لازمی اور قطعی کر لیا تھا اور اس سے پہلے دنیوی زندگی کی ایک مقرر میعاد بنا دی تھی، وہ فیصلہ ضرور واقع ہوگا اگر یہ لوگ غیب دانی کے دعویٰ میں سچے ہیں تو تم کو بتا دیں کہ اس فیصلہ کو میں کب جاری کروں گا یا وہ کس زمانہ میں ظاہر ہوگا۔ اور اگر ان میں اس امر کی قدرت ہے کہ جو کچھ چاہیں پیش کر سکتے ہیں تو ایسی قدرت کا مظاہرہ کریں، جس سے میں اس فیصلے (قیامت) کو نافذ کروں گا۔ میں بہر حال اس فیصلہ کو تمام مذاہب پر غالب کروں گا خواہ شرک کرنے والوں کو پسند نہ ہو اور اگر وہ جیسا چاہیں جوڑ سکتے ہیں تو ایسی حکمت کے ساتھ تالیف کریں جس حکمت سے میں امر قضاء (کو نافذ کرنے) کی تدبیر کرتا ہوں۔ اور میں نے آسمان وزمین کو پیدا کرنے کے دن ہی یہ طے کر دیا تھا کہ نبوت جاری کروں گا اور حکومت نچلے طبقہ کے عوام کو دوں گا اور بے عزتوں کو عزت، کمزوروں کو قوت، محتاجوں کو دولت، جاہلوں کو علم اور بے پڑھے لکھوں کو حکمت عطا کروں گا۔ تم ان سے دریافت کرو کہ اگر وہ جانتے ہوں۔ تو بتائیں ایسا کب ہوگا اور کون یہ کام کرے گا اور کون لوگ ان چیزوں کے کار گزار اور مددگار ہوں گے، یہ یقینی امر ہے کہ میں ان کاموں کے لئے ایک نبی امی کو بھیجوں گا جو اکھڑ نہ ہوگا، درشت مزاج نہ ہوگا، بازاروں میں چیختا نہ پھرے گا، فحش بات زبان پر نہ لائے گا اور بے حیائی کی باتیں نہ کرے گا۔ میں اس کو سیدھا چلاؤں گا تمام عمدہ اخلاق عطا کروں گا وقار کو اس کا لباس بناؤں گا۔ نیکی اور بھلائی کو اس کا شعار، اندرونی لباس تقویٰ کو اس کا ضمیر، حکمت کو اس کا علم، سچائی اور وفاء عہد کو اس کا خمیر، عفو خیر کو اس کی عادت، انصاف کو اس کی سیرت، حق کو اس کی شریعت، ہدایت کو اس کا امام اور اسلام کو اس کا مذہب بناؤں گا۔ اس کا نام احمد ہوگا میں اس کے ذریعہ سے گمراہوں کو ہدایت، جاہلوں کو علم، گمناموں کو بلندی ذکر اور غیر معروف لوگوں کو شہرت عطا کروں گا۔ میں اس کے ذریعے سے قلیل کو کثیر، ناداروں کو زردار بناؤں گا پراگندہ لوگوں کو جمعیت، منتشر دلوں میں ملاپ، متفرق خواہشات رکھنے والوں میں باہم الفت اور متفرق جماعتوں میں اتحاد عنایت کروں گا، میں اس کی امت کو خیر الامم بناؤں گا جو لوگوں کی ہدایت کیلئے پیدا کی جائے گی، بھلائی کا حکم دے گی، برائی سے روکے گی، وہ مجھے واحد مانے گی مجھ پر ایمان لائے گی اور میرے لئے اپنے افکار واعمال کو خالص کرے گی، وہ نمازیں پڑھے گی، نماز میں قیام کرے گی قعود ورکوع اور سجود کرے گی، وہ میری راہ میں صف در صف (یعنی صف بستہ ہو کر) لڑے گی اور دشمنوں پر ہجوم کرے گی وہ اپنے گھروں اور مالوں کو چھوڑ کر میری رضامندی کی طلب میں نکلے گی۔ میں ان کے دلوں میں ڈال دوں گا، تکبیر، توحید، تسبیح، تحمید، مدح، تمجید (یعنی اپنی بزرگی، یکتائی بپاکی، حمد وثناء اور بزرگی) کا اعتراف واقرار اور اظہار، سفر میں بھی، ان کی مجلسوں میں بھی، خواب گاہوں میں بھی، آمد ورفت کے راستوں میں بھی اور قیام گاہوں میں بھی، وہ تکبیریں کہیں گے، تہا میری الوہیت کا اظہار کریں گے اور میری پاکی بیان کریں گے ٹیلوں کی بلندیوں پر چڑھ کر چہروں اور ہاتھوں پاؤں کو میرے لئے پاک کریں گے اور کمر پر کپڑے باندھیں گے ان کے خون ان کی قربانیاں ہوں گے ان کے سینے ان کی انجیلیں (یعنی وہ قرآنی آیات کے مخزن) ہوں گے وہ راتوں میں راہب اللہ سے ڈرنے والے شب زندہ دار اور دن میں (دشمنوں کے مقابلے میں) شیر ہوں گے اور یہ میرا افضل ہے میں جس کو چاہتا ہوں دیتا ہوں۔ اور میں بڑے فضل والا ہوں۔ جب حضرت شعیا اپنے خطبہ سے فارغ ہوئے تو آپ کو قتل کرنے کے لئے بنی اسرائیل نے آپ کے اوپر حملہ کر دیا آپ بھاگ پڑے راستہ میں ایک درخت ملا درخت سے آواز آئی اے اللہ کے نبی میرے اندر آجائیے اور وہ درخت پھٹ گیا، حضرت شعیا اس کی اندر داخل ہو گئے مگر شیطان نے پیچھے سے آپ کے کپڑے کا کونہ پکڑ لیا

آپ کے اندر داخل ہو جانے کے بعد درخت جڑ کر ہموار ہو گیا مگر کپڑے کا کونہ باہر رہ گیا شیطان نے لوگوں کو وہ کونہ دکھادیا اور کہا شعیا اس کے اندر ہیں ثبوت یہ ہے کہ ان کے لباس کا یہ کونہ باہر رہ گیا ہے لوگوں نے آرے سے درخت کے دو ٹکڑے کر دیئے اور حضرت شعیا کو بھی چیر ڈالا۔

اس کے بعد اللہ نے ایک شخص کو جس کا نام ناشیہ بن آموص تھا، بنی اسرائیل کا بادشاہ بنایا اور اس کی رفاقت و ہدایت کے لئے حضرت ہارون بن عمران کی اولاد میں سے ارمیا بن حلقیا کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا۔ ابن اسحاق نے بیان کیا کہ یہ ہی خضر تھے جن کا نام ارمیا تھا اور خضر لقب کیونکہ آپ ایک بار خشک گھاس پر بیٹھے تھے اور اٹھے تو وہ سرسبز ہو کر لہلہانے لگی تھی، اللہ نے حضرت ارمیا کو بادشاہ کی ہدایت اور سیدھے راستے پر چلانے کے لئے مامور فرمایا۔

کچھ مدت کے بعد بنی اسرائیل میں بڑی بڑی بدعتیں پیدا ہو گئیں معاصی کی کثرت ہو گئی اور ممنوعات کو انہوں نے حلال قرار دے لیا۔ اللہ نے حضرت ارمیا کو حکم دیا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کے پاس جاؤ۔ میں تم کو جو حکم دے رہا ہوں وہ ان سے بیان کرو میرے احسانات یاد دلاؤ اور جو بدعتیں ان کے اندر پیدا ہو گئی ہیں، وہ جتاؤ۔ ارمیا نے عرض کیا اے میرے رب اگر تیری طرف سے مجھے قوت عطا نہ ہو تو میں (بجائے خود) کمزور ہوں اگر تو مجھے (مقصد تک نہ پہنچائے تو میں عاجز ہوں اور اگر تو میری مدد نہ کرے (تو میری مدد کہیں سے نہ ہو گی) میں بے یار و مددگار ہوں اللہ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ تمام امور میری مشیت سے ہوتے ہیں تمام دل اور زبانیں میرے ہاتھ میں ہیں، میں جس طرح چاہتا ہوں ان کو موڑ دیتا ہوں میں تمہارے ساتھ ہوں اور میری موجودگی میں کوئی دکھ تم کو نہیں پہنچ سکتا۔ الغرض ارمیا بنی اسرائیل کو خطاب کرنے کھڑے ہو گئے لیکن ان کو کچھ علم نہ تھا کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں فوراً اللہ نے ان کے دل میں ایک بلیغ خطبہ القاء کر دیا، آپ نے لوگوں کو طاعت کا ثواب اور نافرمانی کا عذاب کھول کر جتایا اور آخر میں (استغراق حالت میں) اللہ کی زبان سے کہا، میں نے اپنی عزت کی قسم کھائی ہے کہ ان بنی اسرائیل پر ایک بڑا فتنہ مسلط کروں گا جس کے اندر دانش مند بھی حیران ہو جائے گا کوئی خلاصی کا راستہ سمجھ میں نہیں آئے گا اور ایک ظالم سنگ دل کو ان پر غالب کر دوں گا جس کو میں ہیبت کا لباس پہنا دوں گا (یعنی بڑا ہولناک ظالم ہو گا) اور اس کے سینے سے رحم کو نکال لوں گا اس کے ساتھ ایک لشکر ہو گا، تاریک رات کی سیاہی کی طرح ہر طرف ہر چیز پر چھا جانے والا۔ اس کے بعد اللہ نے ارمیا کو وحی بھیجی کہ میں یافث سے بنی اسرائیل کو تباہ کراؤں گا۔ یافث باشندگان بابل تھے (شاید اہل بابل یافث بن نوح کی نسل میں سے ہوں) چنانچہ اللہ نے بنی اسرائیل پر بخت نصر بابلی کو مسلط کر دیا، بخت نصر چھ لاکھ فوج لے کر نکلا اور مع لشکر بیت المقدس میں داخل ہو گیا۔ شام کو روند ڈالا بنی اسرائیل کو اتنا قتل کیا کہ فنا کر دیا، بیت المقدس کو تباہ کر دیا اور ہر فوجی کو حکم دیا کہ اپنی ڈھال بھر کر مٹی بیت المقدس پر ڈال دے، اس طرح بیت المقدس کو سپاہیوں نے خاک سے پاٹ دیا۔ پھر بخت نصر نے حکم دیا کہ بلاد بیت المقدس کے تمام باشندوں کو یکجا جمع کر لیا جائے چنانچہ سب لوگوں کو فوج والے پکڑ کر لے گئے۔ بنی اسرائیل کے سب بچے بڑے بخت نصر کے سامنے یکجا جمع کر دیئے گئے بخت نصر نے ان میں سے ستر ہزار بچے چھانٹ لئے (یعنی اپنی غلامی اور خدمت گاری کے لئے منتخب کر لئے) اور مال غنیمت فوج کو تقسیم کر دینے کا حکم دے دیا سواروں نے کہا مال غنیمت تو کل آپ کا ہے آپ شاہی خزانہ میں داخل کرا دیجئے بنی اسرائیل کے یہ بچے جو آپ نے منتخب کئے ہیں یہ فوج کو تقسیم کر دیجئے، بخت نصر نے یہ بات مان لی۔ اور بچوں کو بطور غلام سرداران فوج کو تقسیم کر دیا ہر شخص کے حصے میں چار غلام آئے پھر باقی لوگوں کی تین جماعتیں کر دیں بنی اسرائیل کی ایک تہائی جماعت کو تو شام میں ہی قائم رکھا گیا، ایک تہائی کو قیدی بنا لیا گیا اور تہائی کو قتل کر دیا گیا۔ ناشیہ کو اور ستر ہزار بچوں کو بخت نصر بابل لے گیا۔ بنی اسرائیل کی یہ پہلی تباہی تھی جو خود انہی کی بداعمالی کی وجہ سے ان پر آئی۔ آیت فَاِذَا جَاءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ۔ میں یہ ہی تباہی مراد ہے اور عباد سے بخت نصر اور اس کے ساتھی ہیں۔

ایک مدت کے بعد بخت نصر نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ کوئی چیز خواب میں دیکھی تھی لیکن اس کو یاد نہیں رہا کہ کیا

دیکھا تھا۔ دانیال، حنانیا، عزاریا اور میشائیل قیدیوں میں موجود ہی تھے، یہ سب انبیاء کی نسل سے تھے، بخت نصر نے ان لوگوں کو بلوایا اور خواب دریافت کیا۔ ان بزرگوں نے کہا آپ خواب بیان کیجئے تو ہم اس کی تعبیر دیں۔ بخت نصر نے کہا مجھے تو خواب یاد نہیں رہا، تم ہی میرا خواب بتاؤ اور تم ہی اس کی تعبیر بیان کرو اگر ایسا نہ کرو گے تو میں شانوں سے تمہارے ہاتھ اکھڑوا دوں گا۔ یہ بے چارے یہ ظالمانہ حکم سن کر دربار سے باہر آئے اور اللہ کے سامنے بہت گریہ وزاری کی، اللہ نے ان کو بادشاہ کے سوال کا جواب بتادیا جواب کا علم ہونے کے بعد یہ حضرات بادشاہ کے پاس پہنچے اور کہا آپ نے ایک مورت دیکھی تھی جس کے دونوں پاؤں اور پنڈلیاں پختہ مٹی کی تھیں اور زانو اور رانیں تانبے کی اور پیٹ چاندی کا اور سینہ سونے کا اور سر و گردن لوہے کے۔ بادشاہ نے کہا تم نے سچ کہا ان حضرات نے کہا آپ یہ دیکھ ہی رہے تھے اور آپ کو تعجب ہو رہا تھا کہ اللہ نے آسمان سے ایک پتھر اتارا پتھر نے مورتی کو ریزہ ریزہ کردیا یہی وہ چیز ہے جو آپ بھول گئے تھے۔ بخت نصر نے کہا تم نے سچ کہا اب اس کی تعبیر دو۔ انہوں نے جواب دیا آپ کو چند بادشاہوں کی حکومت دکھائی گئی ہے کسی کی حکومت تو نرم کمزور ہے اور کسی کی اس سے سخت اور کسی کی بہت ہی حسین اور کسی کی سب سے زیادہ سخت پختہ مٹی (ٹھیکرے) سب سے کمزور حکومت ہے پھر اس کے اوپر تانبا پہلی حکومت سے زیادہ سخت حکومت ہے پھر تانبے سے خوبصورت اور اعلیٰ چاندی ہے اور سونا چاندی سے زیادہ حسین اور برتر ہے سب کے اوپر لوہا آپ کی حکومت ہے جو پہلی حکومتوں سے زیادہ سخت اور مضبوط ہے اور وہ پتھر جو آسمان سے اترتا ہوا آپ نے دیکھا وہ اللہ کا نبی حکم ہے جو اللہ کی طرف سے آکر اس ساری مورتی کو چکنا چور کردے گا اور حکومت صرف اللہ کی رہ جائے گی۔

بنی اسرائیل کو اہل بابل کی خدمت میں رہتے رہتے جب مدت ہو گئی تو ایک روز بابل والوں نے بخت نصر سے کہا یہ غلام جو تمہاری درخواست پر آپ نے ہم کو عنایت کئے تھے جب سے ہمارے ساتھ رہے ہیں ہم اپنی عورتوں کو کچھ بدلا ہوا پاتے ہیں، عورتوں کے رخ ہماری طرف سے پھر کر ان کی طرف ہوگئے ہیں، آپ ان کو یہاں سے نکال دیجئے یا قتل کرادیجئے۔ بخت نصر نے کہا، تم کو اختیار ہے، چاہو ان کو قتل کردو، چاہو نکال دو۔ جب لوگوں نے ان کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اللہ سے گریہ وزاری کی اور عرض کیا بار الٰہا ہم پر یہ مصیبت دوسروں کے گناہوں کی پاداش میں پڑی ہے (تو ہم پر رحم فرما) اللہ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ تم کو زندہ رکھوں گا۔ آخر کچھ لوگ تو مارے گئے اور بخت نصر نے جن کو جیتا چھوڑ دیا وہ رہ گئے انہی میں سے دانیال، حنانیا، عزاریا اور میشائیل بھی تھے۔

بالآخر جب اللہ نے بخت نصر کو ہلاک اور غارت کردینے کا ارادہ کیا تو وہ خود ہی اپنی تباہی کا سبب بن گیا۔ جو بنی اسرائیل اس کے قبضے میں تھے ان سے ایک روز کہنے لگا۔ بتاؤ جو مکان میں نے تباہ کردیا وہ مکان کیسا تھا۔ اور جن لوگوں کو میں نے وہاں قتل کیا وہ کون تھے۔ بنی اسرائیل نے جواب دیا وہ اللہ کا گھر تھا اور وہ مقتول اس گھر کو آباد کرنے والے تھے، یہ لوگ نسل انبیاء سے تھے لیکن جب انہوں نے مظالم اور زیادتیاں کیں تو اللہ نے ان کی خطاکاریوں کی سزا میں آپ کو ان پر مسلط کردیا، ان کے رب نے جو سارے جہان کا رب ہے ان کو عزت عطا فرمائی تھی اور معزز بنایا تھا لیکن جب انہوں نے وہ کام کئے جو نہایت برے تھے (یعنی مظالم اور نافرمانیاں) تو اللہ نے ان کو غارت کردیا اور دوسروں کو ان پر مسلط کردیا، لیکن غالب آنے والا مغرور ہو گیا۔ اس نے خیال کیا کہ میں نے بنی اسرائیل کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اپنے بل بوتے پر کیا۔ بخت نصر نے کہا اچھا تو تم لوگ مجھے ایسی تدبیر بتاؤ کہ میں اونچے آسمان پر چڑھ جاؤں اور جو بھی وہاں ہو اس کو قتل کرکے اپنی حکومت وہاں قائم کرلوں زمین کی حکومت سے تو میں اب فارغ ہو گیا ہوں، بنی اسرائیل نے کہا کوئی مخلوق بھی ایسا نہیں کرسکتی، کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہنے لگا تم کو ایسا کرنا تو ہوگا آسمان پر چڑھنے اور اس کو فتح کرنے کی تدبیر بتانی ہوگی، ورنہ میں تم سب کو قتل کردوں گا، یہ بات سن کر سب لوگ اللہ کے سامنے روئے اور گڑگڑائے اور عاجزی کے ساتھ دعا کی، اللہ نے ان کی مدد کی اور اپنی قدرت سے ایک مچھر بھیج دیا جو بخت نصر کی ناک کے سوراخ میں گھس کر دماغ تک پہنچ گیا اور دماغ کی جھلی پر اس نے ڈنک مارا۔ بخت نصر بیتاب ہو گیا اس کو قرار ہی نہیں آتا تھا، جب تک سر پر ضربیں نہ لگتی تھیں، آخر اسی حالت میں مر گیا۔ مرنے کے بعد لوگوں نے سر چیر کر دیکھا تو ایک مچھر دماغ کی

جھلی پر ڈنک مارتا نظر آیا جو بنی اسرائیل اس کے قبضہ میں باقی تھے اللہ نے ان کو نجات دی اور وہ شام کو چلے گئے وہاں پہنچ کر انہوں نے عمارتیں بنائیں ان کی تعداد بھی بہت ہو گئی اور جو حالت ان کی پہلے تھی اس سے بھی بہتر حالت ہو گئی لوگ کہتے ہیں کہ جو بنی اسرائیل قتل کردیئے گئے تھے اللہ نے ان کو بھی زندہ کردیا اور وہ بھی ان میں آکر شامل ہو گئے۔

جب بنی اسرائیل ملک شام میں آئے تو ان کے پاس اللہ کی کتاب باقی نہیں تھی، توریت جلا دی گئی تھی، حضرت عزیرؑ بھی بابل کے قیدیوں میں تھے اور چھوٹ کر شام کو آئے تھے آپ تمام لوگوں سے الگ کہیں جنگل میں جا کر دن رات (توریت کے غم میں) روتے رہتے تھے۔ ایک روز کسی شخص نے ان سے پوچھا آپ اتنا روتے کیوں ہیں فرمایا اللہ کی کتاب کو روتا ہوں، اللہ کا وہ احکام نامہ جو ہمارے پاس تھا (جلا دیا گیا) نہ رہا اس کے بغیر نہ ہماری دنیا درست ہو سکتی ہے نہ آخرت۔ اس شخص نے کہا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ توریت آپ کو دوبارہ مل جائے تو روزے رکھیے نفس کو پاک کیجئے اور کپڑے بھی پاک رکھیے اور کل کو اسی جگہ میں آپ سے ملوں گا۔ حضرت عزیرؑ نے روزہ بھی رکھا جسم اور کپڑوں کو بھی پاک کیا اور اسی مقررہ مقام پر اس شخص کا انتظار کرنے لگے، حسب وعدہ وہ شخص پانی سے بھرا ہوا ایک برتن لے کر آیا یہ شخص فرشتہ تھا، اللہ نے اس کو بھیجا تھا۔ حضرت عزیرؑ کو اس نے کچھ پانی پلایا، پانی پیتے ہی توریت آپ کے سینے میں منقش ہو گئی۔ جب بنی اسرائیل کے پاس لوٹ کر آئے اور توریت پیش کی تو بنی اسرائیل کو آپ سے اتنی محبت ہو گئی کہ کسی چیز سے ایسی محبت نہیں ہوئی تھی آپ محبوب قوم بن گئے پھر کچھ مدت کے بعد اللہ نے آپ کو بلا لیا اور بنی اسرائیل طرح طرح کی بدعتوں میں مبتلا ہو گئے اور اللہ بھی ان کو سزا دیتا رہا اور پیغمبروں کو ان کی ہدایت کے لئے بھیجتا رہا، بنی اسرائیل کسی پیغمبر کی تو صرف تکذیب کرتے تھے اور کسی کو قتل کردیتے تھے تصدیق نہیں کرتے تھے۔ سب کے آخر میں اللہ نے حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو بھیجا یہ تینوں حضرات داؤدؑ کی نسل سے تھے۔ حضرت زکریاؑ اپنی موت سے مر گئے۔ بعض نے کہا آپ کو شہید کردیا گیا۔

جب بنی اسرائیل نے حضرت یحییٰؑ کو شہید کردیا اور حضرت عیسیٰؑ کو اٹھا لیا گیا تو بابل کے ایک بادشاہ کو جس کو خردوش کہا جاتا تھا بنی اسرائیل پر مسلط کردیا خردوش نے بابل کا لشکر لے کر شام پر چڑھائی کی ملک میں داخل ہو کر تمام بنی اسرائیل پر مسلط ہو گیا۔ جب کامل تسلط پا لیا تو اپنے ایک فوجی سردار سے جس کا نام بیورزاذان تھا کہا، میں نے اپنے معبود کی قسم کھائی تھی کہ بیت المقدس والوں پر جب مجھے فتح حاصل ہو گی تو ان کو اتنا قتل کروں گا کہ ان کا خون بہہ کر میرے لشکر کے وسطی حصہ تک آجائے، ہاں اگر قتل کرنے کے لئے کوئی شخص باقی ہی نہ رہے تو مجبوری ہے..... تم میری اس قسم کو پورا کرو۔ بیورزاذان اس حکم کی تعمیل کے لئے کھڑا ہو گیا اور بیت المقدس میں داخل ہو کر قربان گاہ تک پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ کچھ خون زمین سے ابل رہا ہے، پوچھا یہ کیا بات ہے، یہ خون کیسا ابل رہا ہے۔ بنی اسرائیل نے کہا اس جگہ ہم نے ایک قربانی ذبح کی تھی، قربانی قبول نہیں ہوئی اور اس وقت سے برابر یہ خون ابل رہا ہے۔ ویسے آٹھ سو برس سے ہم قربانیاں کرتے چلے آئے ہیں اور سب کی سب قبول ہوتی رہی ہیں صرف یہی قربانی قبول نہیں ہوئی بیورزاذان نے کہا تم نے مجھے سچ سچ نہیں بتایا کہنے لگے اگر پہلے جیسا وقت ہوتا تو ضرور یہ قربانی بھی قبول ہو جاتی مگر اب تو نہ ہماری حکومت رہی نہ سلسلہ وحی و نبوت۔ اسی لئے یہ قربانی قبول نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اسی مقام پر بیورزاذان نے بنی اسرائیل کے سرداروں کے سات سو ستر جوڑے ذبح کر ڈالے مگر خون جب بھی نہیں تھما۔ بیورزاذان نے بنی اسرائیل کے سات سو لڑکے اور قتل کرا دیئے پھر بھی خون ٹھنڈا نہ ہوا بیورزاذان نے جب دیکھا کہ خون تھمتا ہی نہیں ہے تو بنی اسرائیل سے کہا کہ کم بختوں مجھے سچ سچ بتا دو اور اپنے رب کے حکم پر صبر کرو، ایک طویل مدت تک اس زمین پر تمہاری حکومت رہی ہے، تم جو چاہتے تھے کرتے تھے، میں تم میں سے کسی آگ پھونکنے والے مرد کو چھوڑوں گا نہ عورت کو، سبھی کو قتل کردوں گا۔ یہ وقت آنے سے پہلے مجھے سچ سچ بتا دو۔ جب بنی اسرائیل نے قتل کی یہ شدت اور ناقابل برداشت مصیبت دیکھی تو سچی بات کہہ دی، کہنے لگے حقیقت میں یہ ایک پیغمبر کا خون ہے وہ ہم کو بہت سی باتوں سے منع کرتے تھے اور اللہ کے غضب سے ڈراتے تھے، اگر ہم ان کا کہا مان لیتے تو یقیناً وہ راستہ ہمارے لئے بہت سیدھا راستہ تھا۔ انہوں

نے ہم کو تمہارے متعلق بھی اطلاع دی تھی مگر ہم نے ان کو سچا نہ جانا اور بجائے تصدیق کے ان کو قتل کر دیا۔ بیورزاذان نے کہا اب تم نے سچی بات بتادی تم سے تمہارا رب اسی کا انتقام لے رہا ہے اس کے بعد بیورزاذان سجدے میں گر پڑا اور جو لوگ اس کی گرد اگرد تھے ان کو حکم دیا کہ خردوش کے لشکر کے جو آدمی یہاں ہیں ان کو باہر کر دو اور شہر کے دروازے بند کر دو۔ جب بنی اسرائیل کے ساتھ تنہا رہ گیا تو کہا اے یحییٰ بن زکریا آپ کے قتل کی وجہ سے جس مصیبت میں آپ کی قوم گرفتار ہوئی اور جتنے مارے گئے اس کو میرا اور آپ کا رب جانتا ہے اب آپ اپنے رب کے حکم سے ٹھہر جائیں قبل اس کے کہ آپ کی قوم کے کسی شخص کو میں زندہ نہ چھوڑوں فوراً اللہ کی حکم سے خون تھم گیا اور بیورزاذان نے بنی اسرائیل کو قتل کرنے کا حکم منسوخ کر دیا اور اور بولا بنی اسرائیل جس پر ایمان لائے ہیں میں بھی اس پر ایمان لایا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا رب نہیں پھر بنی اسرائیل سے کہا خردوش نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں تم کو اتنا قتل کروں کہ تمہارا خون بہ کر اس کے لشکر کے وسطی حصہ تک پہنچ جائے اور میں اس کے حکم عدولی کی طاقت نہیں رکھتا بنی اسرائیل نے کہا خردوش نے جو تم کو حکم دیا ہے اس کی تعمیل کرو۔ بیورزاذان نے ایک خندق کھودنے کا حکم دیا خندق تیار ہو گئی تو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے جتنے گھوڑے، گدھے، خچر، اونٹ، گائیں، بھینسیں اور بکریاں بھیڑیں ہیں سب کو ذبح کر کے خندق میں ڈال دیا جائے۔ اس کی تعمیل بھی کر دی گئی، یہاں تک کہ ان جانوروں کا خون لشکر گاہ کے وسط تک بہ کر پہنچ گیا اور ان جانوروں کے اوپر ان مقتولوں کی لاشوں کو ڈلوا دیا جن کو پہلے قتل کرا چکا تھا، خردوش سمجھا کہ خندق کے اندر صرف لاشیں ہی بھری پڑی ہیں خون تو لشکر گاہ تک پہنچ ہی چکا تھا اس لئے خردوش نے بیورزاذان کو قتل بند کر دینے کا حکم دے دیا، پھر بابل کو واپس چلا گیا۔ اس حادثہ میں سارے بنی اسرائیل فنا ہو گئے یا فنا ہونے کے قریب پہنچ گئے۔ یہی وہ دوسرا واقعہ ہے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے۔ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ۔ پہلا واقعہ تو بخت نصر اور اس کے لشکر کا ہوا اور دوسرا واقعہ خردوش اور اس کی فوج کا۔ دوسرا واقعہ پہلے واقعہ سے زیادہ سنگین تھا اس کے بعد بنی اسرائیل کو استقلال نصیب نہیں ہوا شام اور علاقہ شام کی حکومت رومیوں اور یونانیوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ ہاں جو بنی اسرائیل بچ گئے تھے ان کی نسل بکثرت ہو گئی اور بیت المقدس اور اس کے علاقہ میں ان کی ریاست قائم ہو گئی۔ مستقل حکومت نہ بن سکی۔ پھر بھی اللہ کی بڑی نعمتیں ان کو حاصل ہوئیں اور آسائش و آرام سے بسر کرنے لگے، لیکن پھر انہوں نے طرح طرح کے جرائم کئے اور نافرمانیاں کیں تو اللہ نے ان پر ططیس بن اسیانوس رومی کو مسلط کر دیا ططیس نے ان کی بستیوں کو تباہ کر دیا اور بیت المقدس سے ان کو نکال باہر کیا۔ ریاست ان سے چھین لی اور ایسی ذلت کی مار دی کہ آئندہ جس قوم میں رہے ذلت کے ساتھ اور جزیہ لوا کر کے رہے اور بیت المقدس اجڑا پڑا رہا، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کا دور خلافت آیا تو آپ کے حکم سے مسلمانوں نے اس کو آباد کیا۔

قتادہ نے کہا پہلے مرتبہ اللہ نے جالوت کو مسلط کیا جالوت نے ان کو قید کیا اور آبادیوں کو تباہ کر دیا۔ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ یعنی پھر حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں اللہ نے ان کی باری پھیر دی۔ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ یعنی جب دوسری تباہی کا وقت آیا تو بخت نصر کو اللہ نے ان پر مسلط کیا بخت نصر نے ان کو قیدی بنایا اور بستیوں کو اجاڑا۔ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ یعنی امید رکھو کہ آئندہ اللہ تم پر رحم فرمائے گا، چنانچہ اللہ نے ان پر دوبارہ رحم فرمایا لیکن بنی اسرائیل نے پھر مختلف زمانوں میں شرارتیں کیں اور اللہ نے بھی سزا اور عقوبت ان کو دی۔ آخر کار عرب کو ان پر مسلط فرمایا، اللہ نے فرمایا، وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ اور جب آپ کے رب نے آگاہی دے دی تھی کہ قیامت کے دن تک ان (یہودیوں) پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو برا عذاب دیتے رہیں گے۔ لہٰذا یہودی ہمیشہ عربوں کے ہاتھوں سے عذاب میں رہیں گے۔

سدی نے ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ بیت المقدس کی ویرانی ایک یتیم لڑکے کے ہاتھوں سے ہوگی جو بابل کی ایک بیوہ کا لڑکا ہوگا اور اس کا نام بخت نصر ہوگا (اس زمانہ میں) بنی اسرائیل چونکہ سچ بولتے تھے اس لئے ان کا خواب بھی سچا ہوتا تھا یہ شخص خواب دیکھنے کے بعد بخت نصر کی جستجو میں نکلا یہاں تک کہ اس کی ماں کے پاس پہنچ

گیا بخت نصر لکڑہارا تھا اس شخص نے دیکھا کہ وہ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے آیا گٹھے کو سر سے ڈالنے کے بعد بیٹھ گیا اس آدمی نے بخت نصر سے کچھ باتیں کیں پھر اس کو تین درہم دیئے اور کہا جا کر اس کی کچھ کھانے پینے کی چیز لے آؤ بخت نصر نے جا کر ایک درہم کا گوشت ایک درہم کی روٹی اور ایک درہم کی شراب خرید لی اور لے آیا سب نے مل کر کھانا کھایا اور شراب پی اس آدمی نے دوسرے اور تیسرے روز بھی ایسا ہی کیا (روزانہ تین درہم کی کھانے پینے کی چیزیں منگوائیں اور سب نے کھایا) پھر بخت نصر سے کہا میں چاہتا ہوں کہ اگر کبھی کسی دن تم بادشاہ ہو جاؤ تو میرے لئے پروانہ امان ابھی سے لکھ دو تا کہ تمہاری حکومت کے وقت میرے کام آئے بخت نصر نے کہا، کیا تو مجھ سے مذاق کر رہا ہے اس شخص نے کہا میں مذاق نہیں کرتا، تمہارا کیا حرج ہے کہ پروانہ امان لکھ کر مجھے منت کش بنا دو۔ بخت نصر نے پروانہ امن لکھ دیا۔ اس شخص نے کہا جب تمہارے گرد اگرد لوگ جمع ہوں اور میں اس وقت پہنچوں تو تمہارے پاس تک میری رسائی کیسے ہوگی۔ بخت نصر نے کہا کسی بانس میں اس تحریر کو باندھ کر بلند کرنا میں پہچان لوں گا۔ غرض بخت نصر نے تحریر لکھ کر اس شخص کو دے دی۔

قتادہ نے کہا بنی اسرائیل کا بادشاہ حضرت یحییٰ بن زکریا کی بڑی عزت کرتا تھا آپ کو اس نے اپنا مقرب بنا رکھا تھا (اتفاقاً) بادشاہ کو اپنی بیوی کی بیٹی اور بقول حضرت ابن عباسؓ اپنی بھانجی سے گہری محبت ہو گئی، حضرت یحییٰؑ سے اس نے مسئلہ پوچھا آپ نے نکاح کی اجازت نہ دی، بیوی کی بیٹی یا بھانجی سے نکاح شریعت یہود میں بھی حرام تھا، اس لڑکی کی ماں کو حضرت یحییٰؑ کے فتوئی کی خبر پہنچی تو اس کے دل میں حضرت کی طرف سے کینہ پیدا ہو گیا، ایک روز جب بادشاہ نے محفل شراب منعقد کی تو اس عورت نے اپنی بیٹی کو باریک سرخ رنگ کے کپڑے پہنائے خوشبو سے مہکایا، زیور سے آراستہ کیا اور بنا سجا کر بادشاہ کے پاس بھیج دیا اور یہ کہہ دیا کہ تو بادشاہ کو شراب پلانا اور جب وہ تیری طرف کو مائل ہو تو اول تو اس سے شرط کرا لینا کہ میرا ایک سوال آپ کو پورا کرنا ہوگا، جب وہ زبان دے دے تو اس سے کہنا مجھے یحییٰ بن زکریا کا سر طشت میں رکھا ہوا درکار ہے، پھر وہ جو کچھ تجھ سے چاہے اس کی تعمیل کرنا۔ لڑکی نے ایسا ہی کیا، بادشاہ جب اس کی طرف مائل ہوا تو اس نے حضرت یحییٰ کے سر کی شرط پیش کی۔ بادشاہ نے کہا کم بخت کچھ اور سوال کر لے۔ میں تیرا سوال پورا کر دوں گا یحییٰ کے سر کی طلبگار نہ ہو۔ لڑکی نے اصرار کیا، آخر یحییٰ کا سر بادشاہ نے منگوا دیا۔ سر لا کر رکھ دیا گیا تو سر سے آواز آ رہی تھی یہ عورت تیرے لئے حلال نہیں ہے۔ جب صبح ہوئی تب بھی سر سے خون ابلتا رہا، بادشاہ نے اس پر مٹی ڈالنے کا حکم دیا تب بھی خون نہ تھما، اور مٹی ڈلوائی تب بھی خون ابلتا ہی رہا، یہاں تک کہ شہر کی فصیل تک اس طشت کو لے جایا گیا اور خون جوش مارتا رہا، اسی دوران میں بابل کے بادشاہ صحابین نے بخت نصر کی زیر قیادت بنی اسرائیل پر حملہ کرنے کے لئے ایک لشکر بھیج دیا جب یہ فوج حدود بیت المقدس میں پہنچی تو لوگ قلعہ بند ہو گئے، انہوں نے بستیوں کے دروازے بند کر لئے، بخت نصر محاصرہ کئے پڑا رہا، آخر طول محاصرہ سے تنگ آ کر اس نے ناکام واپسی کا ارادہ کر لیا۔ بنی اسرائیل کی نسل کی ایک بڑھیا نکل کر آئی اور اس نے بخت نصر سے کہا آپ شہر فتح کئے بغیر واپس جانا چاہتے ہیں۔ بخت نصر نے کہا ہاں، میرا یہاں قیام طویل ہو گیا اور ساتھ والوں کو کچھ کھانے کو مل نہیں رہا ہے۔ کہنے لگی تدبیر میں بتاتی ہوں مگر ایک بات میری آپ کو ماننی ہوگی، جس کو قتل کرنے کا میں آپ کو مشورہ دوں اس کو آپ قتل کر دیں اور جب قتل کرنے سے روک دوں آپ رک جائیں۔ بخت نصر نے کہا اچھا، بڑھیا نے کہا صبح کو آپ اپنے لشکر کے چار حصے کر دیں، ہر گوشہ پر لشکر کا ایک حصہ مقرر کر دیں۔ پھر سب مل کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہیں یحییٰ بن زکریا کے خون کے عوض ہم تجھ سے فتح کے طلب گار ہیں، امید ہے کہ دعا مانگتے ہی (شہر کی) دیواریں گر پڑیں گی بخت نصر اور اس کے لشکر نے ایسا ہی کیا، دیواریں فوراً گر پڑیں اور تمام اطراف سے فوج اندر داخل ہو گئی۔ بڑھیا نے بخت نصر سے کہا اب اپنا ہاتھ روک لو، پھر بخت نصر کو لے کر یحییٰ بن زکریا کے خون کے پاس پہنچی اور کہا لوگوں کو گرفتار کرا کے اس خون پر قتل عام اس وقت تک کرو کہ اس کا ابلنا بند ہو جائے، بخت نصر نے وہاں ستر ہزار آدمیوں کو قتل کیا، آخر وہ خون تھم گیا۔ خون رک گیا تو بڑھیا نے کہا اب قتل موقوف کرو۔ جب کوئی نبی قتل کیا جاتا ہے تو اللہ اس وقت تک راضی نہیں ہوتا جب تک قاتلوں کو اور قتل پر رضامند ہونے والوں کو قتل نہ کر دیا جائے

اتنے میں پروانہ امن والا پروانہ امان لے کر آ گیا، بخت نصر نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو امان دے دی اور بیت المقدس کھنڈر کر دیا اور اس میں مردار جانور ڈلوا دیئے...... بیت المقدس کی بربادی میں رومیوں نے بھی بخت نصر کی مدد کی کیونکہ بنی اسرائیل نے یحییٰ کو قتل کیا تھا اور یحییٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی بشارت دی تھی بخت نصر اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے کچھ سرداروں کو لے گیا، جن میں حضرت دانیال اور دوسرے انبیاء زادے تھے اور جالوت کے سر کو بھی ساتھ لے گیا۔

بابل میں پہنچا تو چونکہ صحابین مر چکا تھا، لوگوں نے صحابین کی جگہ اسی کو بادشاہ بنا دیا بخت نصر حضرت دانیال اور آپ کے ساتھیوں کی بڑی عزت کرتا تھا، مجوسیوں کو اس بات سے جلن ہوئی اور انہوں نے بخت نصر سے دانیال کی چغلیاں کھائیں اور کہا دانیال اور ان کے ساتھی آپ کے معبود کو نہیں مانتے اور آپ کے ہاتھ کا ذبیحہ (یعنی آپ کا عقیدہ رکھنے والے مشرکوں کا ذبیحہ) بھی نہیں کھاتے، بخت نصر نے دانیال اور ان کے ساتھیوں سے یہ بات دریافت کی، انہوں نے جواب دیا ہاں ہمارا ایک رب ہے اور ہم آپ لوگوں کا ذبیحہ نہیں کھاتے، بخت نصر نے ایک خندق کھدوائی اور ان سب کو جن کی تعداد چھ تھی اس میں ڈلوا دیا، اور ایک شکاری شیر کو بھی خندق میں چھوڑ دیا تاکہ شیر ان لوگوں کو پھاڑ کھائے، لیکن دن گزرنے کے بعد شام کو جا کر دیکھا تو سب کو (صحیح سالم) بیٹھا ہوا پایا، شیر بھی پاؤں پھیلائے ان کے پاس ہی پڑا ہوا تھا اور اس نے کسی کے خراش بھی نہیں لگائی تھی، اس کے علاوہ ایک ساتواں آدمی اور بھی ان کے ساتھ موجود تھا، حقیقت میں وہ ایک بادشاہ تھا جس کی سات سال تک اللہ برابر ہر سال صورت مسخ کرتا رہا، وہب نے اس کی یوں تفصیل کی ہے کہ بخت نصر کو اللہ نے ایک سال بشکل گدھ رکھا، پھر ایک برس تک بیل کی شکل پر کر دیا، پھر شیر کی صورت پر کر دیا۔ اسی طرح سات سال تک صورت بگڑتی اور بدلتی رہی لیکن دل ہر صورت میں انسان ہی کا رہا، آخر میں پھر اس کی حکومت اس کو عطا فرما دی اور وہ مومن ہو گیا۔ وہب سے دریافت کیا گیا، کیا بخت نصر مومن تھا، وہب نے جواب دیا، اس کے بارے میں میں نے اہل کتاب کے اقوال مختلف پائے، کوئی تو قائل ہے کہ اس کی موت ایمان پر ہوئی اور کوئی کہتا ہے اس نے بیت المقدس کو جلایا جو خانہ خدا تھا، اللہ کی کتابوں کو سوختہ کیا اور انبیاء کو قتل کیا اس پر اللہ کا غضب پڑا اور توبہ قبول نہیں ہوئی۔

سدی کا بیان ہے کہ مسخ شکل کے بعد اللہ نے جب بخت نصر کو اس کی اصلی شکل پر کر دیا اور حکومت بھی اس کو دوبارہ عطا فرما دی، تو دانیال اور آپ کے ساتھیوں کی اس نے بڑی عزت و تعظیم کی۔ مجوسیوں کو اس بات پر حسد ہوا انہوں نے بخت نصر سے کہا دانیال شراب پی لیتا ہے تو پیشاب ضرور کرتا ہے، یہ بات ان لوگوں کی سوسائٹی میں بہت بری مانی جاتی تھی۔ اس پر بخت نصر نے حضرت دانیال اور ان کے ساتھیوں کو کھانا اور شراب بھیجی اور دربانوں سے کہہ دیا، دیکھو جو شخص پیشاب کے لئے سب سے پہلے نکل کر جائے اس کو تبر سے مارنا خواہ وہ یہ بھی کہے کہ میں بخت نصر ہوں تب بھی تم یقین نہ کرنا اور ضرور مارنا اور کہہ دینا کہ تو بخت نصر نہیں جھوٹا ہے۔ بخت نصر نے تو ہم کو حکم دے رکھا ہے کہ جو شخص باہر نکلے اس کو مارنا۔ اتفاق کی بات کہ سب سے پہلے پیشاب کے لئے بخت نصر ہی گیا اور دربان نے اس پر حملہ کر دیا بخت نصر نے ہر چند کہا میں بخت نصر ہوں مگر دربان نے اس کو جھوٹا قرار دیا اور مارتے مارتے مار ہی ڈالا۔

بغوی نے لکھا ہے ارباب تاریخ کے نزدیک حضرت یحییٰؑ کے قتل کے بعد بخت نصر کا بنی اسرائیل پر چڑھائی کرنا ثابت نہیں بلکہ اہل تاریخ اس امر پر متفق ہیں کہ بنی اسرائیل نے جب حضرت شعیا کو قتل کر دیا تو اس کے بعد بخت نصر نے حضرت ارمیا کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو قتل و غارت کیا حضرت ارمیا اور ولادت یحییٰ بن زکریاؑ کے درمیان چار سو اکسٹھ برس کا فصل ہے۔ بہمن بن اسفندیار (شاہ ایران) کی طرف سے کیرش بن اخشورش بن اصبہبذ بابل کا نواب تھا، اس کے زمانے میں ہی دوبارہ بیت المقدس کی تعمیر ہوئی یہ وہ وقت تھا جب بخت نصر کے ہاتھوں سے بیت المقدس کو برباد ہوئے ستر سال گزر چکے تھے۔ پھر تعمیر بیت المقدس سے اٹھاسی سال بعد سکندر نے بیت المقدس پر تسلط کیا اور عہد سکندر سے تین سو تریسٹھ سال بعد حضرت یحییٰ کی پیدائش ہوئی اس حساب سے تو بخت نصر کے ہاتھوں سے جو تخریب ہوئی اس سے ۵۲۱ برس بعد حضرت یحییٰؑ کی ولادت

ہوئی، ۶۱ ۳ کی میزان مذکور تفصیل کے لحاظ سے غلط ہے۔ مترجم) بغوی نے لکھا ہے صحیح وہی ہے جو ابن اسحاق نے بیان کیا ہے۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ (اے بنی اسرائیل) قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے۔ یعنی اگر تم محمد ﷺ پر ایمان لے آؤ گے اور قرآن کا اتباع کرتے ہوئے اپنے اعمال درست کر لو گے تو امید ہے کہ اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔

وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ اور اگر تم (اللہ کی نافرمانی اور رسول کی مخالفت کی طرف) لوٹے تو ہم بھی (سزا اور انتقام کی طرف) لوٹیں گے۔

پس عبداللہ بن سلامؓ، شاہ نجاشیؓ، کعب احبارؒ اور ان جیسے دوسرے اہل کتاب جب رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے تو اللہ نے ان پر رحمت نازل فرما دی، ان کی ثنا کی اور فرمایا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ الخ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا، وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ الخ اور بنی قریظہ، بنی نضیر اور ان کی طرح دوسرے یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی اور آپ کو شہید کر دینا چاہا، آپ ﷺ پر جادو کیا، آپ ﷺ کے کھانے میں زہر ملا دیا، اور آپ ﷺ سے جنگ کی تو اللہ بھی ان کو سزا دینے کی طرف لوٹا، ان سے انتقام لیا، بنی قریظہ کو قتل کرا دیا، بنی نضیر کو جلاوطن کرا دیا، ان پر جزیہ مقرر کیا اور ان کو ذلیل کیا۔

وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا دیا ہے جس سے وہ کبھی نکل نہ سکیں گے۔ بعض علماء کے نزدیک حصیر کا ترجمہ بساط (فرش چٹائی وغیرہ) ہے۔ یعنی کافروں کے لئے ہم جہنم کا بچھونا کر دیں گے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ بے شک یہ قرآن وہ بات یا وہ راہ بتاتا ہے جو تمام باتوں اور تمام راہوں سے زیادہ درست اور سیدھی ہے یا وہ کلمہ بتاتا ہے جو تمام کلمات سے زیادہ صحیح ہے، اس وقت کلمہ سے مراد ہو گی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت۔

وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ۙ

اور ان مومنوں کو جو نیک کام کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے بڑا اجر یعنی جنت ہے۔ اجر کبیر سے مراد جنت ہے۔

وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ۧ

اور مومنوں کو بشارت اس بات کی بھی دیتا ہے کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ہم نے ان کے لئے دکھ والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ قرآن مومنوں کو دوہری بشارت دیتا ہے، جنت ان کے لئے ہو گی اور ان کے دشمنوں کے لئے سخت دکھ پہنچانے والا عذاب ہو گا۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ اور (بعض) آدمی برائی (یعنی عذاب) کی ایسی درخواست کرتا ہے جس طرح بھلائی کی درخواست۔ شر کی دعا کرنے سے مراد یہ ہے کہ غصہ میں اپنے لئے اپنے اہل و عیال اور مال کے لئے بد دعا کرتا ہے یا یہ مراد ہے کہ بعض چیزوں کو اپنے لئے اچھا سمجھتے ہوئے ان کو حاصل کرنے کی اللہ سے دعا کرتا ہے، حالانکہ وہ چیزیں اس کے لئے بری ہوتی ہیں۔

خیر کی دعا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ دنیا اور دین کی بھلائی کے لئے اور عذاب آخرت سے محفوظ رہنے کے لئے دعا کرتا ہے۔ پس اسی طرح وہ شر کا بھی طلب گار ہوتا ہے۔ اگر اللہ اس کی بد دعا قبول فرما لے تو یقیناً وہ تباہ ہو جائے مگر اللہ اپنی مہربانی سے اس کی یہ بد دعا قبول نہیں فرماتا اور اس کے سوال کے مطابق تباہ نہیں کرتا)

وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ اور انسان بڑا جلد باز ہے۔ یعنی جو خیال دل میں آتا ہے، چاہتا ہے کہ فوراً پورا ہو جائے، انجام پر غور نہیں کرتا، اور یہ نہیں سوچتا کہ اگر اس کا خیال پورا کر دیا جائے تو ایسا نتیجہ سامنے آ جائے گا جو اس کو پسند نہ ہو گا، ناگوار ہو گا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا صبر نہیں کرتا نہ اس کو دکھ پر قرار ہوتا ہے نہ سکھ پر ہر چیز سے اکتا جاتا ہے اور تنگ دل ہو کر دعا کرتا ہے۔

بعض علماء نے کہا انسان سے مراد حضرت آدمؑ ہیں، جب روح آپ کے بدن میں ڈالی گئی تو ناف تک ہی پہنچی تھی کہ اٹھنے لگے، مگر گر پڑے اٹھ نہ سکے۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔

واقدی نے مغازی میں حضرت عائشہؓ کے کسی آزاد کردہ غلام کی وساطت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک قیدی کو ساتھ لے کر حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا اس کی بڑی نگرانی رکھنا (کہیں بھاگ نہ جائے) حضرت عائشہؓ کسی عورت سے باتیں کرنے میں قیدی کی طرف سے غافل ہو گئیں، قیدی بھاگ گیا، رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور قیدی کے متعلق دریافت فرمایا، حضرت عائشہؓ نے کہا مجھے معلوم نہیں وہ کہاں گیا میں ذرا اس کی طرف سے غافل ہوئی کہ وہ نکل گیا، حضور والا ﷺ ناراض اور غضب ناک ہو کر فرمایا اللہ تیرا ہاتھ کاٹ دے، یہ فرما کر باہر تشریف لے گئے اور ملزم کے پیچھے آدمیوں کو دوڑایا لوگ اس کو پکڑ لائے پھر آپ اندر تشریف لائے حضرت عائشہؓ بستر پر (بیٹھی) اپنے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر رہی تھیں، فرمایا، کیوں کیا بات ہے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا میں آپ کی بد دعا (کا اثر ظاہر ہونے) کا انتظار کر رہی ہوں، حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی اے اللہ میں ایک انسان ہوں دوسرے انسانوں کی طرح مجھے بھی رنج ہوتا ہے اور غصہ آ گیا ہے، میں جس مومن مرد یا مومن عورت کے لئے کوئی بد دعا کروں تو میری بد دعا کو اس کے لئے گناہوں سے پاکی اور طہارت کا سبب بنا دے۔ واللہ اعلم۔

کلام کی رفتار بتا رہی ہے کہ الانسان سے مراد کافر انسان ہے اور دعا شر سے مراد عذاب کے فوراً آ جانے کی دعا ہے کافر بطور استہزاء جلد عذاب آنے کی درخواست کرتے تھے۔ نضر بن حارث نے کہا تھا اے اللہ! دونوں گروہوں میں جو فریق بہتر ہو اس کو فتح یاب کر اے اللہ اگر تیری طرف سے یہ اسلام و قرآن ہی حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے، چنانچہ بدر کے دن نضر بن حارث کی گردن ماری گئی۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ　اور ہم نے رات اور دن دو نشانیاں بنائی ہیں۔ شب و روز کا تعاقب اور ترتیب کے ساتھ آنا جانا قادر و حکیم کی ذات پر دلالت کر رہا ہے۔ (یہ نشانیاں ہیں قادر کی قدرت اور حکیم کی حکمت کی)۔

فَمَحَوْنَا اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَا اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً　سو رات کی نشانی کو تو ہم نے دھندلا بنایا ہے اور دن کی نشانی کو روشن بنایا ہے۔

یعنی ہم نے رات کو تاریک اور دن کو روشن بنایا، بعض علماء کا قول ہے کہ دو نشانیوں سے مراد ہیں چاند اور سورج، یعنی رات اور دن کو ہم نے دو نشانیوں والا بنایا۔ یا رات اور دن کے درمیان دو نشانیاں بنا دیں پھر رات کی نشانی یعنی چاند کو ہم نے گھٹاتے گھٹاتے مٹا دیا اور دن کی نشانی یعنی سورج کو چمکایا، دمکایا کہ دنیا کی چیزیں اس کی روشنی میں نظر آنے لگیں۔

کسائی نے کہا عرب أَبْصَرَ النَّهَارُ اس وقت بولتے ہیں جب دن کی روشنی میں چیزیں نظر آنے لگیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے سورج کی چمک کے ستر حصے بنائے اور چاند کی روشنی کے بھی اتنے ہی اجزاء قائم کئے پھر چاند کی روشنی کے ۶۹ حصے سورج کی روشنی کے ساتھ شامل کر دیئے یہاں تک کہ جبرئیل نے بحکم خدا اپنا پر چاند کے چہرہ پر تین بار پھیر دیا تو اس کی چمک دمک جاتی رہی صرف روشنی رہ گئی۔ ابن الکواء نے حضرت علیؓ سے اس داغ کے متعلق دریافت کیا جو چاند کے اندر ہے، فرمایا یہ روشنی کو مٹانے کا نشان ہے۔ [1]

---

[1] بیہقی نے دلائل میں سعید مقبری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس سیاہی کے متعلق دریافت کیا جو چاند میں موجود ہے۔ فرمایا دونوں چمکدار تھے۔ پھر بقول باری تعالیٰ فَمَحَوْنَا اٰيَةَ الَّيْلِ (ایک کی چمک مٹا دی گئی) پس یہ سیاہی جو تم کو نظر آ رہی ہے۔ محو کی نشانی ہے۔

لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ تاکہ تم اپنے رب کا فضل طلب کرو۔ یعنی رات میں عبادت کے لئے راحت و فراغت اور دن میں روزی کمانے کے اسباب۔

وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۚ اور (رات دن کے آنے جانے اور چاند سورج کی رفتار سے) سالوں کی گنتی اور (اپنے معاملات کا عموماً) حساب جان لو۔

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ⑫ اور تمہاری دنیا و دین کی ضرورت کی ہر چیز کو ہم نے کھول کر بیان کر دیا ہے یعنی اس طرح بیان کر دیا ہے کہ کوئی اشتباہ باقی نہ رہے اور شرک و گمراہی کی کوئی دلیل تمہارے لئے باقی نہ رہے۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار کر کے رکھا ہے۔

یعنی انسان کا عمل اور مقدر انسان کے ساتھ رہتا ہے انسان جہاں کہیں ہو امر مقدر اس سے جدا نہیں ہو سکتا (حضرت ابن عباسؓ) کلبی اور مقاتل نے کہا نیکی ہو یا بدی اچھائی ہو یا برائی انسان کے ساتھ رہے گی یہاں تک کہ اس سے ہر خیر و شر کی حساب فہمی ہو گی۔ حسن نے کہا طائر سے مراد ہے برکت و نحوست۔ اہل حقیقت کہتے ہیں طائر وہ امر تقدیری ہے جس کا فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ آدمی وہ ضرور کرے گا اور اس کا نتیجہ ضرور حاصل کرے گا، خواہ خوش نصیبی ہو یا بد بختی۔

جانور پرندہ ہو یا چرندہ عرب اس کے نکلنے سے اچھا برا شگون لیتے تھے، اگر شکاری کے بائیں ہاتھ کی طرف سے شکار نکل کر دائیں ہاتھ کی طرف آئے تو اس کو اچھا سمجھتے تھے کیونکہ بغیر مڑنے اور گھومنے کے شکاری اس کو شکار کر سکتا تھا اور اگر دائیں ہاتھ کی طرف سے بائیں ہاتھ کی جانب شکار آ جائے تو اس کو برا سمجھتے کیونکہ اس صورت میں بغیر گھومے شکاری تیر نہیں مار سکتا تھا۔ نہایہ۔ (یہ اچھائی برائی تو شکار اور شکاری سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس کے بعد عرب اس سے عام شگون لینے لگے بائیں جانب سے جانور نکل کر جائے تو نیک فال سمجھتے تھے اور دائیں جانب سے نکلے تو برا شگون جانتے تھے۔ مترجم)

ابو عبیدہ اور قتیبی نے کہا طائر سے اس جگہ نصیب مراد ہے اچھا ہو یا برا۔ عرب بولتے ہیں طَارَ سَهْمُ فُلَانٍ بِكَذَا۔ اسی محاورہ سے لفظ طائر بمعنی نصیب ماخوذ ہے۔

تمام اعضاء میں گلا ایسا عضو ہے کہ اس میں پڑے ہوئے ہار یا طوق سے آدمی کی زینت یا بد نمائی کا خصوصی تعلق ہے عرب اسی وجہ سے جدا نہ ہونے والی چیزوں کے متعلق کہتے ہیں یہ چیز فلاں شخص کے گلے میں پڑ گئی یعنی لازم ہو گئی اس سے جدا نہیں ہوتی۔

مجاہد نے کہا جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے گلے میں ایک پرچہ پڑا ہوتا ہے جس میں سعید یا شقی لکھا ہوتا ہے۔

وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا اور اس کے لئے ہم قیامت کے دن ایک صحیفہ نکالیں گے۔ کتاب سے مراد ہے۔ اعمالنامہ۔

يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ⑬ جو اس کو کھلا ہوا ملے گا۔ بغوی نے لکھا ہے۔ آثار (یعنی اقوال صحابہ) میں آیا ہے کہ جب آدمی کی عمر پوری ہو جاتی ہے تو اللہ فرشتہ کو حکم دیتا ہے کہ اس آدمی کا اعمال نامہ روز قیامت سے پہلے نہیں کھولا جائے گا۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ (اس سے کہا جائے گا) اپنا اعمال نامہ پڑھ یا یہ مطلب ہے کہ اس اعمال نامہ (کے شروع) میں لکھا ہو گا، اپنا اعمال نامہ پڑھ۔

كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ⑭ آج تیرا نفس خود ہی تجھ سے حساب فہمی کے لئے کافی ہے۔ حسیب حساب کرنے والا۔ یا حسیب کا معنی ہے کافی۔ یعنی تیرا نفس ہی تیرے خلاف گواہی دینے کے لئے کافی ہے۔ بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام اعمال نامے عرش کے نیچے ہیں جب موقف ہو گا (یعنی قیامت کے دن سب لوگوں کو ایک میدان میں حساب فہمی کے لئے کھڑا کیا جائے گا) تو اللہ ایک ہوا بھیج دے گا اور ہوا اڑا کر

اعمالناموں کو دائیں اور بائیں ہاتھوں میں پہنچا دے گی۔
حسن نے کہا جس نے تیری ذات کو خود ہی تجھ پر محاسب بنا دیا اس نے یقیناً تیرے لئے انصاف کیا۔ بغوی، ابن جریر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے جو شخص دنیا میں پڑھا ہو انہ ہو گا اس روز وہ بھی پڑھ لے گا۔
ابن مبارک نے حسن کا قول نقل کیا ہے کہ ہر شخص کے گلے میں ایک قلادہ (طوق) ڈال دیا گیا ہے جس کے اندر اس کے اعمال لکھ دیئے جاتے ہیں پھر لپیٹ کر اس کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے، پھر (قیامت کے دن) جب اس کو اٹھایا جائے گا تو اس اعمال نامہ کو اس کے سامنے کھول دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا اِقْرَاْ کِتٰبَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا۔
اصبہانی نے حضرت ابو امامہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، آدمی کے سامنے اس کا اعمال نامہ کھلا ہوا لایا جائے گا تو وہ پڑھ کر کہے گا، میں نے فلاں فلاں نیکیاں کی تھیں اس میں وہ درج نہیں ہیں اللہ فرمائے گا چونکہ تو لوگوں کی غیبت کرتا تھا اس لئے میں نے وہ تیری نیکیاں مٹا دیں۔
مَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ جو شخص دنیا میں سیدھے راستے پر چلتا ہے وہ اپنے نفع کے لئے چلتا ہے۔
یعنی جو کوئی ہدایت یاب ہو گا تو اس کا فائدہ خود اسی کو ملے گا کسی کا ہدایت یافتہ ہونا دوسروں کو عذاب سے نہیں بچائے گا۔
وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ۭ اور جو راستہ بھٹکتا ہے سو وہ اپنے نقصان کے لئے بے راہ ہوتا ہے۔ یعنی جو گمراہ ہو گا اسی کو اپنی گمراہی کا وبال اٹھانا پڑے گا اور اس کی گمراہی دوسروں کی ہلاکت کا باعث نہ ہو گی۔ ابن عبدالبر نے ایک کمزور سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک بار حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے مشرکوں کے ان بچوں کا جو بلوغ سے پہلے مر گئے ہوں حکم دریافت کیا، حضور نے فرمایا وہ اپنے باپوں سے پیدا ہوئے ہیں لہٰذا انہی کے حکم میں داخل ہیں کچھ مدت کے بعد حضرت خدیجہؓ نے یہی سوال کیا تو فرمایا اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اگر بڑے ہو جاتے تو کیا کرتے اس کے بعد جب اسلام مستحکم ہو گیا اور حضرت خدیجہؓ نے یہی سوال کیا تو آیت ذیل نازل ہوئی۔
وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۭ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کے گناہ کا بار اپنے اوپر نہیں اٹھائے گا۔
بلکہ صرف اپنے گناہ کا بار اپنے اوپر اٹھائے گا۔ وزر سے مراد ہے بار گناہ
وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ اور ہم رسول کو بھیجے بغیر کسی کو عذاب دینے والے نہیں۔ یعنی زندگی کے قوانین شرعیہ پیش کرنے اور آخری حجت ختم کرنے والے پیغمبروں کو بھیجے بغیر ہم کسی کو عذاب دینے والے نہیں۔ امام شافعیؒ نے کہا یہ آیت بتا رہی ہے کہ جس شخص کو دعوت پیغمبر کی اطلاع نہ پہنچی ہو فقط عقل و ہوش ملنے کی وجہ سے اس پر کوئی اعتقادی یا عملی حکم واجب نہیں ہوتا، پس پیغمبر کی دعوت نہ پہنچنے کی وجہ سے اگر کوئی شرک یا عملی معصیت کا مرتکب ہو تو اس کو عذاب نہ ہو گا۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا حاکم اللہ ہی ہے لیکن انسانی عقل بجائے خود اللہ کو ایک سمجھنے اور تمام عیوب و نقائص سے پاک جاننے اور معجزات کی روشنی میں نبوت کا اقرار کرنے کی مکلف ہے، اقرار توحید و رسالت کا مدار عقل پر ہے، حکم خداوندی اور ہدایت رسول پر نہیں جس کو بعثت نبی کی اطلاع نہ پہنچی ہو یا انبیاء کو اللہ مبعوث ہی نہ کرے تب بھی توحید و تنزیہ کا اعتراف عقل کا فریضہ ہے تمام شرائع اور احکام کا مدار توحید و نبوت کے اقرار پر ہے، اگر توحید و نبوت کے اقرار کا مدار بھی حکم شریعت پر ہو گا تو دور پیدا ہو جائے گا اور اس چکر کے نتیجے میں کچھ حاصل نہ ہو گا۔ یوں سمجھو احکام شرعیہ نبوت و توحید کے اقرار پر مبنی ہیں، اور نبوت و توحید کا اقرار حکم شرع پر مبنی ہے، تو احکام شرعیہ خود ہی اپنی ذات پر موقوف ہوں گے پس انبیاء کے مبعوث نہ ہونے یا بعثت کی اطلاع نہ پانے کی وجہ سے اگر کوئی شخص شرک کرے گا تو مجرم اور مستحق عذاب ہو گا۔ اس قول کی تائید تحقیقی اس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ حضرت آدمؑ سے فرمائے

گا۔ آدم! حضرت آدم جواب دیں گے لبیک۔ حاضر۔ تمام بھلائیاں تیرے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ فرمائے گا اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ نکالو۔ آدم عرض کریں گے، دوزخ کا حصہ کیا۔ اللہ فرمائے گا، نوسو ننانوے فی ہزار۔ یہ فرمان ایسا ہوگا کہ (جس کی ہیبت سے) بچے بھی بوڑھے ہو جائیں گے اور ہر حاملہ کو اسقاط ہو جائے گا اور لوگ نشہ والوں کی طرح بے قابو اور مدہوش نظر آئیں گے، حالانکہ وہ نشہ آور چیز پیئے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہوگا۔

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ ایک (نجات یافتہ) ہم میں سے کون ہوگا۔ فرمایا تم کو بشارت ہو کہ تم میں سے ایک جہنمی ہوگا اور یاجوج ماجوج میں سے ہزار۔ اِلٰی اٰخِرِ الحَدِیث۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ عقل پانے کے بعد ہر شخص توحید کے اقرار کا مکلف ہے، دیکھو یاجوج ماجوج کی قومیں سد کے پار ہوں گی ان میں کوئی پیغمبر مبعوث نہ ہوگا پھر بھی ان پر عذاب ہوگا۔

دو پیغمبروں کی درمیانی مدت میں جب کہ سلسلۂ رسالت عارضی طور پر منقطع ہو گیا ہو جو لوگ پیدا ہوئے ہوں گے، قیامت کے دن ان کی جانچ کی جائے گی۔ بزاز نے حضرت ثوبانؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن اہل جاہلیت (دور اسلامی سے پہلے کے لوگ جو حضرت عیسیٰؑ کے صحیح دین پر نہ تھے) اپنے بار اپنی اپنی پشت پر اٹھائے ہوئے آئیں گے اللہ ان سے باز پرس کرے گا، وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس اپنا کوئی رسول نہیں بھیجا تھا نہ ہم کو تیرا حکم پہنچا اگر تو کوئی رسول ہمارے پاس بھیجتا تو ہم سب سے زیادہ تیرے فرماں بردار بندے ہوتے۔ اللہ فرمائے گا اچھا اگر میں تم کو اب کوئی حکم دوں تو مانو گے اہل جاہلیت جواب دیں گے، بے شک ہم مانیں گے اللہ ان سے پختہ عہد و پیمان لے کر حکم دے گا، جاؤ دوزخ میں داخل ہو جاؤ، حسب الحکم وہ لوگ دوزخ کی طرف چلیں گے، جب قریب پہنچ کر اس کو دیکھیں گے تو ڈر کر واپس لوٹ پڑیں گے اور عرض کریں گے، اے ہمارے رب ہم کو تو دوزخ سے ڈر لگتا ہے ہم اس میں داخل نہیں ہو سکتے اللہ فرمائے گا، ذلیل ہو کر اس میں داخل ہو (یعنی اس وقت تم نے نافرمانی کی اب ذلت کے ساتھ تم کو دوزخ میں جانا پڑے گا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر وہ پہلی ہی مرتبہ دوزخ میں داخل ہو جاتے تو آگ ان کے لئے ٹھنڈی پڑ جاتی اور سلامتی بن جاتی۔

امام احمد اور ابن راہویہ نے اپنی اپنی مسندوں میں اور بیہقی نے کتاب الاعتقاد میں حضرت اسود بن سریعؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور بیہقی نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن چار آدمی ایسے ہوں گے جو (اپنے گمراہ ہونے کی) حجت پیش کریں گے، بہرا پٹ، احمق، پیر فرتوت جو سو اس کی حد تک پہنچ چکا ہوگا اور وہ شخص جو دور جاہلیت میں مرا ہوگا۔ بہرا کہے گا، میرے رب اسلام آیا تو میں نے دعوت اسلامی نہیں سنی مجھے کچھ سنائی ہی نہیں دیتا تھا۔ احمق کہے گا جب اسلام آیا (تو میری یہ حالت تھی کہ) بچے میرے مینگنیاں مارتے تھے میں تو پاگل تھا۔ پیر فرتوت کہے گا اسلام جس وقت آیا تو میں سمجھ سے قاصر تھا کچھ سمجھتا ہی نہ تھا اور دور جاہلیت میں جو شخص مر گیا ہوگا وہ کہے گا اے میرے رب میرے پاس تو تیرا کوئی رسول ہی نہیں آیا (اللہ فرمائے گا کیا اب اگر تم کو کوئی حکم دیا جائے تو تعمیل کرو گے وہ لوگ تعمیل کا وعدہ کریں گے) اللہ ان سے تعمیل حکم کا مضبوط وعدہ لے کر حکم دے گا کہ دوزخ میں چلے جاؤ (وہ داخل نہ ہوں گے اور ڈر کر لوٹ آئیں گے) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر وہ دوزخ میں حکم ملتے ہی داخل ہو جاتے تو آگ ان کے لئے ٹھنڈی پڑ جاتی اور سلامتی بن جاتی۔ تینوں نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ ان میں سے جو کوئی تعمیل حکم میں دوزخ کے اندر گھس جائے گا آگ اس کے لئے خنکی بخش اور سلامتی کا باعث ہو جائے گی اور جو اپنی خوشی سے داخل نہ ہوگا، اس کو کھینچ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

ابن مبارکؒ نے کہا مجھ سے مسلم بن یسار نے بیان کیا کہ قیامت کے دن ایک اندھے بہرے گونگے بندے کو اٹھایا جائے گا، جس نے نہ کبھی کچھ سنا ہوگا نہ دیکھا ہوگا نہ کوئی بات کی ہوگی اللہ اس سے فرمائے گا جو حکم میں نے تجھے دیا تھا اور جو کچھ

عطا کیا تھا تو نے اس پر کیا عمل کیا وہ عرض کرے گا، اے میرے رب خدا کی قسم نہ تو تو نے مجھے آنکھیں دیں جن سے میں لوگوں کو دیکھتا نہ کان دیئے کہ تیرے اوامر و نواہی کو سنتا نہ مجھے زبان دی کہ میں اچھی بری بات کہتا میں تو بس ایک لکڑی کی طرح تھا اللہ فرمائے گا اب اگر میں تجھے کچھ حکم دوں تو تعمیل کرے گا وہ شخص جواب دے گا جی ہاں اللہ فرمائے گا تو آگ میں گر پڑ یہ حکم سن کر وہ انکار کرے گا تو دھکے دے کر اس کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

میں حنفیہ کے قول کے مواقف کہتا ہوں کہ مشرک اگر باہوش ہے تو اس کو خواہ پیغمبر کی دعوت نہ پہنچی ہو، پھر بھی شرک کرنے کا عذاب دیا جائے گا۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ اللہ شرک کو معاف نہیں کرے گا۔ اس حکم میں بطور عموم وہ لوگ بھی داخل ہیں، جو دور اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں شرک پر مر گئے ہیں، ممکن ہے وہ اللہ کے سامنے اپنی ناواقفیت کا عذر پیش کریں اور اللہ قیامت کے دن ان کا امتحان لے کر آخر جہنم میں بھیج دے۔ قیامت کے دن مشرک اپنے شرک کا انکار کریں گے اور ثبوت و شہادت طلب کریں گے تو ان کے اعضاء خود ان کے خلاف شہادت دیں گے اور اللہ کی طرف سے ثبوت مکمل ہو جائے گا اور شرک کا عذاب اللہ جس کو چاہے گا دے گا اور یہ تقاضا عدل کے خلاف بھی نہ ہوگا (کیونکہ شرک سے روکنے والی اور توحید کی طرف رہنمائی کرنے والی عقل اللہ نے ان کو عطا کر دی تھی، اس کے لئے کسی مزید پیام بھیجنے کی ضرورت نہ تھی) البتہ دوسرے صحیح ضوابط زندگی سمجھنے کے لئے چونکہ عقل انسانی کافی نہیں ہے اس لئے بغیر رسالت و بعثت کے کوئی شخص ان کا مکلف نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ ھَدٰھُمْ حَتّٰی یُبَیِّنَ لَھُمْ مَّا یَتَّقُوْنَ اللہ ایسا تو نہیں کہ کسی قوم کو ہدایت کرنے کے بعد گمراہ کر دے تاوقتیکہ ان باتوں کو کھول کر نہ بیان کر دے جن سے ان کو بچنا ضروری ہے۔

صاحب مدارک نے حنفیہ کے مسلک کی بناء پر آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ پیغمبر کو بھیجے بغیر ہماری طرف سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ دنیا میں کسی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا عذاب دیں، گویا آیت میں لفظ مُعَذِّبِیْنَ سے مفسر مدارک کے نزدیک دنیوی عذاب اس طرح دینا مراد ہے کہ جڑ بنیاد سے کسی قوم کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ میں کہتا ہوں یہ تفسیر بہت ہی دور از فہم ہے کیونکہ مُعَذِّبِیْنَ کا لفظ عام ہے دنیوی اور اخروی ہر طرح کے عذاب کو شامل ہے نکرہ منفی کی نفی عام ہوتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس لفظ سے صرف عذاب دنیا اور عذاب دنیوی میں سے بھی خاص طور پر عذاب استیصال مراد لیا جائے کیونکہ یہ امر ظاہر ہے کہ جب بغیر اتمام حجت کے عذاب دینا ممکن نہیں تو عذاب آخرت کیسے ہو سکے گا (نفی تو دونوں کو شامل ہے)

اس لئے قبل بعثت عذاب نہ دینے سے مراد ہے معاصی اور بد اعمالیوں پر عذاب نہ دینا۔ عذاب شرک کی نفی مراد نہیں ہے (نہ عذاب استیصال کی نفی)

بعض علماء کا قول ہے کہ لفظ رسولاً عقل کو بھی شامل ہے لفظ رسول کے اندر پیغمبر بھی داخل ہیں اور ہر انسان کی تندرست عقل بھی۔ عقل بھی اللہ کی طرف سے ایک رسول ہے جو خیر و شر کا فرق بتاتی ہے اور اچھائی برائی کی اس کے ذریعہ سے تمیز ہوتی ہے۔ پس عقل انسانی جن فرائض و حقوق کا ادراک کر سکتی ہے ان کے ترک پر انسان کو عذاب دیا جائے گا (خواہ شرک ہو یا بدکی واضح امور خیر و شر)

...... فصل ......

آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ مشرکوں کے بچوں اور دیوانے انسانوں کو عذاب نہ ہوگا۔ (نہ عذاب شرک نہ عذاب معاصی) کیونکہ ان کو نہ کسی پیغمبر کی دعوت پہنچی نہ عقل کی (ماں باپ کا شرک ان پر اثر انداز نہ ہوگا) رفتار آیت اسی مطلب پر روشنی ڈال رہی ہے لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی سے یہی مستفاد ہو رہا ہے، بعض احادیث میں بھی اسی طرح کا مضمون آیا

ہے۔ امام احمد نے حسناء بن معاویہ کے چچا کی روایت سے بیان کیا ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے دریافت کیا یا رسول اللہ جنت میں کون لوگ جائیں گے فرمایا نبی جنتی ہیں، شہید جنتی ہیں، اور نوزائیدہ بچے جنتی ہیں اور زندہ در گور کئے ہوئے بچے جنتی ہیں (یعنی یہ لوگ بے حساب جنت میں جائیں گے ان کا جنت میں داخلہ بغیر عذاب کے قطعی ہے)

بخاری نے حضرت سمرہ بن جندبؓ کی روایت سے ایک طویل حدیث خواب بیان کی ہے جس کے اندر یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ایک پیر مرد ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے گرداگرد کچھ بچے بھی تھے رسول اللہ ﷺ کا گزر ادھر سے ہوا اور آپ نے جبرئیلؑ سے دریافت کیا جبرئیل نے بتایا یہ ابراہیمؑ ہیں اور یہ بچے مسلمانوں کے اور مشرکوں کے ہیں، صحابہ نے یہ بات سن کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مشرکوں کے بچے بھی۔ فرمایا ہاں مشرکوں کے بچے بھی۔ اسی وجہ سے بعض علماء کا قول ہے کہ مشرکوں کے بچے اہل جنت کے خادم ہوں گے (یعنی جنت میں تو رہیں گے لیکن مومنوں کے خدمت گار بن کر) کیونکہ ابو داؤد طیالسی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مشرکوں کے بچوں کی بابت دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا نہ تو ان کی برائیاں تھیں کہ وہ دوزخیوں میں سے ہو جائیں نہ ان کی بھلائیاں تھیں کہ اہل جنت میں ان کا شمار ہو جائے اور ان کو نیکیوں کا ثواب دیا جائے پس وہ اہل جنت کے خادم ہوں گے۔

ابن جریر نے حضرت سمرہ کا بیان نقل کیا ہے، ہم نے رسول اللہ ﷺ سے مشرکوں کے بچوں کے متعلق دریافت کیا فرمایا وہ اہل جنت کے خادم ہوں گے۔ یہی حدیث حضرت ابن مسعودؓ سے موقوفاً بھی مروی ہے۔

......ایک شبہ......

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مشرکوں کے بچوں کا کوئی قطعی فیصلہ رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں۔ حضور ﷺ نے یقینی طور پر نہیں فرمایا کہ مشرکوں کے بچے جنتی ہوں گے یا دوزخی۔ چنانچہ صحیحین میں بخاری و مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مشرکوں کے بچوں کے متعلق دریافت کیا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کرنے والے تھے ایسی ہی ایک حدیث حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی آئی ہے۔

......ازالہ......

مشرکوں کے بچوں کی غیر یقینی حالت والی مذکورہ دونوں حدیثیں منسوخ ہیں آیت الفتح ان کی ناسخ ہے جو لوگ کسی کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے تھے رسول اللہ ﷺ ان کے قول کی تردید فرما دیتے تھے، کیونکہ اللہ نے فرما دیا تھا وَمَا اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا اور میرے ساتھ کیا کیا جائے گا......) اسی بناء پر حضرت عثمان بن مظعون کے جنتی ہونے کے قول کی بھی آپ نے تردید فرمادی تھی، لیکن آیت فتح کے نزول سے آپ کو بڑی خوشی ہوئی اور اس کے بعد ایک جماعت کے لئے نام بنام آپ نے جنتی ہونے کی بشارت دی۔

مسلم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک انصاری کے بچے کے جنازہ میں شرکت کے لئے رسول اللہ ﷺ کو بلایا گیا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس کے لئے تو خوشی ہی خوشی ہے وہ تو جنت کی چڑیا تھی کبھی کوئی گناہ نہیں کیا نہ گناہ کرنے کی عمر پائی۔ یا اس کے خلاف کچھ ہوگا، فرمایا (سنو) عائشہؓ اس نے جنت کو پیدا کیا تو اس کے لئے کچھ لوگ ان کے باپوں کی پشت میں ہی پیدا کر دیئے اور دوزخ کو پیدا کیا تو اس کے لئے کچھ لوگ ان کے باپوں کی پشت میں ہی پیدا کر دیئے۔ یہ حدیث بتا رہی ہے کہ مسلمانوں کے بچوں کے معاملے میں کوئی یقینی علم نہیں ہے، توقف ہی رکھنا چاہئے۔ باوجود یہ کہ ان کے جنتی ہونے پر اجماع سلف ہے۔ امام احمد اور ابن ابی زید اور ابو یعلی وغیرہ نے قرار وغیرہ کے حوالے سے اجماع ہونا نقل کیا ہے اس

کے علاوہ قرآن واحادیث کی صریح عبارتیں بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں کذا قال النووی والسیوطی۔ (لیکن یہ سب لاعلمی کا اظہار مسلمانوں کے بچوں کے سلسلہ میں بھی آیت فتح کے نزول سے پہلے تھا)۔

ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور بزار نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ امت جب تک تقدیر کی بابت کوئی جھگڑا اور بچوں کے جنتی و دوزخی ہونے کے سلسلہ میں کوئی گفتگو نہ کرے گی اس کا معاملہ ٹھیک رہے گا کوئی فساد نہ ہوگا ابن حبان کے نزدیک جن بچوں کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے ان سے مراد مشرکوں کے بچے ہیں۔ یہ حدیث بھی آیت فتح سے منسوخ ہے اور یہ ارشاد اس زمانہ کا ہے جب رسول اللہ ﷺ کو مشرکوں کے بچوں کے نتیجہ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکوں کے بچے دوزخ میں جائیں گے

ابو یعلی نے حضرت براءؓ بن عازب کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے مسلمانوں کے بچوں کے متعلق دریافت کیا گیا، فرمایا وہ اپنے باپوں کے ساتھ ہوں گے پھر مشرکوں کے بچوں کے متعلق دریافت کیا گیا تب بھی حضور ﷺ نے فرمایا وہ اپنے باپوں کے ساتھ ہوں گے۔

ابوداؤد نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے، ام المومنین نے فرمایا، میں نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ ﷺ! مومنوں کی اولاد کا کیا ہوگا، فرمایا وہ اپنے باپوں سے ہیں (یعنی انہیں کے ساتھ ہوں گے) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا بغیر عمل کے، فرمایا اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ زندہ رہتے اور جوان ہوتے تو کیا کرتے، میں نے عرض کیا مشرکوں کی اولاد کا کیا حکم ہے فرمایا، وہ اپنے باپوں سے ہیں (یعنی دوزخی ہوں گی) میں نے عرض کیا بغیر عمل کے فرمایا، اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کرتے۔

احمد نے بہت زیادہ ضعیف سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے مشرکوں کے بچوں کے متعلق تذکرہ کیا، فرمایا اگر تم چاہو تو دوزخ کے اندر میں تم کو ان کی جگہ بتا دوں۔

عبداللہ بن احمد نے زوائد المسند میں ایک مجہول منقطع سند کے ساتھ اور ابن ابی حاتم نے السنہ میں حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے ان دونوں بچوں کے متعلق دریافت کیا جو دور اسلامی سے پہلے مر چکے تھے فرمایا دونوں دوزخ میں ہیں، یہ بات سن کر حضرت خدیجہؓ کے چہرے پر کچھ افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے حضور ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے چہرہ پر آثار کراہت دیکھ کر فرمایا، اگر تم کو ان کا مقام نظر آجائے تو خود ان سے نفرت کرنے لگو گی، حضرت خدیجہؓ نے عرض کیا اور جو آپ سے میری اولاد ہو اس کا کیا حکم ہے فرمایا، مومن اور ان کے بچے جنت میں ہوں گے اور مشرک اور ان کے بچے دوزخ میں ہوں گے۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔ ابوداؤد نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے اچھی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا (لڑکی کو) زندہ دفن کرنے والی اور زندہ در گور کی ہوئی (دونوں) دوزخ میں ہوں گی۔

ابوداؤد نے ایک دوسری سند کے ساتھ حضرت سلمہ بن قیس اشجعی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت سلمہ نے فرمایا میں اور میرا بھائی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے عرض کیا ہماری ماں جاہلیت کے زمانے میں مر گئی، وہ مہمان نوازی اور کنبہ پروری کرتی تھی، مگر اس کی ایک بہن تھی جو سن بلوغ کو نہیں پہنچی تھی، ہماری ماں نے اپنی اس بہن کو زندہ زمین میں دفن کر دیا، فرمایا زندہ دفن کرنے والی اور زندہ در گور کی ہوئی (دونوں) دوزخی ہوں گی، ہاں اگر زندہ دفن کرنے والی نے اسلام پالیا اور مسلمان ہوگئی تو جنتی ہو جائے گی۔

ان تمام احادیث کا جواب یہ ہے کہ الوائدہ سے (حدیث میں) دائی مراد ہے اور موؤدہ سے مراد ہے زندہ در گور کی جانے

والی لڑکی کی ماں یعنی جس کی لڑکی زندہ درگور کی گئی ہو اور وہ اس پر راضی ہو۔ احادیث کا باہم تعارض دور کرنے کے لئے یہ تاویل ضروری ہے۔ رہیں وہ احادیث جو مشرکوں کے بچوں کے دوزخی ہونے کے سلسلے میں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے کوئی حدیث بھی اتنی قوی نہیں جتنی وہ احادیث قوی ہیں جن میں اولاد مشرکین کا جنت میں ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر قرآن مجید کی آیات سے بھی ان کا ٹکراؤ ہو رہا ہے، اس لئے ناقابل قبول ہیں۔ اور چونکہ یہ احادیث خبری شکل میں ہیں، یعنی ان میں اولاد مشرکین کے دوزخی ہونے کی اطلاع دی گئی ہے اور نسخ احکام میں ہوتا ہے خبروں میں جاری نہیں ہوتا، اس لئے ہم ان کو منسوخ نہیں کہتے بلکہ انتہائی ضعیف کہتے ہیں بایں معنی ان کو منسوخ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے ان کے لئے عذاب دوزخ تو مقرر کر دیا ہے لیکن رسول اللہ کی شفاعت سے اس کو دور کر دے گا، ابن ابی شیبہ کی حدیث اس مضمون پر دلالت کر رہی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اولاد انسانی میں سے جو لوگ لاہی (کھیلنے والے یا غافل) مر گئے ہوں ان کے متعلق میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ ان کو عذاب نہ دیا جائے، اللہ نے میرا سوال پورا کر دیا۔ ابن عبدالبر نے کہا اس حدیث میں لاہی سے مراد بچے ہیں ان کے اعمال (قابل گرفت نہیں) محض لہو ولعب ہیں نہ عقل کے ساتھ ہوتے ہیں نہ عزم کے ساتھ۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ سلف سے اب تک مشرکوں کے بچوں کے جنتی دوزخی ہونے کے سلسلہ میں علماء کے اقوال مختلف رہے ہیں۔

کچھ علماء احادیث مندرجہ بالا کی روشنی میں اطفال مشرکین کے دوزخی ہونے کے قائل ہیں، لیکن ہم لکھ چکے ہیں کہ احادیث مذکورہ ضعیف ہیں، استدلال میں پیش کرنے کے قابل نہیں۔

کچھ علماء ان کو جنتی اور کچھ اہل جنت کے خادم قرار دیتے ہیں، میرے نزدیک ان دونوں قولوں میں تعارض نہیں ہے، کیونکہ اہل جنت کے خادم بھی جنت میں ہی ہوں گے۔

محتاط ترین قول یہ ہے کہ اطفال مشرکین کا معاملہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، نہ ان کے جنتی ہونے کا قول قول فیصل ہے نہ دوزخی ہونے کا۔ اس قول کی نسبت حماد، ابن مبارک ابن راہویہ اور شافعی کی طرف کی گئی ہے اور نسفی نے امام ابوحنیفہؒ کا قول بھی یہی قرار دیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ قیامت کے دن جس طرح رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے کے لوگوں کی جانچ کی جائے گی، اسی طرح اطفال مشرکین کا بھی امتحان لیا جائے گا۔ ابو یعلی اور بزار نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن چار قسم کے لوگوں کو پیشی میں لایا جائے گا۔ (۱) بچہ جو پیدا ہونے کے بعد جوان ہونے سے پہلے مر گیا (۲) دیوانہ (۳) زمانہ فترت والے یعنی حضرت عیسیٰ کے بعد جب صحیح عیسائیت ختم ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت ابھی نہیں ہوئی اس درمیانی مدت کے لوگ (۴) شیخ فانی یعنی پیر فرتوت ان میں سے ہر ایک اپنا اپنا عذر پیش کرے گا، اللہ آگ کے بالائی حصے سے فرمائے گا باہر نکل آ، پھر فرمائے گا میں دنیا میں اپنے بندوں کے پاس انہیں میں سے کچھ لوگوں کو پیغمبر بنا کر بھیجتا رہا ہوں اور آج میں خود اپنی طرف سے تم کو پیغام دے رہا ہوں اس آگ میں داخل ہو جاؤ اس کے جواب میں وہ لوگ جن کے لئے اللہ کی طرف سے بدبختی لکھ دی گئی ہو گی کہیں گے اے رب کیا ہم اس آگ میں گھس جائیں، اسی سے تو ہم بھاگ رہے ہیں اور جو ازلی خوش نصیب ہوں گے وہ فوراً جا کر آگ میں گھس پڑیں گے، اللہ نافرمانوں سے فرمائے گا جب تم نے آج میرا حکم نہیں مانا تو (دنیا میں) تم میرے پیغمبروں کی بہت زیادہ تکذیب اور نافرمانی کرتے آخر آگ میں داخل ہونے والوں کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور انکار کرنے والوں کو آگ میں بھیج دیا جائے گا۔

بزار اور محمد بن یحییٰ نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین قسم کے لوگ اپنا عذر پیش کریں گے فترت کے زمانہ میں جو شخص کفر پر مرا ہو گا وہ عذر پیش کرے گا اور بچہ جو بچپن میں مر گیا ہو گا وہ عذر پیش کرے گا یہ سب ہلاک ہونے والے اپنی اپنی معذرت کریں گے۔ ایام فترت میں ہلاک ہونے والا کہے گا، اے میرے رب میرے پاس کوئی کتاب ہی نہیں پہنچی، دیوانہ کہے گا تو نے مجھے سمجھ ہی نہیں دی کہ میں بھلائی سمجھتا، بچہ کہے گا میں نے عقل کی

عمر یعنی سن بلوغ کو ہی نہیں پایا ان کی معذرتوں کے بعد ایک آگ کا حصہ یعنی دوزخ کا ابتدائی حصہ سامنے آجائے گا اور اللہ فرمائے گا اس میں داخل ہو جاؤ فوراً وہ لوگ جن کے متعلق اللہ کو معلوم تھا کہ اگر یہ عمل کا زمانہ پاتے تو سعید ہو جاتے اس آگ میں گھس جائیں گے اور جن لوگوں کے متعلق اللہ کو معلوم تھا کہ اگر یہ عمل کے زمانے کو پا بھی لیتے تب بھی بدنصیب رہتے آگ میں داخل ہونے سے رک جائیں گے اللہ فرمائے گا آج جب تم نے میری نافرمانی کی تو میرے پیغمبر دنیا میں اگر تمہارے پاس پہنچ جاتے تو کس طرح نافرمانی نہ کرتے۔

طبرانی اور ابو نعیم نے حضرت معاذؓ بن جبل کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن دیوانہ کو اور فترت کے زمانے میں کفر پر مرنے والے کو اور بچپن کی عمر میں ہلاک ہونے والے کو پیشی میں لایا جائے گا، دیوانہ کہے گا اے میرے رب اگر تو صحیح سمجھ دیتا تو یہ دوسرے عقلمند مجھ سے زیادہ خوش نصیب نہ ہوتے اور دوسرے دونوں بھی ایسی ہی بات کہیں گے۔ اللہ فرمائے گا اچھا اب میں اگر تم کو کوئی حکم دوں تو مانو گے سب کہیں گے جی ہاں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا جاؤ دوزخ میں گھس جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر وہ آگ میں گھس جاتے تو آگ سے کوئی دکھ ان کو نہ پہنچتا پھر اللہ دوزخ کے کچھ حصے ان کے سامنے لے آئے گا، وہ خیال کریں گے یہ تو ہر چیز سے زیادہ ہلاکت انگیز ہے اس لئے فوراً ہی واپس لوٹ پڑیں گے، اللہ دوبارہ حکم دے گا پھر بھی وہ لوٹ آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم کو پیدا کرنے سے پہلے ہی مجھے معلوم تھا کہ تم اگر عمل پر قادر ہوتے تو کیا کرتے۔

مندرجہ بالا احادیث کی بناء پر جن لوگوں نے اطفال مشرکین کے متعلق توقف کا مسلک اختیار کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ قیامت کے دن اللہ ان کا فیصلہ کرے گا اور امتحان کے بعد ان کو دوزخ میں بھیج دے گا یہ دین کی کھلی ہوئی صراحتوں کے خلاف ہے، امام احمد اور ابوداؤد اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ اور عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تین قسم کے لوگوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے یعنی وہ شرعی احکام کے مکلف ہی نہیں ہیں دیوانہ جب تک اچھا نہ ہو جائے، سوتا ہوا آدمی جب تک بیدار نہ ہو جائے اور بچہ جب تک بڑا یعنی بالغ نہ ہو جائے۔

حدیث سے ثابت ہے کہ اگر کسی نے گناہ کا ارادہ کیا تو اس وقت تک اس سے مواخذہ نہ ہوگا جب تک کہ وہ گناہ عملی شکل میں کر نہ لے، جب یہ بات ہے تو جس نے گناہ کا ارادہ ہی نہ کیا بلکہ گناہ کو سمجھنے کی اس میں صلاحیت ہی نہ ہو اس کو کیسے پکڑا جا سکتا ہے، لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔

تمام امت اسلامیہ کا اجماع ہے کہ عقل و بلوغ پر تمام اوامر و نواہی کی بناء ہے۔

احادیث مذکورہ میں جو مولود و مجنون کے الفاظ بھی آئے ہیں، شاید یہ راویوں کے وہم کا نتیجہ ہے یا یوں کہا جائے کہ بچہ اور دیوانہ تو قیامت کے دن اللہ کے حکم کی تعمیل میں آگ کے اندر گھس جائیں گے۔ زمانہ فترت کے مشرکوں کی حالت اس کے خلاف ہوگی (وہ قیامت کے دن بھی اللہ کے حکم کی تعمیل نہیں کریں گے)۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ اطفال مشرکین کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان برزخ میں ان کو رکھا جائے گا وہ نہ دوزخی ہوں گے نہ جنتی۔ بعض نے کہا ان کو خاک کر دیا جائے گا۔ مگر اس کی کوئی دلیل نہیں۔ اولاد مسلمین کے متعلق اجماع امت ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے ان کے متعلق کسی کا اختلاف نہیں۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا — اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ مترفین یعنی صاحبان عیش و راحت اور جابر لوگ۔ مجاہد کی قرأت میں اَمَّرْنَا آیا ہے یعنی ہم مسلط کر دیتے ہیں اور ان کو حاکم بنا دیتے ہیں۔ حسن اور قتادہ اور یعقوب نے آمَرْنَا پڑھا ہے یعنی راحت و نعمت میں پڑے ہوئے لوگوں کو پیغمبر کی زبانی ہم طاعت و فرماں برداری کا حکم دیتے ہیں۔ اَمَرْنَا کے بعد بِالطَّاعَةِ کا لفظ محذوف ہے، قرینہ یہ ہے کہ پہلے فرمایا تھا ہم پیغمبر کو بھیجے بغیر عذاب نہیں دیا کرتے اور اس آیت کے بعد فرمایا ہے۔

فَفَسَقُوا فِيهَا پس وہ اس بستی میں نافرمانی کرتے ہیں۔

فسق کا معنی ہے طاعت سے نکل جانا اور سرکش ہو جانا۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک یہ معنی ہے کہ ہم اصحاب راحت و نعمت کو فسق کرنے کا حکم دیتے ہیں اور وہ فاسق ہو جاتے ہیں۔ عرب کا محاورہ ہے اَمَرْتُهٗ فَجَلَسَ میں نے اس کو حکم دیا یعنی بیٹھنے کا حکم دیا تو وہ بیٹھ گیا۔ اس مطلب پر امر اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ گناہ کا حکم نہیں دیتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا بلکہ مجازی معنی مراد ہوگا یعنی ہم ان کو فسق پر آمادہ کر دیتے، اسباب فسق فراہم کر دیتے ہیں، نعمتوں کی ان پر بارش کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ راحت پسند اور عیش کوش بن جاتے ہیں اور یہ عیش کوشی ان کو فسق میں مبتلا کر دیتی ہے۔

بعض علماء نے اَمَرْنَا کا معنی کَثَّرْنَا بیان کیا ہے۔ اَمَرْتُ الشَّيْءَ میں نے اس چیز کو کثیر کر دیا فَاَمِرَ پس وہ زیادہ ہو گئی۔ حدیث میں آیا ہے خَيْرُ الْمَالِ سِكَّةٌ مَّابُوْرَةٌ وَّ مُهْرَةٌ مَّامُوْرَةٌ۔ سِكَّةٌ کھجور کے درختوں کی قطار۔ مابورہ ہموار درست۔ مہرہ بچھیری۔ ماورة کثیر النسل بہت بچے دینے والی۔ یعنی بہترین مال کھجور کے درختوں کی ہموار قطار ہے اور وہ بچھیری ہے جس کی نسل بہت ہو بہت بچے دینے والی ہو۔

ہرقل والی حدیث میں ابوسفیان کا قول آیا ہے لقد اَمِرَ امر ابْنِ اَبِيْ كَبْشَةَ۔ ابو کبشہ (عبداللہ) کے بیٹے (یعنی محمد ﷺ) کی بات تو بہت ہو گئی اس کا مرتبہ اونچا ہو گیا۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تھا۔ مَالِيْ اَرٰى اَمْرَكَ يَأْمَرُ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کا معاملہ بڑھتا جا رہا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا وَاللّٰهِ لَيَأْمَرَنَّ عَلٰى مَاتَرٰى خدا کی قسم جتنا تم دیکھ رہے ہو اس سے اور بڑھتا جائے گا۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہم جاہلیت کے زمانہ میں کہتے تھے قَدْ اَمِرَ بَنُوْ فُلَانٍ فلاں قبیلہ والے بہت ہو گئے۔

قاموس میں ہے آمَرَهٗ اور اَمَرَهٗ دونوں ہم معنی ہیں اس کی نسل اور مویشیوں کو بڑھا دیا بہت کر دیا۔

ایک محاورہ ہے اُمِّرَ اَمَارَةً فلاں شخص حاکم بنا دیا گیا۔ ممکن ہے آیت میں اَمَّرْنَا اسی محاورہ سے ماخوذ ہو۔ یعنی ہم نے اس بستی کے راحت پسند اور عیش کوش لوگوں کو حاکم بنا دیا۔ مترفین کا خصوصیت کے ساتھ ذکر اس لئے کہ دوسرے لوگ تو ان کے تابع ہوتے ہی ہیں پھر عیش پسند لوگ ہی زیادہ احمق اور فسق پر قادر ہوتے ہیں۔

فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ تب اس پر حجت تمام ہو جاتی ہے آخر اس بستی کو تباہ و غارت کر ڈالتے ہیں، یعنی اس بستی کے رہنے والوں کو ہم تباہ اور ہلاک کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے بستی ویران اور تباہ ہو جاتی ہے۔

بخاری نے حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیانؓ کی وساطت سے حضرت زینب بنت جحشؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز گھبرائے ہوئے خوف زدہ میرے پاس تشریف لائے آپ فرما رہے تھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ شر قریب آ گیا، عرب کے لئے اس سے تباہی (ہونے والی) ہے۔ حضور ﷺ نے انگوٹھے اور کلمے کی انگلی کو ملا کر ایک حلقہ بنا کر فرمایا آج اتنا سوراخ یاجوج ماجوج نے کھول لیا، حضرت زینبؓ کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ عرب میں تو نیک لوگ بھی ہیں کیا وہ بھی ہلاک ہو جائیں گے، فرمایا ہاں اگر گندگی بڑھ جائے گی (تو سب ہلاک ہو جائیں گے)۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ اور نوح کے بعد ہم نے بہت قوموں کو ہلاک کر دیا، جیسے قوم عاد و قوم ثمود وغیرہ۔ اس میں مکہ کے کافروں کے لئے وعید ہے۔

قرن وہ لوگ جو ایک زمانہ میں ہوں، یعنی ان کی پیدائش ایک زمانہ میں ہو۔ قاموس میں ہے عرب بولتے ہیں هُوَ عَلٰى قَرْنِيْ یعنی وہ میری عمر کا ہے، میرا ہم سن ہے۔ قرن کے ختم ہو جانے کا یہ معنی ہے کہ ایک زمانہ کا کوئی ایک شخص بھی باقی نہ رہے جتنے ہم عمر لوگ ہیں مر جائیں تو کہا جائے گا یہ قرن ختم ہو گیا۔ قاموس میں ہے ختم قرن کا یہ معنی ہے کہ ایک جماعت اور ہم زمانہ

قوم میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے سب مر جائیں۔

میں کہتا ہوں قرن صحابہ کا یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا صحبت یافتہ کوئی شخص باقی ہو اگر کوئی صحابی باقی نہ رہے تو قرن صحابہ ختم ہو گیا اور قرن تابعین کا یہ معنی ہے کہ صحابہ کی صحبت میں رہنے والا کوئی آدمی باقی ہو اگر صحابہ کو دیکھنے والا اور صحابہ کا زمانہ پانے والا کوئی شخص باقی نہ رہے تو تابعین کا قرن ختم ہو گیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں قرن زمانہ کی ایک محدود مدت کو کہتے ہیں۔ یہ مدت کتنی ہو اس میں اقوال مختلف ہیں دس سال کی مدت یا بیس سال کی یا تیس سال کی یا چالیس سال کی یا پچاس سال کی یا ساٹھ سال کی یا ستر سال یا اسی یا سو سال کی یا ایک سو بیس برس کی۔ یہ تمام اقوال صاحب قاموس نے ذکر کئے ہیں۔

مفقود الخبر کے انتظار کی مدت حنفیہ کے نزدیک نوے سال ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ قرن ایک صدی کو کہتے ہیں محمد بن قاسم نے عبداللہ بن تستر مازنی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دست مبارک میرے سر پر رکھ کر فرمایا یہ لڑکا ایک قرن جئے گا۔ محمد بن قاسم کا بیان ہے ہم عبداللہ کی عمر کا حساب برابر لگاتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کی عمر کے سو سال پورے ہو گئے تو ان کا انتقال ہو گا۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ۝ اور آپ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے والا دیکھنے والا کافی ہے۔ یعنی لوگ چاہے کتنا ہی چھپائیں اللہ کو بندوں کے گناہوں کی خبر ہوتی ہے اور کتنے ہی پردے ڈالیں مگر اللہ دیکھتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ جس کا مقصد محض دنیا ہوتی ہے تو ہم دنیا کے اندر جس کو مناسب سمجھتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں فوراً (یعنی دنیا ہی میں) دے دیتے ہیں۔ مَا نَشَآءُ جتنا ہم چاہتے ہیں اس کا پورا مطلوب یا کچھ مطلوب دے دیتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ ہر تمنا پوری پوری دے دی جائے۔

لِمَنْ نُّرِيْدُ جس کو چاہتے ہیں۔ یہ اس لئے فرمایا کہ ہر شخص کا سوال اور تمنا تو پوری نہیں کی جاتی۔

ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ پھر (آخرت میں) ہم نے اس کے لئے جہنم مقرر کر دیا ہے جس کی آگ میں وہ داخل ہو گا، ایسی حالت میں کہ اس کو برا کہا جائے گا اور پھٹکار پڑے گی اور اللہ کی رحمت سے دور پھینک دیا گیا ہو گا۔ یعنی دھتکارا ہوا اللہ کی رحمت سے دور پھینکا ہوا۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ اور جو آخرت کا طلبگار ہو گا اور ایماندار ہونے کی حالت میں آخرت کے لئے اس کے مناسب کوشش کرے گا۔ آخرت کے لئے مناسب کوشش کرنے سے مراد ہے اوامر و نواہی کی پابندی۔ صرف تمنا کرنا یا خود اپنے دماغ کے تراشیدہ ذرائع کو موجب تقرب خیال کر کے حصول تقرب کی کوشش کرنا کافی نہیں ہے (بلکہ آخرت کے لئے جیسی کوشش ہونی چاہئے ویسی کوشش اگر کوئی مومن کرے گا اور آخرت کا طلب گار ہو گا) ایمان سے مراد بھی خالص ایمان ہے جس میں نہ کسی قسم کی تکذیب کی آمیزش ہو نہ شرک کا شائبہ۔

فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ سو ایسے لوگوں کی یہ کوشش مقبول ہو گی۔ کوشش مشکور ہونے سے مراد ہے اللہ کے نزدیک مقبول ہو جانا اور ثواب پانا۔ اللہ کی طرف سے شکر کا معنی ہے طاعت کا ثواب عطا کرنا۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ آپ کے رب کی یعنی اپنی عطا سے ہم ہر فریق کی امداد کرتے ہیں ان کی بھی اور ان کی بھی۔ یعنی مذکورہ بالا دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کو اس فریق کو بھی اور اس فریق کو بھی ہم آپ کے رب کی عطاء سے پیہم مدد دیتے ہیں۔

وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ اور آپ کے رب کی دین (دنیا میں کسی مومن یا کافر سے) رو کی نہیں گئی ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ جو آپ کا رب ہے وہی سب کا رب ہے کافر کا بھی مومن کا بھی، کوئی فریق اس کی دین سے

محروم نہیں ہے۔ مترجم) هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ کُلًّا سے بدل ہے اور کُلًّا میں تنوین مضاف الیہ کے عوض لائی گئی ہے۔ اور عَطَآءُ (مصدر) بمعنی عطیہ ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ دیکھو ہم نے دنیا میں بعض کو بعض پر رزق و حسن و صحت وغیرہ کے لحاظ سے کس طرح فوقیت عطا کی ہے۔

وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝۲۱ اور البتہ آخرت مراتب کے اعتبار سے بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے یعنی آخرت میں فرق مراتب دنیوی تفاوت سے بہت بڑا ہے جنت و دوزخ کے درمیان فرق عظیم ہے۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۝۲۲ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود مت تجویز کرو ورنہ بدحال، بے مددگار ہو کو بیٹھ رہو گے۔ خطاب اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو ہے مگر مراد خطاب امت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق تو احتمال شرک کیا ہی نہیں جاسکتا تھا یا ہر شخص مخاطب ہے یعنی اے انسان تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کر۔

فَتَقْعُدَ یعنی تو ہو جائے گا، قعود کا معنی اس جگہ ہو جانا ہے ایک محاورہ ہے شَحَذَ الشَّفْرَةَ حَتّٰى قَعَدَتْ كَاَنَّهَا حَرْبَةٌ اس نے دھار کو تیز کیا یہاں تک کہ وہ چھوٹے برچھے کی طرح ہو گئی یا فَتَقْعُدَ سے مراد ہے عاجز ہو جاؤ گے (عاجز ہو کر بیٹھ رہو گے) قَعَدَ عَنِ الشَّيْءِ۔ وہ اس شئے سے عاجز ہو گیا۔

مَذْمُوْمًا یعنی فرشتوں اور مومن آدمیوں کی طرف سے مذمت کردہ۔ مَخْذُوْلًا بے مدد۔ امداد سے محروم۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اور تیرے رب نے قطعی حکم دے دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پوجا مت کرو اور ماں باپ کے ساتھ خوب اچھا سلوک کرو۔ قضاء یعنی قطعی حکم۔ حضرت ابن عباس، قتادہ، حسن اور ربیع بن انس نے اس جگہ یہی ترجمہ کیا ہے۔ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا اس لیے حکم دیا کہ ظاہری اسباب کے تحت ماں باپ ہی اولاد کے وجود اور زندگی کی علت ہیں۔

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝۲۳ اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو ہوں بھی نہ کرنا اور نہ ان کو جھڑکی دینا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا۔

عِنْدَكَ یعنی تیری زیر کفالت تیری نگہداشت میں۔ اُفٍّ سے مراد وہ لفظ ہے جو کراہت اور تنگ دلی پر دلالت کرتا ہے یا اُفٍّ اسم فعل ہے یعنی تنگ دل ہو جانا۔ ابو عبیدہ نے کہا اصل لغت کے اعتبار سے اف اور تف اس میل کو کہتے ہیں جو انگلیوں پر جم جاتا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے اُفٍّ کا معنی لغوی ہے ناخن کا تراشہ یعنی ناخن کا وہ حصہ جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے یا ناخن کا میل یا کان کا میل اور وہ ذرا سی لکڑی یا کھپاچ کا ٹکڑا جو تم زمین سے اٹھالو۔

یا اُفٍّ سے مراد ہے قلت یعنی ایسی ادنیٰ بات بھی نہ کہو جو تمہاری طرف سے نفرت یا کراہت کا اظہار کر رہی ہو۔ جب ادنیٰ ایذا رساں بات بصراحت نص حرام کر دی گئی تو اس سے بڑا ایذا رساں سلوک تو بدرجہ اولیٰ حرام ہو گیا، نص اسی پر دلالت کر رہی ہے۔ لَا تَنْهَرْهُمَا یعنی ماں باپ کو جھڑکی نہ دو، اپنی ناپسندیدہ بات پر ان کو نہ جھڑکو۔

قَوْلًا كَرِيْمًا اچھی نرم بات۔ ابن مسیب نے یہی ترجمہ کیا ہے جیسے کوئی قصوروار اپنے بدخو آقا سے نرمی کے ساتھ بات کرتا ہے (ایسا ہی تم ماں باپ سے کلام کرو) مجاہد نے کہا جب ماں باپ بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے گھن نہ کرو اور جس طرح تمہارے بہت چھوٹے ہونے کے زمانے میں تمہارا بول و براز وہ صاف کرتے تھے اسی طرح ان کا ایام پیری میں بول و براز صاف کرنے سے تم نفرت نہ کرو اور ان کو اف بھی نہ کہو۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ اور دونوں کے لئے اپنی عاجزی کے بازو بچھا دو۔ یعنی ان کے سامنے عاجزی اور تواضع کا اظہار کرو، حضرت عروہ بن زبیر نے یہ مطلب بیان کیا کہ ان سے نرمی کرو۔ جس چیز کو وہ چاہتے ہوں اس سے ممانعت نہ کرو۔

مِنَ الرَّحْمَةِ انتہائی رحم کی وجہ سے یعنی یہ خیال کرو کہ تم کل ان کے انتہائی محتاج تھے آج وہ تمہارے محتاج ہو گئے اس بات کا خیال کرو اور ان پر ترس کھاؤ۔

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا ۝ اور ان کے لئے دعا کرو اور کہو اے میرے رب ان پر رحمت فرما جیسے انہوں نے مجھ کو میرے بچپن میں پالا پرورش کیا تھا، یعنی ان پر اپنی لازوال رحمت نازل فرما صرف اس دنیوی فانی نعمت پر ہی اکتفاء نہ کر۔

والدین کے لئے دعا رحمت کرنے کا یہ حکم اس وقت ہے جب وہ مسلمان ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک یہ آیت، آیت مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ سے منسوخ ہے۔ بیضاوی نے کہا دعا رحمت کرنے کا حکم عام ہے ماں باپ کافر ہوں یا مسلمان سب کے لئے دعا کا حکم ہے کیونکہ کافر ماں باپ کے لئے دعا رحمت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان کو اسلام کی توفیق دے اسلام کی توفیق دینا بھی رحمت ہے۔ بغوی نے لکھا ہے

حضرت ابو الدرداؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، باپ جنت (کے اندر داخل ہونے) کا وسطی دروازہ ہے اگر تم چاہو تو اس کی نگہداشت کرو یا (چاہو) کھو دو۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ والحاکم بسند صحیح۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے اور اللہ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں رواہ الترمذی والحاکم وصححہ۔ بزار نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس کے ماں باپ یا دونوں میں سے ایک اس کے سامنے بوڑھے ہو گئے اور ان کی خدمت نہ کرنے کی وجہ سے وہ جنت میں داخل نہ ہو سکا۔ دوسری روایت میں ہے بوڑھے ماں باپ اس کو جنت میں نہ لے جا سکے۔ رواہ البغوی والترمذی والحاکم وصححہ۔ حضرت ابو امامہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے، فرمایا وہ دونوں تیری جنت اور دوزخ ہیں، رواہ ابن ماجہ۔

حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے ماں باپ کے معاملہ میں صبح کو اللہ کا فرماں بردار ہوتا ہے اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور جو شخص والدین میں سے کسی ایک کے معاملے میں صبح کو اللہ کا فرماں بردار ہوتا ہے تو اس کے لئے جنت کا ایک دروازہ مفتوح ہو جاتا ہے اور جو شام کو اپنے ماں باپ کے معاملہ میں اللہ کا نافرمان ہو جاتا ہے، اس کے لئے دوزخ کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور ایک کے معاملہ میں نافرمان ہوتا ہے تو دوزخ کا ایک دروازہ اس کے لئے کھل جاتا ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ خواہ ماں باپ نے اس کی حق تلفی کی ہو، فرمایا خواہ انہوں نے اس کی حق تلفی کی ہو خواہ اس پر ظلم کیا ہو، خواہ اس کا حق مارا ہو، یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ماں باپ کا فرماں بردار اپنے والدین کی طرف رحم و شفقت کی نظر سے دیکھتا ہے اللہ ہر بار نظر کرنے کے عوض اس کے لئے ایک حج مقبول کا ثواب ضرور لکھ دیتا ہے، صحابہ نے عرض کیا خواہ ہر روز سو بار دیکھے، فرمایا، ہاں اللہ اس سے بھی بڑا اور پاک ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام گناہوں میں سے اللہ جو گناہ چاہے گا معاف فرما دے گا سوائے ماں باپ کی نافرمانی کے۔ کیونکہ زندگی میں مرنے سے پہلے ہی ماں باپ کی نافرمانی کی سزا اللہ تعالیٰ دے دیتا ہے۔ یہ تینوں حدیثیں بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں اور اول الذکر حدیث ابن عساکر نے بھی ذکر کی ہے۔ طبرانی نے ضعیف سند سے اور حاکم نے حضرت ابو بکرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام گناہوں میں سے جس گناہ کو اللہ چاہتا ہے قیامت پر (اس کے عذاب یا مغفرت کو) ٹال دیتا ہے سوائے ماں باپ کی نافرمانی کے، ماں باپ کی نافرمانی کی سزا تو مرنے سے پہلے

اسی زندگی میں فوراً دے دیتا ہے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہوتا ہے، تمہارا رب اس کو خوب جانتا ہے یعنی ماں باپ کی فرماں برداری کی نیت اور تعظیم کے اندرونی خیال سے اللہ خوب واقف ہے یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ دلوں میں بھی ماں باپ سے نفرت اور بوجھ کا خیال نہ آنا چاہئے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ والدین کی فرماں برداری کے معاملے میں تمہاری نیتوں کو اللہ خوب جانتا ہے اگر ثواب کی امید پر اور اللہ کے حکم کی تعمیل میں فرماں برداری کرو گے تو اللہ اس کا اجر دے گا اور اگر کسی دنیوی لالچ کی وجہ سے فرماں برداری کرو گے تو اس کا نتیجہ نیت کے موافق ہوگا۔

اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝ اگر تم سعادت مند ہو تو اللہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کرنے والا ہے (تمہاری خطا معاف کر دے گا) سعید بن جبیر نے کہا اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جن سے بے سوچ بلا ارادہ اچانک ماں باپ سے کوئی بے ادبی بد سلوکی ہو گئی ہو اور نیت ان کی نیک ہی ہو تو اس کی پکڑ نہ ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت کا حکم عام ہو۔ جو بھی ماں باپ کا نافرمان اپنے والدین کے ساتھ کوئی بد سلوکی کر گزرے اور پھر توبہ کر لے وہ آیت کے حکم میں داخل ہے۔

سعید بن مسیب نے کہا اَوَّاب وہ شخص ہے جو گناہ کرنے کے بعد توبہ کر لے، پھر گناہ کرے اور توبہ کر لے، پھر گناہ کرے اور گناہ کے پیچھے توبہ کر لے۔ سعید بن جبیر نے کہا خیر کی طرف بہت زیادہ رجوع کرنے والا اَوَّاب ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اَوَّاب وہ شخص ہے جو ہر مصیبت اور حادثہ کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرے۔ سعید بن جبیر کی روایت سے حضرت ابن عباس کا قول اس طرح آیا ہے کہ اَوَّابِیْن سے مراد ہیں اللہ کی پاکی بیان کرنے والے کیونکہ اللہ نے پہاڑوں سے فرمایا تھا یَاجِبَالُ اَوِّبِیْ۔ قتادہ نے کہا نمازی مراد ہیں، عوف عقیلی کے نزدیک چاشت کی نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔ بغوی نے حضرت زید بن ارقم کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قبا والے چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے رسول اللہ ﷺ نے بر آمد ہو کر ملاحظہ فرمایا اور فرمایا یہ اوابین کی نماز ہے۔ رواہ احمد و مسلم ورواہ عبد بن حمید و سمویہ عن عبد اللہ بن ابی اوفی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جو لوگ مغرب و عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں ان کو موت کے فرشتے گھیر لیتے ہیں، یہی اوابین کی نماز ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ اور اپنے قرابت داروں کو ان کا حق دو۔ کنبہ پروری، حسن معاشرت، اچھا سلوک اور بھلائی ان کے ساتھ کرو۔ اکثر اہل تفسیر نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا مال دار پر لازم ہے اس قرابت دار محرم کا خرچ جو نادار بچہ ہو یا نادار بالغ عورت ہو، یا اپاہج یا نابینا نادار مرد ہو اس سے حفظ جان وابستہ ہے اور حفظ حیات ہی اصل پر اور صلہ رحمی ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کی تفسیر میں ہم نے اس مسئلہ کی تنقیح کر دی ہے۔

بغوی نے حضرت علی بن حسینؒ (امام زین العابدین) کا قول نقل کیا ہے کہ قُرْبٰى سے مراد رسول اللہ ﷺ کی قرابت ہے (یعنی رسول اللہ ﷺ کے قرابتداروں کو ان کا حق ادا کرو) ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔

طبرانی وغیرہ نے حضرت ابو سعید خدری کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو طلب فرما کر فدک عطا فرما دیا۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی جانب بھی اس بیان کی نسبت کی ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے اس روایت کو صحیح ماننا مشکل ہے کیونکہ اس روایت پر کہنا پڑے گا کہ یہ آیت مدنی ہے حالانکہ مشہور اس کے خلاف ہے (یعنی آیت کا مکی ہونا مشہور ہے) میں کہتا ہوں مشہور قابل اعتماد یہ روایت ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے حضور ﷺ سے خود فدک طلب کیا تھا مگر آپ نے نہیں دیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا قول بھی اسی طرح روایت میں آیا ہے اگر رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو فدک عطا فرما دیا ہوتا تو خلفاء راشدین خصوصاً علیؓ پھر ہر گز اس کو نہ روکتے اور اس کے

خلاف نہ کرتے۔ واللہ اعلم۔

وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ اور مسکین و مسافر کو دو۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرۃ میں کردی گئی ہے۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اور مال کو گناہ کے راستہ میں برباد نہ کرو۔ یعنی اپنے مال کو گناہ کے راستے میں خرچ نہ کرو۔ مجاہد نے فرمایا: اگر کوئی شخص اپنا سارا مال حق کے راستے میں خرچ کر دے تو اس کو تبذیر (مال کو بکھیرنا برباد کرنا) نہیں کہا جائے گا اور اگر ایک سیر غلہ بھی گناہ کے راستے میں خرچ کیا تو اس کو تبذیر کہا جائے گا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے تبذیر کی تشریح فرمائی مال کو خرچ کرنا حق (کے راستے) کے علاوہ (باطل راستہ میں)۔

شعبہ کا بیان ہے میں ابو اسحاق کے ساتھ کوفہ کے راستہ میں جا رہا تھا، سر راہ ایک دیوار چونے اور پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ملی، ابو اسحاق نے کہا، حضرت عبداللہ (ابن مسعود) کے قول پر یہ تبذیر ہے حق کے راستے کے علاوہ (باطل کے راستے میں) مال کا خرچ کرنا ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ درحقیقت مال کو برباد کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں، یعنی شرارت میں شیطانوں کی طرح ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی قوم کے طریقہ کا پابند ہو جائے تو وہ اس قوم کا بھائی ہے۔

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ یعنی منکر نعمت ہے کفر اور ناشکری میں بہت بڑھ چڑھ کر ہے، اس لئے اس کی پیروی درست نہیں۔

اہل تحقیق کا قول ہے کہ کسی منعم کی عطا کردہ نعمت کو اس کی رضامندی کے زیر اثر صرف کرنا شکر ہے اور نافرمانی کے راستے میں صرف کرنا تبذیر ہے، گویا تبذیر شکر کی ضد ہے۔ لامحالہ تبذیر کرنے والا ناشکرا ہوگا۔

سعید بن منصور نے عطا خراسانی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قبیلہ مزینہ کے کچھ لوگ خدمت گرامی میں حاضر ہو کر جہاد میں شرکت کے لئے کچھ سواریوں کے طلب گار ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا میرے پاس کوئی سواری موجود نہیں کہ تم کو دے سکوں، جہاد سے محروم رہنے کا جب ان لوگوں کو یقین ہو گیا تو رنج کی وجہ سے روتے ہوئے لوٹ گئے ان کو خیال ہوا کہ شاید رسول اللہ ﷺ ہم سے ناراض ہیں اسی لئے ہم کو سواریاں نہیں عطا فرمائیں۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

اور اگر اپنے رب کی طرف سے جس رزق کے آنے کی تم کو امید ہو اس کے انتظار میں تم کو ان کی طرف سے رخ پھیرنا پڑے تو ان سے نرمی کے ساتھ بات کہہ دو۔ (یعنی نرمی کے ساتھ ان سے معذرت کر دو) تم ان پر رحم کرو گے اور نرمی سے کلام کرو گے تو اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔ مَيْسُوْرٌ، يَسَّرَ الْاَمْرَ سے ماخوذ ہے۔

بغوی نے لکھا ہے نرم بات کہنے سے یہ مراد ہے کہ ان سے نرمی کے ساتھ وعدہ کر لو۔ بعض کے نزدیک دعاء یسر کرنا مراد ہے یعنی ان کے لئے دعا کرو کہ اللہ تمہاری مشکل آسان کر دے، ہم کو اور تم کو اللہ رزق عطا فرمائے۔ سعید بن منصور نے حضرت سیار بن ابی الحکم کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ کپڑا پیش کیا گیا، حضورؐ بڑے سخی اور بخشش کرنے والے تھے آپ نے فوراً لوگوں کو وہ کپڑا تقسیم کر دیا، تقسیم کے بعد کچھ لوگ پہنچے تو ان کو کچھ نہ ملا، حضور ﷺ تقسیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾

اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لو کہ بالکل کنجوس ہو جاؤ اور نہ بالکل کھول ہی دو کہ سب مال فنا کر دو ورنہ الزام خوردہ تہی دست ہو کر بیٹھ رہو گے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعود کا بیان نقل کیا ہے، حضرت عبداللہ نے فرمایا ایک لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں

حاضر ہوا اور عرض کیا میری ماں نے حضور ﷺ سے فلاں فلاں چیز مانگی ہے (یعنی کھانا یا کپڑا یا کچھ نقد وغیرہ) فرمایا آج تو ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ لڑکا بولا، میری ماں کہتی ہے کہ اپنا کرتہ حضورؐ مجھے عنایت کر دیں۔ آپ نے اپنا کرتہ اس کو عنایت فرما دیا اور خود گھر کے اندر برہنہ بیٹھ گئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے منہال بن عمرو کی روایت سے بھی یہ واقعہ اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابوامامہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا جو کچھ میرے ہاتھ میں ہو تم اس کو خرچ کر دیا کرو۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یوں تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

بغوی نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک لڑکے نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میری ماں آپ سے پہننے کے لئے ایک کرتہ مانگ رہی ہے۔ حضور ﷺ کے پاس اس وقت سوائے اس کرتہ کے جو پہنے ہوئے تھے اور کوئی کرتہ نہ تھا، فرمایا امید ہے کہ فلاں وقت سے فلاں وقت کچھ آجائے، تم کسی اور وقت آنا، لڑکا لوٹ کر اپنی ماں کے پاس چلا گیا پھر لوٹ کر آیا اور عرض کیا میری ماں کہتی ہے کہ جو کرتہ آپ پہنے ہوئے ہیں وہی دے دیجئے یہ درخواست سن کر رسول اللہ ﷺ گھر کے اندر تشریف لے گئے اور کرتہ اتار کر اس لڑکے کو دے دیا اور برہنہ ہونے کے سبب گھر میں بیٹھ رہے، پھر نماز کے لئے بلال نے اذان دی اور صحابہ حضور ﷺ کا انتظار کرتے رہے لیکن آپ برآمد نہیں ہوئے، صحابہ کے دلوں میں کچھ بے چینی پیدا ہوئی اور بعض لوگ حاضر بارگاہ ہوئے تو آپ کو برہنہ پایا اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

آیت کا تشریحی مطلب یہ ہے کہ حق کے راستہ میں خرچ کرنے سے ہاتھ کو نہ روکو جیسے وہ شخص ہوتا ہے جس کے ہاتھ گلے سے بندھے ہوئے ہوں اور وہ ہاتھوں کو پھیلا نہ سکتا ہو اور بالکل ہاتھ کو پھیلا بھی نہ دو کہ ہاتھ میں کچھ باقی ہی نہ رہے یہاں تک کہ اپنی ذات کے اور اپنے اہل و عیال کے اور دوسرے اہل استحقاق کے حقوق بھی ادا نہ کر سکو۔ بیضاوی نے لکھا ہے یہ دونوں جملے کنجوس کی انتہائی کنجوسی اور فضول برباد کرنے والے کی بربادی کی تصویر کشی کر رہے ہیں۔ آیت میں دونوں کی ممانعت کی گئی ہے اور درمیانی راستہ یعنی سخاوت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا کا مطلب یہ ہے کہ باوجود فراخ دستی اور وسعت کے اگر کنجوسی کرو گے یا فضول برباد کرو گے اور تدبیر سے کام نہ لو گے تو اللہ کے نزدیک بھی اور لوگوں کی نظر میں بھی قابل مذمت ہو جاؤ گے۔ مَّحْسُوْرًا کا ترجمہ قتادہ نے پشیمان کیا ہے اور اس کا تعلق دونوں سے قرار دیا ہے، یعنی انتہائی کنجوسی پر بھی پشیمان ہو جاؤ گے اور بربادی پر بھی۔

یا مَلُوْمًا کا تعلق کنجوسی سے ہے اور مَّحْسُوْرًا کا تعلق فضول خرچی سے۔ مطلب اس طرح ہوگا کہ اگر فراخی کے باوجود سائلوں کو نہ دو گے تو سائل تمہاری مذمت کریں گے اور اگر سب مال برباد کر دو گے تو تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں رہے گا اور حسرت زدہ ہو کر رہ جاؤ گے۔ حَسَرَتْهُ بِالْمَسْئَلَةِ تو نے سوال کرنے سے اس کو تنگ کر دیا تو نے اس سے لپٹ چمٹ کر مانگا۔ حَسَرَهُ السَّفَرُ اس کو سفر نے چور کر دیا، شکستہ کر دیا۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۚ　آپ کا رب جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی عطا فرماتا ہے۔ اور جس کا رزق تنگ کرنا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ لہٰذا تم اگر اپنی ضرورت کے مطابق کچھ مال روک لو گے تو تمہارا یہ عمل قابل ملامت نہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۟　لاریب کہ وہی اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ یعنی ان کے باطنی احوال کو بھی جانتا ہے اور ظاہری احوال کو بھی۔ بندوں کی جس بات میں مصلحت ہوتی ہے اللہ اس کا علم رکھتا ہے خواہ ان کو خود معلوم نہ ہو۔ آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ رزق کی تنگی و فراخی اللہ کے حکم سے ہوتی ہے اللہ ہی ان کے ظاہر کو بھی جانتا ہے اور باطن کو بھی، پس جیسا مناسب ہوتا ہے کرتا ہے مگر بندوں پر لازم ہے کہ درمیانی چال سے رہیں۔

یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کبھی رزق فراخ کرتا ہے کبھی تنگ کرتا ہے پس تم بھی طریقہ خداوندی پر چلو نہ بالکل روک ہی رکھو نہ بالکل ہاتھ کھلا ہی رکھو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ کلام آئندہ کلام کی تمہید ہو جس میں بخوف افلاس اولاد کو قتل کرنے کی ممانعت کی

ہے اور فرمایا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ

اور اپنی اولاد کو یعنی لڑکیوں کو محتاجی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی رزق عطا کریں گے اور تم کو بھی۔ سب کو رزق دینے کی ہماری ذمہ داری ہے۔

اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ ان کو قتل کرنا یقیناً بڑا جرم ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا سب سے بڑا کونسا گناہ ہے، فرمایا (سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ) اللہ کے مثل دوسروں کو قرار دے باوجودیکہ اللہ ہی نے تجھے پیدا کیا ہے، میں نے عرض کیا یہ بے شک بڑا گناہ ہے اس کے بعد کونسا گناہ ہے فرمایا اپنی اولاد کو خود قتل کرنا اس اندیشے سے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کونسا گناہ ہے فرمایا، اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرنا۔ متفق علیہ۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، بلاشبہ زنا بہت زیادہ اور کھلی ہوئی برائی کا کام ہے اور برا راستہ ہے۔ کہ اس سے قطع نسب ہوتا ہے اور فتنے بپا ہوتے ہیں۔

حضرت بریدہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں بوڑھے زانی پر لعنت کرتی ہیں اور (دوزخ کے اندر) زانیوں کی شرمگاہیں اپنی سڑی ہوئی بو سے دوزخیوں کو (بھی) اذیت پہنچائیں گی، رواہ الخرائطی۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدمی زنا کرتا ہے تو زنا کرتے وقت ایمان اس کے اندر سے نکل کر سائبان کی طرح اس کے اوپر معلق ہو جاتا ہے جب وہ باز آجاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والبیہقی والحاکم۔

صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زانی جب زنا کرتا ہے تو ایمان دار ہونے کی حالت میں زنا نہیں کرتا اور چور جب چوری کرتا ہے تو ایمان دار ہونے کی حالت میں چوری نہیں کرتا، اور شراب پینے والا جب شراب پیتا ہے تو ایمان دار ہونے کی حالت میں شراب نہیں پیتا (یعنی ان افعال میں مشغول ہونے کی حالت میں اس کے اندر ایمان نہیں رہتا)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ اور جس شخص کے قتل کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق پر۔

نفس سے مراد ہے مسلمان یا ذمی کافر۔ اِلَّا بِالْحَقِّ سے مراد ہے قصاص یا زنا یا بغاوت یا صحابہ کو گالیاں دینا وغیرہ (یعنی قصاص یا زنا یا بغاوت وغیرہ میں قتل کر دینا حق قتل نہیں ہے) مرتد کا قتل نفس محرم کے قتل میں داخل نہیں ہے (یعنی مرتد کو قتل کر دینا مباح الاصل ہے) اللہ نے فرمایا ہے۔ اِنَّمَا جَزٰۗؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا الخ (باغیوں کے قتل کے متعلق فرمایا) فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ (قصاص کے متعلق فرمایا) اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ الخ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلمان شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، اس کا خون جائز نہیں مگر تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے یا تو وہ شادی شدہ زانی ہو یا کسی کے قتل میں اس کو قتل کیا جائے یا دین کو چھوڑ کر مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہو گیا ہو۔ رواہ الشیخان والبوداؤد والترمذی والنسائی۔ دین کو چھوڑنے سے مرتد ہو جانا مراد نہیں ہے کیونکہ ایسا آدمی تو مسلمان ہی نہیں رہتا وہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت پر قائم ہی نہیں رہتا بلکہ اس سے مراد بدعتی فرقے ہیں جو اپنی خواہشات اور رائے کے پرستار ہوتے ہیں اور جماعت (اہل سنت) کو ترک کر دیتے ہیں جیسے رافضی، خارجی وغیرہ (یہ حضرت مفسر کی رائے ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مؤلف کے نزدیک معتزلہ اور روافض و خوارج وغیرہم کا قتل جائز ہے مگر جمہور اہل سنت کا یہ مسلک نہیں ہے، مختلف اہل ہوی کا قتل اس لئے نہیں ہوا کہ وہ

بدعتی ہو گئے تھے بلکہ ان سے قتال اس لئے کیا گیا کہ انہوں نے بغاوتیں کی تھیں اور باغی سے قتال کا جواز فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي سے ثابت ہے۔ رہا مولف کا یہ اعتراض کہ مرتد مسلمان ہی نہیں ہوتا اور آیت میں مسلم کو قتل کرنے کی وجوہ کا بیان ہے تو یہ اعتراض ہی غلط ہے مرتد ارتداد سے پہلے مسلمان ہی ہوتا ہے گزشتہ حالت کے اعتبار سے اس کو مسلم کہا گیا (ماضی اور مستقبل کے اعتبار سے مجازی استعمال عام ہے)

فصل

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن سب سے پہلے خونوں کے فیصلے کئے جائیں گے۔ متفق علیہ۔

حضرت براء بن عازب راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی نظر میں مومن کے ناحق قتل کے مقابلہ میں ساری دنیا کا فنا ہو جانا حقیر ہے۔ رواہ ابن ماجۃ بسند حسن۔ بیہقی نے اتنا زائد نقل کیا ہے کہ اگر تمام آسمانوں اور زمینوں والے ایک مومن کے قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ یقیناً سب کو دوزخ میں داخل کر دے گا۔

نسائی نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے نزدیک ساری دنیا کا فنا ہو جانا مومن کے قتل سے حقیر ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کسی نے مومن کے قتل میں آدھی بات کہہ کر بھی اعانت کی تو اللہ کے سامنے جب وہ جائے گا، اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہو گا، اللہ کی رحمت سے ناامید۔ اصبہانی نے اتنا زائد بیان کیا ہے کہ ابن عیینہ نے آدھی بات کی تشریح میں کہا کہ اُقْتُلْ کا پورا لفظ نہ کہا ہو، بلکہ صرف اُقْ کہا ہو۔ بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بھی حدیث مذکور اسی طرح بیان کی ہے۔

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر گناہ کی امید ہو سکتی ہے کہ اللہ معاف فرما دے، سوائے اس شخص کے جو کافر مرا ہو یا کسی کو قصداً اس نے قتل کیا ہو۔ رواہ النسائی حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے، ابوداؤد نے حضرت ابودرداءؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے اور ابن حبان و حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صبح ہوتی ہے تو ابلیس اپنے لشکر پھیلا دیتا ہے اور کہتا ہے آج جو کسی مسلمان کو بے راہ کر دے گا میں اس کو تاج پہنا دوں گا پھر (شام کو یا کسی وقت) ایک واپس آکر کہتا ہے آج میں اس (مسلمان) کے ساتھ لگا رہا، یہاں تک کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، ابلیس کہتا ہے ہو سکتا ہے وہ (دوسرا) نکاح کر لے، دوسرا آکر کہتا ہے میں اس (مسلمان) کے ساتھ لگا رہا یہاں تک کہ اس نے اپنے باپ اور ماں کی نافرمانی کی ابلیس کہتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ پھر فرماں بردار ہو جائے، تیسرا آتا ہے اور کہتا ہے میں اس کے ساتھ لگا رہا، یہاں تک کہ وہ مشرک ہو گیا، ابلیس کہتا ہے تو تو ہی ہے (یعنی یہ تیرا کام بہت اچھا ہے) چوتھا آکر کہتا ہے میں اس کے ساتھ لگا رہا یہاں تک کہ اس نے مومن کو قتل کر دیا، ابلیس کہتا ہے تو نے (ایسا کام کیا) پھر اس کو تاج پہنا دیتا ہے۔ رواہ ابن حبان فی صحیحہ۔

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝۳۳

اور جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے، سو اس کو قتل کے بارے میں حد شرع سے تجاوز نہ کرنا چاہئے وہ شخص بلاشبہ طرفداری کے قابل ہے۔

وَلِيِّهٖ یعنی وارث جو مقتول کے امور کا اس کے مرنے کے بعد ذمہ دار ہوتا ہے۔ سُلْطٰنًا قوت اور قصاص لینے کا اختیار۔ لَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ کا مطلب دو طرح سے بیان کیا ہے۔ (۱) قاتل زیادتی نہ کرے، یعنی جس کو قتل کرنے کا اس کو حق نہیں ہے اس کو قتل نہ کرے، عقلمند وہ کام نہیں کرتا جس کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی کی شکل میں ظاہر ہونے والا ہو۔ (۲) حضرت

ابن عباسؓ اور اکثر اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا کہ مقتول کا ولی قصاص میں زیادتی نہ کرے یعنی قاتل کے علاوہ دوسرے کو قتل نہ کرے، جاہلیت کے دور میں صرف قاتل کے قتل پر بس نہ کرتے تھے بلکہ قاتل کے علاوہ اس سے اونچے درجہ والے کو بھی قتل کرتے تھے۔

سعید بن جبیر نے کہا قاتل اگر ایک ہو تو اسی کو قتل کیا جاسکتا ہے ایک قتل کے عوض بے قصور اور شریک قتل نہ ہونے والی جماعت کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ عہد جاہلیت کا طریقہ تھا کہ مقتول اگر کوئی بڑا آدمی ہوتا تو قصاص میں تنہا اس کے قاتل کو ہی نہیں قتل کرتے تھے بلکہ قاتل کے ساتھ اس کے قرابتداروں کی ایک جماعت کو بھی قتل کرتے تھے۔ قتادہ نے کہا لَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ کا یہ مطلب ہے کہ قاتل سے قصاص تو لے لیا جائے اس کو مثلہ نہ کیا جائے (یعنی اس کے ناک کان اور آلات رجولیت نہ کاٹے جائیں) جیسا کہ جاہلیت کا دستور تھا۔ كَانَ مَنْصُوْرًا یعنی جو شخص ظلماً قتل کیا گیا ہو اللہ کی طرف سے اس کی مدد و نصرت دنیا میں بھی کی جاتی ہے کہ قاتل کو قصاص میں (حسب قانون شریعت) قتل کرنا ضروری ہے اور آخرت میں بھی مقتول منصور ہوگا اللہ اس کے گناہ ساقط کر دے گا اور اس کے قاتل کے لئے دوزخ لازم کر دے گا۔ مجاہد، قتادہ نے کہا کَانَ کی ضمیر مقتول کے ولی کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی مقتول کے وارث کو قاتل کے خلاف نصرت دی جاتی ہے، قاتل سے قصاص لینے کا اس کو حق دیا گیا ہے، حکام پر لازم ہے کہ اس کی مدد کریں۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک قاتل کی طرف ضمیر راجع ہے جس کو مقتول کا ولی قصاص میں قتل کرتا ہے اگر قصاص میں اسراف سے کام لے گا تو بار گناہ اس پر پڑے گا اور قانون شریعت میں قاتل کی حمایت کی جائے کیونکہ اولیاء مقتول کو صرف قصاص لینے کا حق ہے، قاتل پر زیادتی کرنے کا حق نہیں ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقے سے جو بہترین ہو۔ یعنی یتیم کے مال میں تصرف نہ کرو، ہاں ایسے طریقے سے تصرف کر سکتے ہو جو یتیم کے لئے بہتر ہو، اس کے مال کی حفاظت ہو، اور تجارتی افزونی ہو۔

حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے، یعنی اس حد کو پہنچ جائے، جو صحیح تصرفات کے لئے ضروری ہے۔ استثناء (اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ) اس مفہوم پر دلالت کر رہا ہے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اور عہد کو پورا کرو۔ یعنی اللہ نے اپنے احکام پر عمل کرانے کا تم سے وعدہ لیا ہے اس کو پورا کرو اور لوگوں سے جو تم جائز معاملات کا وعدہ کرو، اس کو بھی پورا کرو۔

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ بے شک (ایسے) عہد کی باز پرس ہونے والی ہے، یعنی عہد کرنے والے سے عہد کا ایفاء مطلوب ہے یا یہ مطلب ہے کہ ہر عہد کے متعلق عہد کو توڑنے والے سے باز پرس کی جائے گی اور وعدہ شکنی پر اس کو سزا دی جائے گی یا عہد پوچھا جائے گا، یعنی عہد توڑنے والے کو قیامت کے دن سرزنش کرنے کیلئے عہد یاد دلایا جائے گا، جیسے زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَلْعَهْدَ سے پہلے مضاف محذوف ہو یعنی صاحب عہد سے عہد پوچھا جائے گا۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ اور ناپ کر دیتے وقت ناپ کا پیمانہ پورا کر دیا کرو اور تول کے وقت صحیح ترازو سے تولا کرو (یعنی ناپ تول میں بے ایمانی نہ کرو) مجاہد نے کہا قِسْطَاس (ترازو) رومی لفظ ہے، عربی میں استعمال کر لیا گیا ہے لیکن اس سے قرآن مجید کے عربی ہونے میں کوئی خرابی نہیں آتی، کیونکہ جو غیر عربی لفظ عربی میں شامل کر لیا اور عربی الفاظ کے احکام اس پر جاری کر دیئے گئے اعراب اور معرفہ و نکرہ کی خصوصیات عربی الفاظ کی طرح اس میں پیدا کر دی گئیں وہ عربی بن گیا غیر عربی نہیں رہا (اگرچہ اصلاً وہ عجمی ہو) اکثر علماء کے نزدیک قِسْطَاس عربی لفظ ہے قسط سے بنا ہے قسط کا معنی ہے، عدل (برابری، انصاف) اَلْمُسْتَقِيْمِ ٹھیک، صحیح۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ یہ (فعل) بہت اچھا اور نتیجہ کے اعتبار سے بہت بہتر ہی ہے۔

تاویل (تفعیل) انجام، نتیجہ۔ اَلَ کا معنی ہے لوٹ گیا۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اور جس چیز کا تم کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ چلو۔ قفا یقفو کسی کے نشان قدم پر چلنا اتباع کرنا، قافیہ اسی سے بنا ہے۔ علم نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جس بات کا تم کو حسی علم بھی نہ ہو اور کوئی نقلی حکم بھی نہ ہو اور نہ کوئی عقلی قطعی دلیل ہو، ایسی چیز کی پیروی نہ کرو۔

ایک شبہ

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ظنی دلیل کی روشنی میں عمل کرنا جائز نہیں (یعنی خبر آحاد اور قیاس سے چونکہ یقینی علم حاصل نہیں ہوتا صرف گمان غالب اور راجح خیال پیدا ہوجاتا ہے اس لئے نہ قیاسی احکام پر چلنا جائز ہے نہ ان اوامر و نواہی پر جو احادیث غیر متواترہ سے مستفاد ہو رہے ہوں)۔

ازالہ

آیت میں علم سے مراد ہے غالب راجح اعتقاد اور حکم خواہ اس کی سند قطعی اور یقینی ہو یا ظنی، لفظ علم کا اس معنی میں استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ آیت میں عدم اتباع کا حکم صرف عقائد کے متعلق ہے (یعنی ظنی، وہمی، شکی دلائل پر عقیدہ کی بنیاد نہ رکھو) بعض اہل علم نے کہا پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانے اور جھوٹی شہادت دینے کی ممانعت اس آیت میں مراد ہے یعنی محصنات پر زنا کی تہمت تراشی اور شہادت زور کی ممانعت کے ساتھ آیت کی خصوصیت ہے عام عدم اتباع ظن مراد نہیں ہے۔

مجاہد نے کہا آیت کی مراد یہ ہے کہ جس چیز کا تم کو قطعی علم نہ ہو اس سے کسی کو متہم نہ کرو۔ کسی پر مت باندھو وہ بات جس کا یقینی ذرائع سے تم کو علم نہ ہو۔ قتادہ نے کہا مطلب یہ ہے کہ ان دیکھی چیز کو دیکھی ہوئی اور ان سنی کو سنی ہوئی اور غیر معلوم کو معلوم نہ قرار دو۔

(حضرت مفسر نے فرمایا) میں کہتا ہوں، ان احادیث آحاد سے جن کے اندر روایت کی تمام شرائط موجود ہوں اور صحیح قیاس سے اور دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت سے جو حکم ثابت ہو جائے اس پر عمل کرنا قطعی نصوص اور اجماع کی رو سے واجب ہے اللہ نے فرمایا ہے۔ لَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا۔ دوسری آیت ہے فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ۔ تیسری آیت ہے وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ الخ (۱) مسلمانوں کے ہر فرقے میں سے اور جماعت میں سے دین کو سمجھنے کے لئے ایک ایک گروہ کیوں وطن سے باہر نکل کر (مدینہ) نہیں جاتا (۲) اے اہل نظر عبرت اور سبق حاصل کرو (اشباہ و نظائر کو سمجھو اور ان کو امثال پر قیاس کرو) (۳) اپنے مردوں میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو۔

متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مختلف افراد صحابہ کو تبلیغ احکام کے لئے بھیجتے تھے، پس اخبار آحاد یا قیاس اگرچہ ظنی ہوتے ہیں لیکن ان سے مستفاد احکام یقینی العمل ہوتے ہیں کیونکہ ان سے حاصل شدہ علم پر عمل کرنا نصوص قطعیہ سے واجب ہے۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی (قیامت کے دن) باز پرس ہوگی۔ یعنی مذکورہ تینوں اعضاء میں سے ہر ایک سے اتباع مذکور کے متعلق باز پرس کی جائے گی یا یہ مطلب ہے کہ اعضاء مذکورہ سے دریافت کیا جائے گا کہ جس شخص کے یہ اعضاء تھے اس نے کیا کیا۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو شخص سننے، دیکھنے اور جاننے کا دعوی کرتا ہے، اس کے اعضاء سے اس کی تصدیق طلب

کی جائے گی۔ آنکھ سے پوچھا جائے گا، کیا اس نے دیکھا تھا (یا دیکھنے کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا) کان سے سوال کیا جائے گا کیا اس نے سنا تھا (یا سننے کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا) اور دل سے دریافت کیا جائے گا کیا اس نے جانا تھا (یا جاننے کا غلط دعویٰ کیا تھا)

حضرت شکل بن حمید راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میری درخواست پر مجھ سے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، کہہ اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں، اپنے کان کے شر سے اور اپنی آنکھ کے شر سے اور اپنی زبان کے شر سے اور اپنے دل کے شر سے اور اپنی منی کے شر سے۔ میں نے یہ دعا یاد کر لی، رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی والحاکم والبغوی۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

اس حدیث کے راوی سعید نے کہا منی کے شر سے پناہ مانگنے کا یہ مطلب ہے کہ میں اپنا پانی ایسے مقام پر نہ ڈالوں جو حلال نہیں ہے۔

مذکورہ تین اعضاء کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا کہ یہ ہی آلات علم ہیں، اکثر محسوسات کا علم آنکھ سے ہوتا ہے یا کان سے اور غیر محسوس چیزوں کا ادراک تو صرف دل سے ہی ہوتا ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو...... مَرَحًا یعنی اکڑتے ہوئے، مرح کا معنی غرور اور مستانہ چال سے چلنا۔

إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ کیونکہ (چال میں زور اور غرور اختیار کر کے) زمین کو تم ہرگز نہ پھاڑ سکو گے (زمین کے دو ٹکڑے نہ کر سکو گے، زمین کو نہ چیر سکو گے)۔

وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝ اور کتنا ہی اٹھ اٹھ کر پنجوں کے بل چلو لیکن پہاڑوں کی اونچائی کو نہ پہنچ سکو گے پھر یہ مغرورانہ مستانہ چال سراسر حماقت نہیں تو اور کیا ہے اس سے فائدہ ہی کیا ہے۔

حضرت عیاض بن حماد مجاشعی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ باہم تواضع اختیار کرو کوئی کسی پر فخر نہ کرے نہ کسی پر زیادتی کرے، رواہ مسلم۔

حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے دل میں ذرہ (چھوٹی سرخ چیونٹی یا ریت کا ذرہ) برابر تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ رواہ مسلم۔

حضرت سلمہؓ بن اکوع کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، آدمی برابر خودسری (غرور) کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کو جبارین (انتہائی ظالم اور مغرور گروہ) میں لکھ دیا جاتا ہے، پھر اس پر وہی عذاب آجاتا ہے، جو ان پر آتا تھا۔ رواہ الترمذی۔

عمرو بن شعیب کے دادا راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن تکبر کرنے والوں کو چیونٹیوں کی طرح حقیر و ذلیل بنا کر آدمیوں کی صورتوں میں اٹھایا جائے گا کہ ہر طرف سے ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، ان کو بولس نام کے جہنم میں داخل کیا جائے گا، سب سے بڑی آگ ان پر مسلط ہوگی اور طینۃ الخبال یعنی دوزخیوں کا نچوڑ ان کو پلایا جائے گا۔ رواہ الترمذی۔

حضرت اسماءؓ بنت عمیس کا بیان ہے میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا وہ بندہ برا ہے جو اتراتا اور تکبر کرتا ہے اور اللہ برتر و بزرگ کو بھول جاتا ہے، رواہ الترمذی والبیہقی فی شعب الایمان۔

ایک روز حضرت عمرؓ نے منبر پر فرمایا تھا لوگو! میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے یہ فرمان سنا تھا کہ جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ اس کو اٹھا کر اونچا کر دیتا ہے گو وہ اپنی نظر میں تو نیچا ہوتا ہے مگر لوگوں کی نظر میں بڑا ہو جاتا ہے اور جو خود بڑا ہو جاتا ہے اور جو خود بڑا بنتا ہے اللہ اس کو پست کر دیتا ہے پس وہ لوگوں کی نظر میں چھوٹا ہو جاتا ہے اور خود اپنی نظر میں بڑا ہوتا ہے یہاں تک کہ لوگوں کے نزدیک وہ کتے اور سور سے بھی زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ پوری توریت پندرہ آیات میں ہے پھر آپ نے آیات وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ الخ تلاوت فرمائیں۔

كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِندَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ۝ یہ سارے برے کام تیرے رب کے نزدیک بالکل ناپسندیدہ ہیں۔

کُلُّ ذٰلِکَ یعنی مذکورہ بالا تمام امور جن میں سے کچھ مامورات ہیں اور کچھ منہیات۔ بعض امور کے کرنے کا حکم دیا گیا

ہے، بعض کے ارتکاب کی ممانعت کی گئی ہے۔ سَیِّئُہٗ یعنی امور مذکورہ میں سے جو برے ہیں اور ان کے ارتکاب کی ممانعت کی گئی ہے۔ مَکْرُوْہًا ناپسندیدہ، قابل نفرت۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ یہ باتیں اس حکمت میں کی ہیں جو خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے آپ کے پاس بھیجی ہیں۔

صاحب قاموس نے حکمت کے متعدد معانی لکھے ہیں، عدل، علم، تحمل، دانائی، نبوت، قرآن، انجیل۔ میرے نزدیک اس جگہ علم نافع مراد ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اور (اے انسان) اللہ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دے۔ ممانعت شرک کا دوبارہ حکم دینے سے اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ توحید ہی بنیاد ہے، اسی پر تمام اعمال کی صحت کا مدار ہے، یہی ہر عمل کا انتہائی مقصد ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی غرض سے کوئی کام کیا جائے یا ترک کیا جائے تو کوئی کوشش نتیجہ خیز نہ ہوگی، توحید ہر حکمت کا سر چشمہ اور مدار ہے۔ علم توحید بالذات اور اصلی مقصد ہے، باقی علوم سے مقصود عمل ہے خود فی نفسہ وہ مقصود نہیں ہے شرک کا نتیجہ دنیا میں بھی برا ہے اور آخرت میں بھی۔

فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ ورنہ تو الزام خوردہ اور ماندہ ہو کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ مَلُوْمًا یعنی تو خود اپنی جان کو برا کہے گا اور اللہ بھی اور ساری مخلوق بھی تجھے ملامت کرے گی۔ مَدْحُوْرًا اللہ کی رحمت سے دھتکارا ہوا۔

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

کیا تمہارے رب نے تمہارے لئے تو لڑکے مخصوص کر دیئے ہیں اور اپنے لئے لڑکیاں اختیار کرلی ہیں، بلاشبہ تم (اللہ کی شان میں) بڑی (گستاخی کی) بات کہتے ہو۔ یعنی بہت بری بات کہتے ہو، اللہ کی طرف صاحب اولاد ہونے کی نسبت کر رہے ہو باوجودیکہ سلسلہ تناسلی ان اجسام کی خصوصیت ہے جو زوال پذیر اور فانی ہیں، پھر اولاد میں سے بھی اس اولاد کا والد اللہ کو قرار دیتے ہو۔ جو صنف کے لحاظ سے کمزور ہے (اور اپنے لئے قوی صنف کو پسند کرتے ہو) اور اس پر طرفہ یہ کہ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہو۔ ملائکہ تو ساری مخلوق میں لطیف ترین نوع ہیں ان کو بیٹیاں کہنا (یعنی ضعیف ترین صنف انسان قرار دینا) انتہائی حماقت ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

اور ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ اس کو اچھی طرح سے سمجھ لیں اور ان کو نفرت ہی بڑھتی جاتی ہے۔

یعنی اس قرآن میں ہم نے متعدد مقامات پر جو عبرتیں، حکمتیں، احکام، امثال، دلائل اور نصیحتیں بیان کی ہیں وہ اسی لئے بیان کی ہیں کہ لوگ نصیحت پذیر اور سبق اندوز ہوں۔ یا یہ مطلب ہے کہ مذکورہ بالا مطلب کو ہم نے بار بار مختلف طریقوں سے اس قرآن میں نصیحت پذیری کے لئے ثابت کیا ہے، یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہٰذَا الْقُرْاٰن سے مراد ہے ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دینے کا ابطالی قول، یعنی فرشتوں کے بنات اللہ نہ ہونے کا قول ہم نے بار بار بکثرت بیان کیا ہے۔ (اس مطلب پر قرآن بمعنی قرائت ہو گا یعنی قول) صَرَّفْنَا (باب تفعیل) کثرت پر دلالت کر رہا ہے، یعنی ہم نے بکثرت بیان کیا۔ لِيَذَّكَّرُوْا تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور جو چیز اللہ کے لئے سزاوار نہیں ہے اس کی نسبت اللہ کی طرف نہ کریں اور اوامر ونواہی کی پابندی کریں۔ وَمَا يَزِيْدُهُمْ یعنی ہمارا بار بار بیان کرنا اور نصیحت کرنا ان کے لئے سود مند نہیں ہوتا اس سے ان لوگوں کو حق سے مزید نفرت اور دوری پیدا ہوتی ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

آپ کہہ دیجئے اگر اس کے ساتھ اور بھی معبود ہوتے جیسا یہ لوگ کہتے ہیں تو اس حالت میں عرش والے

تک انہوں نے راستہ ڈھونڈھ لیا ہوتا یعنی اگر ان کے قول کے مطابق اللہ کے ساتھ دوسرے خدا ہوتے تو بادشاہوں کے دستور کے موافق وہ عرش والے خدا سے لڑتے اور اس پر غالب آنے کی کوشش کرتے۔ اگر دو خدا ہوں گے تو ان کا باہم ٹکراؤ ممکن ہو گا اور امکان تصادم سے ایک کا مغلوب اور دوسرے کا غالب آنا یا دونوں کا مغلوب نہ ہونا ضروری ہے اس طرح ایک غالب ہو گا یا دونوں عاجز ہوں گے اور عاجز ہونا شان الوہیت کے خلاف ہے اسی طرح مغلوب بھی خدا نہیں ہو سکتا۔

سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوۡلُوۡنَ عُلُوًّا كَبِيۡرًا ﴿۴۳﴾ جو باتیں یہ لوگ کہتے ہیں اللہ ان عیوب سے پاک ہے اور بہت زیادہ برتر ہے۔

یعنی اللہ عاجز ہونے اور تصادم سے پاک ہے۔ عجز و تصادم شان الوہیت کے منافی ہے اور مشرکوں کے مشرکانہ قول سے وہ بہت دور ہے جس طرح اللہ کی ذات ہر ذاتی شئی سے اعلیٰ اور بالا ہے اسی طرح اس کا وجود بھی تمام مراتب وجود سے اونچا ہے اور محتاج اولاد ہونا تو ادنیٰ ترین وجود کی خصوصیت ہے، فنا پذیر موجودات کو اولاد کی ضرورت ہوتی ہے شرکت ملکیت کاملہ کے منافی ہے اور ناقص مالکیت کی علامت ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ ؕ وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ

تمام ساتوں آسمان اور زمین اور جتنے ان میں ہیں اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو۔ یعنی ہر چیز لوازم امکان، خصوصیات حدوث اور ان تمام امور سے اللہ کی ذات کے پاک ہونے کا اعتراف کرتی ہے جو شان الوہیت کے خلاف ہیں اور اللہ کے جمال ذات، کمال صفات اور انعامات متواترہ کا اپنی اس نوعی زبان سے اقرار کرتی ہے جو اللہ نے خاص طور پر اس کو عطا فرمائی ہے اور اس کو سنتا اور سمجھتا بھی وہی ہے جس کے دل کو اللہ نے اس زبان و قول کو سننے اور سمجھنے کی قابلیت دی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ہم آیات (معجزات) کو برکت جانتے تھے اور تم لوگ ان کو خوف انگیزی کا سبب خیال کرتے ہو، ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب ایک سفر میں تھے پانی کی کمی پڑ گئی، حضور ﷺ نے فرمایا جو کچھ بچا کھچا ہوا پانی ہو وہ میرے پاس لے آؤ۔ صحابہ نے ایک برتن لا کر حاضر کر دیا جس میں قدرے پانی تھا آپ نے دست مبارک اس میں ڈال دیا اور فرمایا برکت والے پاک (پانی) کی طرف آؤ اور برکت اللہ کی طرف سے ہے۔ میں نے خود دیکھا کہ آپؐ کی انگلیوں کے بیچ میں سے پانی پھوٹ کر نکل رہا تھا اور کھانا کھایا جاتا تو کھانے کے اندر سے ہم سُبۡحَانَ اللّٰہ کی آواز سنا کرتے تھے (یعنی کھانا سُبۡحَانَ اللّٰہ کہتا تھا) رواہ البخاری۔ مجاہد کا قول ہے کہ ہر چیز خواہ جاندار ہو یا بے جان اللہ کی تسبیح پڑھتی ہے یعنی سُبۡحَانَ اللّٰہ و بِحَمۡدِہٖ کہتی ہے۔

ابراہیم نخعی نے کہا ہر چیز خواہ جاندار ہو یا جماد (بے جان) حمد کے ساتھ اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے یہاں تک کہ دروازے کی چرچراہٹ اور چھت کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز بھی تسبیح و تحمید کا اظہار کرتی ہے۔ بعض علماء نے کہا شئی سے مراد ہے، ہر زندہ چیز یعنی زندہ چیزیں سُبۡحَانَ اللّٰہ پڑھتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جن وانس، ملائکہ اور تمام جانور تسبیح خواں ہیں اور اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا تمام حیوانات اور نباتات تسبیح کا اقرار کرتے ہیں (یعنی ہر نمو پذیر چیز سُبۡحَانَ اللّٰہ پڑھتی ہے، جمادات مراد نہیں ہیں)۔

عکرمہ نے کہا درخت تسبیح پڑھتا ہے اور (اسی درخت کی لکڑی سے بنا ہوا) ستون تسبیح نہیں پڑھتا۔

میرے نزدیک یہ تخصیص غلط ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب خطبہ کے وقت ستون سے ٹیک لگانی چھوڑ دی اور منبر پر خطبہ دینے لگے تو آپ کی جدائی کی وجہ سے اس ستون کا بچوں کی طرح رونا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

آیت میں آیا ہے کہ اللہ نے حضرت داؤدؑ کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو تسبیح پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا یَا جِبَالُ اَوِّبِیۡ مَعَهٗ وَالطَّیۡرَ۔ طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا پہاڑ دوسرے پہاڑ سے پکار کر

دریافت کرتے ہیں کیا تیرے اوپر سے کوئی آدمی اللہ کا ذکر کرتا گزرا ہے، جب وہ پہاڑ ہاں کہہ دیتا ہے تو پوچھنے والا پہاڑ خوش ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ ہر چیز بزبان حال تو تسبیح میں مشغول رہتی ہی ہے۔ ہر چیز ممکن ہے، حادث ہے اور ہر ممکن و حادث ایک ایسے صانع کا محتاج ہے جو واجب الوجود ہو، قدیم بالذات ہو، ہر نقص عیب، فنا اور زوال سے پاک ہو، صفات کمالیہ سے متصف ہو۔ لہٰذا تسبیح سے صرف تسبیح حالی مراد لینا غلطی ہے، ہر چیز تسبیح حالی اور تسبیح مقالی میں مشغول ہے۔

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ لیکن (اے لوگو! یعنی اے اکثر انسانو!) تم ان کی تسبیح خوانی کو نہیں سمجھتے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان کی تسبیح مقالی کو نہیں سمجھتے (تسبیح حالی کو تو تمام عقلمند انسان سمجھتے ہیں کون دانشور مصنوع کو بغیر صانع کے اور مخلوق کو بغیر خالق کے اور اثر کو بغیر مؤثر کے کہہ سکتا ہے۔

ہاں مشرک چونکہ کور بصیرت اور دماغی نابینا ہوتے ہیں (وہ تسبیح حالی کو بھی نہیں سمجھتے)۔

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ بلاشبہ اللہ حلم والا اور بخشنے والا ہے۔ گناہ کی سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا اور جو توبہ کرتا ہے اس کو بخش دیتا ہے۔

ابن منذر نے ابن شہاب زہری کے حوالہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب قریش کے مشرکوں کو قرآن مجید پڑھ کر سنایا اور اللہ کی طرف آنے کی دعوت دی تو انہوں نے مذاق بناتے ہوئے کہا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت کو نہیں مانتے، ایک ایسا پردہ حائل کر دیتے ہیں جو قرآن کو سمجھنے سے آڑ بن جاتا ہے۔ قتادہ نے کہا حجاب سے مراد اَكِنَّةٌ ہے (یعنی وہی غلاف اور پردہ مراد ہے جو مشرکوں نے قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ میں کہا تھا) حجاب یعنی ایسا پردہ جو دلوں کو قرآن فہمی سے روک دے اور فائدہ نہ اٹھانے دے۔

مَسْتُوْرًا یعنی وہ پردہ حسی نہیں ہوتا، حواس سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ پردہ دوسرے پردوں کے اندر چھپا ہوا ہوتا ہے (یعنی پردے کے اوپر ایک اور پردہ ہوتا ہے)

بعض علماء نے کہا اس جگہ مَسْتُوْر اسم مفعول سَاتِر اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی چھپانے والا۔ جیسے آیت كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا میں مَاْتِيًّا سے مراد ہے آنے والا۔

بعض نے کہا حجاب سے مراد ہے ایسا پردہ جو رسول اللہ ﷺ کی رسولی شخصیت کو ظاہری آنکھوں سے چھپا دینے والا تھا، بغوی نے سعید بن جبیر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی ایک پتھر لے کر (رسول اللہ ﷺ کو مارنے کے لیے) آئی، آپ اس وقت حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے لیکن عورت کو رسول اللہ ﷺ نظر نہیں آئے، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، خدا کی قسم وہ تو شعر نہیں پڑھتے، نہ شعر کہتے ہیں پھر ہجو کس طرح کی۔ عورت یہ کہتی ہوئی لوٹ گئی، میں تو اس پتھر سے اس کا سر پھاڑنے آئی تھی اگر مل جاتا تو سر پھاڑ دیتی۔ حضرت ابو بکرؓ نے عورت کے جانے کے بعد عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ وہ آپ کو نہیں دیکھ پائی، فرمایا ایک فرشتہ میرے اور اس کے درمیان آڑ کئے رہا۔

میں کہتا ہوں سعید بن جبیرؓ کی روایت کے بموجب آیت کا تعلق ایک مخصوص واقعہ سے قرار پائے گا، ایسا ہمیشہ

حضرت عمرؓ بن خطاب نے فرمایا جانوروں کے منہ پر نہ مارا کرو۔ ہر چیز اللہ کی تسبیح و تحمید کرتی ہے۔ میمون بن مہران کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں ایک کوا پیش کیا گیا جس کے بازو سمٹے ہوئے تھے، آپ نے اس کے بازوؤں کو پھیلایا اور فرمایا کسی شکار کو بھی نہیں شکار کیا جاتا اور کسی درخت کو بھی نہیں کاٹا جاتا مگر اسی وقت جب کہ وہ تسبیح خوانی کھو چکا ہو۔ زہری کی روایت سے اسی طرح منقول ہے۔ (ازالۃ الخفاء)

نہیں ہوتا تھا کہ آپ قرآن پڑھتے ہوں اور کافر آپ کو نہ دیکھ سکتے ہوں۔

وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ اور ان کے دلوں پر قرآن فہمی سے روکنے والے پردے ڈال دیتے ہیں یعنی ایسے پردے، جو دلوں کو چھپا لیتے ہیں اور حق کو سمجھنے اور قبول کرنے سے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دیتے ہیں تاکہ گوش قبول سے نہ سن سکیں (معنی کا فہم دل سے ہوتا ہے اور الفاظ کانوں سے سنے جاتے ہیں، اور قرآن اپنی معنویت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور لفظی ساخت کے اعتبار سے بھی اس لئے مشرکوں کے دلوں پر بھی اللہ نے پردہ ڈال دیا کہ معنوی اعجاز کو سمجھ نہ سکیں اور کانوں میں بھی گرانی پیدا کر دی کہ لفظی اعجاز کو سن نہ سکیں۔

وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِى الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝ اور جب آپ قرآن میں صرف اپنے رب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ لوگ نفرت کرتے ہوئے پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۔

یعنی اگر اللہ کے ساتھ ان کے معبودوں کا ذکر نہ ہو تو وہ محض توحید کا ذکر سن کر بدکتے اور بھاگتے اور نفرت کرتے ہیں۔

نُفُوْرًا، بھاگنا، بدکنا، نفرت کرنا۔ یہ لفظ مفعول لہ ہے یا مفعول مطلق یا نافر کی جمع، جیسے عاقد کی جمع عُقُود ہے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ جس وقت یہ لوگ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں تو ہم خوب جانتے ہیں جس غرض سے یہ سنتے ہیں۔ یعنی جس سبب سے اور جس استہزائیہ طریقے سے وہ قرآن سنتے ہیں اور آپ کا اور قرآن کا مذاق اڑانے کے لئے آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، ہم اس سے بخوبی واقف ہیں۔

وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝

اور جس وقت یہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں جب کہ یہ ظالم یوں کہتے ہیں کہ تم لوگ محض ایسے شخص کا ساتھ دے رہے ہو جو جادو زدہ ہے۔

نَجْوٰى مصدر بمعنی فاعل ہے یا نَجِی کی جمع ہے، یعنی جب آپ کی طرف کان لگا کر قرآن سنتے ہیں تو ہم ان کی اس غرض کو جو وہ دلوں میں پوشیدہ رکھتے ہیں خوب جانتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ جب وہ باہم کانا پھوسی اور سرگوشیاں کرتے ہیں تو ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کیا باتیں کہہ رہے ہیں۔ اَلظّٰلِمُوْنَ سے مراد ہے ولید بن مغیرہ اور اس کے ساتھی۔ رسول اللہ ﷺ کو سحر زدہ قرار دینا آپ پر ظلم تھا اور ولید بن مغیرہ وغیرہ اس ظلم کے مرتکب تھے۔ مَسْحُوْر سحر زدہ کا جادو کی وجہ سے اس کی عقل ٹھکانے سے نہ رہی ہو۔ مجاہد نے مَسْحُوْر کا ترجمہ کیا ہے فریب خوردہ۔ بعض علماء نے کہا یہ لفظ مَا سَحَرَكَ سے ماخوذ ہے، مَا سَحَرَكَ کا معنی ہے تجھے کس چیز نے پھیر دیا، اس وقت مَسْحُوْر کا ترجمہ ہوگا حق سے برگشتہ۔ ابو عبیدہ نے مَسْحُوْر کا ترجمہ کیا سحر والا اور سحر کا معنی ہے پھیپھڑہ۔ مراد یہ ہے کہ یہ شخص تو تم جیسا پھیپھڑوں والا آدمی ہے کھاتا ہے پیتا ہے سانس لیتا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا دیکھو ان لوگوں نے آپ کے لئے کیسے کیسے القاب تجویز کئے ہیں سو یہ لوگ گمراہ ہو گئے۔ کسی نے شاعر کہا، کسی نے جادوگر، کسی نے سحر زدہ اور مسحور، کسی نے کاہن، کسی نے جن رسیدہ دیوانہ۔ یہ باتیں کہنے کی وجہ سے یہ حق سے بھٹک گئے کیونکہ ان باتوں میں سے کسی میں سچائی تو ہے نہیں، کوئی بات حق نہیں ہے۔

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝ اب راستہ ہی نہیں پا سکتے۔

یعنی حق و ہدایت کے راستے پر چل نہیں سکتے، کیونکہ اللہ نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ حسب مراد کسی مدلل، مناسب طعن کا ان کو راستہ نہیں ملتا کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ کہتے ہیں، سب بے دلیل، اندھا دھند ہاتھ مارتے ہیں۔ جیسے حیران پراگندہ بدحواس آدمی ہوتا ہے۔ بدحواسی کی وجہ سے اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ کیا کرے۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝

اور مشرکوں نے کہا کیا جب ہم ہڈیاں اور بوسیدہ ریزے ہو گئے تو کیا ہم کو پھر بھی از سر نو تخلیق کر کے اٹھایا جائے گا۔

رُفَات فرسودہ، بوسیدہ، ریزے ریزے۔ فُتَات اور حِطَام کا بھی یہی معنی ہے۔ قاموس میں ہے رَفَتَ یَرفُتُ (نَصَرَ یَنصُرُ) توڑ دیا، ٹوٹ گیا، ریزہ ریزہ ہو گیا اور ریزہ ریزہ کر دیا۔ یہ لفظ لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ رُفَات بروزن غُراب، فرسودہ بوسیدہ، ریزہ ریزہ۔ مجاہد نے رُفَاتًا کا ترجمہ کیا ہے، خاک، مٹی۔ زندہ آدمی کے بدن میں ترو تازگی اور شادابی ہوتی ہے اور بوسیدہ ہڈیاں خشک ہوتی ہیں، دونوں حالتوں میں تضاد ہے اس لئے مشرکوں کو بوسیدہ ہڈیوں کے از سر نو تروتازہ ہو کر زندہ ہو جانے کا انکار تھا۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۙ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ

آپ کہہ دیجئے تم لوگ پتھر یا لوہا یا کوئی ایسی مخلوق ہو کر دیکھ لو جو تمہارے ذہن میں بہت ہی بعید ہو۔ یعنی پتھر بن جاؤ یا لوہا بن جاؤ یا کوئی اور اس سے بھی بڑھ کر ایسی چیز بن جاؤ۔ جو تمہارے خیال میں قبول حیات سے بہت دور ہو، مثلاً آسمان، زمین، پہاڑ وغیرہ کچھ بھی ہو جاؤ، مرنے کے بعد کچھ بھی بن جانا فرض کر لو۔ تم کو ضرور زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اعراض (یعنی مختلف احوال) کو قبول کرنے میں تمام اجسام برابر ہیں (ہر جسم عرض یعنی مختلف کیت کیفیت وغیرہ کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے) بوسیدہ ہڈیاں ہو جانے کے بعد از سر نو زندہ ہو جانا تو زیادہ دشوار نہیں ہے۔ ہڈیاں تو پہلے زندہ ہی تھیں۔ تروتازگی کے بعد ان میں خشکی آئی ہے۔ جس میں ایک بار تازگی ہو چکی ہے اس کا دوبارہ تازگی کو قبول کرنا آسان ہے۔

كُوْنُوْا حِجَارَةً الخ سے مراد امر تکلیفی نہیں ہے۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ تم کو پتھر یا لوہا بن جانا لازم ہے یا اس کا تم کو اختیار ہے بلکہ مراد امر تقدیری ہے، یعنی فرض کر لو کہ تم پتھر ہو جاؤ گے یا لوہا بن جاؤ گے یا کسی اور اس سے بھی زیادہ چیز میں تبدیل ہو جاؤ گے۔ اور جمادیت میں اتنے آگے بڑھ جاؤ گے جو تمہارے خیال میں زندگی سے بہت ہی زیادہ دور ہے۔

فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ سو (یہ بات سن کر) وہ کہیں گے کہ (مرنے کے بعد) دوبارہ ہم کو زندہ کرے گا کون (یعنی مان لیا کہ ہر جسم قبول حیات کی صلاحیت رکھتا ہے اور ہر جسم میں ہر عرض کے توارد کی قابلیت ہے لیکن ہر جسم پر ہر عرض آتا تو نہیں ہے جب تک کوئی موثر نہ ہو محض صلاحیت و استعداد تو اس کے لئے کافی نہیں ہے کسی زبردست موثر اور فاعل کی ضرورت ہے اور ایسا کرنے والا ہمیں تو کوئی نظر نہیں آتا) آپ کہہ دیجئے کہ جس نے تم کو اول بار پیدا کیا (اس کی قدرت تم کو معلوم ہو چکی ہے) وہی دوبارہ بھی تخلیق کر دے گا (پہلے تو تم مٹی تھے زندگی کو قبول کرنے سے بہت دور اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے میں تو فقط پہلی حالت کو لوٹا کر لانا ہے اور ظاہر ہے کہ عدم محض سے وجود میں لانا معدوم کر کے موجود کر دینے سے زیادہ دشوار ہے)۔

فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ یہ سن کر وہ تمہارے سامنے (تعجب یا استہزاء کے طور پر) سر مٹکا کر کہیں گے اچھا تو ایسا ہو گا کب یعنی اگر ہم مان لیں کہ دوبارہ زندہ ہو جانا ناممکن نہیں ہے اور یہ بھی مان لیں کہ جس نے اول بار پیدا کیا ہے وہی دوبارہ پیدا کر سکتا ہے) تو یہ بتاؤ کہ دوسری زندگی کب ہو گی (اس میں تاخیر کیوں ہے، کروڑوں مر گئے اور آج تک کوئی دوبارہ زندہ ہو کر نہیں آیا یہ تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔)

قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ آپ کہہ دیجئے کہ امید ہے (ہو سکتا ہے) کہ دوسری زندگی قریب ہی ہو (آخر دوسری زندگی ہو گی ضرور اور جو چیز آئندہ ضرور ہونے والی ہے وہ قریب ہی ہے) یا یہ مطلب ہے کہ قریب اور قلیل وقت میں ہی ایسا ہو جائے گا یا یہ مطلب ہے کہ ابتداء تخلیق عالم سے دوسری زندگی زیادہ دور نہیں ہے۔

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ یہ اس روز ہو گا جس روز اللہ تم کو پکارے گا اور تم (بلا اختیار) اس کی حمد کرتے ہوئے حکم کی تعمیل کرو گے۔

یعنی اسرافیل کی زبانی جب اللہ تم کو قبروں سے میدان قیامت کی طرف حساب فہمی کے لئے طلب فرمائے گا تو تم (تعمیل

علم اور عمل سے) دعوت کو قبول کرو گے۔ یا (دعوت اور استجابت سے مراد ہے قبروں سے اٹھایا جانا اور اٹھنا اس صورت میں) یہ مطلب ہے کہ اللہ تم کو قبروں سے اٹھائے گا اور تم اٹھو گے یعنی فور احساب فہمی کے لئے اٹھ کر میدان قیامت میں آجاؤ گے۔ یحمدہٖ کا یہ مطلب ہے کہ قبروں سے اٹھتے وقت تم اللہ کی حمد کرو گے اس وقت اقرار کرو گے کہ اللہ ہی تمہارا خالق ہے اور دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے والا ہے یا بحمدہٖ کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح حمد کرنے والے اطاعت کرتے ہیں تم بھی قبروں سے اٹھنے کے وقت ایسی ہی اطاعت کرو گے۔ بعض علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ آیت میں خطاب مومنوں کو ہے قبروں سے اٹھتے وقت مومن اللہ کی ثناء کریں گے، کافر حمد نہیں کریں گے وہ تو قبروں سے اٹھتے وقت ہائے وائے کریں گے اور کہیں گے یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ ہائے ہم کو ہماری خواب گاہ سے کس نے اٹھا دیا۔ یہ وہی ہے جس کا اللہ نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔ ہائے افسوس، ہم نے اللہ کے معاملہ میں کوتاہی کی۔

ثعلبی نے الدیباج میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے جبرئیل نے اطلاع دی ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مومنوں کے لئے مرنے کے وقت اور قبروں میں قبروں سے نکلنے کے وقت انس ہوگا (یعنی یہ کلمہ وحشت دور کرنے اور سکون بخشنے کا ذریعہ ہوگا) اے محمدؐ اگر آپ دیکھیں گے تو تعجب ہوگا کہ یہ مومن تو قبروں سے سر جھاڑتے اٹھ کھڑے ہوں گے جس کی وجہ سے ان کے چہرے گورے ہوں گے اور یہ کافر پکاریں گے ہائے افسوس میں نے اللہ کے حق میں کوتاہی کی اس وقت ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

طبرانی ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرنے والوں کو نہ مرتے وقت وحشت ہوگی نہ قبروں کے اندر، نہ قبروں سے نکلتے وقت، گویا میرے سامنے ہے وہ منظر کہ چیخ یعنی صور کی آواز ہوتے ہی مومن سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ کہہ رہے ہیں۔

عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کی روایت سے بھی یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔

وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾ اور تم خیال کرو گے کہ (دنیا میں یا قبروں میں) تم بہت ہی کم رہے۔ قتادہ نے کہا قیامت کے مقابلہ میں وہ دنیا کی مدت کو حقیر سمجھیں گے۔

کلبی کا بیان ہے کہ جب مشرکوں نے مسلمانوں کو زیادہ دکھ پہنچانے شروع کئے تو مسلمانوں نے حضور ﷺ سے اس کی شکایت کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہے۔ یعنی اسلام کی دعوت اور کلمہ توحید کی تبلیغ نرمی کے ساتھ مدلل طور پر خیر خواہی کا اظہار کرتے ہوئے، مشرکوں کی جہالت سے ٹکراؤ نہ کریں۔ حسن نے کہا مثلاً مشرکوں سے یوں کہیں اللہ آپ کو سیدھا راستہ دکھا دے۔ اس آیت کا حکم قتال کی اجازت سے پہلے تھا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عمر بن خطابؓ کے متعلق ہوا تھا آپ کو کسی کافر نے گالی دے دی تھی اس پر آپ کو اللہ نے درگزر کرنے کا حکم اس آیت میں دے دیا۔ بعض علماء نے کہا احسن الکلمہ کلمۂ اخلاص یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک آیت کا حکم تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے اللہ نے سب کو حکم دیا ہے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو اور وہ خصلت اختیار کریں جو سب سے افضل ہو۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾

بے شک شیطان لوگوں میں فساد ڈلوا دیتا ہے واقعی شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

یعنی شیطان آدمیوں میں شر اٹھاتا ہے، بگاڑ پیدا کرتا ہے وہ انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے کافروں کو تو بہکا کر جہنم میں لے جاتا ہے اور مسلمانوں میں باہم فساد اور شر اٹھاتا رہتا ہے، اس لئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ کوئی بات ایسی نہ کہیں جس سے شیطان کو شر اور بگاڑ پیدا کرنے کا موقع مل جائے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ تمہارا رب تمہارے احوال سے خوب واقف ہے وہ اگر چاہے گا تو (ایمان کی توفیق دے کر) تم پر رحم کرے گا یا اگر چاہے گا تو (حالت کفر پر تمہارا خاتمہ کر کے) تم کو عذاب دے گا۔

ابن جریج نے کہا یہ آیت اَلَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ کی تشریح ہے (یعنی کلمۂ اَحْسَن رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ الخ ہے) اور درمیانی کلام بطور جملہ معترضہ کے ہے، مطلب یہ ہے کہ کافروں سے تم یہ بات کہو کہ تمہارا رب تمہارے احوال سے بخوبی واقف ہے لہٰذا تم ان سے گالی گلوچ نہ کرو اور جاہلانہ جواب نہ دو، اور صراحۃً ان کو دوزخی نہ کہو، اس سے شر بڑھے گا، پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ جو اس وقت کافر ہیں ان کا خاتمہ کس حالت پر ہوگا ممکن ہے وہ ایمان لے آئیں اور ان کا خاتمہ ایمان پر ہو، خاتمہ کا علم تو صرف اللہ کو ہے۔ کلبی نے کہا یہ خطاب اللہ کی طرف سے مومنوں کو ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے گا تو مکہ والوں کے پنجہ سے تم کو بچالے گا، اور چاہے گا تو ان کے ہاتھوں سے تم کو دکھ پہنچوائے گا، اور ان کو تم پر قابو دے دے گا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ اور (اے محمد ﷺ) ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔ ان کے معاملات آپ کے ہاتھ میں نہیں دے دیئے کہ آپ زبردستی ان کو مومن بنادیں اور ان کے کافر رہنے کی آپ کے لئے کوئی اہمیت ہو، آپ کو تو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، اس لئے ان سے نرمی کیجئے اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیجئے کہ کافروں کی طرف سے پہنچنے والی اذیتوں کو برداشت کریں۔

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اور آسمانوں میں اور زمین میں جو بھی ہیں ان کے احوال سے آپ کا رب ہی خوب واقف ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کون نبوت اور ولایت کے قابل ہے کس کی تخلیق سعادت پر ہوئی اور کون پیدائشی شقی ہے۔

قریش اعتراض کرتے تھے کہ ابوطالب کا یتیم نبی کیسے ہو سکتا ہے اور بلال و صہیب جیسے محتاج لوگ اللہ کے ولی اور جنتی کس طرح ہو سکتے ہیں اور بڑے بڑے شرفاء مکہ دوزخی کیسے بن سکتے ہیں، اس آیت میں ان بیہودہ خیالات کی تردید کردی گئی (کہ اہلیت اور صلاحیت سے اللہ کے سوا کوئی واقف نہیں، دولت اور ظاہری عزت معیار قابلیت نہیں، فطری جوہر قابل کس کو دیا گیا اور کون اس سے محروم ہے اس سے اللہ ہی واقف ہے۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر برتری عطا کی۔ یعنی اخلاقی اور نفسانی فضائل سے نوازا اور جسمانی اور مادی آلودگیوں سے پاک صاف کیا اور اسی کو معیار فضیلت بنایا، مال و اولاد وغیرہ کی کثرت و قلت کو انبیاء کی فضیلت کا ذریعہ نہیں قرار دیا، اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں قتادہ نے کہا اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا، موسیٰ سے کلام کیا، عیسیٰ کی پیدائش (بغیر باپ کے) صرف لفظ کن سے کی۔ (حضرت مفسر نے فرمایا) میں کہتا ہوں جب عیسیٰ گہوارے کے اندر شیر خوارگی کی حالت میں تھے اس وقت ان سے کلام کیا اور ان سے فصیح زبان میں بات کروائی اور ان کو کتاب و حکمت عطا فرمائی اور توریت و انجیل کا علم مرحمت فرمایا اور روح القدس کو ہر وقت ان کی امداد پر مامور فرمایا (قتادہ نے کہا) اور سلیمان کو ایسی حکومت عنایت کی جو آپ کے بعد کسی کو ملنا مناسب نہیں یعنی جن وانس کو ان کا تابع حکم بنادیا اور شیطانوں کو سلیمان کے حکم سے زنجیروں میں مقید کرادیا۔ اور داؤد کو زبور عطا فرمائی۔

وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾ اور داؤد کو ہم نے زبور دی یعنی وحی کے ذریعے سے ان کے پاس کتاب بھیج کر فضیلت و بزرگی سے نوازا، حکومت (بھی دی مگر حکومت) کو وجہ برتری نہیں قرار دیا۔

مکہ کے کافروں نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار اس وجہ سے کیا کہ اگر کسی کو نبی بنایا جانا ہی تھا تو ایسے آدمی کو کیوں بنایا گیا جس کو کوئی وجہ برتری حاصل نہیں۔ نہ مال و دولت اس کے پاس ہے نہ دنیوی وجاہت و اقتدار۔ مذکورہ بالا آیات میں اللہ نے اس کی تردید کر دی اور فرمایا کہ بعض انبیاء کو بعض پر ہم نے برتری عطا کی تھی، یعنی اخلاقی بلندی، نفسانی بزرگی، جسمانی آلودگیوں سے پاکی، وہبی علوم، عمومی ہدایت اور مراتب قرب کے لحاظ سے ایک کو دوسرے سے اونچا کیا تھا، مال و لولاد کی کثرت وجہ برتری نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کو تمام انبیاء سے برگزیدہ بنایا، آپ پر نبوت کو ختم کر دیا، آپ کی امت کو خیر الامم قرار دیا، کیونکہ زبور میں صراحت فرمادی تھی کہ میری زمین کے وارث اصحاب صلاح ہوں گے اور امت محمدیہ کو زمین کا وارث بنایا، معلوم ہوا کہ یہ امت سب امتوں سے برتری رکھتی ہے، رسول اللہ ﷺ کو قرآن مجید عطا کیا جو حجم میں اگرچہ کم ہے مگر علم و افادیت و اعجاز میں سب سے زائد ہے، رسول اللہ ﷺ کو آخری درجہ قرب پر پہنچایا اور اس قرب کو آیت دَنٰى فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى میں ظاہر فرمایا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ زبور اللہ کی کتاب ضرور تھی جو حضرت داؤدؑ کو دی گئی تھی اس میں ایک سو پچاس سورتیں تھیں اور سب سورتیں دعا اور حمد و ثنا سے بھری ہوئی تھیں۔ نہ ان میں حرام و حلال کا بیان تھا نہ فرائض و حدود کا۔ بخاری وغیرہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کچھ آدمی کچھ جنوں کی پوجا کرتے تھے جب وہ جن مسلمان ہو گئے، تب بھی یہ مشرک لوگ انہی جنات سے چپٹے رہے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝۵۶

آپ کہہ دیجئے کہ جن جنات کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہارا دکھ دور کرنے یا منتقل کرنے یعنی تمہارے اوپر سے ٹال کر دوسروں کو اس دکھ میں مبتلا کرنے پر قابو نہیں رکھتے۔ یعنی جن جنات کو تم معبود قرار دیتے ہو وہ تمہارے افلاس اور قحط سالی وغیرہ کو دور نہیں کر سکتے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔

وہ خود اللہ کا قرب ایمان اور اطاعت کے ذریعہ سے چاہتے ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ وسیلہ خاص ہے اور وصیلہ عام۔ وصیلہ کا معنی ہے کسی چیز سے اتصال اور وسیلہ کا معنی ہے رغبت کے ساتھ کسی چیز تک پہنچنا۔ وسیلہ الی اللہ سے مراد ہے علم اور عمل کے لحاظ سے اللہ کی قائم کی ہوئی راہ کی نگہداشت اور مکارم شریعت کے حصول کا ارادہ اور کوشش۔ گویا وسیلہ الی اللہ کا مراوی معنی ہوا قرب خداوندی۔ قاموس میں ہے، وسیلہ اور واسلہ بادشاہ کے دربار میں خاص مرتبہ، درجہ، قربت۔ وَسَّلَ اِلَى اللّٰهِ تَوْسِيْلًا کا معنی ہے ایسا عمل کیا کہ جس سے اللہ کے قرب میں پہنچ گیا۔

اَيُّهُمْ اَقْرَبُ ان کا جو ان میں سب سے زیادہ قرب (خداوندی) رکھتے ہوں۔

یعنی ان میں جو سب سے زیادہ قربت رکھنے والے ہیں وہ خود بھی وسیلہ کے طلب گار ہیں، قربت نہ رکھنے والوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ (زجاج) بعض اہل تفسیر نے اس طرح مطلب بیان کیا ہے کہ وہ اپنے شخص کو طلب کرتے ہیں جو سب سے زیادہ اللہ کا مقرب ہوتا ہے اس کا وسیلہ پکڑتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ وہ قرب الی اللہ ہونے کی بڑی شدت سے خواہش رکھتے ہیں، یعنی کثرت طاعت کے سبب اللہ کے مقرب ترین بندے ہو جانا چاہتے ہیں۔

وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اور امید رکھتے ہیں اس کی رحمت کی اور ڈرتے ہیں اس کے عذاب سے۔ یعنی جب وہ معبود خود ہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں تو کس بنیاد پر مشرک ان کو اپنا معبود قرار دیتے ہیں۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝۵۷ آپ کے رب کا عذاب حقیقت میں ہے ہی ڈرنے کی چیز۔

یعنی ایسا خوفناک ہے کہ اس سے فرشتوں اور پیغمبروں کو بھی ڈرنا چاہیے۔

بیضاوی نے کہا مطلب یہ ہے کہ جن کو تم معبود خیال کرتے ہو جیسے فرشتے اور مسیح اور عزیر ان میں سے کوئی بھی تمہارا دکھ دور نہیں کر سکتا، یہ تو خود اللہ کا مقرب ترین بندہ بننے کے لئے وسیلہ کے خواست گار ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ نے کہا، عیسیٰ، ان کی والدہ، عزیر، ملائکہ، چاند، سورج اور ستارے سب اپنے رب کی جانب وسیلہ کے طلب گار ہیں، اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں (پھر ان کو کارساز معبود کس طرح بناتے ہو) بغوی نے لکھا ہے ایک بار مشرک سخت کال میں مبتلا ہوئے، نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مردار تک کھا گئے، مجبور ہو کر رسول اللہ ﷺ سے دعا کرنے کی درخواست کی اس پر آیت قُلْ لِلْمُشْرِكِيْنَ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهَا اٰلِهَةٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ نازل ہوئی۔ آپ مشرکوں سے کہہ دیجئے کہ اللہ کے سوا تم جن کو معبود خیال کرتے ہو انہیں سے دعا کرو، وہ تمہارا دکھ دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۗ

اور (کفار کی) ایسی کوئی بستی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا (قیامت کے دن) اس کو سخت عذاب نہ دیں۔ یعنی جو بستی کفر و معصیت کرنے والی ہے ہم اس کو یا تو قیامت سے پہلے ہلاک اور تباہ کر دیں گے یا سخت عذاب دیں گے۔ مقاتل وغیرہ نے کہا، ہلاک کرنے سے مراد ہے مار ڈالنا، موت کو مسلط کر دینا، یعنی بستی والے اگر مومن ہوں تو ہم ان پر موت کو مسلط کر دیں گے، زندگی ختم کر دیں گے اور کافر ہوں تو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کر دیں گے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا جب کسی بستی میں زنا اور سود پھیل جاتا ہے (یا علی الاعلان لوگ زنا کرتے اور سود کھاتے ہیں) تو اللہ اس بستی کو تباہ کرنے کا حکم دے دیتا ہے۔

كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝

کتاب میں یہی لکھا ہوا ہے۔ اَلْكِتٰب سے مراد ہے لوح محفوظ۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے اول اللہ نے جس کو پیدا کیا وہ قلم تھا پھر اس سے فرمایا لکھ، قلم نے کہا کیا لکھوں، فرمایا تقدیر کو لکھ، حسب الحکم قلم نے ہر اس چیز کو لکھا جو ہو چکی ہے یا ابد تک ہونے والی ہے۔ رواہ الترمذی، ترمذی نے اس حدیث کی سند کو غریب کہا ہے۔

طبرانی اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اور طبرانی و ابن مردویہ نے حضرت ابن زبیرؓ کے حوالہ سے ایک حدیث ذرا تفصیل کے ساتھ اسی طرح نقل کی ہے کہ اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی آپ کوہ صفا کو سونے کا کر دیجئے اور ان پہاڑوں کو یہاں سے ہٹا دیجئے تاکہ (میدانی زمین نکل آئے اور) ہم اس میں کھیتی کریں، اللہ نے اپنے پیغمبر کے پاس وحی بھیجی کہ اگر آپ چاہیں تو میں ان کی درخواست پوری کرنے میں ڈھیل کر دوں (ٹال دوں) اور آپ چاہیں تو ان کا سوال پورا کر دوں، لیکن سوال پورا کرنے کے بعد اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو میں ان کو اسی طرح تباہ کر دوں گا جس طرح ان سے پہلے والوں کو تباہ کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا، نہیں، تو ان کو ڈھیل دے (درخواست پوری نہ کر) اس پر اللہ تعالیٰ نے آیات ذیل نازل فرمائیں۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۗ

اور ہم کو (مطلوبہ) نشانیاں بھیجنے سے صرف یہ امر مانع ہے کہ (ایسے مطلوبہ معجزات ہم نے گزشتہ قوموں کے لئے ظاہر کئے تھے پھر ان) پہلے لوگوں نے ان آیات کی تکذیب کی (اور ہم نے ان کو تباہ کر دیا) یعنی مکہ کے کافر بھی طبیعت اور خو خصلت میں گزشتہ کافروں کی طرح ہیں، انہوں نے بھی اسی طرح کی نشانیاں طلب کی تھیں اور جب ہم نے ان کی مطلوبہ نشانیاں ظاہر کر دیں تو انہوں نے نہ مانا اور ہم نے ان کو غارت کر دیا۔ یہ کافر بھی انہیں کی طرح ہیں، اگر ان کے مطلوبہ معجزات ظاہر کر دیئے جائیں گے اور یہ نہ مانیں گے

تو ان کو تباہ کر دیا جائے گا اور ہم اس امت کو تباہ کرنا چاہتے نہیں مہلت دینا چاہتے ہیں۔

وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ اور ہم نے (قوم) ثمود کو (ان کی درخواست پر) اونٹنی (پتھر کے اندر سے نکال کر) دی تھی جو کھلی ہوئی نشانی تھی، پھر انہوں نے اس پر ظلم کیا، یعنی کفر کیا یا اس کو قتل کر کے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔

وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۞ اور ہم ایسے معجزات کو صرف ڈرانے کے لئے بھیجا کرتے ہیں۔ یعنی بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے والے عذاب دنیا سے۔ ڈرانے کے لئے جب خوف دلانا ان پر اثر انداز نہ ہوا تو دنیا میں ہی عذاب آپہنچا یا یہ مطلب ہے کہ (غیر مطلوبہ) معجزات جو ہم ظاہر کرتے یا قرآنی آیات بیان کرتے ہیں وہ صرف عذاب آخرت سے ڈرانے کے لئے۔

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ اور (یاد کرو) جب ہم نے آپ سے کہا تھا (آپ کے پاس وحی بھیجی تھی) کہ آپ کا رب سب لوگوں کو گھیرے ہوئے ہے یعنی اللہ کی ذات علم قدرت سب کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے لہٰذا تم کسی کی پروانہ کرو اور جو پیام آپ کو دے کر بھیجا گیا وہ پہنچا دیا (اَلنَّاس سے مراد قریش ہیں) مطلب یہ ہے کہ اللہ قریش کو گھیرے ہوئے ہے یعنی ان کو ہلاک کر دے گا (اَحَاطَ بِهِمْ ان کو ہلاک کر دیا) اس مطلب پر یہ آیت واقعہ بدر کی بشارت ہو گی اور چونکہ آئندہ واقعہ بدر کا ظہور پذیر ہونا یقینی تھا اس لئے ماضی کے صیغہ سے تعبیر کر دی گئی (گویا ایسا ہو چکا)

ابو یعلی نے حضرت ام ہانی کی روایت سے اور ابن المنذر نے حسن کے حوالہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو جس رات کو معراج ہوئی تو اس کی صبح کو قریش کے چند آدمیوں کے سامنے معراج کا واقعہ بیان فرمایا، قریش آپ کی ہنسی اڑانے لگے، اور حضور ﷺ سے سیر معراج کی کوئی نشانی دریافت کی (بیت المقدس کا نقشہ اور اپنے قافلہ کی خبر دریافت کی) آپ نے بیت المقدس کی حالت اور نقشہ بیان کر دیا اور قافلہ کی کیفیت بھی ظاہر کر دی، اس پر ولید بن مغیرہ بولا یہ شخص جادوگر ہے اس پر اللہ نے آیت ذیل نازل کی۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ اور جو تماشا ہم نے آپ کو (شب معراج میں) دکھایا تھا اس کو بس ہم نے لوگوں کے لئے موجب گمراہی کر دیا، لوگوں کے لئے معراج کا واقعہ ایک جانچ کی حیثیت رکھتا تھا کافروں نے تو انکار کر ہی دیا، لیکن بعض کمزور ایمان والے بھی ایمان سے پھر گئے۔ اس آیت میں سیر معراج کو رؤیا (خواب) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی آیت سے تائید ہوتی ہے، حضرت عائشہؓ کے اس قول کی کہ معراج روحانی تھی جسمانی نہ تھی (رواہ البخاری) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رؤیا سے مراد ہے رؤیت یعنی آنکھوں سے دیکھنا۔ سعید بن جبیر، حسن بصری، مسروق، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج اور اکثر علماء کا قول بھی یہی ہے۔ عرب کہتے ہیں، رَاَيْتُ بِعَيْنِيْ رُؤْيَةً وَرُؤْيَا میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ رؤیت اور رؤیا ہم معنی ہیں بعض علماء کا خیال ہے کہ حضور کو دو مرتبہ معراج ہوئی تھی ایک بار آنکھوں سے دیکھنے کی اور ایک بار دل سے دیکھنے کی۔ [1] حضرت امام حسینؓ راوی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ صبح کو کچھ غمگین تھے، سبب دریافت کرنے پر فرمایا، میں نے دیکھا کہ میرے اس منبر پر گویا بنی امیہ باری باری سے آرہے ہیں، عرض کیا گیا یا رسول اللہؐ آپ فکر مند نہ ہوں یہ دنیا ہے جو ان کو مل جائے گی۔ اس پر آیت وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ نازل

---

[1] حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں نے حکم بن عاص کی اولاد کو منبر پر بندروں کی طرح (اچھلتے) دیکھا اور اسی کے متعلق اللہ نے فرمایا وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ یعنی اس آیت میں جس خواب کا ذکر ہے اس کا تعلق حکم اور اس کی اولاد سے ہے (حکم اس کا بیٹا مروان اس کے بیٹے عبدالملک وغیرہ سارے لوگوں کے لئے فتنہ تھے اور خلافت پر قابض ہو گئے تھے۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ کو دکھا دی گئی تھی۔ حضرت سہیلؓ بن سعد، یعلیٰ بن مرہ، حضرت حسینؓ بن علیؓ، حضرت عائشہؓ اور سعید بن مسیب کی روایت سے بھی اسی سے ملتی جلتی حدیث آئی ہے۔ (مظہری)

ہوئی۔ اس روایت کے بموجب لفظ فتنہ سے مراد ہوگا بنی امیہ کے دور اقتدار میں بدعات اور فسق و فجور کا پھیل جانا۔ یہ حدیث شیخ ابن جریر نے حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت سے بھی بیان کی ہے اس روایت کے بموجب حدیث کے الفاظ یہ ہیں رسول اللہ ﷺ نے بنی فلاں (یعنی بنی امیہ) کو خواب میں دیکھا کہ وہ آپ کے منبر پر بندروں کی طرح کود رہے ہیں (کبھی ایک آتا ہے کبھی دوسرا) حضور ﷺ کو اس خواب سے دکھ ہوا اس پر اللہ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عمرو بن عاصؓ اور حضرت یعلی بن مرہ کی روایت سے نیز ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں سعید بن مسیب سے مرسلاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خواب میں بنی امیہ کو منبر پر دیکھا جس سے آپ کو دکھ ہوا اللہ نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ ان کو تو دنیا دیا گیا ہے (یعنی اللہ کا یہی فیصلہ ہے) اس سے آپ کو سکون ہو گیا۔

مذکورہ بالا تمام احادیث ضعیف ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ الرُّءْیَا سے مراد وہ خواب ہے جو حدیبیہ کے سال رسول اللہ ﷺ نے دیکھا آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی مکہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ آپ مقررہ میعاد سے پہلے مکہ کی طرف چل کھڑے ہوئے، جب مشرکوں نے حدیبیہ کے مقام پر آپ ﷺ کو روک دیا تو آپ لوٹ آئے پہلے تو آپ نے لوگوں سے بیان کیا تھا کہ ہم مکہ میں داخل ہو جائیں گے اور پھر اسی سال حدیبیہ سے واپس لوٹنا پڑا اس سے لوگ فتنہ میں پڑ گئے اور بعض لوگوں میں شک پیدا ہو گیا، پھر جب دوسرے سال مکہ میں (صلح کے ساتھ حسب معاہدہ) داخل ہو گئے تو آیت لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ نازل ہوئی، اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو وہ خواب سچ کر دکھایا۔ بیضاوی نے اس روایت پر یہ شبہ وارد کیا ہے کہ آیت مکی ہے (اور حدیبیہ کا واقعہ تو ہجرت کے بعد کا ہے) ہاں اگر مکہ میں خواب دیکھا ہو اور اقامت مدینہ کے زمانہ میں اس کو بیان کیا ہو تو شبہ کا جواز ہو سکتا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے، شاید اس خواب کا تعلق واقعۂ بدر سے ہو۔ جس طرح دوسری آیت میں آیا ہے وَاِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِکَ قَلِیْلًا۔ روایت میں ہے کہ جب حضور ﷺ بدر کے پانی پر اترے تو فرمایا، میں لوگوں (یعنی مشرکوں) کی قتل گاہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں یہ فلاں شخص کی قتل گاہ ہے، یہ فلاں کی قتل گاہ۔ قریش نے یہ بات سنی تو اس کا مذاق اڑایا۔

وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ ؕ اور جس درخت کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے (اس کو بھی موجب گمراہی کر دیا) شجرۂ ملعونہ سے مراد ہے زقوم (تھوہر) کا درخت یعنی اللہ نے اس درخت کو بھی لوگوں کے لئے جانچ کی چیز بنا دیا۔ درخت زقوم کا فتنہ ہونا دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

(۱) ابو جہل نے کہا ابن ابو کبشہ (محمد بن عبداللہ) تم کو ایسی آگ سے ڈراتے ہیں جو پتھروں کو بھی جلا دے گی لیکن خود ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں ایک درخت اُگے گا (جس کو آگ نہیں جلائے گی) تم لوگ جانتے ہو کہ آگ درخت کو جلا ہی دیتی ہے، اس بے وقوف نے اتنا بھی نہیں سمجھا کہ جو سمندل کی پشت کی کھال کو آگ میں جلنے سے محفوظ رکھتا ہے اور جس نے شتر مرغ کے شکمی اعضاء کو یہ طاقت بخشی ہے کہ وہ لوہے کے تپتے دہکتے ٹکڑے نگل لیتا ہے اور اس کی آنتیں نہیں جلتیں نہ حلق میں سوزش ہوتی ہے کیا وہ دوزخ میں ایسا درخت نہیں پیدا کر سکتا جو آگ سے نہ جلے۔ مفسر مدارک نے لکھا ہے کہ سمندل ترکستان میں ایک چھوٹا سا جانور ہوتا ہے جس کی کھال کے رومال بنائے جاتے ہیں، جب رومال میلے ہو جاتے ہیں تو ان کو آگ میں ڈال دیا جاتا ہے، آگ سے ان کا میل جل کر صاف ہو جاتا ہے اور کھال پر آنچ بھی نہیں آتی، صاحب قاموس نے لکھا ہے سمندل ہندوستان میں ایک پرندہ ہوتا ہے جو آگ میں نہیں جلتا (مشہور یہ ہے کہ سمندل جس کو سمندر کہا جاتا ہے ایک ایسا جاندار ہوتا ہے جو آگ میں ہی پیدا ہوتا ہے اور آگ میں ہی جیتا اور زندگی گزارتا ہے، آگ سے باہر نکالا جائے تو مر جاتا ہے۔ مترجم)

(۲) ابن الزبعری نے کہا تھا محمد ہم کو زقوم سے ڈراتے ہیں اور ہم تو زقوم کا معنی مکھن اور چھوارے ہی جانتے ہیں، اس کے علاوہ کوئی دوسرا معنی ہم کو معلوم نہیں۔ یہ سن کر ابو جہل نے لونڈی کو آواز دے کر کہا یا جاریۃ تعالَیْ زَقِّمِیْنَا جاریہ ہمارے

لئے زقوم لا، باندی فوراً مکھن اور چھوارے لے آئی، ابو جہل بولا، لو گو زقوم کھاؤ، محمدؐ تم کو اسی سے ڈراتے ہیں۔ زقوم کا ذکر اللہ نے سورت الصّٰفّٰت میں کیا ہے۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی نے البعث میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب اللہ نے زقوم کا ذکر کیا اور قریش کو زقوم سے ڈرایا تو ابو جہل نے قریش سے کہا جس زقوم سے محمدؐ ہم کو ڈراتے ہیں وہ کیا ہے۔ لوگوں نے کہا ہم کو معلوم نہیں، ابو جہل نے کہا یثرب میں عمدہ قسم کی کھجوریں مکھن کے ساتھ کھائی جاتی ہیں اس مجموعہ کو زقوم کہا جاتا ہے، ہم کو اگر وہ (زقوم) مل جائے تو ہم تو اس کو خوب کھائیں لنتزقمنها تزقما اس پر آیت وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ اور آیت اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ نازل ہوئی حقیقت میں ملعون تو زقوم کھانے والا ہو گا بطور مبالغہ آیت میں درخت کی ہی صفت مَلْعُوْنَۃ ذکر کی ہے کیونکہ یہ درخت جہنم کی جڑ میں ہو گا اور وہ ایسا مقام ہے جہاں پہنچنے والے رحمت خداوندی سے بہت ہی زیادہ دور ہوں گے۔ یا یوں کہا جائے کہ مَلْعُوْنَۃ کا معنی ہے بہت پر اضرر رساں، ناگوار۔ ہر ناگوار، ضرر رساں کھانے کو عرب ملعون کہتے ہیں۔

بعض کے نزدیک زقوم سے مراد شیطان یا ابو جہل یا حکم بن العاص ہے۔ یہ محض تاویل ہے۔

وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝ اور ہم ان کو ڈراتے ہیں لیکن ڈرانے سے ان کی بڑھی ہوئی سرکشی میں اور اضافہ ہی ہوتا ہے۔ طغیان، سرکشی اور تمرد۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝ اور یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا آدم کے لئے (یعنی ان کی طرف) سجدہ کرو فوراً سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا، ابلیس بولا کیا میں اس شخص کو سجدہ کروں جس کو تو نے گارے سے بنایا ہے۔ ابلیس نے اپنے انکار کی وجہ آدم کی (تخلیقی اگری ہوئی) حالت کو قرار دیا، بغوی نے لکھا ہے کہ سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ نے آدم کو پیدا کیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک مٹھی زمین کی خاک لی، شیریں بھی اور نمکین بھی اس سے آدم کا پتلا بنایا، پس جس کو میٹھی خاک سے بنایا وہ تو خوش نصیب ہو گیا، خواہ اس کے ماں باپ کافر ہوں اور جس کی تخلیق نمکین خاک سے کی وہ بد بخت ہوا خواہ وہ انبیاء زادہ ہو۔ احمد، ترمذی، ابوداؤد، بیہقی اور حاکم نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت سے بیان کیا اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ اللہ نے ایک مٹھی خاک تمام زمین سے لی اس سے آدمؑ کو بنایا۔ پس اولاد آدم زمین کے مطابق ہوئی، سرخ، سفید، سیاہ اور میانی رنگ، نرم، سخت، خراب، عمدہ اخلاق والے اسی وجہ سے ہو گئے۔

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ اور ابلیس نے کہا بھلا بتا تو یہ وہی ہے جس کو تو نے مجھ پر برتری عطا کی ہے۔ اور مجھے اس کو سجدہ کرنے کا حکم دے رہا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔

لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ اگر روز قیامت تک تو نے مجھے مہلت دے دی تو سوائے چند لوگوں کے میں اس کی ساری اولاد کو اپنے بس میں کر لوں گا، یعنی اگر تو مجھے مہلت دے گا اور قیامت تک زندہ رکھے گا تو اغواء کر کے میں اس کی نسل کی بیخ کنی کر دوں گا۔ اِحْتَنَكَ الْجَرَادُ الزَّرْعَ محاورہ ہے ٹڈی نے ساری کھیتی کھالی۔ یا یہ مطلب ہے کہ میں اس کو جدھر چاہوں گا کھینچ کر لے جاؤں گا اور اس پر تسلط قائم رکھوں گا۔ حَنَكَ الدَّابَّةَ گھوڑے کا نچلا جبڑا (اوپر سے ملا کر) رسی سے باندھ دیا تاکہ جس طرف چاہے مالک اس کو کھینچ کر لے جائے۔ قاموس میں ہے اِحْتَنَكَ اس پر غالب آ گیا، تسلط جما لیا۔ اِحْتَنَكَ الْجَرَادُ الْاَرْضَ ٹڈی نے زمین کی ساری سبزی کھالی۔

قَلِيْلًا سے مراد ہیں وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے (یعنی انبیاء اور خاص خاص اشخاص) جن کے متعلق اللہ نے فرمایا تھا اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ۔

بیضاوی نے لکھا ہے نسل آدم کو بہکانے پر قادر ہونے کا علم ابلیس کو شاید ملائکہ کے قول سے ہو گیا تھا، ملائکہ نے کہا،

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا یا حضرت آدم کی بناوٹ سے وہ سمجھ گیا ہوگا کہ اس کے اندر قوت غضب و شہوت اور وہم کی پیدائش کردی گئی ہے (لامحالہ اس کو اغواء کرنا سہل ہے)۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝

اللہ نے فرمایا جا اور ان میں سے جو بھی تیرے پیچھے چلے گا، جہنم تم سب کی کامل سزا ہوگی۔ یعنی جا اور جو تیرا دل چاہے کر۔ یہ اللہ کی طرف سے دھتکار اور نکل جانے کا حکم تھا اور نفس کے کہے پر چلنے کی خود مختاری تھی۔ مَوْفُوْر بمعنی وافر ہے، یعنی مکمل پوری پوری۔ عرب بولتے ہیں وَفِّرْ لِصَاحِبِكَ عِرْضَهٗ اپنے ساتھی کی پوری پوری عزت کر۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ

اور ان میں سے جس جس پر تیرا قابو چلے اپنی چیخ پکار سے اس کا قدم اکھاڑ دینا اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالانا۔ اِسْتِفْزَاز۔ ابھار دینا، پھسلا دینا، بے وقوف بنالینا۔ قاموس میں ہے اِسْتَفَزَّهٗ اس کو ابھار دے کر اکھاڑ دیا اور گھر سے نکال دیا۔ بِصَوْتِكَ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک صوت سے اس جگہ دعوت گناہ مراد ہے۔ جو بھی اللہ کی نافرمانی کی دعوت دے وہ ابلیس کی جماعت میں شامل ہے۔ ازہری نے اِسْتَفْزِزْ بِصَوْتِكَ سے یہ مراد لی ہے کہ ان کو اپنی طرف بلانا اور اکھاڑ کر اپنی جانب مائل کر لینا۔ مجاہد نے کہا صوت سے مراد ہے گانا بجانا۔ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ۔ جَلَبَ (باب نصر) اِجْتَلَبَ (قاموس) حدیث میں آیا ہے لَا جَلَبَ یعنی ایک جگہ کا غلہ (جب کہ اس جگہ بھی ضرورت ہو) دوسری جگہ لے جانا جائز نہیں ہے۔ صاحب نہایہ نے لکھا ہے کہ جلب دو طرح کا ہوتا ہے۔

(۱) زکوٰۃ کا محصل جا کر کسی خاص مقام پر فروکش ہو جائے اور اپنے کارندوں کو جابجا ہر طرف بھیج دے تاکہ زکوٰۃ دینے والے خود اپنا مال لا کر جمع کرائیں۔ اس کی شرعاً ممانعت کردی گئی اور زکوٰۃ کے تحصیلداروں کو حکم دیا گیا کہ خود لوگوں کے گھروں اور قیام گاہوں پر جا کر زکوٰۃ کا مال وصول کریں۔

(۲) گھوڑوں کی دوڑ کے موقع پر کوئی شخص اپنے گھوڑے کے پیچھے کسی اور کو لگا دے تاکہ وہ آدمی گھوڑے کو چیخ چیخ کر زور سے تیز دوڑنے پر بھڑکاتا رہے اور گھوڑا کہیں سست رفتار نہ ہونے پائے اس کی بھی ممانعت کردی گئی ہے۔

قاموس میں اَجْلَبَ عَلَى الْفَرَسِ کا یہی معنی آیا ہے۔ جَلَبَة کا معنی آواز بھی ہے۔ قاموس میں ہے رَعَدَ فَجَلَبَ لرزا اور چیخا۔ اَجْلَبَ عَلَيْهِ اس پر چیخ کر اس کو بھڑکایا اور ابھارا۔ قتبی نے کہا جَلَب جَلَبَة کی جمع ہے۔ آوازیں، شور۔ جلب بمعنی اجتماع بھی آیا ہے۔ نہایہ میں ہے اَجْلَبُوْا عَلَيْهِ اس پر جمع ہو گئے، اَجْلَبَهٗ اس کی مدد کی۔ اس تحقیق پر آیت کا مطلب اس طرح ہوگا، اپنے تمام لشکر کو اور اغواء و مکر کے تمام ذرائع کو جمع کر لینا۔

یا یہ مطلب ہے کہ گناہوں پر آمادہ کرنا، بھڑکانا یا یہ مطلب ہے کہ گناہوں کی طرف ان کو ہنکانا یا چلانا یا یہ مطلب ہے کہ گناہ کرنے میں ان کی مدد کرنا۔

بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ گناہوں کے راستہ پر چلنے والا ابلیس کا لشکری ہے سوار ہو کر چلے یا پیادہ۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا جنات اور انسانوں میں سے کچھ اشخاص ابلیس کے سوار بھی ہیں اور پیادے بھی، جو بھی معصیت کے راستہ میں لڑے وہ ابلیس کا لشکری ہے، بیضاوی نے آیت کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ اپنی طرف سے اغواء کر کے لوگوں کو بھڑکانا، سوار ہوں یا پیادے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ عبارت کا حقیقی مفہوم مراد نہ ہو بلکہ اللہ نے جو شیطان کو اغواء پر تسلط عنایت فرمایا تھا کہ وہ کامل طور پر گمراہ کر سکتا تھا اور ہدایت انسانی کو بیخ و بن سے اکھاڑ سکتا تھا اس کو ایسے سپہ سالار ...... سے تشبیہ دی جو اپنے پورے لشکر کے ساتھ دشمن کی بستی پر حملہ کر کے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝

اور ان کے مال و اولاد میں اپنا ساجھا کر لینا اور ان سے وعدے کرنا اور شیطان ان سے بالکل جھوٹے وعدے کرتا

ہے۔

مجاہد، حسن بصری اور سعید بن جبیر کے نزدیک شرکت فی الاموال سے مراد یہ ہے کہ حرام کمائی کرنے اور اس کو جمع کر رکھنے پر لوگوں کو آمادہ کرنا اور حرام مال خرچ کرنا۔ عطاء نے کہا اس سے مراد (سود کا لین دین) ہے اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں پر چھوڑے ہوئے یا خود ساختہ قوانین مذہب کے زیر اثر آزاد کئے ہوئے جانور بھی مراد ہیں، جن کو کھانا اور بعض اوقات ان سے سواری لینا بھی مشرک حرام قرار دیتے ہیں۔ ضحاک نے کہا غیر اللہ کے نام جانوروں کی بھینٹ چڑھانا مراد ہے۔ شرکت فی الاولاد سے حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک زندہ دفن کی ہوئی لڑکیاں مراد ہیں۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا اولاد زنا مراد ہے۔ حسن اور قتادہ نے کہا اولاد کو یہودی اور عیسائی اور مجوسی بنانا مراد ہے (جب کہ یہ مذاہب منسوخ ہو چکے) حضرت ابن عباسؓ کا قول دوسری روایت میں آیا ہے، کہ اولاد کے ناجائز نام رکھنا مراد ہے جیسے عبدالحارث، عبدالشمس، عبدالعزیٰ، عبدالدار وغیرہ۔

حضرت امام جعفر بن امام زین العابدین نے فرمایا جب انسان بیوی سے قربت کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان اس کے ذکر پر بیٹھ جاتا ہے اب اگر وہ شخص بغیر بسم اللہ کہے کام شروع کر دیتا ہے تو اس کے ساتھ شیطان بھی جماع میں مشغول ہو جاتا ہے اور انسان کی طرح عورت کے اندام نہانی میں شیطان بھی انزال کرتا ہے (اس طرح اولاد کی پیدائش میں شیطان شریک ہو جاتا ہے)۔

بغوی نے لکھا ہے بعض احادیث میں آیا ہے کہ تم میں کچھ لوگ مغرب ہیں، دریافت کیا گیا مغرب کون لوگ ہیں۔ فرمایا، جن (کی پیدائش) میں شیطان شریک ہوتے ہیں۔ وعدہ دلانے سے مراد ہے جھوٹی، غلط امیدیں دلانا مثلاً بتوں کی شفاعت، باپ دادا کی بزرگی پر بھروسہ، توبہ میں تاخیر، یہ عقیدہ پیدا کرنا کہ دوزخ اور قیامت وغیرہ کچھ بھی نہیں۔

ایک شبہ

استفزز۔ اجلب۔ شارک۔ عد۔ یہ سب امر کے صیغے ہیں تو کیا اللہ نے ابلیس کو معصیت کا حکم دیا تھا، اللہ تو گناہ کا حکم نہیں دیتا۔

ازالہ

صیغے امر کے ضرور ہیں لیکن مفہوم تہدید مراد ہے یا امر سے مقصود توہین ابلیس ہے کہ تو کچھ بھی کر لے، تیری کسی حرکت سے میری حکومت میں فرق نہیں آسکتا۔

غرور یعنی فریب دھوکہ، باطل کو بصورت حق دکھانا۔

بغوی نے لکھا ہے آثار اقوال صحابہ میں آیا ہے کہ ابلیس کو جب نکال کر زمین پر بھیج دیا گیا تو ابلیس نے عرض کیا اے میرے رب آدم کی وجہ سے تو نے مجھے جنت سے نکال دیا، اب مجھے اس پر اور اس کی اولاد پر قابو عطا فرما دے (کہ میں جس طرح چاہوں ان کو بے راہ کر دوں) اللہ نے فرمایا تجھے قابو دے دیا گیا، ابلیس نے کہا، مجھے تیرے بغیر تو اس کی طاقت نہیں، اللہ نے فرمایا، وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ الخ۔ آدم نے عرض کیا اے میرے رب تو نے ابلیس کو مجھ پر اور میری نسل پر مسلط کر دیا اور تیرے بغیر میں اس سے محفوظ رہنے کی طاقت نہیں رکھتا، اللہ نے فرمایا، تیری جو بھی اولاد ہوگی، میں اس کی حفاظت کے لئے محافظ مقرر کر دوں گا، آدم نے عرض کیا، میں اس کلام کی مزید تفصیل چاہتا ہوں، اللہ نے فرمایا، ہر نیکی کا بدلہ دس گنا دیا جائے گا، آدم نے عرض کیا اور کیا۔ اللہ نے فرمایا جب تک روح جسم میں رہے گی توبہ کی قبولیت سامنے رہے گی (یعنی توبہ کا دروازہ بند نہ ہوگا) آدم نے عرض کیا اور کچھ، اللہ نے فرمایا یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ابلیس نے عرض کیا اے رب تو نے انبیاءؑ بھیجے اور (ان کے پڑھنے کو) کتابیں نازل کیں، میرے پڑھنے کے لئے کیا (مقرر کیا) ہے اللہ نے فرمایا شعر، ابلیس نے عرض کیا میری تحریر (رسم خط) کیا ہوگی، فرمایا (اعضاء جسم کو) گودنا (گویا گودنا اور گدوانا شیطانی تحریر اور رسم خط ہے) ابلیس نے کہا میرے پیغامبر کون ہیں۔ فرمایا کاہن، عرض کیا میرے رہنے کا مقام کونسا ہے، فرمایا حمام (جہاں لوگ برہنہ غسل کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں) عرض کیا میرے بیٹھنے کا مقام کہاں ہے، فرمایا بازاروں میں عرض کیا میرا کھانا کیا ہے فرمایا وہ چیز جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، عرض کیا میرے پینے کی چیز کیا ہے، فرمایا ہر نشہ آور چیز، عرض کیا میرا جال کون سا ہے۔ فرمایا، عورتیں، عرض کیا میرا اساماں (تفریح) کیا ہے، فرمایا باجے۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۚ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝۶۵ بلاشبہ میرے (مخلص) بندوں (کے اغواء) پر تجھے قدرت نہ ہوگی اور تیرا رب (ان کی حفاظت کا) ذمہ دار ہونے کے لئے کافی ہے۔ یعنی جو مخلص بندے اللہ پر بھروسہ رکھیں گے اس کی پناہ کے خواستگار ہوں گے اور اپنے تمام امور اس کے سپرد کر دیں گے، اللہ ان کو اپنی حفاظت میں رکھے گا۔ (ان پر تیری دست رس نہ ہوگی)

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۶۶

تمہارا رب وہی ہے جو تمہارے لئے دریا میں کشتیاں چلاتا ہے تاکہ تم اس کا رزق تلاش کرو۔ بے شک وہ تمہارے حال پر بہت مہربان ہے۔ يُزْجِيْ ہنکاتا ہے، چلاتا ہے۔ فَضْل تجارتی نفع اور طرح طرح کا وہ رزق جو تمہارے پاس نہیں ہوتا۔ اللہ تم پر مہربان ہے اسی نے تمہارے لئے تمام ضرورت کی چیزیں فراہم کر دی ہیں اور تمہاری مشکلوں کو آسان کرتا ہے۔

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ اور جب تم کو دریا میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بجز خدا کے تم جتنوں کی عبادت کرتے تھے، سب غائب ہو جاتے ہیں۔

اَلضُّرُّ، یعنی ڈوبنے کا سخت خوف۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے خوف کے وقت تم اللہ کے سوا کسی معبود کو یاد نہیں کرتے، سب باطل معبود تمہارے ذہن سے غائب ہو جاتے ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ تمام باطل معبود تمہاری مدد کرنے سے غائب ہو جاتے ہیں اور سوائے اللہ کے کوئی تمہاری فریاد رسی نہیں کرتا۔

فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۝۶۷

پھر جب اللہ تم کو ڈوبنے سے بچا کر خشکی کی طرف لے جاتا ہے تو تم اللہ کی توحید سے کترا جاتے ہو اور کافر انسان بڑا ناشکرا ہوتا ہے۔ كَفُوْر نعمتوں کا منکر اور لوائے شکر نہ کرنے والا۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۝۶۸

سو کیا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے کہ تم کو خشکی کی طرف لا کر زمین میں دھنسا دے یا تم پر کوئی ایسی آندھی بھیج دے جو کنکر پتھر برسانے لگے پھر کسی کو تم اپنا کارساز نہ پاؤ۔

یعنی خشکی کے جس حصہ پر تم موجود ہو اللہ اس کو الٹ دے یا تمہاری وجہ سے اس کو الٹ دے اور تم کو اس طرح ہلاک کر دے۔ حَاصِب، وہ آندھی اور طوفان، جس میں سنگریزے بھی اڑ جاتے ہیں اور کہیں سے کہیں جا گرتے ہیں۔ وَكِيْل سے اس جگہ مراد ہے بچانے والا، حفاظت کرنے والا، روک دینے والا۔

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ۝۶۹

یا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے ہو کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دوبارہ دریا میں ہی لے جائے، پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے پھر تم کو

تمہارے کفر کے سبب غرق کردے پھر اس بات پر ہمارا پیچھا کرنے والا تم کو کوئی بھی نہ ملے۔

یعنی ہو سکتا ہے کہ اللہ ایسے اسباب تمہارے لئے پیدا کردے کہ دوبارہ تم کو سمندر کا سفر کرنا پڑ جائے اور پھر ایک طوفان بھیج دے۔

حضرت ابن عباسؓ نے قَاصِفًا کا ترجمہ کیا عاصف تیز آندھی، طوفان۔ ابو عبیدہ نے کہا، قَصف کا معنی ہے کوٹنا، توڑ دینا، قاصف وہ ہوا جو اپنی قوت سے ہر چیز کو توڑ پھوڑ ڈالے۔ قتیبی نے کہا، قَاصِف وہ ہوتا ہے جو درختوں کو توڑ ڈالے۔

بِمَا كَفَرْتُمْ یعنی تمہارے شرک کی وجہ سے یا گزشتہ نعمت نجات کی ناشکری کرنے کی وجہ سے۔ تَبِيعًا مددگار یا طلب گار انتقام۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ

اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور خشکی اور دریا میں ان کو سوار کیا اور نفیس نفیس (کھانے پینے کی) چیزیں ان کو عطا کیں۔

یعنی آدمی کو بہت خاص نعمتیں عطا کیں۔ حسن صورت، سب سے زیادہ معتدل مزاج، قد کا اعتدال، عقل سے اشیاء میں امتیاز، زبان، تحریر اور اشاروں سے سمجھانے کی قوت، معاش و معاد کی ہدایت، زمین کی موجودات پر تسلط یعنی تمام چیزوں سے کام لینا اور مختلف ہنر اور پیشے اور تمام مادی عنصری اور فلکی کائنات کا ربط تاکہ انسان کو مختلف منافع حاصل ہوں اور اسباب رزق فراہم ہوں، پھر دوسرے جانوروں کے برخلاف آدمی کو ہاتھ سے اٹھا کر اور پکڑ کر کھانے کی تعلیم۔ یہ تمام امور انسان کے لئے مخصوص کئے، پھر محبت و عشق کا جذبہ، معرفت وحی اور مراتب قرب کی عطا بھی انسان پر خاص کرم ہے۔ حاکم نے تاریخ میں اور دیلمی نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انگلیوں سے کھانا بھی (انسان کے لئے اللہ کی طرف سے) عزت بخشی ہے۔

حَمَلْنٰهُمْ کا یہ معنی ہے کہ دریا اور خشکی میں سوار ہونے کے لئے ہم نے سواریاں عطا کیں، خشکی میں چوپائے (موٹر ریل وغیرہ) اور دریا میں کشتیاں جہاز۔ حَمَلْتُہٗ حملاً میں نے سوار ہونے کے لئے اس کو سواری دی۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہم نے آدمیوں کو سوار کیا تاکہ زمین کے اندر پاؤں نہ دھنسیں اور پانی میں ڈوب نہ جائیں، دونوں مصیبتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے سواریاں بنائیں۔

اَلطَّيِّبٰتِ سے مراد ہیں لذیذ نفیس کھانے پینے کی چیزیں۔

وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ اور ہم نے اپنی کثیر مخلوق پر ان کو برتری عطا فرمائی۔ ع ۷

لغت میں فضل کا معنی ہے زیادتی، اس جگہ ثواب اور مراتب قرب کی زیادتی مراد ہے۔ فَضَّلْنٰهُمْ میں هُمْ ضمیر بنی آدم کی طرف لوٹ رہی ہے مگر مراد کل بنی آدم نہیں بلکہ صرف اہل ایمان مراد ہیں۔ آیت وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ میں اَلْمُطَلَّقٰت کا لفظ تمام مطلقہ عورتوں کو شامل ہے، بائنہ ہوں یا رجعیہ، لیکن اس سے آگے وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ میں هُنَّ ضمیر اَلْمُطَلَّقٰت کی طرف لوٹ رہی ہے، مگر عام مطلقات کی طرف نہیں بلکہ صرف وہ عورتیں مراد ہیں جن کو رجعی طلاق دی گئی ہو، آیت مذکورہ بالا میں صرف مومن اس وجہ سے مراد ہیں کہ کافروں کو اللہ نے دوسری مخلوق پر برتری نہیں عطا فرمائی، کافر تو اللہ کے نزدیک بدترین اور ذلیل ترین مخلوق ہیں، اللہ نے ان کو شَرُّ الْبَرِيَّةِ (بدترین خلق) قرار دیا ہے۔ ظاہر آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ نے انسان کو کل مخلوق پر برتری نہیں عطا فرمائی بلکہ کثیر مخلوق سے افضل بنایا ہے۔ اس موضوع پر علماء کے اقوال میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ملائکہ پر انسان کو فضیلت نہیں دی گئی، باقی مخلوق سے انسان کو افضل بنایا گیا ہے۔ کلبی نے کہا سوائے چند ملائکہ کے باقی فرشتوں سے بھی انسان کو برتری حاصل ہے، جبرئیل،

میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت کے علاوہ سب پر انسان کو فضیلت دے دی گئی ہے۔ کچھ لوگ ہیں کہ آیت میں لفظ کثیر سے کل مراد لیتے ہیں یعنی تمام ملائکہ پر بھی انسان کو فضیلت دی گئی ہے، ایسا استعمال دوسری آیت میں بھی ہوا ہے وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ میں اکثر سے مراد کل لوگ ہیں۔ اس مضمون کی تائید حضرت جابرؓ کی روایت کردہ مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جب اللہ نے آدم کو اور ان کی ذریت کو پیدا کر دیا تو فرشتوں نے عرض کیا اے رب تو نے ان کو پیدا کر دیا (اس طرح اور ان طاقتوں کے ساتھ کہ) وہ کھائیں گے، پئیں گے عورتوں سے صنفی قربت کریں گے اور سواریوں پر سوار ہوں گے، پس ان کے لئے تو دنیا (کے عیش) کر دے اور ہمارے لئے آخرت خاص کر دے، اللہ نے فرمایا جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور اس کے اندر اپنی روح کا کچھ حصہ پھونکا، اس کو میں اس مخلوق کی طرح نہیں کروں گا جس کو پیدا کرنے کے لئے میں نے کن کہا اور وہ ہو گئی۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

تحقیقی فیصلہ

عام مومن یعنی صالح مومن جو اللہ کے ولی ہیں عام ملائکہ سے افضل ہیں اور جو مومن گنہگار ہیں اولیاء نہیں ہیں تو گناہوں سے پاک صاف ہو جانے کے بعد عام فرشتوں سے افضل بنا دیئے گئے ہیں کیونکہ گناہوں سے صفائی توبہ کے ذریعہ سے بھی ہوتی ہے اور بغیر توبہ کے مغفرت کے ذریعے سے بھی اور بقدر گناہ سزا پا جانے کے بعد بھی ہوتی ہے، بہر حال صفائی کے بعد ان کو بھی اولیاء کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا اور جنت میں ان کا داخلہ ہو جائے گا......... اس طرح ان کو بھی عام فرشتوں سے برتری حاصل ہو جائے گی، رہے خاص مومن یعنی انبیاء تو وہ تمام خاص ملائکہ سے بھی افضل ہیں دیکھو اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے وہ سب مخلوق سے بہتر ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن اللہ کے نزدیک ان ملائکہ سے بھی جو اس کے پاس ہیں زیادہ عزت والا ہے کذا ذکرہ البغوی۔ ابن ماجہ کی روایت میں اس طرح آیا ہے مومن (یعنی نفس مومن خواہ کسی درجہ کا ہو) اللہ کے نزدیک بعض ملائکہ سے زیادہ عزت والا ہے۔[1]

حضرت مفسر نے فرمایا آیت مذکورہ میں کثیر کا لفظ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں بعض ملائکہ کا لفظ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ بعض مومنین یعنی انبیاء کو تمام ملائکہ پر فضیلت نہیں دی گئی ہے، ہاں بطور مفہوم یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کثیر مخلوق پر بنی آدم کو فضیلت دی گئی اور انبیاءؑ بھی بنی آدم ہیں ان کو بھی کثیر مخلوق پر برتری عطا کر دی گئی۔ سب مخلوق پر فضیلت نہیں دی گئی، یعنی کل ملائکہ پر فضیلت نہیں عطا کی گئی، مگر یہ نفی کل، مفہوم مخالف کے طور پر مترشح ہو رہی ہے اور ہمارے نزدیک مفہوم مخالف غیر معتبر ہے اور یہاں تو یقیناً مفہوم مخالف مراد ہی نہیں ہے کیونکہ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ میں اَلْبَرِيَّةِ کا لفظ تمام مخلوق کو شامل ہے جس میں خواص ملائکہ بھی داخل ہیں۔ حقیقت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمام مومنوں کو یعنی ہر مومن کو کثیر مخلوق پر فضیلت عطا کی ہے (یعنی استغراق مجموعی نے مراد ہے استغراق افرادی، اس صورت میں مطلب واضح ہے کہ ہر فرد مومن کو کثیر مخلوق پر برتری عطا کی گئی ہے عام مومن کو عام ملائکہ پر اور خاص مومن کو خاص

[1] شاید حضرت مفسرؒ سے اس جگہ کچھ تسامح ہوا کہ آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ کو انبیاءؑ کی فضیلت عامہ کے ثبوت میں پیش کیا، یہ آیت انبیاءؑ کے لئے مخصوص نہیں، اس میں تمام مومنین صالحین شامل ہیں، انبیاء ہوں یا اولیاء، مومن صالح تو ولی بھی ہوتا ہے۔ پھر حضرت مفسر نے تائید میں جو دو حدیثیں نقل کی ہیں، ان میں بھی صرف انبیاءؑ کا ذکر نہیں ہے یہ تو ہو سکتا ہے کہ مومن سے مراد مومن صالح ہو۔ قرینہ عبارت یہی بتا رہا ہے لیکن انبیاءؑ کی خصوصیت تو احادیث میں بھی مذکور نہیں، اولیاء بھی تو مومن صالح ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ حضرت مفسر کے نزدیک تو اَلْمُؤْمِنِيْنَ سے مراد جنس مومن ہے جس میں گناہ گار مومنوں کا بھی شمول ہے مومن معصوم یا غیر معصوم، تائب یا غیر تائب، عاصی یا غیر عاصی کسی کا بھی ذکر نہیں۔ نفس مومن سب ہی ہیں۔ (مترجم)

ملائکہ پر بھی)۔

اہل سنت کے عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے کہ خاص خاص انسان ہر فرشتے پر فضیلت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ خاص ملائکہ سے بھی افضل ہیں۔ ملائکہ پر مومنوں کی برتری کا سبب یہ ہے کہ بہائم میں شہوت (یعنی جذبہ) ہے عقل (یعنی حواس سے بالاتر فہم کی طاقت) نہیں ہے اور ملائکہ میں عقل ہے شہوت نہیں ہے ان کی سرشت ہی طاعت پر ہوئی ہے (کوئی داعی معصیت ان کے اندر موجود ہی نہیں ہے) اور انسان کے اندر عقل بھی ہے اور شہوت بھی۔ اب جو عقل سے راہ راست اختیار کرتا اور فرماں بردار بن جاتا ہے اور شہوت کا عقل سے مقابلہ کرتا ہے وہ حقیقت میں راہ خدا کا مجاہد ہے (داعی معصیت کو رد کر دینا ہی مجاہدہ ہے) اور مجاہدین کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ اور جو عقل کو بے کار چھوڑ کر تقاضاء شہوت کو پورا کرتا ہے اور دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے ایسے (مفلوج العقل) لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ چوپایوں سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہیں (چوپایوں کے پاس تو شہوت سے روکنے والی عقل موجود ہی نہیں ہے وہ تو فطرتاً معذور ہیں اور ہوا پرست انسانوں کے پاس عقل فطری ہے) اور عقل سے یہ لوگ کام نہیں لیتے۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ جس روز ہم تمام آدمیوں کو ان کے امام کے ساتھ طلب کریں گے۔ یعنی یاد کرو اس دن کو یا اس روز لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ جب سب لوگوں کو ہم حساب فہمی کے لئے طلب کریں گے۔

مجاہد اور قتادہ نے کہا امام سے مراد ہے ہر امت کا نبی۔ ابو صالح اور ضحاک نے کہا وہ الٰہی کتاب مراد ہے۔ جو ہر امت کو دی گئی تھی۔ ابن مردویہ نے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہر امت کو ان کے امام اور ان کے رب کی کتاب کے ساتھ طلب کیا جائے گا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ امام سے مراد ہے ہر قوم کا وہ امام وقت جو اپنی قوم کو گمراہ کرتا یا ہدایت کی طرف بلاتا تھا، اللہ نے دونوں کے متعلق ائمہ کا لفظ فرمایا ہے ایک آیت ہے وَجَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا یعنی اَئِمَّةُ هُدًى۔ دوسری آیت ہے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ یعنی ائمہ ضلالت۔ بعض نے کہا امام سے مراد ہے (باطل فرضی) معبود۔ سعید بن میسب نے کہا ہر قوم اپنے سردار کے پاس جمع ہو گی، خیر کا سردار ہو یا شر کا۔ حسن اور ابو العالیہ نے کہا امام سے مراد ہیں وہ اعمال جو زندگی میں انسان پہلے ہی بھیج دیتا ہے۔ قتادہ نے کہا آیت جاریہ ہے کہ امام سے مراد ہے اعمالنامہ، کتاب کو امام کہا جاتا ہے، اللہ نے فرمایا ہے وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ۔ بعض کے نزدیک امام سے مراد وہ طاقتیں ہیں جو انسان کو غلط یا صحیح عقائد و اعمال پر آمادہ کرتی ہیں۔ محمد بن کعب نے کہا امام اُمّ کی جمع ہے جیسے خِفاف خُف کی یعنی ماؤں کے ناموں کے ساتھ لوگوں کو پکارا جائے گا، اس میں حضرت عیسیٰ کا اکرام و اعزاز اور حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ کی عظمت کا اظہار مقصود ہو گا اور یہ مصلحت بھی ہو گی کہ اولاد زنا رسوا نہ ہونے پائے۔ بِاِمَامِهِمْ کا مطلب یہ ہے کہ جس نبی یا کتاب یا قائد خیر و شر کی پیروی کی ہو گی، اس کی ساتھ پیروی کرنے والے ہوں گے یا اپنے اعمالنامے اور صحیفے ہاتھوں میں اٹھائے ہوں گے یا یہ مطلب ہے کہ امام کے نام کے ساتھ ان کو پکارا جائے گا، مثلاً یوں کہا جائے گا، اے فلاں شخص کی امت اے فلاں شخص کی پیروی کرنے والو، اے فلاں مذہب والو، اے فلاں کتاب والو، اے فلاں فلاں اعمال والو، اے مریم کے بیٹے، اے فاطمہ کے بیٹے وغیرہ۔

فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝

پس جن لوگوں کو ان کے اعمال نامے داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے وہ اپنے اعمالناموں کو پڑھیں گے اور ان کی بالکل حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ فَتِيْلًا (بٹا ہوا) وہ باریک سوتا جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں ہوتا ہے، یا وہ میل کی بتی جو آدمی چٹکی سے بٹ کر پھینک دیتا ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ فتیل برابر بھی ان کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی۔ آیت میں صرف ان

لوگوں کا ذکر کیا گیا جن کے دائیں ہاتھوں میں اعمال نامے دیئے جائیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جن لوگوں کے بائیں ہاتھ میں یا پشت کے پیچھے سے اعمال نامے دیئے جائیں گے (ان کی حالت کچھ اور ہو گی) وہ جب اپنے اعمال نامے پڑھیں گے تو شرمندگی اور حیرت ان پر چھا جائے گی، اتنی کہ زبانوں کو گنگ کر دے گی اور وہ صحیح جواب دینے کے بجائے کہیں گے کاش یہ کتاب مجھ کو نہ دی گئی ہوتی۔ کافروں کا تذکرہ اس آیت میں نہیں نہ ان کے اعمال نامے دینے کا بیان ہے کیونکہ اگلی آیت خود کافروں کی حالت کا اظہار کر رہی ہے۔ فرمایا ہے۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى اور جو شخص اس (دنیا) میں اندھا رہے گا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔

بعض روایات میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ کہ هٰذِهٖ سے مراد ہیں اللہ کی وہ نعمتیں جن کا اظہار اللہ نے رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ سے تفضیلاً تک کیا ہے اور فِي الْاٰخِرَةِ سے مراد آخرت کے معاملے ہیں۔ یعنی اللہ کی ان کھلی ہوئی نعمتوں کو دیکھتے ہوئے جو شخص نابینا رہا وہ آخرت کے معاملے میں تو بہت ہی زیادہ اندھا ہو گا کیونکہ آخرت کو تو اس نے دیکھا ہی نہیں۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک هٰذِهٖ سے دنیا کی طرف اشارہ ہے یعنی جو شخص اس دنیا میں دلائل توحید و حق کو دیکھنے (بچشم عقل معائنہ کرنے) سے نابینا ہے وہ آخرت میں نجات کا راستہ دیکھنے سے تو بہت زیادہ نابینا ہو گا، نجات کا راستہ اس کو بالکل دکھائی نہ دے گا۔

لفظ اعمیٰ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور تفضیلی معنی ہی مراد ہیں۔ یعنی بہت زیادہ اندھا۔

ایک شبہ

(ثلاثی مجرد سے) اسم تفضیل کا صیغہ اَفْعَل کے وزن پر اس وقت آئے گا جب اس کے معنی میں نہ کوئی عیب کا مفہوم ہو نہ رنگ۔ اور اندھا ہونا کھلا ہوا عیب ہے اس لئے اعمیٰ اسم تفضیل کا صیغہ نہیں ہو سکتا اس کا ترجمہ صرف اندھا ہے، زیادہ اندھا ترجمہ غلط ہے۔ اگر رنگ اور عیب والے الفاظ سے ثلاثی مجرد میں اسم تفضیل کا صیغہ بنانا ہوتا ہے تو اَشَدّ یا اَكْثَر کے لفظ کو ملا کر بناتے ہیں مثلاً بہت اندھا کا عربی میں ترجمہ اَشَدُّ عَمًى ہو گا، اعمیٰ نہ ہو گا۔)

جواب

اس جگہ نابینا ہونے سے مراد ہے، دل کا اندھا ہونا کور عقل ہونا اور عقل کی نابینائی معنوی اور باطنی عیب ہے اور جو عیب اسم تفضیل کا صیغہ بنانے سے روکتا ہے وہ ظاہری عیب ہے (پس اعمیٰ سے مراد اگر چشم سر اس کا نابینا ہو تو یہ اسم تفضیل کا صیغہ نہ ہو گا اور اگر چشم قلب کا اندھا ہونا مراد ہو جیسا کہ اس جگہ ہے تو اعمیٰ اسم تفضیل کا صیغہ ہو گا) اعمیٰ کا لفظ اسی طرح تفضیل کا صیغہ ہے جیسے احمق، ابلہ، اجہل وغیرہ (جہالت، بلاہت اور حماقت باطنی عیوب ہیں ان سے اسم تفضیل کے صیغے بنائے جاتے ہیں)

وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۝ اور بہت زیادہ گمراہ۔ یعنی دنیا میں جتنا گمراہ تھا اس سے زیادہ گم کردہ راہ آخرت میں ہو گا۔ نہ استعداد ہدایت یابی ہو گی۔ نہ آلات ہدایت یابی ہوں گے۔ نہ ہدایت یابی کی مہلت ہو گی، دنیا میں تو توبہ قبول ہو سکتی تھی آخرت میں توبہ بھی قبول نہ ہو گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ اندھے سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہو گا۔

ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے بطریق ابن اسحاق بوساطت محمد بن ابی محمد عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ امیہ بن خلف اور ابو جہل بن ہشام اور کچھ دوسرے قریشی جمع ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور عرض کیا محمدؐ تم ہمارے معبودوں کو (تعظیماً ذرا) ہاتھ لگا دو ہم سب تمہارے مذہب میں داخل ہو جائیں گے۔ حضور ﷺ کو اپنی قوم کا مسلمان ہو جانا دل سے مطلوب تھا، اس لئے دل میں کچھ نرمی پیدا ہونے لگی تھی، اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اور یہ کافر لوگ آپ کو اس چیز سے بچلانے ہی لگے تھے جو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعے سے بھیجی ہے۔

مؤلف لباب النقول فی اسباب النزول نے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ کے نزول کے سبب کے متعلق روایت مندرجہ بالا صحیح ترین روایت ہے جس کا سلسلہ سند کھرا ہے اور اس کی تائیدی شہادتیں دوسری روایات سے بھی ملتی ہیں۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیرؒ کے حوالہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ حجر اسود کو چومتے تھے۔ مشرکوں نے کہا ہم آپ کو سنگ اسود کو چومنے نہ دیں گے تاوقتیکہ آپ ہمارے معبودوں کی طرف نہ جھکیں، رسول اللہ ﷺ نے خیال کیا اگر میں ایسا کرلوں تو میرا کیا حرج ہو جائے گا، جب کہ اللہ واقف ہے کہ میں دل سے اس کے خلاف ہوں۔ بغوی نے بھی یہ روایت نقل کی ہے اس روایت کے یہ الفاظ ہیں۔ حجر اسود کو بوسہ کی یہ اجازت دے دیں گے اس کے بعد میں نفرت تو کرتا ہی رہوں گا۔ ابن ابی حاتم نے زہری کی روایت سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے جبیر بن نفیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا اگر آپ کو ہماری ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے تو یہ نچلے کمین لوگ اور غلام جو آپ کے ساتھ ہو گئے ہیں ان کو اپنے پاس سے نکال دیجئے، اس وقت ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے دل میں رسول اللہ ﷺ کچھ ان کی طرف مائل ہو گئے تھے کہ آیت مذکورہ نازل ہو گئی۔

ابن ابی حاتم نے محمد بن کعب قرظی کی روایت ہے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی نماز میں سورۂ النجم تلاوت کی اور اس میں یہ آیت پڑھی اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى اس میں شیطان نے آگے آپ ﷺ پر القاء کر دیا تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى اس پر آیت مذکورۃ الصدر نازل ہوئی، حضور والا برابر غمگین رہنے لگے (کہ یہ کیا الفاظ میری زبان سے بلا اختیار نکل گئے) آخر آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى الخ نازل ہوئی (اس کے بعد آپ کو تسکین خاطر ہوئی)

ان تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے، لیکن کچھ لوگ اس کو مدنی کہتے ہیں اور مندرجہ ذیل واقعہ کو سبب نزول قرار دیتے ہیں۔ ابن مردویہ نے بوساطت عوفی حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس بیان کی نسبت کی ہے کہ ثقیف والوں نے خدمت گرامی میں عرض کیا تھا، ہم کو ایک سال کی مہلت عطا فرما دیجئے (ہمارے معبودوں پر نذریں چڑھائی جاتی ہیں) جب ہمارے قبضہ میں وہ ہدیا اور چڑھاوے آچکیں گے جو لوگ ان پر چڑھاتے ہیں تو ہم مسلمان ہو جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو مہلت دینے کا ارادہ کرلیا اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ اس روایت کی سند ضعیف ہے (اس لئے ناقابل اعتبار ہے)

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف نسبت کر کے یہ قصہ اس طرح لکھا ہے کہ قبیلہ ثقیف کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت تین شرطوں پر کرنے کو تیار ہیں۔ حضور ﷺ نے پوچھا وہ کیا شرطیں ہیں وفد والوں نے کہا، پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نماز کے اندر جھکیں گے نہیں۔ دوسری یہ ہے کہ ہم اپنے بتوں کو اپنے ہاتھوں سے نہیں توڑیں گے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہم لات (پر چڑھائے جانے والے نذرانوں) سے ایک سال تک متمتع اندوز ہوتے رہیں گے۔ البتہ اس کی پوجا نہیں کریں گے، رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا جس (دین کی عبادت) کے اندر رکوع و سجود نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں۔ رہی یہ بات کہ تم اپنے ہاتھ سے اپنے بتوں کو نہیں توڑو گے تو اس کا اختیار تم کو ہے۔ باقی طاغیہ یعنی لات و عزیٰ پر چڑھائے جانے والے نذرانوں سے متمتع اندوز ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ ہماری خواہش ہے کہ عرب یہ سنیں کہ کچھ خصوصی چیز آپ نے ہم کو عطا فرما دی ہے جو دوسروں کو عطا نہیں فرمائی، اب اگر آپ

کو یہ اندیشہ ہے کہ لوگ کہیں گے آپ نے ثقیف والوں کو وہ خاص اجازت دے دی جو دوسروں کو نہیں دی تو آپ جواب میں فرمادیں کہ اللہ نے یہی حکم دیا تھا، حضور ﷺ یہ بات سن کر خاموش ہوگئے..... ان لوگوں نے حضورؐ کے سکوت کو رضامندی سمجھ لیا اور خیال کر لیا کہ آپ ایسا کر دیں گے، اس پر آیت وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ الخ نازل ہوئی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کے بھیجے ہوئے احکام سے نیچے اتار کر آپ کو فتنہ میں مبتلا کرنے کے قریب پہنچ گئے تھے۔

لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ۝ وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝

تاکہ آپ اس کے سوا ہماری طرف غلط بات کی نسبت کریں ایسی حالت میں آپ کو گاڑھا دوست بنا لیتے اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو آپ ان (کے مقصد) کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے۔ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا کہ آپ ہم پر وہ بات باندھ دیں جو ہم نے وحی کے ذریعے سے آپ کے پاس نہیں بھیجی۔ اِذًا اس وقت یعنی جب ایسا کر گزرتے تو وہ آپ کو اپنا رفیق بنا لیتے۔ وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ اور اگر ہم آپ کو حق پر ثابت قدم نہ رکھتے اور جمائے نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کے مقصد کو ماننے کی طرف کسی قدر مائل ہو جاتے کیونکہ ان کا فریب سخت اور مکر شدید تھا اور آپ کو ان کے مسلمان ہو جانے کی بہت زیادہ خواہش تھی لیکن ہماری طرف سے آپ کا بچاؤ کر دیا گیا اور آپ ان لوگوں کے مقصد کی طرف مائل ہونے کے قریب سے بھی بچ گئے، مائل ہو جانا تو بجائے خود رہا شَيْئًا قَلِيلًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ بجائے خود صلاح واستقامت کی استعداد رسول اللہ ﷺ کے اندر اتنی کامل تھی کہ اگر اللہ کی طرف سے عصمت واجبہ نہ بھی ہوتی اور اللہ آپ کو ہر شر سے بچانے کا فیصلہ نہ بھی کر دیتا، تب بھی آپ کی فطرت سلیم اگر گناہ کی طرف مائل ہوتی تو بہت ہی کم میلان ہوتا اور یہ ضروری نہیں کہ گناہ کی طرف ادنیٰ جھکاؤ ہونے کے بعد گناہ کا صدور ہو ہی جاتا اور اب تو احتمال ہی نہیں رہا کہ گناہ کی طرف مائل ہونے کے قریب بھی آپ پہنچ سکتے۔

إِذًا لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ۝

اور اگر ایسا ہوتا تو ہم آپ کو حالت حیات میں اور بعد موت کے دہرا عذاب چکھاتے پھر آپ کو ہمارے مقابلہ میں اپنے لئے کوئی مددگار بھی نہ ملتا۔

یعنی اگر آپ ان کی طرف مائل ہونے کے قریب بھی پہنچ جاتے تو دنیا اور آخرت میں ہم دوسروں سے دوگنے عذاب کا مزہ آپ کو چکھاتے۔ مقصد یہ کہ اس فعل کے مجرموں کو جتنا عذاب ہوگا اس سے دوگنا عذاب آپ پر ہوتا، بڑے مرتبے والے کی تھوڑی فروگذاشت بھی بڑی ہوتی ہے۔ عذاب حیات سے مراد ہے عذاب دنیوی اور عذاب ممات سے مراد ہے مرنے کے بعد کا عذاب۔ بعض علماء کے نزدیک ضِعْفَ الْحَيَاةِ سے عذاب آخرت اور ضِعْفَ الْمَمَاتِ سے مراد عذاب قبر ہے۔

بیہقی نے دلائل میں اور ابن ابی حاتم نے بروایت شہر بن حوشب، عبدالرحمن بن غنم کا بیان نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا اگر آپ نبی ہیں تو شام کو جائیے وہ انبیاءؑ کی سرزمین ہے اور محشر کا مقام بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے قول کی تصدیق کی اور غزوۂ تبوک (سرحد شام) پر تشریف لے گئے۔ تبوک جانے سے آپ کا مقصد شام کو جانا تھا جب تبوک کو پہنچ گئے تو سورۂ بنی اسرائیل کی مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں۔

وَإِن كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا اور وہ لوگ اس سرزمین سے آپ کے قدم ہی اکھاڑنے لگے تھے تاکہ آپ کو یہاں سے نکال دیں۔

پھر اللہ نے مدینہ کو واپس جانے کا حکم دیا۔ جبرئیل نے کہا اپنے رب سے کچھ مانگو ہر نبی کا کوئی ایک سوال قبول ہی کیا جاتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا مجھے مشورہ دیجئے میں کیا دعا کروں، حضرت جبرئیل نے کہا کہئے قُل رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ

صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۔ اس آیت کا نزول شام سے مدینہ کو واپس آنے کے زمانے میں راستہ میں ہوا۔ یہ روایت مرسل اور ضعیف ہے، لیکن ابن ابی حاتم نے سعید بن زبیر کی مرسل روایت اس کی تائید میں نقل کی ہے۔ سعید بن جبیر کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے۔ مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، انبیاء تو شام میں رہتے تھے آپ مدینہ میں کیسے ہیں۔ (یہ بات سن کر) رسول اللہ ﷺ نے مدینہ سے (بالکل) روانہ ہو جانے کا ارادہ کر لیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن جریر کی ایک اور مرسل روایت میں مشرکوں کی جگہ یہودیوں کا لفظ آیا ہے۔ بغوی نے کلبی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینے میں تشریف فرما ہوئے تو یہودیوں کو جلن کی وجہ سے آپ کا مدینہ میں قیام ناگوار ہوا اور انہوں نے عرض کیا ابو القاسم آپ واقف ہیں کہ یہ انبیاء کی سرزمین نہیں ہے انبیاء کی سرزمین تو شام ہے وہ مقدس زمین ہے، وہیں پر ابراہیم اور دوسرے انبیاء رہتے تھے، اگر آپ بھی انہی کی طرح نبی ہیں تو شام کو چلے جائیے آپ جو شام کی سکونت پسند نہیں کرتے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کو رومیوں سے ڈر لگتا ہے (اور روم کی شام میں حکومت ہے) لیکن اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو اللہ رومیوں سے آپ کی ضرور حفاظت کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینے سے نکل کر تین میل کے فاصلے پر اور بقول بعض ذی الحلیفہ میں لشکر گاہ قائم کی تاکہ آپ کے صحابی وہاں جمع ہو جائیں (اور سب تبوک یا شام کی طرف روانہ ہو جائیں) اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مجاہد اور قتادہ کے قول پر یہ آیت مکی ہے اور اَلْاَرْض سے مراد مکہ ہے، مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے نکال دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر اللہ نے اپنی قدرت سے ان کو روک دیا آخر کار خود ہی ہجرت کا حکم نازل فرما دیا اور آپ نے مدینہ کو ہجرت کر لی۔ بغوی نے کہا یہ قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس سے پہلے مکے والوں ہی کا حال بیان فرمایا ہے اور سورت بھی مکی ہے۔ یہ قرینہ اس آیت کو مکی قرار دے رہا ہے۔ بعض نے کہا نہ یہودیوں کے ساتھ اس آیت کی تخصیص ہے نہ مشرکوں کے ساتھ بلکہ سارے کافر مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو سرزمین عرب سے اکھاڑ کر باہر نکال پھینکنا چاہتے تھے مگر اللہ نے ان کو ناکام کر دیا اور اپنے رسول کو محفوظ رکھا۔

وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۷۶﴾ اور ایسی صورت میں (جب کہ وہ آپ کو ابھار کر مدینہ سے نکال دیتے) وہ بھی بس تھوڑی مدت آپ کے پیچھے یہاں ٹھیرتے زیادہ نہ ٹھیر سکتے اللہ ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتا۔ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ جس بات کی پیشین گوئی آیت میں کی گئی ہے ایسا ہو بھی گیا۔ مدینہ کے یہودیوں میں سے بنی قریظہ کو قتل کر دیا گیا اور بنی نضیر کو جلاوطن کر دیا گیا اور حضرت عمرؓ کی خلافت میں خیبر کے یہودیوں کو بھی نکال دیا گیا اور مکہ سے رسول اللہ ﷺ کے نکل آنے کے بعد مشرکین مکہ کو بدر میں قتل کر دیا گیا بالآخر تمام غیر مسلموں کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کر دیا گیا۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ایسا واقع نہیں ہوا اگر وہ رسول اللہ ﷺ کو ابھار کر مدینہ سے نکال دیتے تو ان کو بھی جڑ سے اکھاڑ دیا جاتا۔ ۸۶۷

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا ﴿۷۷﴾

اور یہی ہمارا ان لوگوں کے ساتھ قاعدہ رہا ہے جن کو آپ سے پہلے ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا تھا، اور آپ ہمارے اس قاعدے میں تغیر نہیں پائیں گے۔ یعنی اللہ نے یہ طریقہ جاری کر دیا ہے کہ جس امت نے اپنے پیغمبر کو اپنے اندر سے نکال باہر کر دیا، اللہ نے بھی اس امت کو تباہ کر دیا اور چونکہ اللہ کا یہ طریقہ عمل پیغمبروں کی وجہ سے جاری تھا اور آپ بھی پیغمبر ہیں اس لئے اگر آپ کے ساتھ بھی وہ لوگ ایسا سلوک کرتے تو اللہ بھی ان کو تباہ کر دیتا۔ تحویل کا معنی ہے تغیر و تبدل۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ دلوک آفتاب کے وقت نماز قائم کرو۔ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ، عطاء، قتادہ، حسن بصری اور اکثر علماء تابعین کے نزدیک دلوک کا اس جگہ معنی ہے زوال، سورج

ڈھلنا۔ ابن مردویہ نے حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کی طرف اس تفسیر کی نسبت کی ہے۔ ابن مردویہ اور بزار نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے اس کو مرفوع کہا ہے لیکن دلوک سے مراد زوال ہونے کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس لفظ سے ہوتی ہے جو حضرت ابو مسعود انصاری کی روایت سے اسحاق بن راہویہ نے مسند میں اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں اور بیہقی نے المعرفۃ میں نقل کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیلؑ دلوک آفتاب کے وقت جب سورج ڈھل گیا تھا، میرے پاس آئے اور مجھے ظہر کی نماز پڑھائی۔ الحدیث

دَلْک کا لغوی معنی ہے ملنا، زوال کے وقت سورج کی طرف دیکھنے والا شعاعوں کی تاب نہیں لاتا اور آنکھوں کو ملتا ہے اس لئے دلوک کا معنی ہو گیا زوال۔

بعض علماء کے نزدیک دلوک سے مراد ہے غروب۔ بغوی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول بیان کیا کہ دلوک کا معنی ہے غروب۔ ابراہیم نخعی، مقاتل بن حیان، ضحاک اور سدی کا یہی قول ہے۔ لفظ دلوک کا مفہوم لغوی (جھکنا، ایک طرف کو میلان) زوال کو بھی شامل ہے اور غروب کو بھی، سورج کا جھکاؤ دونوں اوقات میں ہوتا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے دَلَکَتِ الشَّمْسُ دُلُوْکًا سورج ڈوب گیا، زرد پڑ گیا، وسط آسمان سے ڈھل گیا۔ بیضاوی نے لکھا ہے اس لفظ کی اصل ساخت انتقال کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے، دلک مالش کرنے کو بھی اسی لئے کہتے ہیں کہ مالش کرنے والے کا ہاتھ ایک جگہ رکتا نہیں۔ جس لفظ کا پہلا حرف دال اور دوسرا حرف لام ہو اس کے معنی میں انتقال کا مفہوم ضرور ہوتا ہے خواہ تیسرا حرف کوئی ہو جیسے دلج، دلح، دلف، دلہ۔ بغوی نے کہا اول الذکر قول کے قائل بکثرت علماء ہیں اس لئے وہی قابل ترجیح ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر دلوک سے مراد زوال لی جائے تو اس آیت کے اندر نماز کے پانچوں اوقات مجملاً آجائیں گے دلوک شمس سے غسق اللیل تک چار نمازیں اور قرآن الفجر پانچویں نماز۔

اِلٰى غَسَقِ الَّیْلِ رات چھا جانے تک، یعنی شفق کے غائب ہو جانے اور تاریکی بھر جانے کے وقت تک۔ غسق کا معنی ہے بھر جانا۔

قاموس میں ہے غسق شروع رات کی تاریکی۔ غاسق چاند یا رات جب کہ شفق غائب ہو گئی ہو۔ اس آیت میں مجملاً مبہماً چار نمازوں کا ذکر آ گیا، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور وقت فجر کا ذکر آگے کے فقرہ میں کر دیا۔

وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اور فجر کا قرآن یعنی فجر کی نماز، قرآن کی قرات نماز کا جزء اہم ہے، اس لئے صلوٰۃ فجر کی تعبیر قُرْاٰنَ الْفَجْرِ سے کر دی گئی، جیسے رکوع یا سجود بول کر پوری نماز مراد ہو جاتی ہے کیونکہ یہ دونوں اجزاء صلوٰۃ بھی بہت اہم ہیں۔ سورہ نساء کی آیت اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے اوقات نماز کا ذکر کر دیا ہے۔

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا بے شک فجر کی نماز فرشتوں کے حاضر ہونے کا وقت ہے۔ فجر کے قرآن کے وقت رات کے اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ شہود حاضر ہونا۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے، میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جماعت کی نماز تنہا نماز پر پچیس گنا فضیلت رکھتی ہے اور نماز فجر میں رات کے ملائکہ اور دن کے ملائکہ جمع ہو جاتے ہیں۔ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا اگر تم اس کا ثبوت قرآن سے چاہتے ہو تو پڑھو وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (رواہ البخاری وغیرہ)

بیضاوی نے لکھا ہے، صلوٰۃ الفجر کو مشہود کہنے کی یا یہ وجہ ہے کہ اس وقت قدرتی شواہد بہت نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں تاریکی پھٹ کر روشنی نکل آتی ہے اور نیند جس کو اخ الموت کہا گیا ہے، بیداری سے بدل جاتی ہے، یا مشہود کہنے کی یہ وجہ ہے کہ بہت نمازی اس میں حاضر ہوتے ہیں یا اس طرف اشارہ ہے کہ کثیر جماعت کو اس میں حاضر ہونا چاہئے۔

بعض علماء نے آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا ہے نماز کو یعنی مغرب کی نماز کو قائم کرو، غروب آفتاب کے

بعد) سے لے کر غَسَقِ الَّیْلِ یعنی شفق کے غائب ہونے تک۔ اس تفسیر پر آیت میں وقت مغرب کی ابتدا اور انتہا کا بیان
ہو جائے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ مغرب کا وقت شفق کے ڈوبنے تک باقی رہتا ہے، گویا پوری آیت میں اللہ نے دو
نمازوں کا حکم دیا مغرب اور فجر اور (چونکہ یہ دونوں نمازیں دن اور رات کے دونوں کناروں کے اوقات میں واقع ہیں اس لئے) یہ
دونوں زیادہ اہم ہیں۔

وَمِنَ الَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ ﴾ اور رات کے کچھ حصہ میں تہجد کی نماز پڑھو جو
تمہارے لئے زائد چیز ہے۔ یعنی نماز کے لئے نیند کو ترک کر دو۔ بِہٖ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے (اور قرآن سے مراد
ہے نماز) صاحب قاموس نے لکھا ہے ہَجَدَ ہُجُوداً (ثلاثی مجرد) اور تَہَجَّدَ (باب تفعل) سو گیا اور بیدار ہو گیا دونوں معنی
کے لئے مستعمل ہے، لغات اضداد میں سے ہے۔ ہَجَّدَ تَہْجِیداً (باب تفعیل) بیدار کر دیا اور سلا دیا یہ بھی اضداد میں سے
ہے۔ اَہْجَدَ (باب افعال) ہَجَدَ کی طرح سو گیا اور سلا دیا (لازم بھی ہے اور متعدی بھی) حاصل بیان یہ ہے کہ جیم کی تشدید
اگر (سلب ماخذ اور) ازالہ کے لئے قرار دی جائے تو نیند کو زائل کرنا اور بیدار ہونا مراد ہوگا اور اگر متعدی بنانے کے لئے قرار دی
جائے تو سلا دینے کا معنی ہوگا۔

بغوی نے لکھا ہے تہجد جب بیدار ہو جانے کو کہتے ہیں تو یہ سونے کے بعد ہی ہوگا۔ (رات بھر جاگتے رہنے اور نمازیں
پڑھنے کو تہجد نہیں کہا جائے گا) میں کہتا ہوں جب تہجد سے مراد ہے نماز کے لئے نیند کو ترک کرنا تو اس کی تینوں صورتیں
ہو سکتی ہیں۔ بالکل رات کو نہ سونا اور نماز پڑھتے رہنا، شروع رات میں بیدار رہ کر نماز پڑھنا، سو جانا اور پھر بیدار ہو کر نماز پڑھنا۔
موخر الذکر صورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے، ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روزے رکھتے رہے اور آپ
نے رات کو کبھی اٹھ کر ہم کو نماز نہیں پڑھائی جب (آخری عشرہ کی) سات راتیں باقی رہ گئیں (یعنی چوبیسویں رات آئی) تو آپؐ
ہم کو لے کر نماز کو کھڑے ہوئے یہاں تک کہ نماز میں ایک تہائی رات گزر گئی۔
دوسری رات یعنی (تمیں کی طرف سے شمار کرنے میں) چھٹی رات ہوئی تو آپ نہیں اٹھے (تمیں کی طرف سے الٹی
گنتی کرنے میں) پانچویں رات آئی تو پھر آپ ہم کو لے کر نماز کو کھڑے ہوگئے، یہاں تک کہ آدھی رات گزر گئی۔ میں نے
عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کاش حضور ﷺ ہم کو ساری رات یہ نفل نماز پڑھاتے فرمایا آدمی جب امام کے ساتھ نماز پڑھ کر واپس
ہو جاتا ہے تو پوری رات کا قیام اس کے حساب میں لکھ دیا جاتا ہے جب چوتھی رات (یعنی تیسویں کی طرف سے گنتی کرنے کے
بعد جو چوتھی رات پڑتی ہے) ہوئی تو آپ نے ہم کو نماز نہیں پڑھائی یہاں تک کہ مہینہ میں تین راتیں رہ گئیں تو تیسری رات کو
آپ ﷺ نے سب گھر والوں کو اور بیویوں کو اور دوسرے لوگوں کو جمع کیا اور ہم کو لے کر نماز کو کھڑے ہوگئے (اور اتنی طویل نماز
پڑھائی) کہ ہم کو فلاح کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ راوی نے حضرت ابوذرؓ سے دریافت کیا، فلاح سے کیا مراد۔ فرمایا
سحری۔ اس کے بعد (باقی دونوں راتوں کو) آپؐ نے نماز نہیں پڑھائی، رواہ اصحاب السنن۔ ترمذی کی روایت میں ایک لفظ کا تغیر
ہے۔

سائب بن یزید نے بیان کیا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت تمیم داریؓ کو حکم دیا کہ لوگوں کو جماعت
سے گیارہ رکعتیں پڑھائیں۔ (حسب الحکم) امام (نماز میں) پڑھتا تھا اور اس حد تک طول قیام کرتا تھا کہ ہم لاٹھی کا سہارا لیتے تھے
اور فجر کے آثار نمودار ہونے کے وقت فارغ ہوتے تھے، رواہ مالک فی الموطا۔

حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے تھے ہم رمضان میں نماز شب سے ایسے وقت فارغ ہوتے تھے کہ خادم صبح ہو جانے کے
اندیشے سے جلد جلد کھانا تیار کرتا تھا۔ رواہ مالک۔ رسول اللہ ﷺ صبح کے قریب تک سفر جاری رکھتے تھے (یعنی سواری پر صبح کے
قریب تک نفلیں پڑھتے رہتے تھے)

حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں آیا ہے کہ سفر کی حالت میں رسول اللہ ﷺ اونٹنی پر ہی رات کی نماز پڑھتے تھے، اونٹنی کا

رخ جدھر کو ہوتا (پرواہ نہیں کرتے) اور (رکوع سجود کے لئے) اشارہ کرتے تھے۔ وتر بھی اونٹنی پر ہی پڑھتے تھے ہاں فرائض کے لئے اونٹنی روک کر نیچے اترتے تھے۔ صحیحین۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لوگوں کی شروع رات کی نماز نفس کو خوب مرتاض بنانے والی ہوتی ہے، کیونکہ سونے کے بعد آدمی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کب بیدار ہوگا۔ البتہ آخر رات میں تہجد پڑھنے کا ثواب شروع رات میں پڑھنے سے زیادہ ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رات کا تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو ہمارا رب ہر رات آسمانِ دنیا کی طرف نزولِ رحمت فرماتا ہے۔ (الحدیث)

عبدالرحمن بن عبدالقاری نے بیان کیا ہے کہ میں حضرت عمرؓ کے ساتھ ایک رات رمضان کے مہینہ میں مسجد کی طرف گیا، کچھ لوگ الگ الگ متفرق نمازیں پڑھ رہے تھے اور بعض لوگ ایک چھوٹے سے گروہ کو ساتھ لے کر جماعت کر رہے تھے، حضرت عمرؓ نے فرمایا، اگر میں ان سب کو ایک قاری کی امامت پر جمع کردوں تو بہت ہی اچھا ہوگا، چنانچہ آپ نے حضرت ابی بن کعبؓ کو سب کا امام بنادیا۔ پھر ایک اور رات جو آپ کے ساتھ مسجد کی طرف گیا تو دیکھا کہ لوگ اپنے قاری کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ نئی بات اچھی ہے۔ لوگ رات کے ابتدائی حصہ میں نماز پڑھ کر سو جایا کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے فرمایا جس نماز سے تم سو جایا کرتے ہو (یعنی آخر شب میں بیدار ہو کر نماز نہیں پڑھتے) وہ اس نماز سے بہتر ہے، جو تم پڑھتے ہو (یعنی شروع رات کی نماز سے آخر رات کی نماز افضل ہے) رواہ البخاری۔

مسئلہ

شروع میں رات کی نماز رسول اللہ ﷺ پر بھی فرض تھی اور امت پر بھی، اللہ نے فرمایا تھا یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَهٗ الخ پھر حکم میں تخفیف کردی گئی اور پنج وقتی نماز کی وجہ سے رات کی نماز کی فرضیت امت کے سر سے ساقط کردی گئی۔ البتہ نماز شب مستحب رہ گئی۔ اللہ نے فرمایا فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ۔ کیا تہجد کی نماز رسول اللہ ﷺ پر فرض رہی یا آپ کے لئے بھی فرضیت منسوخ ہوگئی، اس مسئلہ میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر تہجد کا وجوب قائم رہا، منسوخ نہیں کیا گیا، حضرت عائشہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں مجھ پر فرض ہیں اور تمہارے لئے سنت۔ وتر، مسواک اور نماز شب (تہجد) اس قول پر آیت میں تہجد کا حکم وجوبی ہوگا اور نَافِلَةً لَّكَ کا یہ معنی ہوگا کہ تم پر یہ مزید فرض ہے (دوسروں پر نہیں ہے) میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ تہجد کی فرضیت رسول اللہ ﷺ سے بھی ساقط کردی گئی تھی اور آپ کے لئے تہجد کی نماز مستحب ہوگئی تھی، آیت کا صراحۃً یہی مفہوم ہے، کیونکہ اگر نَافِلَةً کا معنی مزید فرض ہوتا تو لَکَ کی جگہ عَلَیْکَ (تم پر) کہا جاتا وجوب کے بعد عَلٰی آتا ہے، لام نہیں آتا۔

ایک شبہ

تہجد کی نماز نفل تو سب ہی کے لئے ہے پھر آیت میں خصوصیت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا ہی ذکر کیوں کیا گیا۔

ازالہ

نوافل سے گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے، یہ حکم ساری امت کے لئے عام ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ معصوم تھے، آپ مرتکب گناہ نہیں ہوسکتے تھے۔ رہیں وہ لغزشیں جن کو ذنوب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے وہ بھی تمام اگلی پچھلی اللہ نے معاف فرمادی تھیں، اب آپ کے نوافل کا کفارۂ گناہ بننا تو ممکن ہی نہیں، ہاں آپ کی یہ خصوصیت تھی کہ تہجد جو آپ کے لئے بھی نافلہ تھی وہ صرف آپ کے لئے ترقی درجات کا ذریعہ تھی (نہ کہ معافی گناہ کا۔ اسی لئے آپ ﷺ کے لئے تہجد کو نافلہ خصوصیت کے ساتھ قرار دیا گیا)

رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی تہجد کا نفل ہونا حضرت مغیرہؓ کی روایت کردہ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے، حضرت مغیرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس قدر قیام شب کیا کہ آپ کے قدموں پر ورم آگیا، عرض کیا گیا، حضورؐ کو ایسا کرنے کی کیا

ضرورت، اللہ نے آپ کو تو اگلی پچھلی ساری لغزشیں معاف فرمادی ہیں۔ فرمایا، کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ حضور ﷺ نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ میرے اوپر قیام شب فرض ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ سفر میں رسول اللہ ﷺ علاوہ فرائض کے باقی نمازیں اونٹنی پر سوار ہونے کی حالت میں پڑھتے رہتے تھے، یہاں تک کہ وتر بھی سواری پر ہی پڑھتے تھے، اونٹنی کا رخ جس طرف کو ہوتا (کچھ پروانہ کرتے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ تہجد کی نماز کے لئے بھی اونٹنی سے نہیں اترتے تھے اور تہجد آپ کے لئے بھی نفل تھا فرض نہ تھا)

مسئلہ

امت کے لئے تہجد سنت ہے۔ کیا سنت موکدہ ہے یا مستحب، میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ تہجد سنت موکدہ ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ اس کو پابندی سے ادا کیا۔ حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک شخص کا ذکر کیا گیا اور بیان کیا گیا کہ وہ صبح تک برابر سوتا رہا (تہجد کے لئے) نماز کو نہیں اٹھا، فرمایا، اس کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا۔ متفق علیہ۔ اگر تہجد سنت موکدہ نہ ہوتا تو اس کو ترک کرنے والا عتاب اور ملامت کا مستحق نہ قرار پاتا۔ تارک مستحب مستحق ملامت نہیں ہوتا۔

رسول اللہ ﷺ کے تہجد کی کیفیت

حضرت زید بن خالد جہنیؓ کا بیان ہے میں رات کو رسول اللہ ﷺ کی نماز کو غور سے دیکھنا چاہتا تھا اس لئے حضور کے دروازے کی دہلیز پر تکیہ لگائے دیکھتا رہا، آپ اٹھے اور دو خفیف رکعتیں پڑھیں، پھر دو طویل رکعتیں پڑھیں دو طویل رکعتیں، دو طویل رکعتیں پھر دو رکعتیں پڑھیں جو اس سے پہلے والی رکعتوں سے کم تھیں پھر دو رکعتیں جو ان سے بھی چھوٹی تھیں پھر دو رکعتیں پڑھیں جو ان سے بھی کم تھیں اس کے بعد وتر پڑھے یہ کل تیرہ رکعتیں ہوئیں۔ رواہ مسلم۔ بغوی نے اسی طرح نقل کیا ہے لیکن صاحب مشکوٰۃ نے پھر دو رکعتیں پڑھیں جو پہلی والی رکعتوں سے چھوٹی تھیں۔ یہ الفاظ چار بار نقل کئے ہیں (اس طرح کل رکعتیں پندرہ ہو جائیں گی) مشکوٰۃ میں یہ روایت کتاب الحمیدی اور موطا مالک اور سنن ابو داؤد اور جامع الاصول سے لی گئی ہے اس صورت میں وتر سے مراد ایک رکعت ہو گی اور بغوی کی روایت میں تین وتر مراد ہوں گے، غرض کل رکعات تیرہ ہی رہیں گی۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رمضان اور غیر رمضان سب میں رسول اللہ ﷺ (رات کی نماز) گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے پہلی چار رکعتوں کی خوبی اور طول کا حال تو کیا کہنے پھر دوسری چار رکعتوں کی خوبی اور طول بھی ناقابل بیان ہے پھر تین رکعتیں پڑھتے تھے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا وتر پڑھنے سے پہلے آپ سو جاتے ہیں، فرمایا، عائشہؓ میری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا۔ رواہ البخاری و مسلم۔

حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد فجر تک رات میں رسول اللہ ﷺ گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے، اور آخر میں ایک رکعت پڑھتے تھے اور دو سجدے کرتے تھے۔ جن کی مقدار سر اٹھانے سے پہلے اتنی ہوتی تھی کہ آدمی پچاس آیات پڑھ لے۔ اور موذن اذان فجر کہہ کے جب خاموش ہو جاتا اور فجر نمودار ہو جاتی تو آپ اٹھ کر دو خفیف رکعتیں پڑھتے، پھر دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے۔ پھر موذن آکر نماز کی اطلاع دیتا، اور آپؐ نماز کے لئے باہر تشریف لے جاتے تھے۔ کذا ذکر فی الصحیحین۔

حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں جب بھی رسول اللہ ﷺ کو نماز شب میں مشغول دیکھنا چاہتے دیکھ سکتے تھے (یعنی رات میں نماز بھی پڑھتے تھے اور سوتے بھی تھے) یہ بھی حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے کہ کسی مہینے میں آپؐ اتنے روزے رکھتے کہ ہم خیال کرتے اب اس مہینہ میں ناغہ نہیں کریں گے اور روزہ نہ رکھتے تو اتنے ناغہ کرتے کہ ہم کہتے اب اس ماہ میں روزہ نہیں رکھیں گے۔ رواہ النسائی۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، رسول اللہ ﷺ رات کو تیرہ رکعات پڑھتے وتر اور فجر کی دو رکعتیں اس میں شامل تھیں۔ رواہ مسلم۔

مسروق کا بیان ہے، میں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کی نماز شب کے متعلق دریافت کیا، فرمایا فجر کی دو رکعتوں کے علاوہ کبھی سات رکعتیں، کبھی نو رکعتیں، کبھی گیارہ رکعتیں ہوتی تھیں۔ رواہ البخاری۔

حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھنے رات کو اٹھتے تو دو خفیف رکعتوں سے آغاز کرتے تھے۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ رات کو تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہو تو دو خفیف رکعتوں سے نماز کا آغاز کرے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے ایک رات میں رسول اللہ ﷺ کے گھر سویا، آپ ﷺ نے بیدار ہو کر مسواک کی، پھر آیات اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ ختم سورت تک تلاوت کیں پھر (وضو کر کے) نماز کو کھڑے ہو گئے اور دو رکعتیں پڑھیں، جن میں قیام، رکوع اور سجود بہت طویل کیا، پھر نماز ختم کر کے سو گئے (اتنی گہری نیند سے) کہ سانس چلنے کی آواز آنے لگی، پھر اٹھ کر نماز پڑھنے لگے۔ ایسا تین مرتبہ کیا، کل چھ رکعتیں ہو گئیں، ہر مرتبہ میں اٹھ کر مسواک بھی کرتے تھے اور وضو بھی اور آیات مذکورہ کی تلاوت بھی کرتے تھے، آخر میں تین وتر پڑھے۔ رواہ مسلم۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا جسم مبارک بھاری پڑ گیا تو زیادہ تر رات کی نماز بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ متفق علیہ۔ حضرت حذیفہؓ کا بیان ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز شب پڑھتے دیکھا، آپ نے اول تین بار اللہ اکبر فرمایا پھر پڑھا ذُو الْمَلَكُوْتِ وَالْجَبَرُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ اس کے بعد نماز شروع کی اور سورۂ بقرہ پڑھی، پھر رکوع کیا اور تقریباً قیام کے برابر کیا جس میں پڑھتے رہے لِرَبِّيَ الْحَمْدُ پھر سجدہ کیا اور تقریباً قیام کے برابر طویل سجدہ کیا اور سجدے میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى پڑھتے رہے پھر سجدہ سے سر اٹھایا اور دونوں سجدوں کے درمیان تقریباً سجدہ کے برابر بیٹھے رَبِّ اغْفِرْلِيْ رَبِّ اغْفِرْلِيْ پڑھتے رہے اس طرح چار رکعتیں پڑھیں جن میں سورۂ بقرہ، آل عمران، النساء اور مائدہ یا الانعام پڑھیں۔ رواہ ابو داؤد۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور صبح تک ایک آیت یعنی آیت اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ پڑھتے رہے۔

ایک صحابی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز پڑھ کر کچھ دیر کو لیٹ گئے پھر بیدار ہوئے اور آسمان کے کناروں کی طرف دیکھ کر پڑھا رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ...... اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ تک۔ پھر بستر کی طرف ہاتھ بڑھا کر مسواک نکالی اس کے بعد ایک لوٹے سے پیالہ میں پانی الٹا اور دانتوں پر مسواک کی، پھر نماز کو کھڑے ہو گئے اور میری نظر میں اتنی دیر نماز پڑھی جتنی دیر سوئے تھے۔ نماز کے بعد پھر لیٹ گئے اور میرے خیال میں جتنی دیر نماز پڑھی تھی اتنی ہی دیر سوتے رہے، پھر بیدار ہو کر وہی کیا جو پہلی بار کیا تھا اور وہی کہا جو پہلے کہا تھا۔ یہ عمل حضور ﷺ نے فجر کی نماز سے پہلے تین بار کیا۔ رواہ النسائی۔

حضرت اُم سلمہؓ نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ اتنی ہی دیر سوتے جتنی دیر نماز پڑھتے، پھر جتنی دیر سوتے اتنی ہی دیر نماز پڑھتے پھر نماز کے بقدر سو جاتے، یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی قرأت کی تشریح فرماتے ہوئے ایک ایک حرف الگ الگ پڑھ کر سنایا۔ رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی۔

عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ امید ہے (یعنی امید رکھو) کہ تمہارا رب تم کو مقام محمود میں جگہ دے گا۔

مقام محمود یعنی ایسا مقام جس کی ستائش اگلے پچھلے سب ہی لوگ کریں گے۔ بغوی نے ابو وائل کی وساطت سے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ نے ابراہیم کو خلیل بنا لیا تھا اور تمہارا ساتھی اللہ کا خلیل اور اس

کے ہاں سب مخلوق سے زیادہ عزت والا ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ اس کو عرش پر بٹھالے گا، حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے فرمایا اللہ کرسی پر متمکن کردے گا۔ (اول روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام محمود عرش ہے اور دوسری روایت میں صراحت ہے کہ وہ کرسی ہے) صحیح یہ ہے کہ مقام محمود سے مراد مقام شفاعت ہے۔ احمد ابن ابی حاتم اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مقام محمود وہ مقام ہے، جہاں میں اپنی امت کے لئے شفاعت کروں گا۔ حضرت انسؓ کی روایت سے صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن مسلمانوں کو روک دیا جائے گا، جس کی وجہ سے ان کو فکر ہوگی اور وہ کہیں گے، کاش ہم کسی سے اپنے رب کے دربار میں سفارش کرا سکتے اور اللہ اس مقام سے ہم کو بچا دیتا، چنانچہ لوگ حضرت آدمؑ کے پاس جا کر کہیں گے، آپ سب لوگوں کے باپ ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور اپنی جنت میں آپ کو جگہ دی اور فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور تمام چیزوں کے نام آپ کو سکھا دیئے آپؑ اپنے رب سے ہماری سفارش کر دیجئے کہ وہ اس جگہ سے ہم کو رہائی عطا فرما دے، آدمؑ فرمائیں گے، میں تمہارے لئے اس مقام پر نہیں ہوں، آپ کو درخت ممنوعہ کا پھل کھانے کا اپنا قصور یاد ہوگا، فرمائیں گے تم لوگ نوحؑ کے پاس جاؤ (طوفان کے بعد) وہ پہلے پیغمبر تھے جن کو اللہ نے زمین والوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تھا لوگ حضرت نوحؑ کے پاس جائیں گے۔ حضرت نوحؑ فرمائیں گے۔ میں اس مقام پر نہیں ہوں آپ کو اپنا وہ قصور یاد ہوگا کہ نادانی میں اپنے بیٹے کے لئے نجات کی درخواست کی، پھر آپؑ فرمائیں گے تم لوگ ابراہیم خلیل الرحمٰنؑ کے پاس جاؤ، لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے، آپؑ فرمائیں گے میں اس مقام پر نہیں ہوں آپ کو اپنے وہ تین جھوٹ یاد ہوں گے جو آپ کی زبان سے نکلے تھے (شاہ مصر کے سامنے حضرت سارہ کو اپنی بہن قرار دینا اور قوم کے ساتھ میلے میں شرکت نہ کرنے کے لئے اپنے کو بیمار کہنا اور بتوں کو خود توڑنے کے بعد قوم کے سامنے یہ کہنا کہ بڑے بت سے پوچھو اس نے ایسا کیا ہے) آپؑ کہیں گے تم لوگ موسیٰؑ کے پاس جاؤ، ان کو اللہ نے توریت عنایت فرمائی تھی، ان سے کلام کیا تھا، ان کو اپنا مقرب بنا کر خطاب کیا تھا۔ لوگ موسیٰؑ کے پاس جائیں گے۔ حضرت موسیٰؑ فرمائیں گے میں اس مرتبے پر نہیں ہوں، آپ کو اپنی وہ غلطی یاد ہوگی کہ ایک آدمی کو غلطی سے قتل کر دیا تھا، فرمائیں گے تم لوگ عیسیٰؑ کے پاس جاؤ وہ عبد اللہ تھے، رسول اللہ تھے، روح اللہ تھے، کلمۃ اللہ تھے، لوگ حضرت عیسیٰؑ کے پاس جائیں گے۔ آپؑ جواب دیں گے، میں اس مقام پر نہیں ہوں، تم لوگ محمد ﷺ کے پاس جاؤ اللہ نے ان کی اگلی پچھلی لغزشیں معاف فرما دی تھیں۔ لوگ میرے پاس آئیں گے میں اپنے رب سے اس کے مکان میں داخل ہونے کی اجازت کا طلب گار ہوں گا اور اجازت ملنے پر اس کے پاس داخل ہوں گا، اور جوں ہی میری نگاہ اس پر پڑے گی فوراً سجدے میں گر پڑوں گا، اور جتنی دیر اللہ چاہے گا سجدے میں پڑا رہوں گا، پھر اللہ فرمائے گا محمدؐ سر اٹھاؤ اور (جو کچھ کہنا ہے) بیان کر، تیری بات سنی جائے گی۔ مانگ (جو کچھ مانگنا چاہے) تیرا سوال پورا کیا جائے گا میں سجدے سے سر اٹھاؤں گا اور اپنے رب کی وہ حمد و ثنا کروں گا جو مجھے وہ سکھا دے گا، پھر شفاعت کروں گا۔ اللہ میرے لئے ایک حد مقرر کر دے گا (یعنی محدود تعداد کی رہائی کا حکم دے دے گا) میں جا کر ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دوں گا، پھر لوٹ کر آؤں گا اور دوبارہ بارگاہ الٰہی میں داخلے کی اجازت کا خواستگار ہوں گا اور اجازت مل جائے گی تو اندر داخل ہوں گا اور جونہی میری نظر اس پر پڑے گی فوراً سجدے میں گر پڑوں گا، اور جتنی دیر اللہ چاہے گا سجدے میں پڑا رہوں گا، پھر اللہ فرمائے گا، محمد سر اٹھاؤ (اپنا مقصد) بیان کرو، تمہاری بات سنی جائے گی، شفاعت کرو تمہاری سفارش قبول کی جائے گی، مانگو، تمہارا سوال پورا کیا جائے گا۔ میں سر اٹھاؤں گا اور حسب تعلیم الٰہی اپنے رب کی حمد و ثنا کروں گا، پھر شفاعت کروں گا، اللہ میرے لئے (دوزخ سے لوگوں کو باہر نکال لانے کی) حد مقرر فرما دے گا، میں بارگاہ خداوندی سے باہر آکر ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دوں گا (تیسری مرتبہ بارگاہ خداوندی میں داخل ہونا، سجدہ میں گر پڑنا، اللہ کی طرف سے خطاب ہونا، سجدے سے سر اٹھا کر حمد و ثنا کرنا، قیدیوں کی محدود تعداد کو رہا کرنے کا حکم ملنا اور جا کر ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دینا بھی انہی الفاظ کے ساتھ اس حدیث میں

حضور ﷺ نے بیان فرمایا ہے جو اوپر ذکر کیے گئے ہیں۔ اس کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) یہاں تک کہ دوزخ کے اندر سوائے ان لوگوں کے جن کو (ہمیشہ دوزخ میں رکھے جانے کی قرآن نے صراحت کردی ہے اور) قرآن نے ہمیشہ کے لئے ان کو دوزخ میں روک دیا ہے اور کوئی باقی نہیں رہے گا، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہی وہ مقام محمود ہوگا، جس کا وعدہ اللہ نے تمہارے نبی کے لئے کرلیا ہے۔

صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث شفاعت ذکر کی گئی ہے اس روایت میں حدیث کے الفاظ اس طرح آئے ہیں۔ میں اپنے رب کے پاس داخل ہونے کی اجازت طلب کروں گا مجھے اجازت مل جائے گی اور اللہ میرے دل میں کچھ کلمات حمد القاء کردے گا، جن سے میں اپنے رب کی حمد کروں گا، اس وقت وہ الفاظ میرے سامنے نہیں (یعنی جو کلماتِ حمد میں قیامت کے دن مقام شفاعت میں پہنچ کر استعمال کروں گا وہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں) میں انہی الفاظ سے اپنے رب کی حمد کروں گا، پھر سجدہ میں گر پڑوں گا، اللہ فرمائے گا محمد ﷺ سر اٹھاؤ اور جو کچھ گزارش کرنا چاہتے ہو بیان کرو تمہاری بات سنی جائے گی، مانگو تم کو دیا جائے گا۔ شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا یارب امتی امتی۔ حکم ہوگا جاؤ اور جس کے دل میں جو برابر ایمان ہو اس کو نکال لاؤ۔ میں جاکر حکم کی تعمیل کروں گا۔ پھر واپس آکر وہ کلماتِ ثنا، حسب سابق عرض کروں گا۔ پھر سجدے میں گر پڑوں گا حکم ہوگا جا کر اس کو نکال لو جس کے دل میں رائی کے دانے سے بھی کم ایمان ہو۔ میں جاکر ایسا ہی کروں گا۔ پھر حضور ﷺ نے تیسری اور چوتھی مرتبہ جانے اور شفاعت کرنے کا ذکر فرمایا اور فرمایا، میں عرض کروں گا اے میرے رب مجھے ان لوگوں کے نکال لینے کی اجازت دے دے جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے قائل تھے، اللہ فرمائے گا قسم ہے اپنی عزت و جلالِ کبریا اور عظمت کی جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا قائل تھا میں اس کو ضرور ضرور (دوزخ سے) نکال دوں گا۔

سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ علماء نے اس روایت کی صحت میں قوی شبہ کیا ہے۔ کیونکہ حدیث کا شروع حصہ تو موقف کی تکالیف سے تعلق رکھتا ہے اور آخری حصہ میں شفاعت کا اور دوزخ سے لوگوں کو نکالنے کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ شفاعت اور دوزخ سے برآمدگی کا واقعہ تو سب سے آخر میں ہوگا، اس سے پہلے موقف حشر سے جدا ہونا، پل صراط پر گزرنا اور گرنے والوں کا دوزخ میں گرنا ہو چکا ہوگا۔ حضرت حذیفہؓ کی صحیح روایت میں اس شفاعت کے بعد صراط سے گزرنے کا ذکر آیا ہے اور حضرت ابوہریرہؓ و حضرت ابوسعیدؓ کی روایات میں آیا ہے کہ ہر امت کو حکم ہوگا کہ جس کی عبادت کرتے تھے اس کے پیچھے لگ جاؤ، پھر منافقوں کو چھانٹ کر مومنوں سے الگ کردیا جائے گا، پھر پل صراط قائم کیا جائے گا اور لوگ اس پر سے گزریں گے، پھر شفاعت کرنے اور دوزخ سے نکالنے کا حکم ہوگا، گویا سب سے پہلے حکم ہوگا کہ ہر امت اپنے معبود کے پیچھے چلی جائے اس کے بعد موقف کی تکلیف سے نجات اور دوزخ سے نکالنے کا اور شفاعت کا حکم ہوگا، قاضی عیاض اور نووی نے یہی ترتیب ذکر کی ہے۔

میں کہتا ہوں حدیث مذکورۃ الصدر میں کچھ اختصار ہے اول اس شفاعت کا ذکر ہے جو میدان قیامت اور موقف کی شدتوں سے رہائی دلانے کے لئے ہوگی اور آخر میں دوزخ سے رہائی کے لئے شفاعت کا ذکر کیا گیا ہے دو قسم کی شفاعتوں کا ذکر دوسری احادیث میں بھی آیا ہے۔

میرے نزدیک حدیث میں جو فِیْ دَارِهٖ آیا ہے اس سے مراد جنت ہے اللہ کا دیدار صرف جنت میں ہی ہوگا (یعنی میدان حشر مراد نہیں ہے) اللہ کا مکان یا بارگاہ جنت سے باہر نہیں ہو سکتی۔ اللہ کو دیکھ کر سجدے میں گر پڑنا یقیناً جنت کے اندر ہی ہوگا۔

بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ لوگ تیزی کے ساتھ ادھر سے ادھر جائیں گے ہر امت اپنے نبی کے پیچھے لگ جائے گی اور اس سے شفاعت کی خواستگار ہوگی آخر میں شفاعت کا اختیار رسول اللہ ﷺ کو ہوگا یہ وہی ہوگا کہ اللہ آپ کو مقام محمود میں کھڑا کردے گا۔

بعض احادیث میں آیا ہے کہ سورج قریب آجائے گا اتنا کہ (اس کی گرمی سے) پسینہ آدھے کانوں تک آجائے گا، اسی

حالت میں لوگ حضرت آدمؑ سے فریاد کریں گے۔ حضرت آدمؑ فرمائیں گے مجھے اس کا اختیار نہیں، پھر آخر میں محمد ﷺ کی نوبت آئے گی اور وہ شفاعت کریں گے اور اللہ فیصلہ کرے گا، محمدؐ جا کر جنت کا دروازہ پکڑ لیں گے اس روز اللہ ان کو مقام محمود میں کھڑا کرے گا، یہ مقام ایسا ہوگا کہ میدان قیامت میں جمع ہونے والے سب لوگ اس کی تعریف کریں گے۔

بزار اور بیہقی نے حضرت حذیفہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اللہ سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کرے گا مگر کوئی کسی سے بات نہیں کرے گا، سب سے پہلے محمد ﷺ کو پکارا جائے گا آپ جواب دیں گے لَبَّیْکَ میں حاضر ہوں وَسَعْدَیْکَ اور حاضری کی سعادت حاصل کر رہا ہوں وَالْخَیْرُ فِیْ یَدَیْکَ (اور ہر بھلائی تیرے ہاتھوں میں ہے) وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ (اور کسی شر کی نسبت تیری طرف نہیں ہے) وَالْمَھْدِیُّ مَنْ ھَدَیْتَ (اور ہدایت یافتہ وہی ہے جس کو تو نے ہدایت کر دی) وَعَبْدُکَ بَیْنَ یَدَیْکَ (اور تیرا بندہ تیرے سامنے حاضر ہے) وَبِکَ وَاِلَیْکَ (اور تیرے ہی سبب سے وہ موجود ہوا اور تیری ہی طرف اس کا رجوع ہے یعنی مخلوق کا آغاز بھی تجھی سے ہے اور سب کی واپسی بھی تیری ہی طرف ہے) لَا مَنْجَاءَ مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ (تجھ سے کسی کو مفر نہیں تجھ سے بھاگ کر ہر ایک کا تیری ہی طرف فرار ہے) تَبَارَکْتَ وَتَعَالَیْتَ رَبَّ الْبَیْتِ (اے کعبے کے مالک تو برکت والا اور سب سے بالاتر ہے) اس وقت آپ شفاعت کریں گے، یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے۔ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔

ترمذی نے باسناد حسن اور ابن خزیمہ اور ابن مردویہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور میرا یہ قول فخر نہیں ہے۔ اور قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا اور یہ قول بھی فخر نہیں ہے اس روز ہر نبی آدم ہوں یا دوسرے میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ زمین پھٹ کر سب سے پہلے میں ہی برآمد ہوں گا اور یہ بات بھی (میری طرف سے) فخر نہیں ہے (اس روز) لوگوں پر تین ہیبتیں اور گھبراہٹیں ہوں گی، لوگ آدم کے پاس جائیں گے اور شفاعت کے خواستگار ہوں گے اور کہیں گے آپ ہمارے باپ ہیں ہماری سفارش کر دیجئے، حضرت آدمؑ جواب دیں گے میں نے ایک بڑا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے مجھے زمین پر اتار دیا گیا تم نوحؑ کے پاس جاؤ، نوحؑ کے پاس جب لوگ جائیں گے تو وہ جواب دیں گے میں نے سب زمین کے باشندوں کے ہلاک کرنے کی بددعا کی تھی اور وہ میری بددعا سے ہلاک بھی کر دیئے گئے تم ابراہیمؑ کے پاس جاؤ، لوگ ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے، حضرت ابراہیمؑ فرمائیں گے، میں نے تین باتیں جھوٹی بھی کہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ فرمایا، انھوں نے کوئی بات جھوٹی نہیں کہی بلکہ جو بات بھی جن کی شکل کذب کی تھی ان کا مقصد دین الٰہی کی طرف سے مدافعت تھی تم موسیٰ کے پاس جاؤ، موسیٰ کہیں گے میں نے ایک شخص کو (ناحق) قتل کر دیا تھا تم لوگ عیسیٰ کے پاس جاؤ، حضرت عیسیٰؑ کہیں گے میری تو اللہ کے سوا پوجا ہونے لگی تھی لوگوں نے مجھے میرے بعد معبود بنا لیا تھا تم لوگ محمدؐ کے پاس جاؤ، لوگ میرے پاس آئیں گے میں ان کے ساتھ جاؤں گا اور جنت کے دروازے کا حلقہ پکڑ کر کھٹ کھٹاؤں گا، دریافت کیا جائے گا کون ہے میں کہوں گا محمد ﷺ، دروازہ کھول دیا جائے گا اور (فرشتے) کہیں گے مرحبا، میں سجدہ میں گر پڑوں گا پھر اللہ میرے دل میں اپنی حمد وثنا اور مجد القاء فرما دے گا اور حکم ہوگا اپنا سر اٹھاؤ۔ مانگو تمہارا سوال پورا کیا جائے گا، شفاعت کرو تمہاری سفارش قبول کی جائے گی، اظہار مدعا کرو تمہاری بات سنی جائے گی، یہ ہی مقام مقام محمود ہوگا۔

قرطبی نے کہا تین ہیبتیں اور گھبراہٹیں میرے خیال میں اس وقت ہوں گی جب دوزخ کو لگاموں میں پکڑ کر کھینچ کر لایا جائے گا اور لوگ اس کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جائیں گے۔

ابن خزیمہ اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سلمان کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن سورج کو دس سال کی (مجموعی) گرمی دے دی جائے گی اور کھوپڑیوں کے قریب لے آیا جائے گا۔

مذکورہ حدیث میں آیا ہے کہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے آ کر ملیں گے اور شفاعت کی خواہش کریں گے، حضور ﷺ فرمائیں گے ہاں میں تمہارا ساتھ دوں گا، چنانچہ آپ چل کر جنت کے دروازے کی زنجیر پکڑ کر کھٹ کھٹائیں گے، دریافت کیا

جائے گا کون ہے، آپ جواب دیں گے محمد ﷺ۔ دروازہ کھول دیا جائے گا، آپ ﷺ اللہ کے سامنے جا کر کھڑے ہو جائیں گے اور سجدہ کریں گے، ندا آئے گی اپنا سر اٹھاؤ مانگو تم کو تمہارا سوال دیا جائے گا۔ شفاعت کرو تمہاری سفارش قبول کی جائے گی۔ یہ ہی وہ مقام محمود ہوگا (جس کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے)

قرطبی نے یہ حدیث نا تمام ذکر کی ہے لیکن ابن ابی حاتم نے السنۃ میں اور ابن ابی شیبہ نے پوری حدیث بیان کی ہے جس کے آخر میں ہے کہ جس کے دل میں گیہوں کے دانہ کے بقدر یا جَو کے دانہ کے برابر یا رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا اس کے حق میں شفاعت قبول کرلی جائے گی پس یہی مقام محمود ہوگا۔ طبرانی نے حضرت کعب بن مالکؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن اللہ لوگوں کو اٹھائے گا۔ میں اور میری امت اس روز ایک ٹیلہ پر ہوں گے اور میرا رب مجھے ایک سبز جوڑا پہنائے گا، پھر مجھے اجازت دی جائے گی اور میں اللہ کی ثناء کروں گا ان الفاظ کے ساتھ جن کا وہ مستحق ہے، مقام محمود یہ ہی مقام ثناء ہے۔

فائدہ

شفاعت کبریٰ کے متعلق متعدد احادیث مفصل آئی ہیں۔ بزار، ابو عوانہ، ابو یعلی اور ابن حبان نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت سے، شیخین وغیر ہم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے، احمد اور ابو یعلی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے مسلم اور حاکم نے حضرت حذیفہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے طبرانی، ابن مبارک اور ابن جریر نے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے یہ احادیث بیان کی ہیں۔ سورۃ ابراہیم کی آیت وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ کی تفسیر میں اس کی تشریح ہم نے کردی ہے۔ قرطبی نے لکھا ہے یہ ہی شفاعت عامہ جس کا حق صرف رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمایا گیا ہے۔ اس حدیث میں مراد ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، ہر نبی کو ایک مقبول دعا کا اختیار دیا گیا، چنانچہ ہر نبی نے اسی زندگی میں اپنی دعا میں عجلت کرلی، لیکن میں نے اپنی امت کی شفاعت کے لئے اپنی دعا کو بچائے رکھا اور یہ شفاعت موقف والوں کے لئے ہوگی (یعنی میدان حشر میں جن کو روک لیا گیا ہوگا ان کی رہائی کے لئے شفاعت ہوگی) قرطبی نے کہا یہ شفاعت اس لئے ہوگی کہ ان کو موقف کی ہولناکی سے نجات مل جائے اور جلد حساب فہمی ہو جائے۔

میرے نزدیک اس شفاعت سے جو رسول اللہ ﷺ نے امت کے لئے بچائے رکھی ہے تیسری شفاعت مراد ہے جو گناہ گاروں کو دوزخ سے نکالنے کے سلسلے میں ہوگی، رسول اللہ ﷺ کو تین شفاعتوں کا حق ہوگا۔ ابن جریر نے تفسیر میں، طبرانی نے المطولات میں، ابو یعلی نے مسند میں، بیہقی نے البعث میں، ابو موسیٰ مدینی نے المطولات میں، علی بن معبد نے کتاب الطاعۃ و العصیان میں اور ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ایک طویل حدیث بیان کی ہے جس میں صور کی پیدائش کا، پھونکے جانے کا، نفخۂ خوف و بیہوشی کا، قبروں سے اٹھنے کا اور آخر میں اہل جنت کے جنت اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخلے کا بیان ہے اور ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جن کی گردنوں پر لکھا ہوگا یہ وہ دوزخی ہیں جن کو رحمٰن نے خود دوزخ سے آزاد کیا ہے۔ ہم ذیل میں اس حدیث کو مختصراً نقل کرتے ہیں۔

اس حدیث میں مذکور ہے کہ لوگوں کو ایک جگہ روک کر کھڑا کر دیا جائے گا اور ان کا مدت تک کچھ فیصلہ نہ ہوگا، لوگ چیخ پڑیں گے اور سفارش کے طلب گار ہوں گے۔ پہلے آدمؑ کے پاس جائیں گے۔ حضرت آدمؑ فرمائیں گے مجھے اس کا اختیار نہیں، غرض یہ لوگ ایک کے بعد دوسرے نبی کے پاس اور دوسرے کے بعد تیسرے نبی کے پاس اس طرح متعدد انبیاءؑ کے پاس جائیں گے اور ہر ایک شفاعت کرنے سے انکار کر دے گا، یہاں تک کہ میرے پاس آئیں گے، میں ان کے ساتھ چل دوں گا اور عرش کے سامنے پہنچ کر سجدہ میں گر پڑوں گا، باوجودیکہ اللہ بخوبی عالم ہے، لیکن دریافت فرمائے گا تیری کیا ضرورت ہے۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب، تو نے مجھ سے (حق) شفاعت عطا فرمانے کا وعدہ کیا تھا اب اپنی مخلوق کے سلسلے میں میری سفارش قبول فرما اور ان کا فیصلہ کردے (انتظار میں روکے نہ رکھ) اللہ فرمائے گا میں نے تیری سفارش قبول کی، میں آ کر تمہارا

فیصلہ کئے دیتا ہوں۔ اس طویل حدیث میں چوپایوں اور وحشی جانوروں کے فیصلہ کا بھی ذکر ہے۔ پھر انسانوں کے باہمی حقوق اور قتل و خون کا فیصلہ ہوگا (یہ بھی حدیث میں مذکور ہے) پھر حکم ہوگا، ہر شخص یا ہر امت اپنے اپنے معبودوں سے جا ملے، سب لوگ اپنے اپنے معبودوں کے ساتھ ہو جائیں گے صرف مومن رہ جائیں گے جن میں منافق بھی شامل ہوں گے۔ یک دم اللہ اپنی پنڈلی کھول دے گا تو مومن فوراً سجدہ میں گر پڑیں گے اور ہر منافق گدی کے بل پیچھے گرے گا (اس کی کمر نہیں جھکے گی) گائے کی پشت کے مہروں کی طرح اس کی پشت ہو جائے گی۔ پھر پل صراط قائم کیا جائے گا اور لوگ اس پر سے گزریں گے۔ کچھ لوگ تو بالکل بے داغ بچ جائیں گے، بعض لوگوں کے کچھ خراشیں لگ جائیں گی مگر بچ وہ بھی جائیں گے اور پل کے پار ہو جائیں گے اور کچھ آدمیوں کے چہرے آنکڑوں سے زخمی ہو جائیں گے اور وہ آگ میں گر پڑیں گے۔ جب اہل جنت جنت تک پہنچ جائیں گے تو اندر داخل ہونے کے لئے پھر کسی شفیع کے طلب گار ہوں گے کہ کوئی سفارش کر کے ان کو جنت میں داخلے کی اجازت دلوا دے۔ چنانچہ سب سے پہلے اپنے باپ آدمؑ کے پاس پہنچیں گے۔ حضرت آدمؑ اپنے گناہ کو یاد کر کے کہیں گے مجھے اس کا اختیار نہیں ہے، تم نوحؑ کے پاس جاؤ۔ لوگ نوحؑ کے پاس جائیں گے۔ حضرت نوحؑ بھی حضرت آدمؑ کی طرح جواب دے دیں گے۔ پھر لوگ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے پاس جائیں گے اور ہر ایک ایسا ہی جواب دے دے گا بالآخر میرے پاس آئیں گے۔ مجھے اللہ سے تین شفاعتوں کا حق ملا ہوا ہے اس نے مجھ سے اس کا وعدہ فرما لیا ہے، میں جنت کی طرف جا کر دروازے کی زنجیر پکڑ کر دروازہ کھولنے کی درخواست کروں گا دروازہ کھول دیا جائے گا اور جو نہی نظر اٹھا کر اپنے رب کی طرف دیکھوں گا، فوراً سجدے میں گر پڑوں گا، اللہ مجھے اپنی حمد و ثنا اور بزرگی بیان کرنے کی ایسی مخصوص اجازت عطا فرمائے گا جو کسی کو نہیں دی ہوگی، پھر فرمائے گا، محمد ﷺ اپنا سر اٹھاؤ شفاعت کرو تمہاری سفارش قبول کی جائے گی، مانگو تم کو دیا جائے گا۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب تو نے مجھ سے شفاعت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اہل جنت کے بارے میں میری شفاعت قبول فرما ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دے۔ اللہ میری شفاعت قبول فرمائے گا۔

اسی حدیث میں ہے کہ جب دوزخ میں گر جائیں گے اور ایک کثیر مخلوق اس میں چلی جائے گی جن کو ان کے اعمال نے وہاں باندھ رکھا ہوگا تو ان میں کچھ لوگ تو ایسے ہوں گے کہ صرف قدموں تک ان کے آگ ہوگی، اس سے اوپر نہ ہوگی۔ کچھ لوگوں کے نصف پنڈلیوں تک آگ ہوگی، کسی کے زانو تک آگ ہوگی، کسی کی کمر تک ہوگی اور بعض ایسے بھی ہوں گے کہ سوائے چہروں کے باقی تمام بدن کو آگ نے پکڑ لیا ہوگا۔ صرف ان کے چہرے اللہ نے آگ کے لئے حرام کر دیئے ہوں گے۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب میری امت کے کچھ لوگ آگ میں ہیں، اللہ فرمائے گا جن کو تم پہچانتے ہو ان کو دوزخ سے نکال لو۔ حسب الحکم وہ لوگ نکال لئے جائیں گے یہاں تک کہ ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا، اس کے بعد اللہ شفاعت کی اجازت دے دے گا اور کوئی پیغمبر اور شہید ایسا نہ ہوگا جو شفاعت نہ کرے، اللہ حکم دے گا جن دلوں میں تم دینار برابر ایمان پاؤ ان کو نکال لو۔ پھر (نوبت بنوبت) فرماتا جائے گا، جس کے دل میں دو تہائی دینار، نصف دینار، چہارم دینار، ایک قیراط۔ رائی کے ایک دانہ کے برابر ایمان ہو اس کو بھی نکال لو یہاں تک کہ دوزخ کے اندر جب کوئی شخص ایسا باقی نہیں رہے گا، جس نے اللہ کے لئے کوئی بھلائی کبھی کی ہو اور ہر شفاعت کا حق رکھنے والا شفاعت کر چکے گا تو اللہ فرمائے گا، اب میں رہ گیا اور میں ارحم الراحمین ہوں۔ یہ فرمانے کے بعد اللہ اپنا ہاتھ جہنم میں ڈال دے گا اور بے شمار مخلوق کو جہنم سے نکال لے گا۔ ان کے جسم سوختہ ہو کر کوئلے کی طرح ہو گئے ہوں گے (الحدیث)

حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے بعض اجزاء میں نکارت ہے اور روایت کا مدار اسماعیل بن رافع قاضی مدینہ پر ہے۔ اس حدیث کی روایت کی وجہ سے اسماعیل بن رافع کے ثقہ ہونے میں بھی لوگوں کو کلام ہو گیا، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ متفرق اسنادوں اور طریقوں سے روایت کئے ہوئے مختلف اجزاء کو اسماعیل نے یکجا کر دیا ہے اور مسلسل ایک حدیث بنا دیا ہے۔ حافظ ابو موسیٰ مدینی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اس کی سند میں بھی گو بعض راوی ایسے ہیں جن کے متعلق کلام کیا گیا ہے

لیکن حدیث کے متفرق اجزاء جن اسنادوں سے نقل کیے گئے ہیں وہ سندیں بجائے خود ثابت ہیں۔

ابن عربی اور قرطبی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی اس کی تصویب کی ہے۔ لیکن بیہقی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ یحییٰ بن سلام بصری نے اپنی تفسیر میں کلبی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں جاچکیں گے تو اہل جنت یعنی اہل ایمان کا ایک آخری گروہ دوزخ میں رہ جائے گا جن کو آگ کامل طور پر جلا چکی ہوگی دوزخی کافر مشرک منافق کہیں گے ہم تو شک اور کفر کی وجہ سے پکڑے گئے مگر تم کو بھی تمہارے ایمان نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا (طنز) سن کر وہ لوگ چیخ پڑیں گے جن کی آواز جنت والے بھی سن لیں گے اور حضرت آدمؑ کے پاس جاکر شفاعت کے طلب گار ہوں گے۔ الی آخر الحدیث۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ وہ لوگ محمد ﷺ کے پاس جائیں گے، محمد ﷺ بارگاہ رب العزت میں پہنچ کر سجدہ کریں گے اور عرض کریں گے تیرے کچھ بندے ایسے ہیں جو ہیں تو گناہ گار مگر تیری توحید میں انہوں نے شک کبھی نہیں کیا۔ مشرکوں نے ان کو تیرے پرستار ہونے کا طعنہ دیا۔ اللہ فرمائے گا اپنی عزت کی قسم میں ان کو دوزخ سے ضرور ضرور باہر لے آؤں گا۔ شیخ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ (یعنی جنت میں پہنچنے کے بعد لوگوں کا موحد گناہگاروں کے لئے شفاعت کا طلب گار ہونا) اگر ثابت ہو جائے تو ورلودی نے جو حدیث شفاعت پر شبہ کیا ہے کہ موقف کی شدت سے بچانے کے لئے شفاعت ہوگی وہ شبہ حل ہو جائے گا، لیکن حقیقت میں یہ حدیث ضعیف ہے اور صحیح احادیث کے صراحۃً خلاف ہے۔ انبیاء سے درخواست شفاعت تو اس وقت کی جائے گی، جب لوگ موقف قیامت میں ہوں گے، اور مومن جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہوئے ہوں گے۔ سیوطی نے لکھا ہے دونوں روایتوں کا تعارض اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ ایک بار موقف کی شدت سے رہائی کے لئے مومن طلبگار شفاعت ہوں گے اور دوسری بار جنت کے اندر پہنچ کر دوزخی مومنوں کو دوزخ سے نکلوانے کے لئے سفارش کی درخواست کریں گے۔

میں کہتا ہوں تین مرتبہ لوگ شفاعت کے طلب گار ہوں گے ایک بار موقف سے رہائی کے لئے، دوسری بار جنت میں داخل ہونے کے لئے اور تیسری بار دوزخ کے اندر باقی ماندہ مومنوں کے خلاصی کے لئے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا ہے کہ میرے رب کے سامنے تین شفاعتوں کا حق ہوگا، جن کا اس نے مجھ سے وعدہ کرلیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ تین بار آپ شفاعت کریں گے اور مقام محمود مقام شفاعت کا ہی نام ہے، خواہ کوئی سی شفاعت ہو (گویا شفاعتیں متعدد ہوں گی مقام شفاعت ایک ہی ہوگا اور اسی کو مقام محمود کہا گیا ہے)۔

مسئلہ

معتزلہ کا فرقہ اور خوارج شفاعت کے منکر ہیں یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر مرتکب کبیرہ بغیر توبہ کے مرجائے گا تو ہمیشہ کے لئے دوزخی ہو جائے گا، اس کی کوئی شفاعت نہ ہوگی نہ کبھی اس کو دوزخ سے رہائی ملے گی۔ لیکن ثبوت شفاعت کے لئے اتنی کثرت سے صحیح احادیث آئی ہیں کہ حد تواتر کے قریب پہنچ گئی ہیں، بلکہ تواتر معنوی کی حد تک پہنچ چکی ہیں۔

مسلم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم کا یہ قول ذکر کیا ہے رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ پھر حضرت عیسیٰ کا یہ قول ذکر کیا اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر عرض کیا، امتی امتی، پھر روئے۔ اس پر اللہ نے فرمایا جبرئیل جاکر محمد ﷺ کو یہ پیام پہنچادے کہ تمہاری امت کے معاملے میں ہم تم کو راضی کردیں گے، دکھ نہیں پہنچائیں گے۔

بزار نے الاوسط میں اور ابو نعیم نے اچھی سند کے ساتھ حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں اپنی امت کے لئے شفاعت کروں گا، یہاں تک کہ میرا رب پکار کر فرمائے گا محمدؐ کیا تو خوش ہوگیا، میں عرض کروں گا جی ہاں میرے رب، میں راضی ہوگیا۔

ایک حدیث ہے، حضور ﷺ نے فرمایا میرے رب نے مجھے دو باتوں میں سے ایک کو انتخاب کر لینے کا اختیار عطا فرمایا، ایک یہ کہ وہ میری آدھی امت کو بلا حساب کے جنت میں داخل فرمادے گا دوسری یہ کہ وہ مجھے حق شفاعت عطا فرمادے گا۔ میں نے حق شفاعت کو لینا پسند کر لیا، اب میری شفاعت ہر مسلمان کے لئے ہوگی۔ دوسری روایت میں آیا ہے، میری شفاعت ہر اس شخص کے لئے ہوگی جو شرک پر نہ مرا ہو (مرتے وقت مشرک نہ ہو) یہ حدیث عوف بن مالک اشجعی کی روایت سے ترمذی، ابن ماجہ، حاکم، ابن حبان، بیہقی اور طبرانی نے بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور امام احمد، بزار اور طبرانی نے اچھی سند کے ساتھ حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے۔ اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ امام احمد، طبرانی اور بیہقی نے بھی اس کو نقل کیا ہے اس روایت کے آخر میں ہے کیا تم متقیوں کے لئے میری شفاعت خیال کرتے ہو، نہیں شفاعت تو گناہ گاروں، خطاکاروں اور معصیت کے ساتھ آلودہ لوگوں کے لئے ہوگی۔

ایک حدیث میں فرمایا، میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لئے ہوگی جو کبیرہ گناہوں والے ہوں گے، رواہ ابوداؤد والترمذی والحاکم والبیہقی عن انسؓ بن مالک والطبرانی وابو نعیم عن عبیدؓ بن بشیر بمعناہ۔ والطبرانی فی الاوسط عن ابن عمرؓ نحوہ والطبرانی فی الکبیرہ عن ام سلمۃؓ بمعناہ والترمذی والحاکم عن جابرؓ بمعناہ وعن کعب بن عجرۃؓ وعن طاؤس۔

بیہقی نے کہا، یہ حدیث مرسل حسن ہے۔ شِفَاعَتِی لِاَہْلِ الْکَبَائِرِ کی عبارت تابعین میں بہت زیادہ شائع تھی۔ ان الفاظ سے اصل روایت کی تائید کی شہادت ہو جاتی ہے۔

ابن ابی حاتم نے السنہ میں حضرت انسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں برابر اپنے رب سے شفاعت کرتا رہوں گا اور وہ میری سفارش قبول فرماتا جائے گا یہاں تک کہ آخر میں عرض کروں گا، اے میرے رب جو لوگ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے قائل تھے ان کے متعلق میری شفاعت قبول فرمالے۔ اللہ فرمائے گا، محمد یہ اختیار تمہارا نہ کسی اور کا یہ صرف میرا اختیار ہے قسم ہے اپنی عزت و جلال اور رحمت کی۔ میں کسی ایسے شخص کو جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا تھا دوزخ میں نہیں چھوڑوں گا۔

ایک حدیث ہے حضور ﷺ نے فرمایا، میں اپنی امت کے برے لوگوں کے لئے بہترین آدمی ہوں میری امت کے جو برے لوگ ہیں ان کو میری شفاعت سے اللہ جنت میں داخل فرمادے گا اور جو اچھے لوگ ہیں ان کو ان کے اعمال کی وجہ سے جنت میں لے جائے گا۔

طبرانی نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں قیامت کے دن (سب) لوگوں کا سردار ہوں گا۔ (اور میرا یہ قول) بغیر فخر کے ہے قیامت کے دن ہر شخص میرے جھنڈے کے نیچے کشائش کا امیدوار ہوگا میرے ساتھ لواء الحمد ہوگا، لوگوں کو ساتھ لے کر میں جنت کے دروازہ تک جاؤں گا اور دروازہ کھلوانے کی درخواست کروں گا، دریافت کیا جائے گا کون ہے، میں عرض کروں گا محمد ہے، حکم ہوگا، خوش آمدید محمدؐ۔ جب میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو اداء شکر کے لئے سجدہ میں گر پڑوں گا، حکم ہوگا اپنا سر اٹھاؤ، اظہار مدعا کرو تم کو تمہارا سوال دیا جائے گا۔ شفاعت کرو۔ تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی، مجرم اللہ کی رحمت اور میری شفاعت سے دوزخ سے نکال لئے جائیں گے۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں جہنم کی طرف جاکر اس کا دروازہ بجاؤں گا، دروازہ کھول دیا جائے گا۔ میں اندر چلا جاؤں گا۔ اور اللہ کی ایسی ثنا کروں گا کہ نہ مجھ سے پہلے کسی نے ثنا کی ہوگی نہ میرے بعد کوئی کرے گا پھر اس کے اندر سے ہر اس شخص کو نکال لاؤں گا جو خلوص کے ساتھ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا قائل تھا کچھ قریشی میری طرف اپنا رشتہ قرابت بتاتے ہوئے بڑھیں گے لیکن میں ان کو دوزخ میں ہی چھوڑ دوں گا۔ بخاری نے حضرت

عمران بن حصینؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے۔ کہ کچھ لوگ محمد ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کردیئے جائیں گے وہ جنت والوں میں جہنمی کہلائیں گے۔ صحیحین میں حضرت جابرؓ کی مرفوع روایت آئی ہے کہ شفاعت کی وجہ سے اللہ کچھ لوگوں کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل فرمادے گا۔

طبرانی نے اچھی سند کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اس قبلہ والوں میں سے اتنے لوگ اپنی گناہ گاری اور معصیت کوشی کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے کہ ان کی گنتی سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا، مجھے شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی تو میں سجدہ میں پڑ کر اللہ کی ویسی ہی ثنا کروں گا جیسی کھڑا ہو کر کروں گا حکم ہوگا اپنا سر اٹھاؤ اور مانگو جو کچھ مانگنا چاہو تمہارا سوال پورا کیا جائے گا اور شفاعت کرو، تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔

احمد اور طبرانی نے ایسی سند کے ساتھ جس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ فرمائے گا۔ محمد ﷺ میں نے جو بھی نبی یا رسول بھیجا اس نے مجھ سے کچھ نہ کچھ مانگا اور میں نے وہ مانگ اس کی پوری کی، محمدؐ تم بھی مانگو تم کو تمہاری مانگ دی جائے گی۔ میں عرض کروں گا میری مانگ اپنی امت کے لئے قیامت کے دن شفاعت کرنے کی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ شفاعت کیسی۔ فرمایا میں عرض کروں گا، اے میرے رب مجھے وہ شفاعت عطا فرما، جو میں نے تیرے پاس محفوظ رکھی تھی، اللہ فرمائے گا ہاں پھر میری باقی امت کو بھی جنت میں داخل فرمادے گا۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور مسلم نے حضرت انسؓ و حضرت جابرؓ کی روایت سے اور امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے اور بزار و بیہقی نے حضرت عبدالرحمٰن بن عقیلؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہر نبی کی ایک مقبول دعا ہوتی ہے، چنانچہ ہر نبی نے اپنی دعا میں عجلت کی (اور وہ قبول کرلی گئی) مگر میں نے اپنی دعا امت کی شفاعت کے لئے محفوظ رکھ چھوڑی۔ سیوطی نے کہا یہ حدیث معنی کے لحاظ سے متواتر ہے۔

صحیحین میں حضرت عمر فاروقؓ کی روایت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو (کتخدا زانی وزانیہ کو) سنگ سار کرنے کے حکم کی اور خروج دجال کی تکذیب کریں گے اور مغرب کی جانب سے آفتاب کے طلوع ہونے کی خبر کو بھی نہیں مانیں گے اور عذاب قبر کے بھی منکر ہوں گے اور شفاعت کا بھی انکار کریں گے اور اس بات کو بھی نہیں مانیں گے کہ کچھ دوزخیوں کو دوزخ کے اندر سوختہ ہو جانے کے بعد نکالا جائے گا۔ اور پھر ان کو جنت میں پہنچادیا جائے گا۔

سعید بن منصور اور بیہقی اور ہناد نے حضرت انسؓ کا قول نقل کیا کہ جو شفاعت کا قائل نہ ہوگا اس کو شفاعت نصیب نہ ہوگی اور جو رسول اللہ ﷺ کے حوض کو نہ مانے گا اس کو حوض سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

ابونعیم نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میری امت کے دو قسم کے لوگوں کو میری شفاعت حاصل نہ ہوگی۔

(۱) مرجئہ (وہ فرقہ جو کہتا ہے کہ اعمال ہیچ ہیں اگر ایمان دل میں ہے تو کوئی بدعملی آخرت میں ضرر رساں نہ ہوگی، کوئی مومن خواہ کتنا ہی بدکردار ہو دوزخ میں نہیں جائے گا)

(۲) قدریہ (وہ فرقہ جو قائل ہے کہ ہم اپنے اعمال کے خود خالق ہیں اور تقدیر اعمال کوئی چیز نہیں ہم جس طرح چاہیں کرسکتے ہیں خیر ہو یا شر)

بیہقی نے شبیب بن ابی فضالہ مکی کی روایت سے بیان کیا کہ لوگوں نے حضرت عمران بن حصین کے سامنے شفاعت کا تذکرہ کیا ایک شخص بولا ابونجید (حضرت عمران کی کنیت) آپ لوگ کچھ ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہم کو

قطعاً نہیں ملتا۔ حضرت عمران کو غصہ آگیا اور فرمایا تو نے قرآن پڑھا ہے اس شخص نے کہا جی ہاں فرمایا کیا قرآن میں تو نے نماز عشاء کی چار رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں، فجر کی دو رکعتیں، ظہر کی چار رکعتیں اور عصر کی چار رکعتیں، کہیں پائی ہیں اس شخص نے کہا نہیں فرمایا پھر کس سے تم نے یہ باتیں سیکھیں کیا ہم سے نہیں لیں۔ ہم نے یہ تفصیل رسول اللہ ﷺ سے ہی تو حاصل کی، کیا تم نے ہر چالیس درہم میں زکوٰۃ کا ایک درہم اور اتنی بکریوں میں سے ایک بکری اور اتنے اونٹوں میں ایک اونٹ قرآن میں کہیں لکھا پایا، اس شخص نے کہا نہیں۔ فرمایا تم نے قرآن میں وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ تو دیکھ لیا لیکن کیا یہ بھی لکھا دیکھا ہے کہ سات مرتبہ طواف کرو اور مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز پڑھو یہ باتیں تم نے کس سے لیں کیا ہم سے نہیں لیں اور ہم نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیں، لوگوں نے کہا بے شک ایسا ہی ہے۔ فرمایا کیا قرآن میں تم نے کہیں پایا کہ شہر سے باہر نکل کر دیہات سے غلہ لانے والوں کا غلہ راستے میں ہی نہ خرید لیا کرو۔ جلب کی اجازت نہیں اور نہ تور کا نکاح صحیح (کوئی شخص اپنی بہن بیٹی کا نکاح اس شرط پر کسی سے کردے کہ وہ اپنی بہن بیٹی کا نکاح معاوضہ میں اس کے ساتھ کردے، اور مہر کسی عورت کا کچھ نہ ہو اس کو شغار یا تور کا نکاح کہتے ہیں شریعت میں اس کی اجازت نہیں) لوگوں نے کہا نہیں۔ فرمایا اللہ نے اپنی کتاب میں فرمادیا ہے۔ مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (رسول اللہ ﷺ جو کچھ تم کو دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے باز رہو) ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بہت سے ایسے مسائل واحکام حاصل کئے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے۔

بغوی نے بیان کیا کہ یزید بن صہیب فقیر نے کہا خوارج کی رائے نے مجھے فتنہ میں ڈال دیا تھا (یعنی بعض مسائل میں میں ان کا ہم خیال ہو گیا تھا) ایک بار حج کے ارادے سے ایک جماعت کے ساتھ ہم چلے اور مدینہ کی طرف سے گزر ہوا تو وہاں جابر بن عبداللہؓ رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کر رہے تھے اور جہنمیوں کا انہوں نے ذکر کیا تھا، میں نے حضرت جابرؓ سے کہا اے رسول اللہ ﷺ کی صحابی آپ یہ کیا بیان کر رہے ہیں اللہ نے تو فرمایا ہے إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ. كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا. (بے شک تو جس کو آگ میں داخل کردے گا اس کو رسوا کردے گا۔ اور دوزخی جب دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو ان کو دوزخ کے اندر ہی لوٹا دیا جائے گا)۔

حضرت جابرؓ نے فرمایا جوان! تم قرآن پڑھتے ہو میں نے کہا جی ہاں فرمایا کیا تم نے محمدؐ کے مقام محمود کا ذکر پڑھا ہے جس میں آپ کو اللہ کھڑا کرے گا، میں نے کہا جی ہاں فرمایا، بس یہی مقام محمود محمد ﷺ کا مقام ہو گا، جس کی وجہ سے اللہ جس دوزخی کو نکالنا ہو گا۔ نکال دے گا پھر حضرت جابرؓ نے پل صراط کی حالت بیان کی اور پل صراط پر سے لوگوں کے گزرنے کی تشریح کی اور فرمایا کچھ لوگ دوزخ کے اندر سے نکال لئے جائیں گے۔

فصل

شفاعت انبیاءؑ وغیرہ کا بیان

ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت عثمانؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ قیامت کے دن انبیاء شفاعت کریں گے پھر علماء پھر شہداء۔ بزار کی روایت میں اس سے آگے اتنا زائد ہے پھر موذن..... دیلمی نے حضرت ابن عمرؓ کی موقوف روایت نقل کی ہے کہ عالم سے کہا جائے گا اپنے شاگردوں کی شفاعت کر خواہ ان کی تعداد آسمان کے تاروں کو پہنچ جائے۔ ابوداؤد اور ابن حبان نے حضرت ابودرداءؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ شہید اپنے ستر گھر والوں کی شفاعت کرے گا۔ احمد اور طبرانی نے اسی طرح کی حدیث حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت سے اور ابن ماجہ نے حضرت مقدام بن معد یکربؓ کی روایت سے اور بیہقی نے بروایت حسن بصری اور حاکم و بیہقی وہناد نے حضرت حارث بن قیس کی روایت سے اور احمد نے حضرت ابو بردہؓ کی روایت سے اور ہناد نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور احمد و طبرانی و بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو امامہؓ کی روایت سے بیان کی ہے ان سب حضرات نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میری امت کے ایک آدمی کی شفاعت سے قبائل ربیعہ و مضر سے بھی زیادہ

تعداد جنت میں داخل ہو جائے گی۔
بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ دوسرے انبیاءؑ، اولیاء، علماء بھی شفاعت کریں گے۔

ایک شبہ

جب رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے ہر گناہ گار دوزخ سے رہا کر دیا جائے گا اور کوئی دوزخ میں باقی نہیں رہے گا تو پھر دوسرے انبیاءؑ اور اولیاء کی شفاعت کا کیا اثر ہو گا۔

ازالہ

ممکن ہے دوسرے انبیاءؑ کی شفاعت اپنی اپنی امتوں کے لئے مخصوص ہو۔ شفاعت عامہ نہ ہو اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت صرف اپنی امت کے لئے خاص نہ ہو، دوسری امتوں کو بھی شامل ہو رہے انبیاءؑ کے لئے علاوہ دوسرے لوگ تو ممکن ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے درخواست کریں کہ حضور ﷺ اللہ سے شفاعت کر دیں یا رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے ان کو شفاعت کرنے کی اجازت مل جائے گی۔

بیہقی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا تھا کہ شَفَاعَتِي لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِي (میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لئے ہوگی جو مرتکب کبیرہ ہوئے ہوں گے) یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ ملائکہ اہل کبائر کی شفاعت نہیں کریں گے، ہاں چھوٹے گناہوں کی معافی اور لوگوں کے درجات کی ترقی کے لئے شفاعت کریں گے۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ نے فرمایا اول اللہ نے فرمایا وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ اس کے بعد فرمایا عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ اس ترتیب ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد کی نماز کو مقام شفاعت حاصل ہونے میں بڑا دخل ہے۔

ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے پھر آپ کو ہجرت کا حکم دے دیا گیا اور آیات ذیل کا نزول ہوا۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ اور دعا کرو۔ کہو اے میرے رب مجھے خوبی کے ساتھ پہنچانا اور مجھے خوبی کے ساتھ لے جانا۔

مُدْخَلَ صِدْقٍ سے مراد مدینہ اور مُخْرَجَ صِدْقٍ سے مراد مکہ ہے۔ حسن اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ مُدْخَل اور مُخْرَج اسم ظرف ہیں، داخل اور خارج ہونے کی جگہ۔ یہ دونوں مصدر ہیں اس صورت میں آیت کا مطلب اس طرح ہو گا کہ مجھے مدینے میں اس طرح داخل فرما کہ میرے سامنے کوئی ناگوار صورت نہ آئے اور مکہ سے ایسے پسندیدہ طریقہ سے نکال کہ میری قلبی توجہ اور میلان خاطر بھی مکہ کی سکونت کی جانب باقی نہ رہے۔ ضحاک نے تشریح معنی اس طرح کی ہے کہ مجھے مکہ سے امن کی حالت میں نکال کہ مشرک مجھے دکھ نہ پہنچا سکیں اور مدینہ میں اس طرح داخل فرما کر مجھے وہاں اقتدار اعلیٰ حاصل ہو جائے۔ مجاہد نے کہا داخل کرنے سے مراد ہے فریضۂ نبوت کی ادائیگی میں داخلہ اور خارج کرنے سے مراد ہے فرض نبوت کی انجام دہی سے فراغت۔ یعنی جو امر نبوت تو نے میرے سپرد کیا ہے۔ اس میں صدق کے ساتھ مجھے داخل فرما، اور صدق ہی کے ساتھ مجھے اس فرض کی ادائیگی کی توفیق عطا فرما۔ جب میں دنیا سے جاؤں تو نبوت کے فریضے کو کامل طور پر ادا کر چکا ہوں۔ حسن نے کہا مُدْخَلَ صِدْقٍ سے مراد ہے جنت اور مُخْرَجَ صِدْقٍ سے مراد ہے مکہ۔

میں کہتا ہوں جب مُدْخَلَ صِدْقٍ سے مراد جنت ہو تو مُخْرَجَ صِدْقٍ سے دنیا سے جانا اگر مراد لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ بیضاوی نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ مجھے قبر میں خوشگوار طریقے سے داخل فرما اور قیامت کے دن قبر سے عزت کے ساتھ اٹھا، بعض نے اس طرح تشریح مطلب کی، مجھے اپنی طاعت میں داخل فرما اور ممنوعات سے نکال دے۔ بعض نے کہا کسی جگہ میں داخلہ خارجہ ہو یا امر میں بہر حال صدق کا لفظ ذکر کرنے سے یہ مراد ہے کہ مجھے داخل کرتے میں ہو یا خارج

کرنے میں، دونوں صورتوں میں دور خا اور ذو غلانہ بنا۔ دور خا آدمی اللہ کے نزدیک باعزت نہیں ہوتا۔ یا داخل و خارج کرنے سے مراد ہے غار میں داخل کرنا اور وہاں سے نکالنا۔ صدق اور کذب اصل میں کلام خبری کی صفات ہیں۔ کوئی خبر یا اطلاع ہی سچی یا جھوٹی ہوتی ہے۔ لیکن انشاء (یعنی امر، استفہام، نہی وغیرہ) کو بھی کبھی صادق و کاذب کہہ لیتے ہیں۔ لیکن یہ اطلاق مجازی ہوتا ہے انشاء کے اندر اگر خبر کا معنی ہوتا ہے تو اس کو بھی سچا یا جھوٹا کہہ لیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی دریافت کرتا ہے، کیا زید گھر میں ہے۔ یہ جملہ اگرچہ سوالیہ انشائیہ ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے سوال کرنے والا کہہ رہا ہے کہ گھر کے اندر زید کے موجود ہونے نہ ہونے کا مجھے علم نہیں، اس لئے دریافت کر رہا ہوں، پس دریافت کرنا اس بات کو ظاہر کر رہا کہ سوال کرنے والا اپنی لاعلمی کی خبر دے رہا ہے، یہ تو قول اور کلام کے لئے صدق و کذب کا استعمال ہوتا ہے لیکن کبھی صدق و کذب کسی عمل اور فعل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص لڑائی کا حق کامل طور پر ادا کر دے اور خوب لڑے، کوشش میں کمی نہ کرے تو عرب کہتے ہیں هُوَ صَدَقَ فِي الْقِتَالِ۔ اللہ نے فرمایا ہے رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کر رکھا تھا اس کو پورے طور پر ادا کیا۔ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا اللہ نے اپنے رسول کو وہ خواب سچ کر دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ہر عمدہ، اعلیٰ و افضل کام کو صدق کہہ دیا جاتا ہے اور پھر کسی عمل یا چیز کی صدق کی طرف اضافت کر دی جاتی ہے، جیسے فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ۔ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ۔ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ۔ اسی محاورہ کے مطابق اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ ہے یعنی مجھے ایسا دخول و خروج عنایت فرما کہ اگر کوئی اس کو دیکھ کر تعریف کرے تو اس کی تعریف سچی ہو۔

وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝ اور اپنے پاس سے مجھے ایسا غلبہ دینا جس کے ساتھ نصرت ہو۔

مجاہد نے سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا کا ترجمہ کیا کھلی ہوئی غالب دلیل۔ حسن نے کہا، ایسی طاقتور حکومت جس سے مخالفوں پر غلبہ حاصل ہو جائے۔ اور ایسی نمایاں طاقت جس سے دین کا قیام و استحکام ہو جائے۔ اس دعا کے نتیجہ میں اللہ نے فارس اور روم وغیرہ کی حکومتیں عطا فرمانے کا وعدہ فرمالیا (اور چند ہی روز میں اقتدار کامل عطا فرما دیا)۔

قتادہ نے کہا، رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ بغیر اللہ کی مدد کے اقامت دین اور احکام قرآنی کا قیام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ ﷺ نے سلطانِ نصیر کی درخواست کی۔

میں کہتا ہوں اللہ نے آپ کو یہ بتا دیا تھا اور اس بات کا علم عطا فرما دیا تھا کہ اقامت دین کے لئے من جانب اللہ نصرت کی ضرورت ہے اسی لئے حکم دے دیا تھا کہ اللہ سے مدد کی درخواست کریں۔

بعض علماء نے کہا کہ کفر پر اسلام کو فتح یاب بنانے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ نے اللہ سے دلیل واضح اور اقتدار حکومت کی درخواست کی تھی اور اللہ نے آپ ﷺ کی اس دعا کو قبول فرما لیا اور ارشاد فرمایا، فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ اور فرمایا لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔

وَقُلْ اور (اے محمد ﷺ فتح مکہ کے وقت جب آپ شہر میں داخل ہوں تو) کہیے۔

جَآءَ الْحَقُّ حق (یعنی اسلام یا قرآن یا خالص اللہ کی عبادت کا وقت) آگیا۔

وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اور باطل گیا، یعنی شرک برباد ہو گیا، بتوں کی پوجا دور گیا زَهَقَ کا معنی ہے خَرَجَ۔ زَهَقَ رُوْحُهٗ اس کی روح نکل گئی۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ باطل بلاشبہ برباد ہونے والا ہی ہے یعنی باطل اس قابل ہی ہے کہ فنا ہو جائے قائم نہ رہے۔ باطل ہوتا ہی بے بنیاد ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن کعبہ میں داخل ہوئے اس زمانہ میں کعبہ کے گرداگرد

۳۶۰ استھان تھے، اس وقت دست مبارک میں لکڑی تھی، آپ اس لکڑی کی نوک سے ہر بت کو کچوکا دیتے جارہے تھے اور فرماتے جارہے تھے جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۔ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ رواہ البخاری و مسلم والترمذی و النسائی۔ طبرانی نے الصغیر میں اور ابن مردویہ نے الدلائل میں اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ اور قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لئے شفا اور رحمت ہیں۔ یعنی کفر و جہالت کی بیماری کے لئے شفا اور دلوں کی تاریکی کو دور کرنے والی روشنی ہے۔ روحوں کی کثافت کو زائل کرنے کے لئے جلاء ہے۔ قلبی اور نفسانی میل کو صاف کرنے والی ہے اور اندرونی اخلاق رذیلہ کو دفع کرنے والی ہے۔ اس صورت میں مِنَ الْقُرْاٰنِ میں مِنْ بیانیہ ہوگا۔ بعض علماء کے نزدیک مِن تبعیضیہ ہے اور شفاء سے مراد ہے امراض جسمانی کی شفاء یعنی قرآن کا کچھ حصہ مثلاً سورۂ فاتحہ وغیرہ جسمانی بیماری کو دور کرنے والا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا عَلَيْكُمْ بِالشِّفَائَيْنِ الْعَسَلُ وَالْقُرْاٰنُ تم دونوں (اسباب) شفاء کو اختیار کرو شہد اور قرآن (ظاہر ہے کہ شہد بعض جسمانی بیماریوں کی دوا ہے اور شہد کے ساتھ قرآن کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہنا پڑے گا کہ قرآن بھی جسمانی مرض کی شفاء ہے۔ یہ مطلب اور استنباط کمزور ہے۔ مترجم)۔

مومنوں کے لئے رحمت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جو لوگ اس کو مانتے اور اس پر عمل کرتے ہیں ان کو قرآن سے دنیوی اور اخروی فوائد حاصل ہوں گے۔

وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ اور جو ظالم یعنی قرآن کے منکر ہیں ان کے لئے اس سے نقصان اور بڑھے گا۔ کفر اور تکذیب کی وجہ سے ان کے نقصان میں مزید اضافہ ہوگا۔ قتادہ کا قول ہے اس قرآن کے ساتھ جو کوئی بیٹھتا ہے وہ کچھ اس سے لے کر اٹھتا ہے یا کچھ نقصان کر کے۔ اللہ فیصلہ کر چکا ہے کہ یہ قرآن مومنوں کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور کفار کے لئے موجب خسارہ۔

وَاِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ اور آدمی کو جب ہم نعمت عطا کرتے ہیں تو منہ موڑ لیتا ہے۔ نعمت سے مراد ہے جسمانی صحت، مالی وسعت اور نزولِ قرآن۔ اعراض کرنے سے یہ مراد ہے کہ وہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔

وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ اور پہلو پھیر لیتا ہے۔ یعنی اپنی گردن نیوڑا لیتا ہے۔ پہلو کو موڑ لیتا ہے، گویا وہ اس کا ضرورت مند نہیں ہے، مستغنی ہے۔

وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ اور جب اس کو کوئی برائی (ناداری یا بیماری) چھو بھی جاتی ہے تو بالکل نراس ہو جاتا ہے۔ اللہ کی رحمت کا امیدوار بھی نہیں رہتا۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ آپ کہہ دیجئے ہر شخص (شکر گزار ہو یا ناشکرا) اپنے طریقے پر کام کر رہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے شَاكِلَتِهٖ کا ترجمہ کیا اپنی سمت اور اپنے رخ پر جس کی طرف اس کا جھکاؤ ہو، خواہ ہدایت ہو یا گمراہی۔ قتادہ اور حسن نے کہا اپنی نیت پر یعنی جو شخص دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے وہ اپنے عمل سے دنیوی بہبود حاصل ہونے کا خواستگار ہوتا ہے اور جو آخرت کا طلبگار ہوتا ہے، وہ اپنے عمل میں اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی بہتری کی نیت رکھتا ہے۔ مقاتل نے شَاكِلَتِهٖ کا ترجمہ کیا جبلت سرشت۔ فراء نے کہا خلقی اور سرشتی طریقے پر ہر شخص کام کرتا ہے۔

قتیبی نے طبیعت اور پیدائشی حالت کہا ہے۔ الفاظ مختلف ہیں مطلب سب کا ایک ہے، سب اقوال میں وہ پیدائشی صلاحیت واستعداد مراد ہے جو اللہ نے ہر شخص کے اندر رکھ دی ہے، یہی مفہوم ہے رسول اللہ ﷺ کے اس قول کا کہ ہر شخص کو اسی بات کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ متفق علیہ عن علی بن ابی طالب مرفوعاً۔

حضرت ابودرداءؓ کا بیان ہے ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے اور باہم گفتگو کر رہے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو سچ مان لینا، لیکن اگر یہ سنو کہ کوئی شخص اپنی سرشت سے بدل گیا ہے تو نہ ماننا کیونکہ وہ (عارضی طور پر اگرچہ اپنی سرشت کو چھوڑے ہوئے نظر آئے گا۔ لیکن بالآخر) اسی جبلت کی طرف لوٹ آئے گا جس پر اس کی تخلیق ہوگی۔ رواہ احمد۔

استعداد فطری کیا ہے

ہر شخص کے اندر ایک خاص کیفیت ابتداء آفرینش سے موجود ہے جو پیدا کرنے والے کی صفت کا عکس اور پرتو ہے، خالق کے اندر ہادی ہونے کی صفت بھی ہے اور مُضِل ہونے کی بھی، جس صفت کا پرتو جس شخص پر پڑتا ہے وہی کیفیت فطرتاً اس شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر ہر شخص کی مزاجی ترکیب چار عناصر سے ہوئی ہے اور عناصر کی طبیعتوں میں تضاد ہے پس جس عنصر کی خاصیت کا جس شخص پر فطرتاً غلبہ ہوتا ہے اسی کے مناسب فطری خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اجزاء زمین کی خصوصیات بھی گوناگوں ہیں۔ سرخ، سفید، سیاہ اور متوسط، نرم، سخت، بری، اچھی اس اختلاف ارضی کی وجہ سے بھی اختلاف تخلیقی ہو جاتا ہے ایک حدیث کا مفہوم بھی یہی ہے۔ پس فاعل مطلق کی خصوصی صفات کی اثر اندازی اور مادہ تخلیقی کی مختلف طور پر اثر پذیری سے جو پیدائشی صلاحیت میں اختلاف ہو جاتا ہے یہی استعداد فطری کا اختلاف ہے۔

بعض علماء نے عَلٰی شَاکِلَتِهٖ کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ ہر شخص اسی راستہ پر چلتا ہے جو اس نے اپنے لئے اختیار کر لیا ہوتا ہے۔

بیضاوی نے کہا ہر شخص اس راستہ پر چلتا ہے جو اس کی حالت کے مناسب ہوتا ہے گمراہی کا ہو یا ہدایت کا یا اس راستہ پر چلتا ہے جو اس کے جوہر روح اور ان احوال کے مناسب ہوتا ہے جو اس کے مزاج جسمانی کا تقاضا ہیں۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے شَاکِلَۃ شکل، صورت، مثل۔ ہر وہ حالت جو مناسب ہو۔ کسی چیز کی محسوس یا وہمی صورت، سمت، نیت، طریقہ مذہب۔

فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا۠ سو تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون زیادہ صحیح راستہ پر ہے، یعنی کس کے عقیدے اور عمل کا راستہ حق تک پہنچانے والا ہے اور کس کا عملی اور اعتقادی راستہ ٹیڑھا ہے اور کجی ہے تو کتنی ہے کم یا زیادہ۔

بخاریؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ کے کھیتوں میں ایک بار جا رہے تھے، میں بھی ساتھ تھا، آپ کے پاس کھجور کی ایک شاخ تھی آپ اس پر ٹیک لگائے چل رہے تھے، چلتے چلتے یہودیوں کی ایک جماعت کی طرف سے گزرے۔ حضور ﷺ کو دیکھ کر یہودی باہم کہنے لگے، ان سے روح کے متعلق دریافت کرو۔ ایک شخص بولا کچھ مت پوچھو، کہیں ایسا جواب نہ دے دیں جو تم کو ناگوار ہو، دوسرے نے کہا ہم ضرور پوچھیں گے، چنانچہ ایک یہودی نے کھڑے ہو کر روح کے متعلق حضور ﷺ سے دریافت کیا، آپ کچھ دیر خاموش رہے، میں سمجھ گیا کہ وحی ہونے والی ہے میں بھی کھڑا ہو گیا، کچھ دیر میں جب وحی کی حالت دور ہو گئی تو آپ ﷺ نے مندرجہ ذیل آیت تلاوت فرمائی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ اور یہ لوگ آپ سے (بطور امتحان) روح کے متعلق پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے، یعنی روح اس کائنات میں سے ہے جس کی ایجاد بغیر مادہ کے صرف لفظ کن سے ہوئی ہے۔ اعضائے جسم کی پیدائش کی طرح اس کی پیدائش کسی مادی اصل سے نہیں ہے۔ سوال کرنے والوں کے سمجھ کے اندازے کے مطابق جواب دے دیا گیا جس سے اتنا معلوم ہو گیا کہ دوسری مادی مخلوق کی طرح روح کی ہستی نہیں ہے، بلکہ سب سے الگ ہے لیکن یہودیوں نے تو روح کی حقیقت دریافت کی تھی اور حقیقت روح اس

جواب سے واضح نہیں ہوئی۔ اس لئے آگے فرمایا۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ اور (غیر مادی) اشیاء کا تم کو علم نہیں دیا گیا ہے مگر تھوڑا سا۔ یعنی اتنا جتنا تم اپنے حواس کے ذریعہ حاصل کر سکو۔ نظری حقائق کا علم بدیہیات سے حاصل ہوتا ہے اور بدیہیات کا علم احساسِ جزئیات سے (اس طریقے کے علاوہ نظری علوم حاصل کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں) اسی لئے کہا گیا ہے کہ جس نے حس کو کھو دیا اس نے علم کو کھو دیا، یہی وجہ ہے کہ اکثر غیر محسوس چیزوں کے اجزاء اور ذاتیات تک جس کی رسائی نہیں ہے ان کا علم محض امتیازی اوصاف اور خواص کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور الفاظ کی وضع یا تو محسوس چیزوں کے لئے کی جاتی ہے یا ان نامحسوس چیزوں کے لئے جن کے حصولِ علمی کا ذریعہ محسوس اشیاء ہوتی ہے۔ فرعون نے جب حضرت موسیٰؑ سے کہا مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ رب العالمین کون۔ اس کی کیا حقیقت ہے تو جواب میں حضرت موسیٰؑ نے رب العالمین کے بعض خصوصی اوصاف کا ذکر کیا (حقیقت نامعلوم تھی اس کو بتانے کے لئے الفاظ ہی نہ تھے اس لئے حقیقت کا کامل بیان نہ کر سکے) لیکن اس آیت سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ حقیقت روح کا علم رسول اللہ ﷺ اور بعض مخصوص روشن بصیرت رکھنے والے اولیاء کے لئے بھی ناممکن تھا کیونکہ انبیاءؑ اور مخصوص اولیاء کا علم کسبی نہیں ہوتا، ان کو علم کے لئے وساطت حواس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا علم محض الہامی اور انکشافی ہوتا ہے۔ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ نورانی اور لمعانی ہوتا ہے وہ دلوں کے کانوں سے وہ آوازیں سنتے ہیں جو چہرے کے کانوں سے سنائی نہیں دیتیں اور چشم بصیرت سے وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو چشم بصر سے نہیں دیکھی جا سکتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ نے فرمایا ہے میرا بندہ نوافل کے ذریعہ سے برابر میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ مجھے اس سے محبت ہو جاتی ہے اور جب مجھے اس سے محبت ہو جاتی ہے تو میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے (یعنی اس کا سننا میرا سننا اور اس کا دیکھنا میرا دیکھنا ہو جاتا ہے، وہ کسی چیز کو ہاتھ سے پکڑتا ہے تو گویا میں پکڑتا ہوں اور وہ اپنے قدموں سے چلتا ہے تو گویا میں چلتا ہوں۔ مترجم)

اصحابِ بصیرت کو حقیقت روح کا علم ہوتا ہے۔ اربابِ انکشاف نے صراحت کی ہے کہ روح سفلی ایک ہے۔ جس کو نفس کہا جاتا ہے اور علوی ارواح پانچ ہیں قلب، روح، سر، خفی، اخفی، ان سب میں ذاتی فرق بھی ہے اور حقائق بھی۔ ہر ایک کی ذات دوسرے کی ذات اور ہر ایک کے اوصاف دوسرے کے اوصاف سے ممتاز ہیں کسی کا کسی سے اشتباہ نہیں۔ لیکن بعض لوگوں کو ان میں باہم اشتباہ ہو جاتا ہے بلکہ یہ تمام علوی ارواح اتنی لطیف ہیں کہ مراتب وجوب کے ساتھ ان کا اشتباہ ہو جاتا ہے اسی اشتباہ کی وجہ سے بعض لوگ کہہ اٹھے تھے، میں نے تیس برس روح کی عبادت کی۔ تیس برس کے بعد اللہ نے روح کی حقیقت کا اور روح کے ممکن و حادث ہونے کا اس پر انکشاف کر دیا اور وہ بول اٹھا۔ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ۔

ایک شبہ

ابن مردویہ نے عکرمہؒ کی روایت سے (مرسلاً) بیان کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے آیت مذکورہ صحابہؓ کے سامنے پڑھی تو صحابہؓ نے عرض کیا یہ (حکم یعنی روح کا علم نہ ہونا) تو ہمارے لئے مخصوص ہے (آپ کو تو روح کی حقیقت معلوم ہوگی) فرمایا نہیں بلکہ ہم بھی اور تم بھی سب ہی مخاطب ہیں کسی کو بھی حقیقت روح معلوم نہیں صحابہؓ نے عرض کیا، عجیب بات ہے ایک وقت تو آپ فرماتے ہیں وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (جس کو حکمت عطا کی گئی اس کو خیر کثیر عطا کر دی گئی) اور دوسرے وقت آپ یہ بات فرماتے ہیں (کہ حقیقت روح مجھے معلوم نہیں۔ روح کو جاننے سے زیادہ حکمت اور خیر کثیر اور کیا ہوگی) اس پر آیت وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ الخ نازل ہوئی۔ یہ روایت بتا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی روح کی حقیقت معلوم نہ تھی۔

ازالہ

یہ روایت اگر پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا کا خطاب عام ہے۔ صحابہ اور رسول سب ہی مخاطب ہیں اور سب ہی کو روح کا تھوڑا سا علم عطا کیا گیا ہے اور یہ بات ہے بھی صحیح۔ انبیاء اور ملائکہ کے علوم ہوں یا دوسری مخلوق کے سب کے علوم کی مقدار اللہ کے علم کے مقابلہ میں نہایت حقیر اور قلیل ہے آیت وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ الخ سے اس کی تائید ہو رہی ہے لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں کہ جو حکمت و معرفت انبیاءؑ اور ان کے مخلص متبعین کو عطا فرمائی گئی ہے (جن کے اندر حقیقت روح کا علم بھی داخل ہے) وہ خیر کثیر نہیں ہے یقیناً جو حکمت انبیاءؑ کو عطا کی گئی ہے (گو وہ اللہ کے علم کے مقابلے میں کتنی ہی حقیر و قلیل ہو پھر بھی) خیر کثیر ہے انسان کے ظاہری و باطنی کمال کی جامع ہے کوئی انسانی کمال اس سے خارج نہیں ہے۔

فائدہ

آیت مذکورہ کی جو تشریح اور شان نزول ہم نے بیان کی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے، لیکن بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ قریش نے جمع ہو کر باہم مشورہ کیا اور کہا محمد ﷺ ہم میں پلے بڑھے ہیں اور ہمیشہ امانت و سچائی کے حامل رہے ہیں کبھی ہم نے کسی جھوٹ کا ان پر شبہ بھی نہیں کیا، لیکن اب انہوں نے وہ دعویٰ کیا جو تم لوگ جانتے ہو، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو مدینہ کے یہودیوں کے پاس بھیج کر دریافت کراؤ، وہ اہل کتاب ہیں دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔ چنانچہ چند آدمیوں کو یہودیوں کے پاس مدینہ میں بھیجا گیا، لوگوں نے جا کر یہودیوں سے دریافت کیا یہودیوں نے جواب دیا، محمدؐ سے جا کر تین باتیں پوچھو، اگر وہ تینوں کا جواب دے دیں یا کسی کا جواب نہ دیں تو سمجھ لو وہ نبی نہیں ہیں اور اگر دو باتوں کا جواب دیں اور تیسری کا جواب نہ دیں تو سمجھ لو وہ نبی ہیں۔

(۱) ان سے دریافت کرو وہ نوجوان کون تھے جنہوں نے بھاگ کر کہیں پناہ پکڑی تھی ان کا کیا واقعہ تھا۔

(۲) وہ کون شخص تھا جو مشرق اور مغرب تک پہنچ گیا تھا اس کا کیا واقعہ تھا۔

(۳) روح کیا ہے۔ اس کے متعلق بھی جا کر دریافت کرو۔

قریش نے رسول اللہ ﷺ سے یہ تینوں سوال کئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں کل کو تمہارے سوالوں کے جواب دے دوں گا۔ آپ ﷺ نے انشاء اللہ نہیں فرمایا، اس لئے وحی آنے میں تاخیر ہو گئی۔ مجاہد کے قول میں بارہ دن، بعض اقوال میں پندرہ دن اور عکرمہ کے نزدیک چالیس دن تک تاخیر وحی کی صراحت آئی ہے۔ اہل مکہ کہنے لگے، محمد ﷺ نے ہم سے کل کا وعدہ کیا تھا، لیکن اتنی مدت ہو گئی کچھ بھی نہیں بتایا، ادھر نزول وحی میں تاخیر ہوئی اور ادھر اہل مکہ ایسی باتیں کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کا رنج ہوا (اور سخت رنج ہوا) اسی اثناء میں اچانک ایک روز جبرئیلؑ یہ وحی لے کر آئے وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ پھر اول سوال کے متعلق نازل ہوا اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا۔ دوسرے سوال کے جواب میں نازل ہوا وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ الخ اور روح کے متعلق ارشاد ہوا قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ۔ ترمذی نے یہ قصہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ابن کثیر نے دونوں حدیثوں کا تعارض دور کرنے کے لئے تکرار نزول کا قول اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی اسی قول کو پسند کیا ہے اور اتنا زائد بھی لکھا ہے یا یہودیوں کے سوال کے وقت رسول اللہ ﷺ خاموش رہے اس امید پر کہ شاید بیان میں کچھ زیادتی کر دی جائے اگر دونوں حدیثوں میں تطبیق کی کوشش نہ کی جائے تو لازمی طور پر کسی روایت کو ترجیح دینی پڑے گی اور

ظاہر ہے کہ صحاح کی روایت ہی قابل ترجیح ہے۔ اس کی علاوہ بخاری کی روایت کے راجح ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ (جو راوی ہیں) یہودیوں کے وقت اسی جگہ موجود تھے اور بغوی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کی دوران قصہ میں موجودگی مذکور نہیں۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی بھی نسبت کی ہے کہ جس روح کے متعلق سوال کیا گیا تھا اس سے مراد حضرت جبرئیلؑ تھے (یعنی جبرئیلؑ کے متعلق یہودیوں نے دریافت کیا تھا) حسن اور قتادہ کا بھی یہی قول منقول ہے۔

میں کہتا ہوں ضحاک کا قول عبد بن حمید اور ابو الشیخ نے اور ایک روایت میں حضرت علیؓ کا قول بغوی نے نقل کیا ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے جس کے ستر ہزار چہرے ہیں اور ہر چہرے میں ستر ہزار زبانیں ہیں اور تمام زبانوں سے وہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے، مجاہد نے کہا روح ایک اور مخلوق ہے جو ہیں تو آدمی کی شکل کے، ان کے ہاتھ بھی ہیں، پاؤں بھی ہیں اور وہ کھانا بھی کھاتے ہیں لیکن وہ آدمی نہیں ہیں فرشتے بھی نہیں ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا عرش کے سوا اللہ نے روح سے بڑی اور کوئی مخلوق پیدا نہیں کی اگر وہ چاہے تو ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں اور ان کی ساری موجودات کا ایک لقمہ بنا کر نگل سکتا ہے، اس کی جسمانی ساخت تو فرشتوں جیسی ہے اور چہرے کا ڈول آدمیوں کے چہروں کی طرح ہے، قیامت کے دن وہ عرش کے دائیں جانب کھڑا ہوگا اور تمام مخلوق سے زیادہ اللہ کے قریب ستر حجابوں کے پاس موجود ہوگا اور اہل توحید کی شفاعت کرے گا۔ اگر اس کے اور ملائکہ کے درمیانی نور کا حجاب حائل نہ ہو تو آسمانوں والے اس کے نور سے سوختہ ہو جائیں۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر نے عکرمہ کا قول بیان کیا کہ روح فرشتوں سے بھی بڑی مخلوق ہے اور کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ روح ضرور ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ روح سے مراد قرآن ہے اور مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کا معنی ہے مِنْ وَحْیِ اللّٰہِ۔ بعض کے نزدیک حضرت عیسیٰ مراد ہیں۔ اس قول پر آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ عیسیٰؑ ویسے نہیں جیسا یہود ان کو جانتے ہیں اور ان کی والدہ پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں اور نہ ابن اللہ ہیں جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے بلکہ ان کی پیدائش محض اللہ کے حکم سے کلمۂ کن سے بغیر باپ کے ہوئی تھی۔

آیت مندرجہ بالا میں اللہ نے سارے جہان کے علم کا اپنے علم کے مقابلے میں قلیل اور حقیر ہونا ظاہر فرما دیا، آئندہ آیت میں رسول اللہ ﷺ کو کافروں کی طرف سے پہنچنے والے دکھ پر صابر رہنے کی تلقین فرمانے کی غرض سے نعمت وحی کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾

اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر وحی ہم نے آپ کے پاس بھیجی ہے سب سلب کر لیں پھر (اس کو واپس لانے کے لئے) آپ کو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی نہ ملے۔ یعنی اگر ہم چاہیں تو اس قرآن کو واپس لے لیں اور لوگوں کے سینوں سے اس کو نکال دیں اور تحریروں سے مٹا دیں، پھر آپ کو کوئی ایسی ہستی نہیں ملے گی جو ہم سے قرآن واپس لینے کی ذمہ داری لے سکے۔

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ مگر یہ آپ کے رب کی رحمت ہے (کہ اس نے ایسا نہیں کیا) اس آیت کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے (۱) مگر اللہ کی رحمت اگر ہو تو وہ ہی واپس دلوا سکتی ہے (۲) استثناء منقطع ہے، یعنی اللہ کی رحمت نے اس قرآن کو باقی رکھا ہے تمہارے دلوں میں تحریروں میں قائم رکھا ہے، اس مطلب پر اللہ کی طرف سے احسان ہونے کی دوہری صراحت کی گئی ہے، قرآن کا نازل کرنا اور پھر اس کو باقی رکھنا۔ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾

واقعہ یہ ہے کہ اللہ کا فضل آپ پر بڑا ہے کہ اللہ نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا اور اپنی کتاب نازل فرمائی، پھر اس کو تحریروں اور دلوں میں جمع کر لیا اور لوگوں سے بیان کرنے کا حکم دیا اور مقام محمود اور حوضِ کوثر آپ کو عطا فرمائی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا، قیامت سے پہلے قرآن اٹھالیا جائے گا۔ قبل اس کے کہ قرآن اٹھالیا جائے تم اس کو پڑھا کرو (یعنی اس کو سمجھ لو اور اس پر عمل کرو) ایک شخص کہنے لگا یہ تحریریں تو اٹھائی جا سکتی ہیں (کہ نئی نقلیں کرنا لوگ چھوڑ دیں اور پرانی تحریریں بوسیدہ فرسودہ ہو کر مٹ جائیں۔ مترجم) لیکن جو قرآن سینوں میں ہو گا وہ کیسے اٹھالیا جائے گا، فرمایا لوگ رات گزاریں گے سینوں میں قرآن ہو گا پھر اٹھالیا جائے گا صبح کو اٹھیں گے تو کچھ بھی یاد نہ ہو گا اور نہ لکھے ہوئے کاغذوں میں کچھ ملے گا آخر شاعری میں لگ جائیں گے (اور قرآن کی جگہ شاعری لے لے گی)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ نے فرمایا قیامت بپا ہونے سے پہلے قرآن لوٹ کر وہیں چلا جائے گا، جہاں سے اترا تھا، شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح عرش کے گرد اگرد اس کی گن گناہٹ ہو گی، اللہ فرمائے گا کیوں کیا بات ہے قرآن کہے گا اے میرے مالک مجھے پڑھا تو جاتا ہے مگر مجھ پر عمل نہیں کیا جاتا۔ بغوی نے یہی بیان کیا ہے۔

صحیحین میں حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ علم کو اس طرح قبض نہیں کرے گا کہ لوگوں کے سینوں سے کھینچ کر نکال لے بلکہ علماء کو قبض کر لے گا اور جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے جو بغیر جانے فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔

امام احمد اور ابن ماجہ نے حضرت زیاد بن لبیدؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض چیزوں کا تذکرہ کیا اور فرمایا، ایسا اس وقت ہو گا جب علم جاتا رہے گا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ علم کیسے جاتا رہے گا ہم قرآن پڑھیں گے اور اپنی اولاد کو پڑھائیں گے اور ہماری اولاد اپنے بچوں کو پڑھائے گی اور یہ سلسلہ یوں ہی قیامت تک چلتا رہے گا۔ فرمایا، زیادؓ تجھ پر تیری ماں روئے، میں تو تجھے مدینہ کے دانش مند آدمیوں میں سے سمجھتا تھا، کیا یہودی اور عیسائی توریت وانجیل نہیں پڑھتے لیکن توریت وانجیل کے احکام پر عمل نہیں کرتے (یہی حالت مسلمانوں کی ہو جائے گی) ترمذی نے یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔ اور دارمی نے حضرت ابوامامہ کی روایت سے بھی یونہی بیان کیا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ میں نے خود حضور ﷺ کو فرماتے سنا علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ فرائض علم میراث سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیونکہ میں (ہمیشہ نہیں رہوں گا) وفات پا جانے والا آدمی ہوں اور علم بھی قبض کر لیا جائے گا اور فتنے پیدا ہو جائیں گے فریضہ (ترکۂ میت کی تقسیم) کے متعلق دو آدمیوں میں اختلاف ہو گا تو کوئی تیسرا آدمی ان دونوں کا فیصلہ کرنے والا نہ ملے گا (یعنی کوئی عالم ہی نہیں رہے گا کہ فیصلہ کر سکے) رواہ الدارمی والدار قطنی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اسی حدیث کو سن کر قرآن کے تحریروں سے زائل ہو جانے اور سینوں سے فراموش ہو جانے کا ذکر فرمایا۔

صحیحین کی حدیث سے ظاہر ہو رہا ہے کہ قبض علم کی صورت یہ ہو گی کہ علماء نہیں رہیں گے، یہ مطلب نہیں کہ سینوں کے اندر سے قرآن نکال لیا جائے گا، حضرت زیادؓ کی روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ قبض علم کا معنی صرف یہ ہے کہ علم پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ توفیق عمل ختم ہو جائے گی۔ ان تینوں احادیث وروایات کے باہم تعارض کو دور کرنے کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ اول علم کے مطابق عمل کی توفیق جاتی رہے گی۔ پھر علماء کی قلت ہو جائے گی۔ چنانچہ یہ زمانہ قلت علماء کا ہی ہے پہلے علماء بہت تھے، پھر عمل میں کمزوری آئی، پھر تعلیم و تعلم میں کمی ہوئی اور علماء کم ہو گئے۔

سعید یا عکرمہ کی وساطت سے ابن جریر اور ابن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ سلام بن مشکم یہودیوں کی ایک جماعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ارکان جماعت کے نام راوی نے بیان کئے تھے۔ اور عرض کیا ہم آپ کا اتباع کس طرح کر سکتے ہیں آپ نے تو ہمارا قبلہ بھی چھوڑ دیا اور جو کچھ آپ لائے ہیں یعنی (قرآن) اس میں توریت کی طرح ہم کو کوئی ربط نظر نہیں آتا، ہم پر کوئی ایسی کتاب اتارو جس کو ہم پڑھیں اور اس کی حقانیت وصداقت کو پہچان لیں، ورنہ جیسا آپ نے بیان کیا ہے ایسا تو ہم بھی پیش کر سکتے ہیں، اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۝۸۸

آپ کہہ دیجئے کہ اگر (سب) انسان اور جنات متفق ہو کر ایسا قرآن لانے کے لئے جمع ہو جائیں تو اس جیسا قرآن نہیں لا سکیں گے خواہ (باہم مل کر ایک) دوسرے کے مددگار ہو جائیں (اور سب مل کر کوشش کریں) یعنی اگرچہ یہ لوگ بڑے بڑے بلیغ، زبان دان، شاعر اور خالص عرب ہیں لیکن بلاغت، حسن ترتیب اور محاسن معنوی کے لحاظ سے قرآن جیسی عبارت نہیں پیش کر سکتے۔ بغوی نے لکھا ہے یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کافروں نے کہا تھا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسا کلام کہہ لیں۔ اللہ نے اس آیت میں کافروں کے اس قول کو غلط قرار دیا، یہ اللہ کی طرف سے ایک معجزہ تھا کہ دیسا ہی ہوا جیسا اس آیت میں دعویٰ کیا گیا تھا۔ باوجود انتہائی کوشش کے کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ بھی مقابلہ میں قرآن جیسی نہیں پیش کر سکے۔

بیضاوی نے لکھا ہے آیت میں ملائکہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ملائکہ کوئی کلام قرآن کی طرح اپنا بنایا ہوا پیش بھی کر دیں، تب بھی یہ قرآن انسانوں اور جنات کے لئے تو معجزہ رہے گا اور اس کے معجزہ ہونے میں فرق نہیں آئے گا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ ملائکہ کے توسط سے تو یہ قرآن پہنچا ہی ہے (انسان اور جن کو وساطت میں کوئی دخل نہیں ہے) میں کہتا ہوں قرآن کی مانند کلام پیش کرنے کی دعوت کا یہ معنی ہے کہ خود بنا کر لاؤ جس میں وحی خداوندی کو کوئی دخل نہ ہو۔ اور فرشتے خود ایسا کلام لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے جس کے خالق وہ خود ہوں اور وہ غیر مخلوق کلام کی طرح ہو، کلام اللہ کے مقابلہ میں کلام بنانے کی کوشش تو کفر ہے اور ملائکہ سے کفر و انکار کا ظہور ممکن نہیں، وہ معصوم ہیں۔

یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ آیت سابق آیت ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا کے مفہوم کی تاکید ہو۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ٘ اور ہم نے لوگوں کے سمجھانے کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کا عمدہ مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے۔

صَرَّفْنَا یعنی بار بار، طرح طرح سے وضاحت اور تاکید کر کے ہم نے بیان کیا۔

مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ہر مقصد اور معنی، خبر، تمثیل، احکام، وعدہ، وعید وغیرہ۔

مَثَلٍ کہاوت اپنے اندر ندرت رکھتی ہے قرآن کے اندر بھی ندرت ہے حسن ہے، دل نشینی ہے، یہ بھی ان اوصاف میں مثل کی طرح ہے۔

فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا۝۸۹ پھر بھی اکثر لوگ بے انکار کیے نہ رہے۔ یعنی اکثر لوگوں نے سوائے کفر و انکار کے قرآن کی ہدایت میں سے کسی بات کو قبول کرنا پسند نہیں کیا۔

بغوی نے بوساطت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کا مندرجہ ذیل بیان نقل کیا ہے کہ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب اور قبیلہ عبدالدار کا ایک اور آدمی (بقول بغوی نضر بن حارث) اور ابوالبختری، اسود بن المطلب، زمعہ بن اسود، ولید بن مغیرہ، ابو جہل بن ہشام، عبداللہ بن ابی امیہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل، نبیہ بن حجاج، منبہ بن حجاج اور ان کے ساتھ کچھ اور لوگ سب کے سب غروب آفتاب کے بعد کعبہ کی پشت کے پاس جمع ہوئے اور باہم مشورہ کیا کہ کسی کو محمد ﷺ کے پاس بھیج کر ان کو بلواؤ اور ان سے بات چیت کرو اور جھگڑا طے کر لو تاکہ اتمام حجت ہو جائے اور پھر تم جو کچھ کرو تم کو معذور سمجھا جائے، چنانچہ ایک شخص کو بھیج کر یہ پیام کہلوایا کہ تمہاری قوم کے سردار تم سے گفتگو کرنے جمع ہوئے ہیں آکر بات چیت کر لو۔ رسول اللہ ﷺ کو خیال ہوا کہ لوگوں کی رائے میں کوئی نئی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے آپ تو دل سے چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کو ہدایت ہو جائے پیام ملتے ہی فوراً چلے آئے جب آکر بیٹھ گئے تو حاضرین نے کہا محمد ﷺ ہم نے آدمی بھیج کر تم کو اس غرض سے بلوایا ہے کہ تمہارے متعلق ہم حجت تمام کر دیں کوئی عربی شخص آج تک اپنی قوم پر وہ مشکلات

نہیں لایا جو تم اپنی قوم پر لائے ہو، تم نے اسلاف کو گالیاں دیں، ان کے مذہب کو برا کہا، اہل عقل کو سبک سر قرار دیا، ان کے معبودوں کو برا بھلا کہا، جماعت میں پھوٹ ڈال دی، کوئی ایسی قبیح بات باقی نہیں جو تم نے اپنے اور ہمارے درمیان پیدا نہ کردی ہو اگر اس چیز (قرآن اور اسلام) کو پیش کرنے سے تمہارا مقصد حصول زر ہے تو ہم آپس میں چندہ کر کے تم کو اتنا مال دینے کو تیار ہیں کہ تم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ۔ اور اگر تم عزت کے طلبگار ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بنالیں گے اور حکومت چاہتے ہو تو اپنا حاکم بھی تم کو قرار دے سکتے ہیں اور اگر کوئی جن تم پر مسلط ہو گیا ہے جو یہ کلام تم کو بتاتا ہے اور تم اس کو لوٹا نہیں سکتے تو ہم تمہارے علاج کے لئے اپنا مال خرچ کرنے کو تیار ہیں (کسی کاہن یا عامل کو روپیہ دے کر اس کا اتار کرا دیں گے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جتنی باتیں تم نے کہیں ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ میں یہ قرآن پیش کر کے نہ زر کا طلبگار ہوں، نہ عزت و سیادت کا، نہ حکومت و اقتدار کا، مجھے تو اللہ نے تمہارے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور مجھے ایک کتاب عطا فرمائی اور مجھے حکم دیا ہے کہ ماننے والوں کو جنت کی خوش خبری دے دوں اور (نہ ماننے والوں کو دوزخ سے) ڈراؤں، اب میں اللہ کا پیام پہنچا چکا اور تم کو نصیحت کر چکا اگر مان لوگے تو یہ دنیا اور آخرت میں تمہاری خوش نصیبی ہوگی۔ رد کر دو گے تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا اور منتظر رہوں گا کہ اللہ میرا اور تمہارا کیا فیصلہ کرتا ہے۔ کہنے لگے، محمد جو کچھ ہم نے پیش کیا اگر تم کو وہ قبول نہیں تو اپنی پیغمبری کا ثبوت پیش کرو تم واقف ہو کہ ہماری یہ بستی بہت تنگ ہے ہر طرف سے پہاڑ گھیرے ہوئے ہیں ہم اس کو کسی طرف بڑھا نہیں سکتے اور ہمارے پاس مال بھی سب (یعنی اہل یمن و شام) سے کم ہے اور ہماری زندگی بھی بہت زیادہ دکھی ہے پس تم اپنے رب سے درخواست کر کے ان پہاڑوں کو جنہوں نے ہماری بستی کو تنگ کر رکھا ہے یہاں سے ہٹوا دو کہ ہمارا یہ شہر پھیل جائے اور شام و عراق کی طرح ہمارے ملک میں بھی ہمارے لئے دریا بہا دو اور یہ بھی اپنے رب سے کرا دو کہ ہمارے آباء و اجداد زندہ ہو جائیں جن میں قصی بن کلاب (قریش کا مورث اعلیٰ) بھی ضرور ہو وہ بڑا سچا آدمی تھا، پھر ہم ان سب سے دریافت کریں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے یا جھوٹ اگر وہ تمہاری تصدیق کر دیں گے تو ہم بھی تم کو سچا مان لیں گے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے اس لئے نہیں بھیجا گیا ہے۔ جو پیام مجھے دے کر بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا اگر مان لوگے تو دنیا و آخرت میں یہ تمہاری خوش نصیبی ہوگی قبول نہ کرو گے تو میں اللہ کے حکم کے انتظار میں صبر کروں گا۔ کہنے لگے اچھا اگر تم یہ نہیں کرتے تو اپنے رب سے کہہ کر اتنا ہی کرا دو کہ وہ تمہاری تصدیق کرنے کے لئے ایک فرشتے کو بھیج دے اور تم کو کچھ باغ اور سونے چاندی کے خزانے دے دے کہ جس تکلیف اور افلاس میں ہم تم کو دیکھ رہے ہیں اس سے تم بے غم ہو جاؤ، تم بازاروں میں کھڑے ہماری طرح روزی کی جستجو میں لگے رہتے ہو پھر اس کی فکر تم کو نہ رہے، حضور ﷺ نے فرمایا اللہ نے مجھے اس لئے نہیں بھیجا، مجھے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے کہنے لگے اچھا تو ہمارے اوپر آسمان کو ہی گروا دو کیونکہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تمہارا رب اگر چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ اختیار اللہ کو ہے اگر وہ تمہارے ساتھ ایسا کرنا چاہے گا تو کر دے گا، ایک شخص بولا، ہم تو تمہاری بات اس وقت تک نہ مانیں گے، جب تک اللہ اور فرشتوں کو تم ہمارے سامنے لا کر شہادت نہ دلوا دو۔ یہ بات سن کر رسول اللہ ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ آپ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کا لڑکا عبداللہ بن ابی امیہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور راستہ میں کہنے لگا محمد ﷺ! تمہاری قوم نے چند باتیں تمہارے سامنے رکھیں اور تم نے کسی بات کو قبول نہیں کیا پھر انہوں نے چند باتیں طلب کیں جن سے معلوم ہو جاتا کہ اللہ کے ہاں تمہارا مرتبہ خصوصی ہے تم نے ان کو بھی نہ مانا پھر انہوں نے تم سے کہا کہ جس عذاب سے تم ڈرا رہے ہو وہ جلد لے آؤ تم نے ایسا بھی نہیں کیا اب بخدا میں تمہاری اس بات کا صرف اس وقت ہی یقین کر سکوں گا کہ تم میری نظر کے سامنے سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جاؤ۔ پھر میرے سامنے وہاں سے ایک کھلی ہوئی کتاب لے کر آ جاؤ اور تمہارے ساتھ چار فرشتے بھی آئیں جو تمہاری تصدیق کریں۔ اور میرا تو خیال ہے کہ اگر تم ایسا کر بھی گزرو گے تب بھی میں تمہاری تصدیق نہیں کر سکوں گا۔ کافروں کی اتنی نفرت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ غمگین ہو کر اپنے گھر لوٹ آئے اور آیات ذیل بَشَرًا رَّسُوْلًا تک نازل ہوئیں۔

ابن جریر نے بطریق ابن اسحاق ایک مصری شیخ (مجہول الاسم) کی وساطت سے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے اور سعید بن منصور نے بھی سعید بن جبیر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ان آیات کا نزول حضرت ام سلمہ کے بھائی عبداللہ بن امیہ کے متعلق ہوا صاحب لباب النقول نے لکھا ہے یہ روایت مرسل ہے مگر صحیح ہے۔ سابق روایت میں جو ابہام تھا اس کی توضیح اس سے ہو جاتی ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ　　اور (کفار مکہ نے) کہا کہ ہم ہرگز آپ کا قول سچا نہیں مانیں گے۔ یعنی قرآن کا معجز ہونا ان کو ثابت ہو گیا اور دوسرے معجزات بھی دیکھ لئے، پھر بھی از راہ عناد انہوں نے کہا۔

حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝۹۰ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝۹۱　　جب تک آپ مکہ کی زمین سے ہمارے لئے کوئی چشمہ جاری نہ کردیں، یا خاص آپ کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو پھر اس باغ کے بیچ بیچ میں جگہ جگہ بہت سی نہریں آپ جاری کردیں۔

الْاَرْضِ یعنی ارض مکہ۔ يَنْۢبُوْعٌ ایسا چشمہ جو کبھی خشک نہ ہو یہ لفظ نَبَعَ الْمَاءُ (پانی پھوٹ نکلا) سے ماخوذ ہے۔

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا　　یا جیسا کہ آپ کہا کرتے ہیں آسمان کے ٹکڑے آپ ہم پر نہ گرا دیں یعنی آسمان پھٹ جائے اور اس کے ٹکڑے ہم پر گر پڑیں۔ كِسَفٌ كِسْفَةٌ کی جمع ہے جیسے قِطَعٌ قِطْعَةٌ کی جمع ہے كِسْفَةٌ بمعنی قِطْعَةٌ کے ہے پارہ ٹکڑا۔

اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝۹۲　　یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا نہ کھڑا کر دیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے قَبِیْلًا کا ترجمہ کفیل کیا ہے یعنی اللہ اور ملائکہ کو اپنے دعوے کی صداقت کا ذمہ دار، کفیل بنا کر پیش کرو جو شہادت دیں کہ تمہاری بات صحیح ہے اگر اس بات کو ماننے سے ماننے والوں کو کچھ نقصان پہنچا تو اس کے ذمہ دار اللہ اور ملائکہ ہوں گے۔ قتادہ نے قبیلا کا ترجمہ کیا مقابلا آمنے سامنے یعنی ہماری آنکھوں کے سامنے لے آؤ۔ فراء نے کہا عرب بولتے ہیں لَقِیْتُ فُلَانًا قَبِیْلًا وَّقُبُلًا میں نے فلاں شخص سے رُو در رُو ملاقات کی۔ اس ترجمہ پر قَبِیْلًا الْمَلٰٓئِکَۃ سے حال ہوگا۔ مجاہد نے کہا قبیل قَبِیْلَۃ کی جمع ہے قَبِیْلًا سے مراد ہے قسم یعنی قسم قسم کے ملائکہ کو پیش کرو۔

اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ　　یا تمہارے لئے کوئی سونے کا مکان ہو یا تم آسمان کے زینہ پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے صرف چڑھنے کا بھی یقین نہیں کریں گے جب تک تم ایک ایسی کتاب لے کر ہم پر نازل نہ ہو جس کو ہم پڑھیں زُخْرُفٌ کا اصل لغوی معنی ہے سجاوٹ۔ اس جگہ مراد ہے سونے کا مکان۔ یہ قول عبداللہ بن امیہ کا تھا۔ كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ سے یہ مراد ہے کہ اس کتاب کے اندر تمہاری تصدیق ہو اور ہم کو تمہارا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔

قُلْ　　اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے یعنی ان کے سوالات و مطالبات پر تعجب کرتے ہوئے کہہ دیجئے۔ یا اللہ کو اس کمزوری سے پاک قرار دیتے ہوئے کہہ دیجئے۔

ع ۱۰ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝۹۳　　سبحان اللہ میں بجز اس کے کہ آدمی ہوں مگر پیغمبر ہوں اور کچھ نہیں ہوں۔ یعنی تمہارا سوال پورا کرنا انسانی اور بشری طاقت سے خارج ہے۔ ہاں اگر اللہ چاہے تو تمہاری خواہشات پوری کر دے لیکن فرمائشی معجزات کا اظہار اللہ کا دستور نہیں، اپنے رسول کے ہاتھ پر اللہ اتنی آیات و معجزات کا اظہار کر چکا ہے کہ تمہاری ان فرمائشات کو پورا کرنے کی ضرورت نہیں، قرآن مجید اس نے اتار دیا، رسول ﷺ کی انگلی کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا، رسول اللہ ﷺ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے بہا دیئے اور طرح طرح کے معجزوں کا ظہور ہو چکا۔ اس آیت میں کافروں کے سوالات کا ایک مجمل جواب دیا گیا ہے۔ تفصیلی جواب دوسری آیات میں آیا ہے فرمایا ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ الخ۔ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ۔ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى یعنی کچھ بھی ہو جائے قرآن کے ذریعہ سے پہاڑ چلنے لگیں یا زمین کی طنابیں کھینچ دی جائیں یا مردے زندہ ہو کر بولنے لگیں وہ ایمان نہیں لائیں گے ہر کام کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ اور ہدایت یعنی رسول یا قرآن کے آچکنے کے بعد لوگوں کو ایمان لانے سے سوائے اس کے اور کوئی وجہ مانع نہیں کہ انہوں نے تعجب کیا اور کہا کیا اللہ نے آدمی کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یعنی وحی نازل ہو گئی۔ حق ظاہر ہو گیا اب رسول اور قرآن پر ایمان نہ لانے کی اور کوئی معقول قابل قبول وجہ سوائے اس کے نہیں کہ ان کو آدمی کا پیغمبر ہونا عجیب نظر آیا اور انہوں نے نبوت بشری کا انکار کر دیا لیکن ان کا یہ تعجب وانکار بے جا ہے عقل اور نقل کی شہادت ہے کہ رسول اللہ کو اسی نوع میں سے ہونا چاہئے جو مرسل الیہ کی ہو۔ تاکہ رسول ان کو پیام دے سکے اور وہ رسول کی رسالت سے فائدہ اندوز ہو سکیں غیر جنس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ آپ کہہ دیجئے اگر زمین پر فرشتے چین کے ساتھ چلتے پھرتے (فرشتوں کی آبادی ہوتی اور یہیں ان کی سکونت ہوتی آسمان تک پہنچنے کا ان کو اختیار نہ ہوتا) تو ہم آسمان سے ان کے لئے رسول بنا کر کسی فرشتہ کو اتار دیتے (لیکن زمین پر تو آدمی آباد ہیں، آسمان پر جا کر یہ خود احکام حاصل نہیں کر سکتے ان کی ہدایت کے لئے تو آدمی کو ہی رسول بنا کر بھیجنا ضروری تھا، اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ مترجم)

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ آپ کہہ دیجئے میرے اور تمہارے درمیان بس اللہ ہی شہادت کے لئے کافی ہے۔ یعنی میرے رسول ہونے کا اللہ شاہد ہے اور اسی کی شہادت بس کافی ہے اسی نے میرے ہاتھ پر معجزات میرے دعویٰ کی تصدیق کے لئے ظاہر فرما دیئے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی شہادت اس امر پر کافی ہے کہ میں نے فرض رسالت ادا کیا اس کا پیام تم کو پہنچا دیا اور ظہور حق کے بعد بھی از روئے عناد تم نے مخالفت کی۔ وہی میرا تمہارا فیصلہ کرے گا جو حق پر ہو گا اس کو ثواب دے گا اور جو باطل پر ہو گا اس کو سزا دے گا۔

اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝ کیونکہ وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا خوب دیکھتا ہے۔ یعنی ڈرانے والے پیغمبر ہوں یا وہ امت جس کو ڈرایا جاتا ہے، سب کے ظاہری اور باطنی احوال سے اللہ واقف ہے اور ان کے احوال کے موافق سزا و جزا دے گا۔ اس جملہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے پیام تسکین اور کافروں کے لئے عذاب کی تہدید ہے۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ اور جس کو اللہ راہ راست پر لگا دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دے یعنی بے مدد چھوڑ دے اور کج راہی سے محفوظ نہ رکھے اور شیطانی اغواء اندرونی کو وہ قبول کر لیں) تو ان لوگوں کے لئے تم کو بجز خدا کے اور کوئی حامی نہیں ملے گا جو ان کو راہ راست پر ڈال سکے۔

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ ـــــــــــ اور قیامت کے دن ہم ان کو اندھا، گونگا، بہرا اٹھائیں گے کہ وہ منہ کے بل چلیں گے یا منہ کے بل ان کو گھسیٹا جائے گا۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا، کافر منہ کے بل قیامت کے دن کیسے چلے گا فرمایا، جس خدا نے اس کو ٹانگوں کے بل چلایا ہے کیا وہ منہ کے بل اس کو چلا نہیں سکتا۔ متفق علیہ۔

ابوداؤد اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں کا حشر تین طریقے پر ہو گا، کچھ لوگ سوار ہوں گے، کچھ پیدل، کچھ منہ کے بل گھسٹتے ہوئے۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول

اللہ ﷺ منہ کے بل کیسے چلیں گے فرمایا جس نے ٹانگوں کے بل چلایا ہے وہ منہ کے بل بھی چلا سکتا ہے۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ اور حضرت معاویہ بن جندب کی روایت سے اس طرح بھی بیان کیا ہے کہ حضرت معاویہ بن جندب نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ تمہارا حشر کیا جائے گا۔ سوار ہونے کی حالت میں اور پیدل ہونے کی حالت میں اور تم کو گھسیٹا جائے گا منہ کے بل (یعنی قیامت کے دن کچھ لوگ سوار کر کے لے جائے جائیں گے اور کچھ پیدل اور کچھ منہ کے بل گھسیٹ کر)

نسائی، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں کی تین جماعتیں (بنا کر) اٹھائی جائیں گی، ایک جماعت کپڑے پہنے، کھائے پیے اور سواریوں پر سوار ہوگی اور ایک جماعت پیدل چلے گی اور دوڑے گی اور ایک جماعت کو ملائکہ منہ کے بل گھسیٹیں گے۔

اندھے گونگے بہرے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ کوئی ایسی صورت ان کے سامنے نہیں آئے گی جس کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور کوئی ایسا عذر بیان نہ کر سکیں گے جو قابل قبول ہو اور کوئی خوش کن مسرت آفریں بات ان کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔ کیونکہ آیات قدرت اور نشانہائے عبرت کو دیکھنے سے ان کی آنکھیں اندھی تھیں۔ کلام حق سننے سے ان کے کان بہرے تھے اور کلمۂ حق بولنے سے ان کی زبانیں گونگی تھیں۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس تفسیر کی نسبت کی ہے۔ (حضرت ابن عباسؓ کی اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ اندھا گونگا بہرا ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکیں گے، نہ بول سکیں گے، نہ سن سکیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں وہ آیات وہدایات کو چشم بصیرت سے نہیں دیکھتے تھے اور کلمۂ حق کو گوش قبول سے نہیں سنتے تھے اور کلام حق زبانوں پر نہیں لاتے تھے، اسی طرح قیامت کے دن وہ کوئی جاذب قلب شکل نہیں دیکھیں گے کوئی صداء مسرت آفریں نہیں سنیں گے اور کوئی قابل قبول عذر زبانوں سے نہ پیش کر سکیں گے اس تشریح کے بعد اس آیت میں اور ان آیات میں جن میں قیامت کے دن کافروں کو دیکھنا، سننا اور بولنا مذکور ہے کوئی تعارض نہیں ہو سکتا، اللہ نے فرمایا ہے وَرَاَى الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ مجرم دوزخ کو دیکھیں گے۔ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا وہاں ہلاکت کو پکاریں گے۔ سَمِعُوْا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا غصے اور جھلاہٹ کو سنیں گے (ان آیات میں کافروں کا قیامت کے دن دیکھنا، پکارنا اور سننا ثابت ہو رہا ہے اور آئندہ ایک آیت میں تینوں کا یکجائی تذکرہ ہے فرمایا ہے) رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا۔ کافر کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو دنیا میں لوٹا دے کہ ہم نیک کام کرلیں۔ ان آیات میں حقیقی رویت، سماعت اور نطق کی صراحت اور عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا سے حقیقی دیکھنے سننے اور بولنے کی نفی مقصود نہیں بلکہ اس بینائی، شنوائی اور گویائی کی نفی مقصود ہے جو حضرت ابن عباسؓ کی تشریح میں مذکور ہے فَلَا مُنَافَاةَ بَيْنَهُمَا۔

بعض اہل تفسیر نے آیات کے تعارض کو دور کرنے کے لئے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حشر کے وقت تو واقعی سب کافر اندھے، گونگے، بہرے ہوں گے، لیکن دوزخ کے سامنے جانے اور حساب کے لئے پیش ہونے کے وقت بینا، شنوا اور گویا ہو جائیں گے۔

بعض نے کہا کہ حساب کے بعد جب موقف سے دوزخ کی طرف ان کو لے جایا جائے گا اس وقت ان کے حواس غائب ہو جائیں گے، اس وقت گویائی سلب ہو جائے گی، بینائی اور شنوائی زائل ہو جائے گی۔

سعید بن منصور اور بیہقی نے محمد بن کعب کا قول نقل کیا ہے کہ دوزخ کے اندر دوزخیوں کی پانچ مرتبہ درخواست ہوگی اور ہر مرتبہ کی پکار کا جواب اللہ دے دے گا، اس کے بعد وہ بول ہی نہ سکیں گے۔

(۱) دوزخی کہیں گے رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ۔ اللہ اس کے جواب میں فرمائے گا ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ الخ۔

(۲) پھر دوزخی کہیں گے رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ۔ اللہ جواب میں فرمائے گا فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ الخ

(۳) پھر دوزخی کہیں گے۔ رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ۔ اللہ جواب میں فرمائے گا اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ۔

(۴) پھر دوزخی کہیں گے رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ اللہ جواب میں فرمائے گا اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ الخ

(۵) پھر دوزخی کہیں گے رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ۔ اللہ جواب میں فرمائے گا اِخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ اس کے بعد دوزخی کبھی کلام نہیں کریں گے۔

النصف

مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۝ (پھر) ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے وہ جب ذرا دھیمی ہونے لگے گی تب ہی ان کے لئے اور زیادہ بھڑکا دیں گے۔ یعنی جب ان کی کھالیں اور گوشت جل چکیں گے اور آگ کی بھڑک میں کچھ سکون پیدا ہو جائے گا تو دوبارہ ان کو کھالیں اور گوشت پہنا دیا جائے گا اور اس اجسام سے پھر آگ بھڑکائی جائے گی اور یونہی برابر ہوتا رہے گا۔ چونکہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھائے جانے کے وہ منکر تھے اس لئے اللہ بھی ان کو یہ سزا دے گا کہ بار بار مریں گے اور بار بار جئیں گے، اور یہ سلسلہ قائم رہے گا، اسی کی طرف آیت ذیل میں اشارہ فرمایا۔

ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ یہ ان کی سزا اس لئے ہوگی کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا (تھا) اور کہا (تھا) کہ جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جس اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ اس بات پر قادر ہے کہ ان جیسے آدمی دوبارہ پیدا کر دے۔ یعنی آسمانوں اور زمین کی بناوٹ تو بہت زیادہ بڑی اور قوی ہے اور یہ انسان صغیر الجثہ بھی ہے اور کمزور بھی اور اللہ نے بغیر سابق نمونے اور نظیر کے یہ آسمان و زمین بنائے ہیں تو وہ انسانوں کو کیونکر دوبارہ پیدا نہیں کر سکے گا۔ ایجاد سے تو دوبارہ تخلیق آسان ہے۔

وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا اور ان کے عذاب کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔

لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ بعض کے نزدیک اجل سے مراد موت ہے اور بعض کے نزدیک روز قیامت۔

فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ پس باوجودیکہ حق واضح ہے پھر بھی ظالم لوگ بغیر انکار کئے نہ رہے۔ لفظ ظالمین بتا رہا ہے کہ ان کا کفر و انکار بے جا ہے۔

ع ۱۱

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَاۗىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) کے خزانوں (یعنی کمالات) کے مختار ہوتے تو اس صورت میں تم اس کے خرچ کرنے کے اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے اور آدمی ہے بڑا تنگ دل۔ حضرت مولانا تھانویؒ کے نزدیک رحمت سے مراد نبوت اور خزائن سے مراد کمالات ہیں، لیکن حضرت مولف کے نزدیک رحمت رب سے مراد رزق ہے یا ہر نعمت مراد ہے اور خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ سے مراد ہے ناداری کا خوف۔ یا ختم ہو جانے کا اندیشہ نَفِقَ الشَّيْءُ وہ چیز ختم ہو گئی، عربی محاورہ ہے۔ قَتُوْر کا معنی ہے بخیل، کنجوس۔ انسان حاجت مند ہے اور جس چیز کی اس کو حاجت ہوتی ہے اس کو خرچ کرنے میں کنجوسی کرتا ہے اور خرچ کرتا ہے تو معاوضہ کے لالچ میں، مگر اللہ

غنی ہے، کسی چیز کا محتاج نہیں، جتنا بھی وہ عطا فرمادے اس سے ہزاروں گنا زیادہ پیدا کر سکتا ہے، اس لئے اس کے خزانے کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو نو کھلے ہوئے نشانات (قدرت یعنی معجزات) دیئے تھے۔ تعیین معجزات میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور ضحاکؒ کے نزدیک نو معجزات یہ تھے۔ عصا، ید بیضا، زبان کی گرہ کھل جانا، سمندر کا لاٹھی کی ضرب سے پھٹ جانا، طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک، خون۔ عکرمہ، مجاہد اور عطاء کے نزدیک نو معجزات یہ تھے۔ طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک، خون، عصا، ید بیضاء، قحط، پھلوں کی کمی۔ قبطیوں میں سے ایک شخص اپنی بی بی کے ساتھ ایک بستر پر سو رہا تھا (شاید حضرت موسیٰ کی بددعا سے) دونوں پتھر بن گئے۔ ایک عورت کھڑی روٹی پکا رہی تھی (شاید حضرت موسیٰ کی شان میں گستاخی کرنے سے) وہ بھی پتھر کی ہو گئی۔ محمد بن کعب قرظی نے طمس (صورتوں کو بدل دینا یا بگاڑ دینا) اور سمندر کو پھاڑنے اور طور کے سروں پر معلق ہو جانے کو بھی تسع آیات میں شمار کیا ہے۔

حضرت صفوان بن عسال کا بیان ہے ایک یہودی نے دوسرے یہودی سے کہا چلو اس نبی کے پاس چلیں۔ اس نے کہا ارے نبی نہ کہو اگر اس نے یہ لفظ سن لیا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ غرض دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نو واضح آیات دریافت کیں حضور نے فرمایا (نو کھلی ہوئی آیات یعنی احکام یہ ہیں)۔ (۱) کسی چیز کو اللہ کا ساجھی نہ قرار دو۔ (۲) چوری نہ کرو۔ (۳) زنا نہ کرو۔ (۴) ناحق ناجائز خون نہ کرو۔ (۵) کسی بے قصور کو (قتل یا بغاوت وغیرہ کی تہمت لگا کر) حاکم کے پاس قتل کرانے کے لئے نہ لے جاؤ۔ (۶) جادو نہ کرو۔ (۷) سود نہ کھاؤ۔ (۸) کسی پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت نہ لگاؤ۔ (۹) جہاد میں مقابلہ کے وقت بھاگنے کے لئے پشت نہ پھیرو۔ اور اے یہودیو! تمہارے لئے خاص طور پر یہ حکم تھا کہ سنیچر کے دن کی حرمت میں (حدود شرعیہ سے) تجاوز نہ کرو (کہ ظاہری حیلہ بہانہ کر کے سنیچر کے دن اپنے معاشی کاروبار جاری رکھو اور کوئی شرعی حیلہ اس کے لئے تلاش کر لو) یہ سن کر دونوں یہودیوں نے حضور ﷺ کے ہاتھ پاؤں چوم لئے، اور بول اٹھے ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نبی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا، پھر میرا اتباع کرنے سے تمہارے لئے کون سی چیز مانع ہے۔ کہنے لگے، حضرت داؤدؑ نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ انہی کی نسل سے اللہ ہر پیغمبر مبعوث فرمائے اب اگر ہم آپ کی اتباع کریں گے تو ہم کو ڈر ہے کہ یہودی ہم کو قتل کر دیں گے۔ رواہ ابو داؤد والنسائی وابن ماجہ والترمذی والحاکم۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔ حاکم نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ اس کو معلول قرار دینے کی ہم کو کوئی وجہ معلوم نہیں۔ بغوی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے۔ ایک یہودی نے اپنے ساتھی سے کہا، آؤ ہم اس نبی سے کچھ سوال کریں۔ ساتھی نے کہا اس کو نبی نہ کہو اگر وہ سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی، غرض دونوں نے حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ سے آیت وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ کی تشریح دریافت کی۔

بہر حال اس روایت کی روشنی میں آیات سے مراد احکام ہوں گے اور یہ احکام وہ ہیں جو ہر قوم اور ہر شریعت میں موجود ہیں اس روایت میں جو یہودیوں کے لئے حرمت شنبہ کی خصوصیت ظاہر کی گئی اس کا شمار آیات تسع میں نہیں ہے۔ یہ حکم صرف یہودیوں کے لئے تھا اور اصل جواب سے یہ آخری جملہ زائد ہے۔

فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ پھر ہم نے (موسیٰ سے) کہا (کہ فرعون سے) بنی اسرائیل کو مانگ لو (یعنی فرعون سے کہو کہ بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ چھوڑ دے اور موسیٰ سے یہ بات ہم نے اس وقت کہی) جب وہ فرعون اور اس کے آدمیوں کے پاس پہنچے تھے (اس تشریحی ترجمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ فَسْـَٔلْ میں خطاب حضرت موسیٰ کو ہے اور قُلْنَا لِمُوْسٰى ہم نے موسیٰ سے کہا۔ کا جملہ محذوف ہے اور اِذْ جَاۗءَهُمْ کا بھی قُلْنَا محذوف سے تعلق ہے) اس تشریح

کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو سعید بن منصور نے سنن میں اور امام احمد نے الزہد میں حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فَسْئَلْ کی جگہ فَسَاَلَ (بصیغۂ ماضی) پڑھا تھا۔

یا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اور مطلب اس طرح ہے اے محمدؐ آپ بنی اسرائیل سے وہ واقعات دریافت کیجئے جو فرعون و موسیٰ کے درمیان ہوئے تھے اور آیات بینات کے متعلق بھی ان سے پوچھیے (وہ آپ کی تصدیق کریں گے) تاکہ مشرکوں کو بھی آپ کی سچائی معلوم ہو جائے۔ یا اس لئے دریافت کیجئے کہ آپ کو بجائے خود بھی تسلی ہو جائے اور آپ جان لیں کہ بنی اسرائیل کی تمام فرمائش بھی اگر پوری کر دی جائیں تو عناداً انکار پر جمے رہیں گے، ایمان نہیں لائیں گے جیسے ان سے پہلے کے لوگ گزر گئے (کہ آیات بینات دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے) یا یہ مطلب ہے کہ بنی اسرائیل سے دریافت کر لیجئے تاکہ آپ کو یقین اور اطمینان خاطر کامل طور پر پیدا ہو جائے۔ اس تشریح پر اِذْ جَاءَهُمْ کا تعلق اٰتَيْنَا سے ہوگا۔

فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ فرعون نے موسیٰؑ سے کہا موسیٰ میرا تو یہ قطعی خیال ہے کہ تیرے اوپر یقیناً جادو کیا گیا ہے تو بلاشبہ سحر زدہ ہے۔ تیرا دماغی توازن بگڑ گیا ہے کہ ایسی ناممکن باتوں کا مدعی بن بیٹھا ہے۔ اپنے کو اللہ کا رسول کہتا ہے۔ کلبی نے مَسْحُوْرًا کا ترجمہ کیا حق سے برگشتہ کیا ہوا۔ فراء اور ابو عبیدہ نے کہا مَسْحُوْر بمعنی سَاحِر ہے جادوگر۔ محمد بن جریر نے کہا سحر کی تعلیم دیا ہوا یعنی تجھے جادو سکھا دیا گیا ہے اور تمام عجیب باتیں جو تو ظاہر کر رہا ہے سحر کا کرشمہ ہیں۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ

موسیٰؑ نے کہا تو جانتا ہے (یعنی دل میں) کہ یہ (عجائبات) خاص آسمان و زمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں جو بصیرت حاصل کرنے کے کافی ذرائع ہیں، اور میرے خیال میں ضرور تیری کم بختی کے دن آ گئے ہیں، پھر اس نے چاہا کہ اس سرزمین سے بنی اسرائیل کا قدم اکھاڑ دے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، فرعون حضرت موسیٰؑ کو برحق جانتا تھا، لیکن عناد کی وجہ سے انکار کرتا تھا۔ اللہ نے فرمایا ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ انہوں نے معجزات کا انکار کیا مگر دل سے یقین رکھتے تھے۔

بَصَآئِرَ بَصِيْرَة کی جمع ہے یعنی یہ آیات و معجزات میری سچائی کو تیرے سامنے ظاہر کر رہے ہیں مگر تو عناداً انکار کر رہا ہے۔

مَثْبُوْرًا کا ترجمہ حضرت ابن عباسؓ نے ملعون کیا ہے اور مجاہد نے ہلاک شدہ، اور قتادہ نے ہلاک کردہ۔ فراء نے کہا عرب کہتے ہیں مَا ثَبَرَكَ عَنْ هٰذَا اس سے تجھے کس چیز نے روک دیا۔ اس صورت میں ثبور کا ترجمہ ہوا ایسا شخص جو سرشتی شریر ہو جو فطری طور پر خیر سے برگشتہ ہو۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے ظن کا مقابلہ اپنے ظن سے کیا فرعون کا ظن غلط تھا اولۂ قطعیہ کے خلاف تھا اور حضرت موسیٰ کا ظن ایسی علامات پر مبنی تھا جو مفید یقین تھیں۔

اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ ان کو اکھاڑ دے موسیٰؑ کو اور ان کی قوم کو نکال دے۔

الْاَرْض سے مراد ہے زمین مصر یا تمام روئے زمین، فرعون چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل کو قتل کر کے روئے زمین سے ان کو نکال دے۔

فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾ پس ہم نے اس کو اور جو اس کی ساتھی تھے سب کو ڈبو دیا، یعنی مصر سے ہم نے اس کی اور اس کے ساتھیوں کی جڑ اکھاڑ دی۔

وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ اور فرعون کو ڈبونے کے بعد

ہم نے بنی اسرائیل سے کہا تم اس زمین میں (جہاں سے تم کو فرعون نکالنا چاہتا تھا) رہو۔

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا ۝ پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم سب کو جمع کر کے حاضر کر دیں گے۔

اَلْآخِرَة یعنی دوسری مرتبہ یا دوسری زندگی، یا دوسری ساعت یا دار آخرت۔ بہر حال قیامت مراد ہے۔ لَفِیْفًا مخلوط، باہم آمیختہ، یعنی تم اور وہ دونوں قیامت کے دن مخلوط ہو کر آؤ گے۔ پھر اہل شقاوت کی جماعت الگ کر دی جائے گی۔ لَفِیْف مختلف متعدد قبائل کا مجموعہ، قیامت کے دن بھی ایسا ہی ہوگا، شروع میں مومن، کافر، نیک، بد مخلوط ہوں گے۔ کلبی کے نزدیک وعد آخرت آنے سے مراد ہے، حضرت عیسیٰؑ کا آسمان سے آنا اور جِئْنَا بِکُمْ لَفِیْفًا کا یہ مطلب ہے کہ ادھر ادھر ہر طرف سے مختلف اقوام آئیں گی۔

وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۗ اور حق ہی کے ساتھ ہم نے اس کو اتارا ہے اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل ہوا ہے۔ اول اَلْحَقّ سے مراد ہے وہ حکمت و مصلحت جو نزول قرآن کی مقتضی تھی اور دوسرے اَلْحَقّ سے مراد ہے دانائی اور سچائی جو قرآن کے اندر ہے۔ بعض اہل تفسیر نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم نے قرآن کو ملائکہ کی نگرانی میں آسمان سے اتارا ہے اور ملائکہ کی حفاظت میں ہی وہ رسول پر نازل ہوا ہے۔ شیاطین کی دست رس سے قرآن محفوظ ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ اور (اے محمدؐ) ہم نے آپ کو صرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، فرماں برداروں کو جنت کی خوش خبری دینے والا اور نافرمانوں کو دوزخ سے ڈرانے والا۔ یعنی آپ کا کام صرف بشارت اور تخویف ہے، ہدایت پر مجبور کرنا آپ کا کام نہیں۔

وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا ۝

اور قرآن میں جابجا ہم نے فصل رکھا تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھیر ٹھیر کر پڑھیں اور ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا۔

فَرَقْنٰهُ یعنی ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے متفرق طور پر اتارا پورا قرآن بیس برس میں اترا[1] یا یہ مطلب ہے کہ قرآن کو ہم نے تفصیل دار اور کھول کر بیان کیا ہے۔ حسن نے کہا فَرَقْنَا کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے اس کے اندر حق کو باطل سے الگ کر دیا، حق و باطل میں امتیاز کر دیا۔

مُکْثٍ مہلت۔ قرآن کو وقفہ وقفہ سے تھوڑا تھوڑا اتارنے کی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو سمجھنے اور یاد کرنے میں آسانی ہو۔

قُلْ آمِنُوا بِهِ أَوْ لَا تُؤْمِنُوا ۚ إِنَّ (اے محمدؐ) آپ کہہ دیجئے کہ تم قرآن کو سچا مانو یا نہ مانو۔ یعنی تمہارے ایمان سے قرآن کو کوئی فائدہ نہیں اور انکار سے اس کا کچھ ضرر نہیں، تمہارے ایمان سے خود تم کو فائدہ پہنچے گا۔ قرآن کے کمال میں اضافہ نہ ہوگا اور انکار سے تمہارا نقصان ہوگا۔ قرآن کے کمال میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ۩ ۝

جن لوگوں کو قرآن سے پہلے علم دیا گیا تھا جب یہ قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔

---

[1] معلوم نہیں حضرت مفسرؒ کو بیس سال کی روایت کہاں سے پہنچی، تاریخی حقیقت اس کے خلاف ہے چالیس سال کی عمر میں بعثت ہوئی اور نزول قرآن کا آغاز ہوا اور ۶۳ یا ۶۴ سال کی عمر میں وفات ہوئی اور قرآن کا نزول ختم ہوا اس حساب سے ۲۳ یا ۲۴ سال میں پورا قرآن اترا۔ مترجم۔

یعنی اگر تم ایمان نہ لائے تو نہ لاؤ دوسرے لوگ اس پر ایمان لے آئے، جو تم سے بہتر ہیں ان دوسرے ایمان لانے والوں سے مراد ہیں اہل کتاب کے علماء جو کتب سابقہ پڑھتے، حقیقت وحی کو جانتے اور علامات نبوت سے واقفیت رکھتے تھے اور حق و باطل میں امتیاز کر سکتے تھے، انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے اوصاف اور حالات سابقہ کتابوں میں پڑھے تھے۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے مراد ہیں وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے دین حق کی جستجو میں لگے ہوئے تھے جو نبی رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی وہ ایمان لے آئے، جیسے حضرت زید بن عمرو بن نفیلؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ وغیرہ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں منکروں کو تہدید کرنی مقصود نہ ہو بلکہ رسول اللہ ﷺ کو تسکین و تسلی دی گئی ہو کہ یہ جاہل ایمان نہیں لائے تو آپ پریشان نہ ہوں، اہل علم تو ایمان لے آئے آپ ان منکروں کی رو گردانی کی پرواہ نہ کیجئے۔ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گرنے سے مراد ہے منہ کے بل سجدہ میں گرنا۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔

یعنی حکم الٰہی کی تعظیم کے لئے اور اس شکریہ میں کہ اللہ نے جو سابق کتابوں میں وعدہ فرمایا کہ انقطاع رسل کی مدت میں ہم محمد ﷺ کو پیغمبر بنا کر بھیجیں گے اور ان پر قرآن نازل کریں گے وہ وعدہ اللہ نے پورا کیا۔

وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ اور کہتے ہیں ہمارا رب وعدہ خلافی سے پاک ہے، ہمارے رب کا وعدہ یقیناً پورا ہونے والا ہے یعنی کتب سابقہ میں اللہ نے جو وعدہ کیا تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجنے اور قرآن نازل کرنے کی بشارت دی تھی، لامحالہ اس کو پورا ہونا تھا۔

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ اور ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہوئے روتے ہیں، ٹھوڑیوں کے بل گرنے کا دوبارہ ذکر اس لئے کیا کہ سجدہ کرنے کے سبب میں اختلاف تھا، پہلا تو سجدۂ شکر تھا کہ اللہ نے وعدہ پورا کیا اور دوسرا سجدہ اس تاثر کا نتیجہ تھا جو قرآنی ہدایات پڑھ کر ان کے دلوں میں پیدا ہوا تھا۔

وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ اور قرآنی برکات کا جو نزول ان کے دلوں پر ہوتا ہے اس کی وجہ سے قرآن سننا ان کے اندر خشوع، علم اور یقین بڑھنے کا موجب ہوتا ہے۔

مسئلہ

قرآن سننے کے وقت رونا مستحب ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ کے خوف سے رویا وہ دوزخ میں داخل نہ ہوگا یہاں تک کہ دودھ تھن میں لوٹ جائے (اور تھنوں کے اندر دودھ کا لوٹایا جانا تو محال ہے، پس خوف خدا سے رونے والے کا دوزخ میں داخل ہونا بھی محال ہے) اور اللہ کی راہ میں پڑنے والا غبار اور جہنم کا دھواں مسلمان کے نتھنوں میں جمع نہیں ہوگا (یعنی جس مسلمان کے بدن پر راہ خدا میں غبار پڑا وہ جہنم کا دھواں بھی نہ سونگھے گا) رواہ البغوی والحاکم، حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ بیہقی کی روایت میں حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں، دو (قسم کی) آنکھوں کو دوزخ کی آگ کا پالینا حرام کر دیا گیا ہے (ایک) وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی (دوسری) وہ آنکھ جو رات بھر (بیدار رہ کر) اسلام اور اہل اسلام کی کافروں سے حفاظت کرتی رہی۔ حضرت حکیم بن حزامؓ کا بیان ہے، میں نے خود حضور ﷺ کو فرماتے سنا تین (طرح کی) آنکھوں پر آگ حرام کر دی گئی ہے، (ایک) وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی، (دوسری) وہ آنکھ جو اللہ کی راہ میں بیدار رہی، (تیسری) وہ آنکھ جو ممنوعات خداوندی سے بند رکھی گئی۔

بغوی نے حضرت ابوریحانہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اس آنکھ پر آگ حرام ہے جو اللہ کے خوف سے روئی اور اس آنکھ پر آگ حرام ہے جو اللہ کی راہ میں بیدار رہی اور اس آنکھ پر دوزخ حرام ہے جو اللہ کی ممنوعات سے بند رکھی گئی، یا فرمایا اس آنکھ پر آگ حرام ہے جو اللہ کی راہ میں پھوڑی گئی۔ طبرانی نے اس روایت کو الکبیر میں لکھا ہے اور صحیح کہا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مومن بندے کی آنکھ سے اللہ کے خوف سے آنسو نکلتے ہیں خواہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہوں اللہ نے آگ کو اس پر حرام کر دیا ہے۔ رواہ ابن ماجۃ۔ ابن مردویہ وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز نماز پڑھی اور دعا کی یا اللہ یا رحمٰن۔ مشرک یہ الفاظ سن کر کہنے لگے اس بے دین کو دیکھو ہم کو تو دو معبودوں کو پکارنے سے منع کرتا ہے (اور خود دو کو پکارتا ہے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی

آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کو (لفظ اللہ کہہ کر) پکارو یا رحمٰن جس سے بھی پکارو۔

(دونوں درست ہیں) کیونکہ اس کے اچھے اچھے نام بہت سے ہیں۔ بغوی کے بیان میں حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے آیا ہے کہ مکہ میں ایک رات کو نماز کے اندر سجدے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یا اللہ یا رحمٰن۔ ابو جہل بولا محمد ﷺ ہم کو تو ہمارے معبودوں کو پکارنے سے منع کرتا ہے اور خود دو معبودوں کو پکارتا ہے۔ اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی ذات کے دونوں نام ہیں، بولنے میں تعدد ہے مگر یہ تعدد وحدت ذات سے مانع نہیں۔ وہی ذات مستحق عبادت ہے کوئی دوسرا مستحق معبودیت نہیں۔ آیت میں لفظ اَوْ تخییر کے لئے ہے (یعنی تم کو اختیار ہے کہ ایک ذات کو لفظ اللہ کہہ کر پکار دیا لفظ رحمٰن کہہ کر) بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے کہا تھا آپ لفظ رحمٰن (اللہ کے لئے) کہتے ہیں (یہ لفظ تو توریت کا ہے) اللہ نے توریت میں بکثرت ذکر کیا ہے اس پر آیت بالا کا نزول ہوا، مطلب یہ ہے کہ دونوں لفظ برابر ہیں، دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ پکارنے سے مراد ہے نام لینا۔ اللہ کے سب نام اچھے ہیں کیوں کہ ان سے صفات جلال و جمال کا ظہور اور ہر عیب و نقص سے پاکی کا مظاہرہ ہوتا ہے، اللہ کے اسماء کی تفصیل اور اس سے متعلق مباحث سورۂ اعراف کی آیت وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا کی تفسیر میں لکھ دیئے ہیں۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾

اور اپنی نماز نہ تو بہت پکار کر پڑھو اور نہ بالکل چپکے چپکے ہی پڑھو اور دونوں کے درمیان ایک طریقہ اختیار کرو۔ یعنی نماز میں قرأت اتنی اونچی آواز سے نہ کرو کہ (دور رہنے والے) مشرک بھی اس کو سن لیں اور نہ اتنی ہلکی آواز سے پڑھو کہ پیچھے صف اول کے مسلمان (شرکاء نماز) بھی نہ سن پائیں، بلکہ درمیانی راستہ اختیار کرو۔ متوسط درجہ ہر چیز کا بہتر ہوتا ہے (افراط و تفریط دونوں مرجع قبیح ہیں) اَلصَّلٰوۃ سے مراد رات کی نماز ہے، فرض ہو (مغرب، عشاء) یا نفل، (تہجد وغیرہ) کیونکہ دن کی نمازیں تو باجماع امت سری ہیں ظہر و عصر میں قرأت جہری نہیں، جمہور امت اسلامیہ تمام کی تمام دن کی نمازوں میں قرأت سری کرتی چلی آئی ہے۔

یا متوسط راہ اختیار کرنے کا یہ مطلب ہے کہ دن کی نمازوں میں اور جہاں مشرک سن سکتے ہوں وہاں سری قرأت اختیار کرو۔ اور رات کی نماز میں متوسط جہر سے قرأت کرو۔

بغوی نے بطریق بخاری ابو بشیر کی وساطت سے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس زمانہ میں مکہ میں چھپے ہوئے تھے، اس دور میں جب صحابہ کو نماز پڑھاتے تھے تو قرأت اونچی آواز سے کرتے تھے، جب مشرک قرآن کو سنتے تو قرآن کو اور قرآن اتارنے والے کو اور جس پر اتارا گیا تھا اس کو سب کو برا کہتے تھے، اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ یعنی قرأت اونچی آواز سے نہ کرو کہ مشرک سن کر قرآن کو گالیاں دینے لگیں۔ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا اور نہ اتنی پست آواز سے پڑھو کہ ساتھی بھی نہ سن پائیں۔ وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اور درمیانی راہ اختیار کرو کہ صحابہ سن لیں اور مشرکوں تک قرأت کی آواز نہ پہنچے۔ بغوی نے لکھا ہے کچھ علماء کا خیال ہے کہ آیت کا نزول دعا کے متعلق ہوا تھا (یعنی صلوٰۃ سے مراد اس آیت میں دعا ہے) ام المومنین حضرت عائشہ، نخعی، مجاہد اور مکحول کا یہی قول ہے، بخاری نے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے آیت وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا کے متعلق فرمایا یہ دعا کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ ابن جریر نے بطریق ابن عباس اس روایت کو نقل کیا ہے۔ لیکن اول روایت کو قوی الاسناد ہونے کی وجہ سے ترجیح دی ہے، نووی

کے نزدیک اول روایت راجح ہے۔ شیخ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں مطابقت پیدا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نماز کے اندر دعا کے متعلق غالباً اس آیت کا نزول ہوا۔

ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کے پاس جب نماز پڑھتے تو دعا اونچی آواز سے کرتے۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ حضرت مفسرؒ نے فرمایا مجھے تطبیق کی یہ کوشش پسند نہیں کیونکہ نماز کے اندر پڑھنے کی جو دعائیں اب تک منقول چلی آئی ہیں جو قعدہ میں پڑھی جاتی ہیں اور نوافل میں بحالت قیام و سجود بھی بعض دعاؤں کا پڑھنا آیا ہے وہ سب باتفاق روایت سری ہی پڑھی جاتی رہی ہیں۔ صرف دعا قنوت میں اختلاف ہے کہ اس کو جہراً پڑھا جائے یا سراً۔ اس کے علاوہ آیت اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ کا حکم عام ہے نماز کے اندر ہو یا باہر ہر دعا کو چپکے چپکے پڑھنے کا حکم ہے۔ اس لئے اگر روایات میں مطابقت پیدا کرنی ہی ہے تو مناسب ترین یہ توجیہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی مذکورہ روایت میں دعا سے مراد سورۂ فاتحہ ہے کیونکہ اس کے اندر آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ دعا ہی ہے۔

آیت مذکورہ کے سبب نزول کے متعلق دو روایتیں اور بھی آئی ہیں، لیکن چونکہ یہ روایت صحیح اور اجماعی روایت کے خلاف ہیں، اس لئے قابل قبول نہیں۔ ابن جریر اور حاکم نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کہا تھا اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حکم دیا گیا کہ لَا تُخَافِتُوْا وَلَا تَجْهَرُوْا۔

بغوی نے حضرت عبداللہ بن شداد کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قبیلہ بنی تمیم کے اعرابی رسول اللہ ﷺ کے سلام کے جواب میں بلند آواز سے کہتے تھے اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا مَالًا وَّوَلَدًا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ دونوں روایات قابل قبول نہیں۔

بغوی نے بطریق ترمذی حضرت عبداللہ بن رباح انصاریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا تم پست آواز سے قرات کر رہے تھے میں تمہاری طرف سے گزرا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا میں جس سے خطاب کر رہا تھا اس کو ہی سنا رہا تھا، فرمایا ذرا آواز اونچی رکھا کرو۔ اور حضرت عمرؓ سے فرمایا، میں تمہاری طرف سے گزرا تھا تو تم قرآن پڑھنے میں آواز بلند کر رہے تھے (یعنی بہت اونچی آواز سے پڑھ رہے تھے) حضرت عمرؓ نے عرض کیا میں (اپنی قرات سے) سوتے کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، فرمایا ذرا آواز کو نیچی رکھا کرو۔

حضرت ابوداؤد وغیرہ نے حضرت ابوقتادہؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔ قرأت جہری اور سری کے کچھ مسائل ہم نے سورۂ اعراف کی آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ میں بیان کئے ہیں اور جہر و اخفاء کا ذکر اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً کی تفسیر میں کیا ہے۔

فصل

رسول اللہ ﷺ کی قرأت کی کیفیت

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ قرأت میں رسول اللہ ﷺ کبھی آواز کو اٹھاتے تھے اور کبھی پست کرتے تھے، رواہ ابوداؤد۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھر کے اندر ہوتے تھے تو آپ کی قرأت اتنی آواز سے ہوتی تھی کہ حجرہ کے اندر والے سن لیتے تھے۔ رواہ ابوداؤد۔

حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی قرأت کی کیفیت خود پڑھ کر بتائی اور ایک ایک لفظ کھول کھول کر پڑھ کر بتایا، رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی۔

حضرت ام ہانی کا بیان ہے میں اپنے بالاخانہ پر رسول اللہ ﷺ کی قرأت کی آواز سنا کرتی تھی (یعنی مسجد سے بالکل متصل حضرت ام ہانی کے مکان کی بالائی منزل تک قرأت کی آواز پہنچتی تھی) رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجہ۔

حضرت عبداللہ بن قیسؒ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کی قرأت کی بابت دریافت کیا کہ

حضور ﷺ کیا چپکے چپکے قرأت کرتے تھے یا جہر کے ساتھ فرمایا، ہر طرح پڑھتے، کبھی چپکے چپکے پڑھتے تھے، کبھی جہر کے ساتھ۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث صحیح حسن غریب ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾ ع ۱۲

اور کہو کہ تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے خاص ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ اس کا کوئی سلطنت میں شریک ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے کوئی اس کا مددگار ہے اور اس کی خوب بڑائیاں بیان کیا کرو۔

(حضرت مفسرؒ کے نزدیک) اَلْمُلْك سے مراد ہے الوہیت، اَلذُّلُّ کمزوری۔ وَلِیٌّ، حامی، مددگار۔ یعنی اس کے اندر کوئی کمزوری نہیں کہ اس کو اپنی کمزوری دفع کرنے کے لئے مددگار کی ضرورت ہو۔ اول جنسی اور غیر جنسی شریک کی نفی کی اور اختیاری شریک یعنی اولاد اور غیر اختیاری شریک یعنی سلطنت میں کسی دوسرے کے ساجھی نہ ہونے کی صراحت فرمائی، پھر کسی مددگار کے ہونے اور کمزوری کو دور کرنے والے حامی کی نفی کی یعنی اس امر کی صراحت کی کہ اس کے اندر کوئی کمزوری ہی نہیں ہے جس کو دور کرنے کے لئے مددگار کی ضرورت ہو، نہ کوئی اس کا مددگار ہے اور تینوں اوصاف پر حمد کو مرتب کیا کیونکہ جب وہ کامل الذات، خلاقیت میں منفرد اور منعم علی الاطلاق ہے تو ہر حمد کا وہی مستحق ہے اس کے سوا تمام مخلوق ناقص، مملوک اور نعمت یافتہ ہے پس مخلوق کی جو حمد بھی کی جائے وہ حقیقت میں اللہ ہی کی طرف لوٹتی ہے۔

امام احمد نے مسند میں نیز طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت معاذ جہنی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا آخر سورۃ تک۔ آیت عزت ہے۔

آیت میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ بندہ اللہ کی تنزیہ اور تمجید کتنی بھی کرتا ہو اور کتنی ہی اللہ کی حمد و ثنا کرے اور کتنی ہی عبادت کرے پھر بھی اس کو اقرار کرنا چاہئے کہ حق ادا کرنے سے قاصر رہا۔

حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن جن کو جنت کی طرف سب سے پہلے بلایا جائے گا وہ وہی لوگ ہوں گے جو دکھ سکھ ہر حالت میں اللہ کی بہت زیادہ حمد کرتے ہیں، رواہ الطبرانی والبیہقی والحاکم۔

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حمد شکر کی چوٹی یعنی مدار ہے جو بندہ اللہ کی حمد نہیں کرتا وہ شکر نہیں کرتا۔ رواہ البیہقی وعبد الرزاق فی الجامع۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے بڑھیا دعا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ہے، اور سب سے اعلیٰ ذکر لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ رواہ الترمذی وابن ماجۃ۔

حضرت سمرہ بن جندبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ کو سب سے زیادہ پیارے چار جملے ہیں، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور سُبْحَانَ اللّٰهِ اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ جس سے شروع کرو، کوئی حرج نہیں (یعنی ترتیب ضروری نہیں) رواہ مسلم واحمد بسند صحیح۔ بغوی نے مذکورہ بالا چاروں احادیث ذکر کی ہیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت طبرانی نے ذکر کی ہے کہ قیامت کے دن سب بندوں میں بڑھیا درجہ والے وہ لوگ ہوں گے جو بہت زیادہ حمد کرتے ہیں۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ بندہ کا سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ کہنا اللہ کو بہت ہی محبوب ہے۔ رواہ احمد و مسلم والترمذی۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نسل عبد المطلب کے بچہ کی جب زبان کھل جائے تو اس کو تعلیم دو اور کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا الخ۔ یہ حدیث ابن سنی نے عمل الیوم واللیلۃ میں نقل کی ہے۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے حوالہ سے عبد الرزاق اور ابن ابی شیبہ نے اپنے اپنے مصنف میں اس کو مفصل بیان کیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔ سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر ۳ رمضان ۱۲۰۲ھ کو اللہ کی مدد و توفیق سے ختم ہوئی۔

الحمد للہ والشکر کہ سورۂ بنی اسرائیل کا ترجمہ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ کو بعونہ تعالیٰ پورا ہوا۔

سورة الکهف

سورۃ الکہف مکی ہے اس میں ایک سو گیارہ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابن جریر نے بطریق اسحاق ایک مصری شیخ کے حوالہ سے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے، قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینہ کے علماء کو یہود کے پاس بھیجا اور ہدایت کی کہ محمدؐ جو کچھ کہتے ہیں اور ان کے جو احوال ہیں وہ تم یہودی عالموں سے جا کر بیان کرو وہ اہل کتاب ہیں ان کے پاس جو علمی ذخیرہ ہے ہمارے پاس نہیں ہے جو کچھ وہ فیصلہ کریں آ کر ہم کو بتاؤ۔ دونوں قاصد حسب مشورہ مدینہ پہنچے، یہودی علماء سے ملے رسول اللہ ﷺ کی کچھ باتیں اور احوال ان سے بیان کئے، یہودی علماء نے کہا، تم جا کر محمدؐ سے تین باتیں دریافت کرو۔ اگر وہ بتا دیں تو یقیناً وہ خدا کے فرستادہ نبی ہیں، نہ بتائیں تو سمجھ لو جھوٹے ہیں۔

(۱) ان سے دریافت کرو، وہ چند نوجوان کون تھے جو پچھلے زمانے میں گزر گئے اور ان کے واقعات دنیا سے بالکل انوکھے تھے وہ واقعات کیا تھے۔

(۲) وہ کون آدمی تھا جو زمین کے سارے مشرق و مغرب میں گھوما تھا، اس کے واقعات اور حالات کیا تھے۔

(۳) ان سے پوچھو، روح کی کیا حقیقت ہے۔

دونوں نمائندے مدینہ سے مکہ واپس آ گئے اور قریش سے کہا ہم ایک فیصلہ کن امر لے کر آئے ہیں جو تمہارے اور محمد ﷺ کے درمیان قطعی فیصلہ کر دے گا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ان لوگوں نے آپ سے مذکورہ بالا تینوں سوال کئے، حضور ﷺ نے فرمایا، تمہارے سوالوں کا جواب میں کل کو بتا دوں گا، حضور ﷺ نے بتا دینے کا وعدہ تو کر لیا مگر انشاء اللہ اس کے ساتھ نہیں فرمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پندرہ روز کی تاخیر ہو گئی، اس مدت میں نہ کبھی جبرئیل آئے نہ اللہ نے کوئی وحی بھیجی۔ آخر وحی نہ آنے سے آپ کو بڑی پریشانی ہوئی۔ اہل مکہ بری خبریں اڑانے لگے اور قریش کی طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھاڑ پڑنے لگی۔ آخر اللہ کی طرف سے جبرئیل سورۃ الکہف لے کر نازل ہوئے۔ اس سورۃ میں دونوں سوالوں کا جواب ہے اور روح کے متعلق آیت یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ الخ بھی ہے، اور کافروں کی ہدایت کے غم میں گھلتے رہنے پر کچھ عتاب بھی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ تعریف ہے اس اللہ کی جس نے اپنے (خاص) بندے پر قرآن مجید اتارا۔ قرآن اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے یہ بندوں کو تکمیل انسانیت کا راستہ بتاتا ہے، معاش و

معاد کو درست کرنے والی تعلیم دیتا ہے اور اللہ ہی نے بندوں کو یہ نعمت عطا فرمائی ہے، اس لئے اس نے انعام قرآن کا ذکر کر کے خود اپنی ثنا کی اور اس میں بندوں کو حمد خداوندی کرنے کی (در پردہ) تعلیم بھی دے دی۔

وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۟ؕ اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی۔

معانی میں کجی کو عِوَج بکسر عین اور خارجی چیزوں کی کجی کو عَوَج بفتح عین کہا جاتا ہے۔ فی رَأیہٖ عِوَجٌ اور فی عَصَاہ عَوَجٌ بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے نہ الفاظ میں کوئی خرابی اور اختلال ہے، نہ معانی میں کوئی تعارض و اختلاف، نہ اللہ کی طرف دعوت دینے میں کسی جگہ مقصد سے انحراف ہے، نہ کسی آیت میں حکمت و مصلحت سے خروج۔ حضرت ابن عباسؓ نے آیت قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ کی تفسیر میں غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ کا ترجمہ غیر مخلوق کیا ہے۔ اس تفسیر کی روشنی میں بعض علماء نے لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا کا ترجمہ اور مرادی معنی یہ بیان کیا کہ اللہ نے قرآن کو مخلوق نہیں کیا، یعنی قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں ہے۔

قَیِّمًا استقامت کے ساتھ متصف فرمایا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، یعنی معتدل جس کے احکام میں نہ افراط (شدت) ہے نہ تفریط (زیادہ نرمی) فراء نے کہا تمام آسمانی کتابوں کی صحت کا شاہد اور ان کے بعض احکام کو منسوخ کرنے والا۔ بعض اہل تفسیر نے کہا تمام انسانوں کے مصالح کا درست کرنے والا۔

کجی نہ ہونا اور مستقیم ہونا دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، لیکن کچھ سیدھی مستقیم چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان میں کسی قدر کجی ہوتی ہے (جو محسوس نہیں ہوتی) اس لئے کجی نہ ہونے اور مستقیم ہونے کی تاکیدی صراحت کر دی۔

لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۟ۙ مّٰكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۟ۙ تاکہ وہ (بندہ قرآن کے ذریعہ سے کافروں کو) اللہ کی طرف سے آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے (جو دوزخ کے اندر ہوگا) اور جو مومن نیک کام کرتے ہیں ان کو اچھے ثواب کی بشارت دے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اچھے ثواب سے مراد ہے جنت اور اللہ کی خوشنودی۔ مّٰكِثِیْنَ مقیم رہیں گے۔ اَبَدًا اتنی مدت جو کبھی منقطع نہ ہوگی۔

وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۟ۗ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۟ اور تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جو کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ اولاد رکھتا ہے نہ تو اس کی کوئی دلیل ان کے پاس ہے نہ ان کے باپ دادا کے پاس تھی، بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے اور وہ بالکل ہی جھوٹ بکتے ہیں۔

اللہ کو صاحب اولاد قرار دینا شدید ترین کفر ہے اسی شدت کفر کو ظاہر کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرانے کا ذکر کیا جو کسی کو اللہ کی اولاد قرار دیتے ہیں۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ یعنی اللہ کی (مفروضہ) اولاد کا یا اولاد قرار دینے کا یا اس (کفریہ) بات کا ان کو کوئی علم نہیں۔ مطلب یہ کہ جو بات زبان سے نکالتے اور جو عقیدہ رکھتے ہیں اس کی حقیقت کا ان کو کوئی علم نہیں، محض جہالت یا توہم پرستی یا دوسروں کی تقلید میں ایسا کہتے ہیں، خود ان کو اپنے کلام کی مراد معلوم نہیں باپ (اب) بیٹے (ابن) کا اطلاق ان کے نزدیک موثر اور اثر پر بھی ہوتا ہے اور نسبی باپ بیٹے پر بھی۔ اگر ان کو اس لفظ کی مراد معلوم ہوتی اور نسبی باپ بیٹا مراد ہوتا تو ایسا لفظ کبھی نہیں بولتے، یہ بات جو ان کی زبانوں سے نکل رہی ہے، بڑی کفریہ ہے۔ اس سے مخلوق کا خالق جیسا ہونا، اللہ کے ساتھ مخلوق کو شریک کرنا اور اللہ کا محتاج ہونا اور اپنا جانشین بنانے کا ضرورت مند ہونا ثابت ہوتا ہے۔

ایک شبہ

نادانی میں کوئی جرم ہو جائے تو قابل مواخذہ نہ ہونا چاہئے، خطاء اجتہادی قابل عفو ہے پس بے علمی کی وجہ سے کچھ لوگ کفریہ الفاظ زبان سے نکالتے ہیں اور خدا کو صاحب ولد کہتے ہیں تو کیوں ان کو عذاب کی وعید دی گئی۔

ازالہ

کسی چیز کا علم نہ ہونے کی دو صورتیں ہوتی ہیں (۱) وہ چیز موجود ہو اور اس کے احوال کا علم نہ ہو۔ (۲) وہ چیز معدوم ہو بلکہ اس کا وجود ہی ناممکن ہو اس لئے اس کی کسی حالت کا علم نہ ہو۔ اول صورت میں ناواقفیت کبھی عذر بن سکتی ہے، لیکن دوسری قسم کی جہالت کا کوئی عذر قابل پذیرائی نہیں۔ اس جگہ ناواقفیت اور جہالت کی دوسری صورت مراد ہے جو بہر حال قابل مواخذہ ہے۔ کَبُرَتْ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ کفر کے اعتبار سے یہ کفریہ بات بڑی ہے۔ دوسرا معنی کَبُرَتْ کا بِئْسَتْ ہے یعنی یہ بات بری ہے۔ کلمہ کا استعمال پورے کلام بلکہ پورے قصیدہ کے لئے بھی ہوتا ہے، اس جگہ کلام (بات) ہی مراد ہے بات کی آواز تو منہ سے ہی نکلتی ہے اس آیت میں تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ کا لفظ بڑھا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کی جرأت کفر بہت زیادہ ہے کہ کلمۂ کفر اپنے منہ سے (دانستہ) نکالتے ہیں۔ جھوٹ کہنے سے یہ مراد ہے کہ اس بات کی واقع میں کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا کہ قریش کی ایک جماعت جس میں ربیعہ کے دونوں بیٹے عتبہ اور شیبہ اور ابو جہل بن ہشام اور نضر بن حارث اور عاص بن وائل اور اسود بن مطلب اور ابو البختری شامل تھے جمع ہوئے (اور رسول اللہ ﷺ کو بلوایا اور آپ سے وہ گفتگو کی جو اوپر شروع میں نقل کر دی گئی ہے اور بالآخر رسول اللہ ﷺ مایوس ہو کر مجلس سے اٹھ آئے) تو ان لوگوں کی مخالفت اور نصیحت سے سرتابی حضور ﷺ کو بہت کھلی اور قلبی تکلیف ہوئی، اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ⑥

اگر انہوں نے اس کلام یعنی قرآن کو نہیں مانا تو شاید آپ ان کے پیچھے انتہائی غم سے اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے۔

اَسَفٌ انتہائی غم و غصہ جیسے کسی کے دوست اس کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں اور فراق پر وہ صبر نہ کر سکے اور غم سے گھل گھل کر مر جائے، یہی حالت رسول اللہ ﷺ کی تھی، آپ کو سرداران قریش کے ایمان لے آنے کی انتہائی فکر و خواہش تھی اور ان کی سرتابی سے بہت زیادہ اندوہ و ملال تھا آپ کے انتہائی اندوہ و حسرت کو اس فراق زدہ کے غم سے تشبیہ دی، جس کو فراق احباب نے جان ہار بنا دیا ہو۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا زمین پر جو کچھ ہے (خواہ کانیں ہوں یا نباتات یا جاندار حیوان) اس کو ہم نے زمین اور اہل زمین کے لئے سجاوٹ بنایا ہے۔

ایک شبہ: سانپ، بچھو، موذی جانور اور شیطان زمین کی زینت کس طرح ہیں۔

جواب: سانپ، بچھو وغیرہ بھی اپنے بنانے والے کے کمال قدرت و صنعت اور وحدت ذات و صفات پر دلالت کر رہے ہیں، اس لئے یہ بھی زمین کی زینت ہی ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مَا عَلَى الْاَرْضِ سے صرف انسان مراد ہیں، بعض اہل تفسیر کے نزدیک صرف علماء اور صلحاء مراد ہیں، بعض علماء کے نزدیک صرف وہ زینت مراد ہے جو آب رواں اور سرسبز لہلہاتے درختوں سے زمین پر ہو جاتی ہے، دوسری آیت میں اس کو زینت ارض قرار دیا گیا ہے، فرمایا حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ۔ بعض کے

نزدیک صرف وہ چیزیں مراد ہیں جن سے اس دنیا کی آرائش ہو رہی ہے (کوٹھیاں، اونچے محلات، اعلیٰ فرنیچر، چمنستان، باغات وغیرہ)

(حضرت مفسر نے فرمایا) میں کہتا ہوں مَا عَلَى الْاَرْضِ سے اگر ہر موجود ارضی مراد ہو تو ناممکن نہیں ہے کیونکہ مجموعی طور پر بحیثیت اجمال پورا نظام حسین ہے یا یوں کہا جائے کہ ہر چیز کو تحسین میں دخل ہے کیونکہ ہر (ذاتی حسین) چیز کا حسن اضافی ہے اگر قبیح کا وجود نہ ہو تو حسین کا جمال معلوم نہ ہو (پس قبیح کو بھی زینت ارض میں دخل ہے)۔

لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ تاکہ ہم جانچ لیں کہ (زمین کی چیزوں کا استعمال) کون (مومن ہو یا کافر) اچھے طور پر کرتا ہے۔ سب سے بہتر استعمال کرنے والا وہی ہوگا جو ان چیزوں کا حریص اور ان پر فریفتہ نہ ہو اور قدر ضرورت پر قناعت کرلے اور صحیح راستہ میں ان کو صرف کرے، حدیث میں آیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کوئی شک نہیں کہ دنیا سرسبز اور شیریں ہے اور اللہ تم کو (پچھلوں کا) جانشین اس دنیا میں بنائے گا اور دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝ اور ہم زمین پر کی تمام چیزوں کو ایک چٹیل میدان بنا دیں گے۔

یعنی جس حیوان و نبات وغیرہ کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے اس کو یقیناً ہم خاک بنا دیں گے۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ کہف و رقیم والے ہمارے عجائبات میں سے کوئی عجیب چیز تھے۔ استفہام تقریری ہے یعنی کیا تم کو معلوم ہے کہ کہف و رقیم والے منجملہ آیات خداوندی کے ایک عظیم الشان نشانی تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ اصحاب کہف و رقیم اللہ کی قدرت کی عجیب نشانی تھے یا استفہام انکاری ہے یعنی کیا تم یہ سمجھے ہوئے ہو کہ کہف و رقیم والے کوئی عجیب نشانی تھے، ایسا نہیں ہے، زمین اس کی مختلف الانواع، متعدد الاجناس موجودات جن کی کوئی گنتی نہیں اور اللہ نے ان کو زمین کی زینت بنایا ہے کہیں زیادہ تعجب آفرین ہیں پھر ان کا خاک میں مل جانا اور اپنی اصل کی طرف لوٹ جانا بہت ہی عجیب آیت قدرت ہے۔

کہف پہاڑی کشادہ غار۔ رقیم سے کیا مراد ہے سب سے اچھا قول اس سلسلہ میں سعید بن جبیر کا ہے کہ رانگ یا پتھر کی ایک تختی تھی جس میں اصحاب کہف کے نام اور ان کا قصہ لکھا ہوا تھا، اس قول پر رَقِيْم رَقْم سے مشتق ہوگا، اور رَقْم کا معنی ہے لکھنا۔ اور رَقِيْم بمعنی مَرْقُوْم ہوگا۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ رقیم اس وادی کا نام تھا جس میں اصحاب کہف کا غار تھا، اس قول پر رقیم کا اشتقاق رَقْمَةُ الْوَادِي (وادی کا کنارہ) سے ہوگا۔ کعب احبار نے کہا رقیم اس بستی کا نام ہے جہاں سے اصحاب کہف برآمد ہوئے تھے۔ بعض نے رقیم اس پہاڑ کا نام بتایا ہے جس میں اصحاب کہف کا غار تھا۔ ان تمام اقوال پر اصحاب الکہف اور اصحاب الرقیم دونوں ایک ہی تھے الگ الگ نہ تھے، لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اصحاب الکہف الگ تھے اور اصحاب الرقیم الگ۔

عبد بن حمید، ابن المنذر، طبرانی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت نعمان بن بشیر کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اصحاب الرقیم کے متعلق ارشاد فرما رہے تھے کہ وہ تین شخص تھے جو ایک غار میں جا گھسے تھے۔

امام احمد اور ابن المنذر نے حضرت انسؓ کی مرفوع روایت بیان کی کہ گزشتہ لوگوں میں تین آدمی تھے جو گھر والوں کے لئے معاش کی جستجو میں چل دیئے راستے میں بارش آگئی، وہ ایک غار میں پناہ گیر ہو گئے۔ جونہی غار کے اندر داخل ہوئے ایک چٹان (دروازے کی طرف) آپڑی اور غار کا دروازہ بند ہو گیا۔ ایک شخص بولا (بھائیو) جس کسی نے جو بھی کوئی نیک کام کیا ہو اس وقت اس کو یاد کرکے اللہ سے دعا کرے، شاید اللہ اس کی برکت سے ہم پر رحم فرما دے۔ چنانچہ ایک نے کہنا شروع کیا میں نے ایک روز کچھ مزدور کام کرانے کے لئے رکھے۔ ایک مزدور دوپہر کو آیا لیکن اس نے باقی آدھے دن میں اتنا کام کیا جتنا دوسروں نے پورے دن میں کیا تھا، میں نے اس کو مزدوری دوسروں کے برابر دے دی۔ دوسرے مزدوروں میں سے ایک شخص کو اس پر غصہ

آگیا، اور وہ اپنی مزدوری میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی مزدوری گھر کے کسی گوشے میں رکھ دی، کچھ مدت کے بعد میں نے اس مزدوری سے بکری کا ایک بچہ خرید لیا اور اس کی نسل بڑھتے بڑھتے اللہ کی مشیت کے مطابق بہت ہو گئی، مدت کے بعد وہ مزدور میرے پاس لوٹ کر آیا، بوڑھا اور کمزور ہو گیا تھا، میں نے اس کو پہچانا بھی نہیں کہنے لگا میرا آپ کے پاس کچھ حق ہے پھر اس نے اپنے حق کی یاد دہانی کی، اس وقت میں نے اس کو پہچانا اور میں نے سارا مال یعنی بچہ کی نسل کے سارے جانور اس کو دے دیئے۔ اے اللہ اگر میں نے یہ محض تیری خوشنودی کے لئے کیا تھا تو اس کو کھول دے، چنانچہ پتھر میں اتنا شگاف ہو گیا کہ روشنی نظر آنے لگی۔

دوسرے نے کہا میرے پاس دولت تھی ایک بار سخت قحط پڑا لوگ تنگ حال ہو گئے ایک عورت میرے پاس آئی اور کچھ خیرات مانگی۔ میں نے کہا تیرے معاوضہ میں دے سکتا ہوں اس کے بغیر نہیں دے سکتا۔ اس نے انکار کیا اور واپس چلی گئی۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا آخر اس نے اپنے شوہر سے جا کر اس کا ذکر کیا، شوہر نے کہا اپنے بچوں کی مدد کے لئے اس کی درخواست مان لے۔ عورت میرے پاس آئی اور اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا، میں نے اس کا کپڑا کھولا اور کچھ کرنا چاہا تو وہ کانپنے لگی۔ میں نے لرزہ کی وجہ دریافت کی، کہنے لگی مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے کہا تو اس سختی میں اس سے ڈرتی ہے، اور میں فراخ حالی میں اس سے نہ ڈروں ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر میں نے اس کو یونہی چھوڑ دیا اور جو کچھ اس نے مانگا تھا، وہ دے دیا، اے اللہ! اگر میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لئے کیا تھا تو اس کو کھول دے فوراً پتھر اتنا پھٹ گیا کہ ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ تیسرے نے کہا میرے ماں باپ بوڑھے تھے اور میرے پاس بکریاں تھیں۔ میں والدین کو کھلا پلا کر بکریاں لے کر جنگل کو جاتا تھا، ایک روز بکریوں کے گم ہونے یا منتشر بکریوں کو جمع کرنے کی وجہ سے میں رات سے پہلے نہ لوٹ سکا پھر گھر آکر دودھ کا برتن ہاتھ میں لئے یونہی صبح تک کھڑا انتظار کرتا رہا آخر صبح کو وہ بیدار ہوئے تو میں نے ان کو پلایا اے اللہ! اگر یہ کام میں نے تیری خوشنودی کے لئے کیا ہو تو اس کو ہم سے کھول دے چنانچہ اللہ نے وہ چٹان کھول دی اور سب باہر نکل آئے واللہ اعلم۔

اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ قابل ذکر ہے وہ وقت جب ان نوجوانوں نے اس غار میں جا کر پناہ لی تھی.... یہاں سے اصحاب کہف کا قصہ شروع ہے۔ اَوٰى فُلَانٌ اِلٰى مَوْضِعٍ فلاں شخص نے اس جگہ کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ بغوی نے لکھا ہے یہ غار بیجلوس پہاڑ میں تھا۔ اس غار کا نام تھا جیرم۔

فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً انہوں نے کہا اے ہمارے رب ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ رحمت کا لفظ عام ہے دین کی ہدایت، گناہوں کی مغفرت، رزق کی وسعت، امن وغیرہ سب کو شامل ہے۔

وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ⑩ اور ہمارے لئے اس کام میں درستی کا سامان مہیا کر دیجئے۔ یعنی ایمان اور مفارقت کفر پر قائم رہنے کی کوئی صورت ہمارے لئے تیار کر دے (اس مطلب پر اَمْرِنَا سے مراد ہو گا ایمان اور ترک کفر) یا یہ مطلب ہے کہ ہمارے تمام معاملات میں ہم کو حق پر استقامت عطا فرما، اس وقت اَمْرِنَا سے تمام معاملات زندگی مراد ہوں گے۔ رَاَيْتُ مِنْكَ رُشْدًا عربی محاورہ ہے یعنی میں نے تیری طرف سے حق پر استقامت اور پختگی دیکھ لی۔ کذا فی القاموس۔ رَشِدَ باب نصر و سمع دونوں سے آتا ہے اس کا مصدر رُشْد اور رَشَد اور رَشَاد ہے رَشِدَ ہدایت یاب ہو گیا۔ باب استفعال سے بمعنی رَشَدَ کے بھی آتا ہے اور طلب رشد بھی اس کا معنی ہو جاتا ہے۔ اللہ کی صفات میں رشید کا استعمال ہادی کے معنی میں ہوتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اصحاب کہف غار کے اندر پناہ گیر ہونے پر کیوں مجبور ہوئے، علماء نے اس کے مختلف اسباب بیان کئے ہیں۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا عام عیسائیوں کی دینی حالت بہت بگڑ گئی تھی، بت پرستی تک نوبت پہنچ گئی تھی، بتوں پر چڑھاوے چڑھانے اور ان کے نام پر قربانیاں کرنے کا بھی رواج ہو گیا تھا، بادشاہ بھی سرکش اور بے دین ہو گئے تھے، لیکن کچھ لوگ صحیح دین عیسوی پر قائم تھے اور اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے تھے، بے دین مخالف توحید بادشاہوں میں سے دقیانوس نام کا بھی

ایک بادشاہ تھا اس کی حکومت بلادِ روم پر تھی، یہ بت پرستی کرتا اور بتوں کے نام کی قربانیاں کرتا تھا اور جو لوگ توحید پر قائم رہتے تھے ان کو قتل کرا دیتا، اپنے ملک کی مختلف بستیوں میں جاتا اور وہاں کے باشندوں کی جانچ کرتا جو بت پرستی اختیار کر لیتا اس کو چھوڑ دیتا اور جو انکار کرتا اس کو قتل کرا دیتا تھا، حسب عادت ایک بار یہ شہر افسوس میں جا کر اترا جو لوگ اہل ایمان تھے ڈر کے مارے وہ چھپ گئے اور جدھر کو جس کا منہ اٹھا بھاگ نکلے جو اہل ایمان پکڑے جاتے ان کو بت پرستی کی ترغیب دی جاتی اگر وہ توحید چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرنے لگتے تو ان کو چھوڑ دیا جاتا ورنہ قتل کر دیا جاتا۔ اور مقتولین کے ٹکڑے کر کے شہر پناہ کی دیواروں پر اور دروازوں پر لٹکا دیا جاتا۔ چند مومن نوجوان جن کی تعداد آٹھ بتائی گئی ہے، ایمان میں بڑے پختہ اور نماز روزے کے بہت پابند تھے اور سب رومی امراء کے لڑکے تھے، سخت گھبرا گئے اور مضطرب ہو کر زاری کے ساتھ انہوں نے دعا کی رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ ہمارا رب وہی ہے جو زمین و آسمان کا رب ہے ہم اس کے سوا کسی معبود کی عبادت ہرگز نہیں کریں گے ورنہ یہ بڑی زیادتی اور حق سے تجاوز ہوگا، اے رب اپنے ایماندار بندوں سے اس فتنہ کو دور کر دے، ان کی مصیبت دفع کر دے کہ وہ تیری عبادت علی الاعلان کر سکیں۔ یہ لوگ مسجد کے اندر سجدوں میں پڑے یہ دعا کر ہی رہے تھے کہ سرکاری افسر آپہنچے اور سب کو گرفتار کر کے دقیانوس کے پاس لے گئے اور کہا آپ دوسرے لوگوں کو تو اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لئے قتل کراتے ہیں اور یہ لوگ جو آپ ہی کے خاندان کے ہیں آپ کے حکم کے خلاف کرتے اور آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بادشاہ نے حکم دیا ان کو پیش کرو۔ یہ نوجوان پیش کیے گئے۔ سب کے چہرے غبار آلود تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے، بادشاہ نے کہا تمہارے شہر کے سردار ہمارے معبودوں کی پرستش کرتے اور ان پر قربانیاں چڑھاتے ہیں تم ان کی طرح کیوں نہیں کرتے اور ان کا رنگ ڈھنگ کیوں نہیں اختیار کرتے، میں تم کو اختیار دیتا ہوں کہ یا تو ہمارے معبودوں پر بھینٹ چڑھاؤ اور ان کی پوجا کرو، ورنہ میں تم کو قتل کرا دوں گا۔ مکسلمینا نے جو سب میں بڑا تھا کہا ہمارا معبود وہ ہے جس کی عظمت سے تمام آسمان بھرے ہوئے ہیں، ہم اس کے سوا کبھی کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اسی کے لئے حمد، بزرگی اور پاکی ہے ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اسی سے نجات اور خیر کے طلب گار ہیں، آپ جو چاہیں کریں ہم آپ کے بتوں کی پوجا نہیں کر سکتے۔ مکسلمینا کے دوسرے ساتھیوں نے بھی دقیانوس کو یہی جواب دیا، یہ جواب سن کر دقیانوس نے حکم دیا کہ ان کے امیرانہ کپڑے اتروا لئے جائیں۔ حکم کی تعمیل کر دی گئی، پھر کہنے لگا میں ذرا (دوسروں سے) فارغ ہو لوں تو تم کو وہ سزا دوں گا جو تمہارے لئے میں نے تجویز کی ہے، تم ابھی نوجوان ہو تم کو قتل کرنا میں نہیں چاہتا اسی لئے میں تم کو سزا دینے میں جلدی نہیں کر رہا ہوں اور تم کو مہلت دیتا ہوں کہ تم اپنے معاملہ پر غور کر لو۔ اس کے بعد ان کے سارے امیرانہ زیور اتار لئے گئے اور دربار سے نکال دیا گیا اور دقیانوس اس بستی کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر کو چل دیا اور واپسی تک کی ان کو سوچنے کی مہلت دے گیا۔ جب وہ شہر سے چلا گیا تو سب نے باہم مشورہ کیا کہ اس کی واپسی سے پہلے پہلے کچھ تدبیر کرنی ضروری ہے، چنانچہ باہم مشورہ کر کے طے کیا کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر سے کچھ روپیہ لے کر آئے اس میں سے کچھ تو غریبوں کو بانٹ دے اور کچھ کھانے پینے کے لئے رکھ لے پھر سب شہر کے قریب کوہ بیجلوس کے غار میں جا کر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جائیں اور دقیانوس کی واپسی تک وہیں ٹھہرے رہیں، جب دقیانوس آ جائے تو اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو جائیں پھر وہ جو کچھ چاہے کرے (یعنی ہر ایک کو قتل ہونے کے لئے تیار ہو کر دقیانوس کے پاس جانا چاہیے حسب مشورہ ہر شخص اپنے باپ کے گھر جا کر کچھ روپیہ لے آیا، اس میں سے کچھ خیرات کر دیا اور باقی اپنی گزر بسر کے لئے رکھ لیا اور ایک غار میں داخل ہو گئے، ایک کتا بھی ان کے پیچھے ہو لیا وہ بھی غار میں چلا گیا۔ سب غار میں جا کر ٹھہر گئے۔ کعب احبار کا بیان ہے اثناء راہ میں ایک کتا ان کے پیچھے ہو لیا، انہوں نے بھگا دیا لیکن وہ پھر لوٹ آیا، انہوں نے پھر بھگا دیا کتا پھر لوٹ آیا ایسا چند مرتبہ کیا تو کتا بولا لوگو! تم چاہتے کیا ہو، میری طرف سے اندیشہ نہ کرو۔ جن کو اللہ سے محبت ہے مجھے ان سے محبت ہے تم وہاں سو نا میں تمہارا چوکیدارا کروں گا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے یہ لوگ رات کو دقیانوس سے بھاگے تھے، کل سات آدمی تھے ایک چرواہے کی طرف

سے گزرے جس کے پاس کتا تھا چرواہا بھی ان کا ہم مذہب ہو گیا اور ساتھ ہو لیا اور کتا بھی پیچھے پیچھے آ گیا، سب لوگ شہر سے نکل کر ایک قریبی غار کی طرف چلے گئے اور اس میں داخل ہو گئے اور وہیں قیام پذیر ہو کر نماز، روزے، تحمید، تسبیح اور تکبیر اللہ کی حمد کرنے، اس کی پاکی بیان کرنے اور عظمت کا اقرار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اس کے علاوہ ہر شغل کو چھوڑ دیا اور کل روپیہ اپنے ایک ساتھی جس کا نام تملیخا تھا کے پاس رکھ دیا، تملیخا بڑا اچھی خوش تدبیر، خوبصورت اور بہادر تھا شہر کو چھپ کر جاتا اور سب کے لئے کھانے پینے کی چیزیں خرید لاتا تھا، تملیخا جب شہر کو جانا چاہتا تو اپنے بڑھیا خوب صورت کپڑے اتار کر فقیروں اور بھیک منگوں کے جیسے کپڑے پہن لیتا اور سکہ لے کر شہر میں جا کر کھانے پینے کی چیزیں خریدتا اور ٹوہ لگاتا کہ دقیانوس یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے ان لوگوں کا کچھ تذکرہ کیا یا نہیں، پھر لوٹ کر آ جاتا اور ساتھیوں کو مطلع کر دیتا۔ اس طرح غار کے اندر یہ لوگ مدت تک رہے، مدت کے بعد دقیانوس شہر میں واپس آیا اور سرداران شہر کو بتوں پر قربانیاں چڑھانے کا حکم دیا، اہل ایمان میں پھر کھلبلی مچ گئی، تملیخا ابھی اس وقت شہر کے اندر ہی تھا، ساتھیوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں خرید نے گیا تھا، غریب تھوڑا سا کھانا لے کر روتا ہوا لوٹ آیا اور آ کر ساتھیوں کو بتایا کہ وہ ظالم شہر میں آ گیا ہے وہ اور اس کے ساتھی اور شہر کے بڑے لوگ ہماری جستجو میں ہیں، یہ بات سن کر سب گھبرا گئے اور سجدہ میں پڑ کر گڑگڑا کر اللہ سے دعا کرنے اور فتنہ سے پناہ مانگنے میں مشغول ہو گئے۔ تملیخا نے کہا یارو! سروں کو اٹھاؤ کھانا کھاؤ اور اللہ پر توکل رکھو، سب نے سجدے سے سر اٹھائے آنکھوں سے آنسو جاری تھے، پھر سب نے کھانا کھایا، یہ واقعہ غروب آفتاب کے وقت کا تھا کھانے کے بعد آپس میں باتیں کرنے اور پڑھنے پڑھانے اور باہم نصیحتیں کرنے میں مشغول ہو گئے، غار کے اندر باتوں میں ہی مشغول تھے کہ یکدم اللہ نے سب پر نیند کو مسلط کر دیا، سب سو گئے۔ کتا دروازے پر پاؤں پھیلائے پڑا تھا جو نیند اللہ نے ان لوگوں پر مسلط کی تھی وہی کتے پر بھی مسلط کر دی، اس وقت ان کا سارا روپیہ سرہانے پڑا رہا دوسرے دن صبح ہوئی تو دقیانوس نے ان کو تلاش کرایا لیکن کسی کو نہ پا سکا کہنے لگا مجھے ان جوانوں کے کیس نے پریشان کر رکھا ہے، انہوں نے خیال کیا کہ میں ان پر ناراض ہوں (اور ضرور قتل کرا دوں گا اس لئے چھپ گئے) وہ اپنی نادانی کی وجہ سے میرے سلوک سے واقف نہ تھے اگر وہ توبہ کر لیتے اور میرے معبودوں کو پوجنے لگتے تو میں ان پر کسی قسم کا بار نہیں ڈالتا، شہر کے سرداروں نے کہا آپ کو ان سرکشوں، نافرمانوں، بدکاروں پر رحم کرنا ہی نہیں چاہئے تھا (وہ اس قابل ہی نہیں تھے) آپ نے ان کو ایک محدود مہلت دے دی تھی اگر وہ چاہتے تو اس مدت کے اندر توبہ کر لیتے اور (فرماں برداری کی طرف) لوٹ آتے لیکن انہوں نے تو توبہ ہی نہیں کی۔ بادشاہ یہ بات سن کر سخت مشتعل ہو گیا اور اصحاب کہف کے باپوں کو بلوایا اور ان کے بیٹوں کے متعلق جواب طلب کیا اور دریافت کیا تمہارے وہ سرکش بیٹے کہاں ہیں جنہوں نے میرے حکم سے سرتابی کی۔ وہ بولے ہم نے تو آپ کی نافرمانی کی نہیں، پھر ان سرکشوں کے جرم کی وجہ سے آپ ہم کو قتل نہ کریں وہ تو ہمارا بھی مال لے گئے اور لے جا کر بازاروں میں برباد کر دیا یعنی فقیروں کو بانٹ دیا۔ یہ معذرت سن کر بادشاہ نے ان کو چھوڑ دیا اور کچھ آدمیوں کو کوہ بیجلوس کی طرف بھیجا اور اس کے سوا کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی کہ جس غار کے اندر اصحاب کہف داخل ہوئے تھے، اس کا منہ بند کرا دے، اللہ کی مشیت تھی کہ اصحاب کہف کو عزت عطا فرما دے اور آنے والی قوموں کے لئے اپنی قدرت کی نشانی بنا دے اور لوگوں کو دکھا دے کہ قیامت ضرور آئے گی اور (جس طرح اس غار کے اندر نیند کی حالت میں اللہ نے ان کو سینکڑوں برس رکھ کر پھر زندہ اٹھایا اسی طرح) اللہ قبروں سے مردوں کو زندہ کر کے اٹھائے گا۔ غرض دقیانوس نے غار کا منہ بند کرا دیا اور کہا جس غار کو انہوں نے اپنے لئے پسند کیا ہے اسی غار کو ان کے لئے قبریں بنا دو۔ وہیں گھٹ گھٹ کر بھوکے پیاسے مر جائیں، اس کا خیال تھا کہ اصحاب کہف بیدار ہیں اور غار کے بند ہو جانے کا ان کو علم ہے، حالانکہ اللہ نے نیند کی حالت کی طرح ان کی روحوں کو قبض کر لیا تھا، کتا غار کے دروازے پر اگلے دونوں پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا اور جس طرح نیند اصحاب کہف پر مسلط کر دی گئی تھی اسی طرح کتے پر بھی نیند چھا گئی تھی۔ اللہ کے حکم سے اصحاب کہف سونے میں دائیں بائیں کروٹیں بھی لیتے تھے (اگر ایک پہلو پر پڑے رہتے تو ممکن تھا گوشت گل جاتا اس لئے کروٹ لینا ضروری تھا)

شاہ دقیانوس کے خاندان میں دو آدمی مومن بھی تھے جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے ایک کا نام بیدروس اور دوسرے کا رایاش تھا، دونوں نے مشورہ کرنے کے بعد اصحاب کہف کے نام نسب، خاندان اور پورا واقعہ رانگ کی ایک تختی پر لکھ کر تانبے کے صندوق میں تختی کو رکھ کر ایک بنیاد میں صندوق کو اس خیال سے دفن کر دیا کہ قیامت سے پہلے ممکن ہے اہل ایمان کا کوئی گروہ اس جگہ قابض ہو جائے اور اس تحریر کو پڑھ کر ان کو اصحاب کہف کا واقعہ معلوم ہو جائے..... دقیانوس اور اس کی قوم کے بعد صدیاں گزر گئیں اور پے در پے بادشاہ آتے جاتے رہے اور اصحاب کہف غار کے اندر استراحت فرماتے رہے اور صندوق دفن رہا۔ عبید بن عمیر کا بیان ہے کہ اصحاب کہف چند نوجوان تھے جو گلے میں طوق اور ہاتھوں میں کنگن پہنے ہوئے تھے، زلفیں چھوڑی ہوئی تھیں، ایک شکاری کتا، ان کے ساتھ تھا کسی بڑے تہوار کے موقع پر بن سج کر گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلے اور ساتھ میں ان بتوں کو بھی لے لیا جن کو پوجتے تھے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا، ان میں سے ایک وزیر بھی تھا سب در پردہ مومن تو ہو گئے لیکن ہر ایک نے دوسرے سے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا اور ہر ایک نے دل میں طے کر لیا کہ ان کافروں کے ساتھ مجھے نہ رہنا چاہئے کہیں ان کے جرائم پر آنے والا عذاب مجھ پر نہ آجائے۔ غرض سب الگ الگ ہو گئے پہلا ایک جا کر کسی درخت کے سایہ میں تنہا بیٹھ گیا، دوسرے نے اس کو تنہا بیٹھے دیکھا تو خیال کیا کہ شاید اس کی حالت بھی میری حالت کی طرح ہو گئی ہے، اس لئے زبان سے ظاہر کئے بغیر اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا، پھر تیسرا اسی خیال کو لے کر چلا اور دونوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا، اس طرح ایک ایک کر کے سب جمع ہو گئے۔ پھر ایک نے ایمان کو پوشیدہ رکھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے دوسرے سے کہا، آپ حضرات یہاں کس غرض سے جمع ہوئے ہیں، دوسرے نے بھی یہی پوچھا، اور تیسرے چوتھے، غرض سب نے یہی سوال کیا، پھر دو دو کی ٹکڑیاں بنا کر انتہائی رازداری کے ساتھ ایک نے دوسرے پر حقیقت ظاہر کی اور معلوم ہوا کہ سب مومن ہیں، پہاڑ میں قریب ہی ایک غار تھا سب نے مشورہ کر کے اس کی طرف رخ کیا اور غار میں چلے گئے، شکاری کتا بھی ساتھ تھا اندر جا کر سب سو گئے اور ۳۰۹ برس تک سوتے رہے۔ قوم والوں نے ان کو تلاش کیا لیکن اللہ نے غار کو ہی ان کی نظر سے غائب کر دیا اور تمام نشانات محو کر دیئے، مجبوراً ان کے نام نسب خاندان ایک تختی پر تحریر کئے اور لکھ دیا کہ فلاں فلاں اشخاص جو فلاں فلاں بادشاہ (امراء) کے بیٹے تھے، فلاں بادشاہ کے دور حکومت میں فلاں سال فلاں مہینے کھو گئے اور تلاش کے بعد بھی نہیں ملے، پھر یہ تختی سرکاری محافظ خانہ میں رکھ دی گئی، کچھ مدت کے بعد وہ بادشاہ مر گیا اور صدیاں گزرتی گئیں۔

وہب بن منبہ نے بیان کیا حضرت عیسیٰ کا ایک حواری اصحاب کہف کے شہر کو گیا تھا، شہر کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا، کسی نے کہا شہر کے دروازے پر ایک بت ہے، پہلے اس بت کو سجدہ کرنا پڑتا ہے، پھر اندر داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے، حواری نے اس حرکت کو پسند نہیں کیا اور شہر کے قریب ایک حمام میں جا کر حمام والے کی نوکری کر لی اور کام کرنے لگا، حمام والے کو حواری کے آتے ہی بڑی برکت حاصل ہوئی اس کے کام کو بہت ترقی ہو گئی۔ شہر کے بعض نوجوانوں کا بھی اس حواری سے کچھ تعلق ہو گیا وہ اس کے پاس بیٹھنے لگے، حواری ان کو آسمان و زمین کی خبریں سناتا تھا اور وہ شوق سے سنتے تھے آخر وہ لوگ حواری پر ایمان لے آئے اور عیسائی ہو گئے۔ حواری نے حمام والے سے شرط کر لی تھی کہ رات کو میری نماز میں کوئی مداخلت نہ کرے رات میری ہے، رات کو کوئی کام نہیں کروں گا ایک روز شہزادہ ایک عورت کو لے کر حمام میں آیا، حواری نے کہا آپ شہزادے ہیں اور اس عورت کو لے کر حمام میں داخل ہو رہے ہیں۔ شہزادہ کو شرم آئی اور واپس چلا گیا، لیکن دوسری مرتبہ پھر آیا اور حواری نے پہلی بار کی طرح نصیحت کی، اس مرتبہ حواری کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ کی بلکہ اس کو جھڑک دیا، دونوں حمام میں داخل ہو گئے۔ بادشاہ کو کسی نے اطلاع دی کہ شہزادہ کو حمامی نے قتل کر دیا، بادشاہ نے حمامی کی تلاش کے لئے آدمی بھیجے مگر وہ بھاگ گیا، ہاتھ نہیں آیا۔ بادشاہ نے پوچھا، اس کے ساتھ کون لوگ رہتے تھے لوگوں نے بتایا فلاں فلاں جوان رہتے تھے، ان جوانوں کی جستجو کی گئی لیکن وہ بھی شہر سے باہر نکل گئے اور راستہ میں ایک اور شخص کو بھی ساتھ لے لیا جو انہیں کی طرح ایمان پر قائم تھا۔ ایک کتا بھی ساتھ ہو لیا، حمامی سب کو ایک غار پر لے گیا، سب اس میں داخل ہو گئے اور وہیں رات

گزارنے کا ارادہ کرلیا اور طے کرلیا کہ آج رات یہیں رہو، صبح ہوگی تو کچھ سوچیں گے۔ چنانچہ اندر پہنچ کر رات کو بے خبر سو گئے، بادشاہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ان کی جستجو میں نکلا اور غار پر جا پہنچا، معلوم ہوا وہ لوگ اندر جا چکے ہیں، بادشاہ کے ساتھیوں میں سے کسی شخص نے اندر گھسنے کا ارادہ کیا مگر دہشت زدہ ہو گیا پھر کسی میں اندر گھسنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک شخص نے بادشاہ سے کہا اگر وہ آپ کے ہاتھ آجاتے تو کیا آپ کا ارادہ ان کو قتل کر لینے کا نہ تھا۔ بادشاہ نے کہا ہاں، یہی ارادہ تھا۔ اس شخص نے کہا تو اب غار کے دروازے کو بند کرا کے کوئی دیوار بنوا دیجئے کہ اندر بھوکے مر جائیں (بہر حال قتل کر دینا تو مقصد ہی ہے) بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔

وہب کا بیان ہے، دروازے کی بندش کو اس کے بعد طویل زمانہ گزر گیا، ایک دور کے بعد دوسرا دور آیا اور گزرتا چلا گیا مدت کے بعد اتفاقاً جنگل میں کسی چرواہے کو بارش نے آگھیرا وہ بکریاں بھیڑیں لے کر پناہ لینے کے لئے اس غار کی طرف آیا اور بکریوں کو سایہ میں محفوظ رکھنے کے لئے کوشش کر کے اس نے دروازہ کھول دیا ادھر۔ صبح ہوگی تو اللہ نے ان کی روحیں لوٹا دیں (یعنی ان کو بیدار کر دیا اور ایسا معلوم ہوا کہ رات بھر سو کر صبح کو بیدار ہوئے ہیں)۔

محمد بن اسحاق نے لکھا ہے مدت کے بعد وہاں کی حکومت ایک نیک آدمی کے ہاتھ آگئی اس شخص کا نام بیدوسیس تھا، اس کی حکومت کو جب ۶۸ سال گزر گئے تو لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے، ایک گروہ مومنوں کا تھا جو اللہ پر ایمان رکھتا اور قیامت کو حق جانتا تھا اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا جو اللہ اور قیامت کا منکر تھا، بیدوسیس کو یہ پھوٹ اور گمراہی کا پھیلاؤ دیکھ کر بڑا رنج ہوا وہ اللہ کے سامنے رو دیا، زاری کی اور اس کو اس بات سے بڑا دکھ ہوا کہ اہل باطل حق پرستوں پر غالب ہوتے بڑھتے چلے جارہے ہیں، اہل باطل حشر جسمانی کے قائل نہیں تھے صرف حشر روحانی کو مانتے تھے اور دنیوی زندگی پر ہی ریجھے ہوئے تھے، بیدوسیس نے ان لوگوں کو بلوایا جن کے متعلق خیال تھا کہ وہ ائمہ حق اور اصحاب خیر ہیں جب وہ آئے تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بھی قیامت کے قائل نہیں ہیں اور لوگوں کو حواریوں کے دین و مذہب سے مرتد بنا دینے اور لوٹا دینے کے خواستگار ہیں یہ دیکھ کر بادشاہ اپنے کمرے میں چلا گیا، دروازہ بند کر لیا، کمبل کا لباس (یعنی فقیرانہ لباس) پہن لیا اور راکھ بچھا کر اس پر بیٹھ گیا اور مدت تک رات دن مسلسل اللہ کے سامنے گریہ وزاری کرتا اور دعا کرتا رہا کہ الٰہی تو ان لوگوں میں تفرقہ پڑ جانے سے واقف ہے کوئی ایسی نشانی ظاہر کر دے، جس سے ان لوگوں کا یہ عقیدہ کا غلط اور باطل ہونا واضح ہو جائے۔ یوں بھی اللہ رحمن ور حیم ہے اس کو اپنے بندوں کا تباہ ہونا پسند نہیں، اس نے اپنے نیک بندے بیدوسیس کی دعا قبول فرمائی اور اصحاب کہف کی حالت کو ظاہر کرنا اور ان کو منکرین قیامت کے خلاف بطور دلیل پیش کرنا اور ثبوت قیامت اور مردوں کی بعثت پر یقین دلانے کے لئے ایک نشانی نمایاں کرنا چاہا۔ اس کی یہ بھی مرضی ہوئی کہ مسلمانوں کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر مجتمع ہو جائے جس کی صورت اس نے یہ پیدا کی کہ جس بستی میں اصحاب کہف کا غار تھا وہیں ایک باشندہ کے دل میں یہ ارادہ پیدا کر دیا کہ غار کے دروازے پر جو عمارت بنائی گئی تھی اس کو ڈھا کر اپنی بکریوں کے لئے ایک باڑہ بنادے اس شخص کا نام اولیاس تھا، اولیاس نے دو مزدور رکھ کر غار کے دروازے کی عمارت کے پتھر اکھڑوانا اور اپنی بکریوں کے لئے باڑہ بنوانا شروع کر دیا آخر دروازہ کی ساری عمارت صاف کر دی اور دروازہ کھل گیا، پھر اللہ نے اصحاب کہف کو اٹھا کر بٹھا دیا وہ خوش خوش شگفتہ رو، ہشاش بشاش اٹھے اور خیال کیا کہ حسب معمول ہم رات کو سوئے تھے اور صبح ہوئی تو بیدار ہو گئے۔ پھر معمول کے مطابق انہوں نے نمازیں پڑھیں اور کوئی ایسی علامت ان کے چہروں پر نمودار نہیں ہوئی جس سے اجنبیت یا انوکھا پن ظاہر ہوتا وہ یہی سمجھتے رہے کہ بادشاہ دقیانوس ہماری جستجو میں لگا ہوا ہے۔ اتنی بات ضرور تھی کہ وہ یہ سمجھے تھے کہ ہم آج کچھ زیادہ سوئے اسی لئے انہوں نے باہم پوچھنا شروع کیا ہم کتنی دیر سوئے کسی نے کہا ایک دن، دوسرے نے کہا کچھ کم ایک دن سوئے ہوں گے (تعیین کے ساتھ صحیح مقدار خواب کوئی نہ بتا سکا) بالآخر بول اٹھے اللہ ہی جانے ہم کتنے وقت سوتے رہے۔ نماز کے بعد انہوں نے اپنے ایک ساتھی سے جس کا نام تملیخا تھا اور جس کے پاس سب کا خرچ تھا، کہا جا کر خبر لاؤ کہ اس ظالم کے سامنے شام کو (ہمارے آنے کے بعد) لوگوں نے کیا باتیں کہیں۔ تملیخا نے کہا گیا

تم شہر میں نہیں ہو، وہ ظالم چاہتا ہے کہ تم کو پکڑ وا لے اور تم اس کے بتوں پر قربانیاں چڑھاؤ اور انکار کرو تو وہ تم کو قتل کرا دے۔ جو اللہ چاہے گا وہ ہوگا فکر کس بات کی ہے مکسلمینا بولا، دوستو! خوب سمجھ لو کہ تم سب کو اللہ کے سامنے جانا ہے اللہ کے اس دشمن کے کہنے سے اپنا ایمان چھوڑ کر کافر نہ بن جانا، اس کے بعد سب نے تملیخا کو مامور کیا کہ شہر کو جا کر خبر لائے کہ وہاں کیا تذکرے ہو رہے ہیں اور دقیانوس سے کیا باتیں کہی جا رہی ہیں اور ذرا چالاکی سے جانا کسی کو تمہارا پتہ نہ چل جائے اور وہاں سے کھانے کے لئے بھی کچھ زیادہ خرید کر لانا ہم سب بھوکے ہیں۔ تملیخا تیار ہو گیا اور بھیس بدلا، کپڑے اتار کر دوسرے پہنے اور دقیانوسی سکے لے کر باہر نکلنے کے لئے چل دیا، غار کے دروازے پر پہنچا تو دیکھا دروازے کے پتھر اکھڑے ہوئے ہیں دیکھ کر تعجب کیا لیکن کچھ زیادہ پرواہ نہیں کی اور چھپتا چھپاتا اور راستے سے کتراتا شہر کے دروازے پر پہنچ گیا وہ دقیانوس ہی کا زمانہ سمجھا تھا، اس لئے ڈرتا تھا کہ کوئی اس کو پہچان نہ لے۔ اس کو معلوم ہی نہ تھا کہ دقیانوس کو مرے ہوئے تین سو برس ہو گئے۔ شہر کے دروازے پر پہنچا اور دروازے کے اوپر نظر پڑی تو ایسی علامتیں دکھائی دیں کہ ایمان والوں کو یہاں آزادی ہے، علامات سے اس بستی کا ایمانداروں کی بستی ہونا ظاہر ہو رہا تھا یہ دیکھ کر بڑا تعجب کیا اور پوشیدہ طور پر حیرت سے دروازے کو دیکھنے لگا پھر اس دروازے کو چھوڑ کر شہر کے دوسرے دروازے کی طرف گیا، وہاں بھی وہی علامتیں دکھائی دیں جو پہلے دروازے پر تھیں خیال کیا کہ یہ وہ شہر ہی نہیں ہے کوئی دوسرا شہر ہے جو میری شناخت میں نہیں آرہا ہے، وہاں کچھ لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے پایا تو وہ لوگ بھی غیر نظر آئے۔ غرض تعجب میں پڑ گیا اور خیال کیا کہ راستہ بھٹک گیا پھر لوٹ کر پہلے دروازہ پر آگیا اور حیرت کرنے لگا کہ یہ وہی چیزیں ہیں جو کل رات تھیں یہ نشانیاں تو مسلمانوں کی ہیں جن کو وہ پوشیدہ رکھا کرتے تھے اور آج یہ نظروں کے سامنے ہیں کیا میں سوتے میں خواب دیکھ رہا ہوں پھر خود ہی کہتا تھا میں تو جاگ رہا ہوں آخر اپنی چادر سر پر ڈالی اور شہر میں داخل ہو گیا، چلتے چلتے بازار میں پہنچا تو وہاں کچھ لوگوں کو حضرت عیسیٰ بن مریم کی قسمیں کھاتے ہوئے سنا اس کے دل میں اور زیادہ ڈر پیدا ہوا اور یقین کر لیا کہ میں راستہ بھول کر کہیں اور آنکلا ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا، کل شام تو سوائے چند آدمیوں کے اس سرزمین پر عیسیٰ بن مریم کا نام لینے والا کوئی بھی نہ تھا، آج صبح کیا بات ہو گئی کہ جس سے سنتا ہوں وہ بے دھڑک عیسیٰ کا ذکر کر رہا ہے، شاید میں کسی انجان شہر میں آگیا۔ مگر ہمارے شہر کے قریب تو کوئی اور بستی بھی نہ تھی، پھر ایک جوان سے ملاقات ہوئی اور اس سے تملیخا نے اس شہر کا نام پوچھا، جوان نے کہا اس شہر کا نام افسوس ہے۔ تملیخا نے دل میں کہا شاید میں مسلوب الحواس اور بے عقل ہو گیا، اب تو میرے لئے یہی مناسب ہے کہ میں یہاں سے نکل جاؤں اس سے پہلے کہ میری بے عزتی کی جائے یا کوئی اور افتاد مجھ پر پڑے اور میں مارا جاؤں پھر ذرا ہوش آیا تو کہنے لگا قبل اس کے کہ لوگ مجھے جان لیں، یہاں سے بہت جلد نکل جانا ہی مناسب ہے یہ سوچ کر فوراً نان فروشوں کے پاس گیا اور چاندی کا سکہ جو ساتھ لیا تھا نکال کر ایک نان فروش کو دے کر کھانا طلب کیا، نان فروش نے روپیہ لے کر اس کو غور سے دیکھا، مہر اور سکہ کی ضرب پر نظر کی اور تعجب کیا پھر ایک اور آدمی کی طرف پھینک دیا اس نے بھی غور سے دیکھا، اس طرح چند آدمی دیکھنے لگے، ایک دوسرے کی طرف پھینک دیتا، اور وہ دیکھ کر تیسرے کی طرف پھینک دیتا اب ان لوگوں نے آپس میں کہنا شروع کیا، پرانے زمانے کا گڑا ہوا کوئی پوشیدہ دفینہ اس شخص کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ تملیخا نے جوان لوگوں کو سکے کے متعلق گفتگو کرتے دیکھا تو اس کو بڑا ڈر لگا۔ خوف کے مارے کانپنے لگا اور سمجھ گیا کہ یہ لوگ مجھے پہچان گئے اور شاہ دقیانوس کے پاس مجھے پکڑ کر لے جانا چاہتے ہیں کچھ دوسرے لوگ اور بھی آگئے اور تملیخا کو انہوں نے پہچاننے کی کوشش کی مگر پہچان نہ سکے۔ تملیخا نے ان لوگوں سے ڈرتے ڈرتے کہا، مجھ پر مہربانی کرو تم نے میرا روپیہ بھی لے لیا اور کھانا بھی نہیں دیا اب مجھے تمہارے کھانے کی ضرورت نہیں اور روپیہ بھی تم ہی رکھ لو، لوگوں نے پوچھا اے شخص تو ہے کون اور واقعہ کیا ہے یقیناً گزشتہ لوگوں میں سے کسی کا کوئی دفینہ تجھے مل گیا ہے تو اس کو ہم سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ہم کو اپنے ساتھ لے کر چل اور دفینہ دکھا اور ہم کو بھی اس میں حصہ دار بنا۔ اس صورت سے تو ہم تیرا معاملہ پوشیدہ رکھیں گے ورنہ حاکم کے پاس لے جائیں گے اس کے سپرد کر دیں گے اور تو مارا جائے

گا، تملیخا نے ان کی باتیں سن لیں تو کہا اسی مصیبت میں پھنس گیا جس کا مجھے اندیشہ تھا، لوگوں نے کہا اے شخص خدا کی قسم اب تو ہم سے چھپا کے تو نہیں رکھ سکتا، تملیخا کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان باتوں کا کیا جواب دے، ڈر کے مارے خاموش رہا، کچھ بھی نہیں بتایا، لوگوں نے دیکھا کہ وہ بولتا ہی نہیں تو سر سے چادر کھینچ کر گلے میں ڈال کر کھینچتے ہوئے شہر کی گلیوں میں لے گئے، گلیوں والے وجہ پوچھتے تو بتاتے یہ شخص اس لئے پکڑا گیا ہے کہ اس کے پاس پرانا دفینہ ہے، غرض شہر کے تمام باشندے چھوٹے بڑے جمع ہونے لگے اور تملیخا کو دیکھ کر کہنے لگے یہ آدمی اس شہر کا رہنے والا تو ہے نہیں ہم نے اس کو کبھی نہیں دیکھا، تملیخا ڈر کے مارے خاموش تھا، بات ہی نہیں کرتا تھا، لیکن یہ اس کو یقین تھا کہ اس کا باپ، بھائی اور قرابتدار اسی شہر میں موجود ہیں اور اس شہر کے بڑے لوگ ہیں جب وہ سنیں گے تو یقیناً آئیں گے اور یہ لوگ اگر پکڑ کر لے جانا چاہیں گے تو گھر والے آکر چھڑا لیں گے، بے چارہ اسی انتظار میں تھا کہ لوگ اس کو شہر کے دو حاکموں کے پاس لے جانے لگے۔ یہ دونوں حاکم شہر کے منتظم تھے اور نیک آدمی تھے، ایک کا نام اریوس اور دوسرے کا نام اسطیوس تھا۔ تملیخا واقف نہ تھا، راستہ میں گھر والوں کے انتظار میں دائیں بائیں دیکھتا جاتا تھا اور لوگ پاگل کی طرح اس کی ہنسی بنا رہے تھے۔ تملیخا نے روتے ہوئے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہا اے اللہ تو آسمانوں کا اور زمین کا الٰہ ہے۔ آج میرے دل میں صبر ڈال دے اور اپنی طرف سے میرے ساتھ روح (جبرئیل) یا اور کوئی غیبی مددگار کو بھیج دے جو اس ظالم کے سامنے میری مدد کرے، غریب تملیخا آنسو بہا رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا دوستوں سے مفارقت ہو گئی، میں ان سے بچھڑ گیا، جو کچھ مجھے پیش آیا کاش اس کی ان کو اطلاع ہو جاتی تو وہ یقیناً آجاتے اور سب مل کر اس ظالم کے سامنے جاتے کیونکہ ہم نے آپس میں معاہدہ کر لیا تھا کہ کوئی جدا نہ ہو، سب ساتھ رہیں گے زندگی میں بھی اور مرنے میں بھی۔ وہ اپنے دل میں یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ لوگ دو نیک حاکموں یعنی اریوس اور اسطیوس کے پاس لے پہنچے جب تملیخا نے دیکھا مجھے دقیانوس کی پاس نہیں لے جایا جائے گا تو ہوش درست ہو گئے اور رونا موقوف کر دیا اریوس اور اسطیوس نے روپیہ لے کر دیکھا اچنبھے میں پڑ گئے اور دریافت کیا اے شخص جو دفینہ تجھ کو ملا ہے وہ کہاں ہے۔ تملیخا نے کہا مجھے تو کوئی دفینہ نہیں ملا یہ روپیہ تو میرے باپ دادا سے میرے پاس آیا ہے ضرب اور ٹکسال اسی شہر کی ہے لیکن میری سمجھ میں خود اپنی حالت نہیں آتی کہ میں کہاں ہوں، کل میں نے کیا دیکھا تھا اور آج کیا دیکھ رہا ہوں، کیوں گیا۔ حاکم نے پوچھا تم کون ہو تملیخا نے جواب دیا، میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں، پوچھا تمہارے باپ کا کیا نام ہے اور تم کو کوئی پہچاننے والا بھی ہے، تملیخا نے باپ کا نام بتایا لیکن حاضرین میں کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس کے باپ کو جانتا ہو۔ حاکم نے کہا تو جھوٹا ہے، سچی بات نہیں بتاتا، تملیخا نے سر جھکا لیا اور سمجھ میں نہ آیا کہ جواب کیا دے۔ ایک شخص بولا یہ دیوانہ ہے، دوسرا بولا دیوانہ نہیں ہے چھوٹنے کے لئے دیوانہ بن رہا ہے، حاکم نے تملیخا کو سخت نظر سے دیکھا اور کہا کیا تو یہ خیال کرتا ہے کہ ہم تجھے چھوڑ دیں گے اور تیری اس بات کو مان لیں گے کہ یہ سکہ تجھے باپ دادا سے ملا ہے اس کی ضرب اور نقوش تو تین سو برس سے بھی زیادہ پہلے کے ہیں۔ تو جوان لڑکا ہے ہم سے باتیں بنا کر ہماری ہنسی اڑانا چاہتا ہے، حالانکہ ہمارے بال سفید ہو چکے ہیں اور تیرے گرداگرد شہر کے سردار اور کرتا دھرتا ہیں۔ اس شہر کے تمام دفینے ہمارے ہاتھوں میں ہیں ان میں کوئی درہم و دینار اس ضرب کا نہیں ہے میرا خیال ہو رہا ہے کہ تجھے سخت سزا دے کر قید کر دینے کا حکم جاری کر دوں اور اس وقت تک قید رکھوں کہ تو دفینہ ملنے کا اقرار کر لے، حاکم کی یہ تقریر سن کر تملیخا نے کہا، میں آپ لوگوں سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اگر آپ اس کا جواب دے دیں گے تو جو کچھ میرے پاس ہے میں بھی وہ سچ سچ بتا دوں گا، حاضرین نے کہا پوچھو ہم تم سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔ تملیخا نے کہا دقیانوس بادشاہ کہاں گیا، لوگوں نے جواب دیا، آج روئے زمین پر اس نام کا کوئی بادشاہ موجود نہیں ہے، بہت پرانے زمانے میں دقیانوس بادشاہ تھا وہ مر گیا اور اس کے بعد صدیاں بیت گئیں۔ تملیخا نے کہا تو یقیناً میں راہ سے بھٹک گیا ہوں، کوئی شخص مجھے سچا نہیں جانے گا، لیکن میں کہتا ہوں کہ ہم چند جوان دین اسلام پر قائم تھے، بادشاہ نے ہم کو بت پرستی پر مجبور کیا، ہم نے انکار کیا اور کل شام بھاگ نکلے اور غار میں جا کر سو رہے صبح کو بیدار ہوئے تو میں کھانا خریدنے اور احوال کی ٹوہ لگانے کے لئے نکلا، کو بیچلوس کے غار تک تم لوگ میرے ساتھ چلو، میں اپنے ساتھیوں سے

تمہاری ملاقات کراؤں گا، تملیخا کی یہ بات سن کر اریوس، اسطیوس اور تمام شہر والے چھوٹے بڑے اصحاب کہف کو دیکھنے کے لئے تملیخا کے ساتھ چل پڑے۔ ادھر اصحاب کہف کے پاس کھانا لے کر جب تملیخا واپس نہیں پہنچا اور مقررہ مدت سے زیادہ وقت گزر گیا تو انہوں نے خیال کر لیا کہ تملیخا گرفتار ہو گیا اور پکڑ کر لوگ دقیانوس کے پاس لے گئے وہ یہ خیال کر ہی رہے تھے کہ کچھ آوازیں اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی فوراً سمجھ گئے کہ یہ ظالم دقیانوس کے بھیجے ہوئے لوگ ہیں اور ہم کو گرفتار کرنے کے لئے ان کو بھیجا گیا ہے، فوراً نماز کو کھڑے ہو گئے اور نماز کے بعد ایک نے دوسرے کو دعا سلامتی دی اور حق پر قائم رہنے کی وصیت کی پھر آپس میں کہا چلو اپنے بھائی تملیخا کے پاس چلیں وہ ظالم دقیانوس کے پاس ہمارے پہنچنے کے انتظار میں ہوگا وہ غار کے اندر سامنے کے رخ پر بیٹھے، یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اریوس اور اس کے ساتھی غار کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے اور تملیخا آگے بڑھ کر روتا ہوا اندر آ گیا اس کو روتا دیکھ کر اصحاب کہف نے حالات دریافت کئے۔ تملیخا نے کل حال بیان کر دیا، اس وقت سب کی سمجھ میں آیا کہ اس پوری مدت اللہ کے حکم سے ہم سوتے رہے، اللہ ہم کو ایک نشانی اور قبروں سے مردوں کے اٹھانے کی ایک دلیل بنانا چاہتا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ قیامت حق ہے اس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں جو اللہ تین سو برس تک سلانے کے بعد بیدار کر کے اٹھا سکتا ہے وہ مردوں کو بھی زندہ کر کے اٹھا سکتا ہے کیونکہ نیند بھی ایک قسم کی موت ہی ہے تملیخا کے پیچھے اریوس بھی اندر پہنچ گیا دروازہ پر اس کو تانبے کا ایک صندوق دکھائی دیا، جس پر چاندی کی مہر لگی تھی اریوس نے باہر سے ایک سردار کو بلا کر اس کے سامنے صندوق کھولا، صندوق کے اندر رانگ کی دو تختیاں ملیں ان پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ مکسلینا، مخشلینا، تملیخا، مرطولس، بیریوس، بشر طونس، دیومس اور یطومس۔ ظالم بادشاہ دقیانوس کے ڈر سے بھاگ گئے تاکہ بادشاہ ان کو دین سے منحرف نہ کر سکے اور یہ لوگ اس غار کے اندر گھس گئے۔ بادشاہ کو اطلاع ملی کہ وہ لوگ اس غار کے اندر چلے گئے تو اس نے پتھروں سے غار کا منہ بند کر دینے کا حکم دے دیا، ہم نے ان حضرات کا حال اور واقعہ اس لئے لکھ دیا کہ بعد کو آنے والے لوگوں کو اس کا علم ہو جائے، اگر وہ اس تحریر سے واقف ہو جائیں۔ تمام حضرات کو یہ تحریر پڑھ کر تعجب ہوا اور اللہ کا شکر ادا کرنے لگے جس نے ان کو اپنی قدرت کی نشانی دکھا دی پھر اریوس اور اس کے ساتھی غار کے اندر اصحاب کہف سے جا کر ملے۔ اصحاب کہف بیٹھے ہوئے تھے چہرے نور سے دمک رہے تھے، ان کے کپڑے بھی پرانے نہیں ہونے پائے تھے، اصحاب کہف کو اس حالت میں دیکھ کر اریوس اور اس کے ساتھی اللہ کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور اللہ کی حمد میں رطب اللسان ہو گئے، جس نے ان کو یہ نشانی دکھائی۔ اس کے بعد اصحاب کہف نے اریوس اور اس کے ساتھیوں کو اپنی سرگزشت سنائی اریوس نے ایک قاصد اپنے دیندار بادشاہ بیدوسیس کے پاس بھیجا اور تحریر کیا کہ آپ فوراً آ جائیں تاکہ اللہ کی قدرت کی وہ نشانی آپ بھی دیکھ لیں جو اللہ نے آپ کے دور سلطنت میں لوگوں کی ہدایت کے لئے نمودار کی ہے کہ تین سو برس مردہ رکھنے کے بعد اللہ نے ان لوگوں کو زندہ کر کے اٹھا دیا، بادشاہ نے جونہی یہ اطلاع سنی اس کا سارا غم جاتا رہا، اور اللہ کی ستائش کرتے ہوئے اس نے کہا شکر ہے تیرا اے آسمانوں کے، زمین کے مالک میں تیری عبادت کرتا ہوں تمام عیوب و نقائص سے تیرے پاک ہونے کا اقرار کرتا ہوں، تو نے مجھ پر بڑا احسان کیا، بڑی مہربانی کی اور جو روشنی تو نے میرے آباء و اجداد اور نیک بندے قسطنطینوس کو عطا فرمائی تھی وہ مجھے بھی مرحمت فرمائی، میرے لئے اس نور کو نہیں بجھایا، ملک والوں کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ بھی شہر افسوس میں آ گئے اور سب بیدوسیس کے ساتھ غار کی طرف چل دیئے۔ بیدوسیس کو دیکھ کر اصحاب کہف خوشی سے کھل پڑے اور اللہ کے سامنے سربسجود ہو گئے، بیدوسیس ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور دوزانو ہو کر ان کو گلے لگا لیا اور زمین پر ان کے پاس بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد اصحاب کہف نے بیدوسیس سے کہا اب رخصت فی امان اللہ آپ پر اللہ کی طرف سے سلامتی اور رحمت ہو، اللہ آپ کو اور آپ کی حکومت کو شر سے محفوظ رکھے اور جن و انس کے شر سے بچائے، ہم آپ کو اور آپ کے ملک کو اللہ کو پناہ میں دیتے ہیں بادشاہ کھڑا ہو گیا اور ابھی کھڑا ہی تھا کہ وہ لوگ اپنی خواب گاہوں کی طرف واپس چلے گئے اور سو گئے اور اللہ نے ان کی روحوں کو قبض کر لیا، بادشاہ نے ان کو کپڑے اوڑھا دیئے اور حکم دیا کہ ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ سونے کے صندوق میں رکھ دیا جائے۔ جب

رات ہوئی اور بادشاہ سو گیا تو خواب میں اصحاب کہف نے آکر اس سے کہا ہم کو سونے چاندی سے نہیں پیدا کیا گیا تھا، مٹی سے بنایا گیا تھا ہم مٹی ہی کی طرف منتقل ہو رہے ہیں، اس لئے قیامت تک کے لئے ہم کو مٹی پر اسی حالت میں چھوڑ دو جس حالت میں ہم غار کے اندر تھے، قیامت کے دن اللہ ہم کو اسی مٹی سے اٹھائے گا۔ یہ خواب دیکھ کر بادشاہ نے ساکھی لکڑی کے صندوق بنوادیئے اور صندوقوں میں رکھوا کر ان کو وہیں چھوڑ کر چلے آئے پھر اللہ نے ان کو لوگوں کی نظروں سے چھپا دیا اور خوف کی وجہ سے کوئی ان کو دیکھ بھی نہ سکا نہ غار کے اندر جا سکا، بادشاہ نے غار کے دروازے پر نماز کے لئے ایک مسجد بنوادی اور ہر سال وہاں خوشی منانے کے لئے جمع ہونے کا حکم دے دیا۔

بعض روایات میں اس طرح آیا ہے کہ تملیخا کو جب بادشاہ کے سامنے لے جایا گیا اور بادشاہ نے پوچھا تو کون ہے، تملیخا نے جواب دیا میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں فلاں جگہ میرا مکان ہے فلاں فلاں لوگ میرے رشتہ دار ہیں کل شام میں یہاں سے نکلا تھا تو کسی نے نہ تملیخا کو پہچانا نہ ان ناموں کے آدمیوں کو جن کا ذکر تملیخا نے کیا تھا، بادشاہ نے پہلے بھی سنا تھا کہ پرانے زمانہ میں کچھ نوجوان تھے، جن کے نام محافظ خانہ کے اندر کسی تختی پر لکھے ہوئے ہیں، تملیخا کی بات سن کر اس نے تختی منگوا کر دیکھی اور مندرجہ ناموں کو پڑھا تو ثابت ہوا کہ تملیخا کا نام اس کے اندر موجود ہے، باقی لوگوں کے متعلق تملیخا نے کہا یہ میرے ساتھیوں کے نام ہیں اس بات پر بادشاہ اپنے ساتھیوں کو لے کر تملیخا کی نشان دہی پر چل پڑا، غار کے دروازے پر پہنچ کر تملیخا نے کہا مجھے اجازت دیجئے کہ میں پہلے اندر جا کر ان کو خوش خبری دے دوں، کیونکہ اگر تم بغیر اطلاع کے میرے ساتھ اندر جا پہنچو گے تو وہ لوگ خوفزدہ ہو جائیں گے، تملیخا اجازت ملنے کے بعد اندر گیا اور غار والوں کو خوش خبری دی خوش خبری سنتے ہی اللہ نے ان کی روحیں قبض کرلیں اور بادشاہ یا اس کے ساتھیوں کی نظروں سے اللہ نے ان کو اوجھل کر دیا کسی کو ان کا نشان اور راستہ بھی نہیں ملا، آیت اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾ سو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا۔ یعنی ہم نے ان کے کانوں پر ایسے پردے ڈال دیئے تھے کہ باہر کی آواز اندر داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ پردے سے مراد ہے نیند کا پردہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کو سلا دیا کہ کسی آواز سے بیدار نہیں ہو سکتے تھے۔

سِنِيْنَ کے بعد لفظ عَدَدًا بڑھانے سے کثرت سنین کی طرف اشارہ ہے کم چیز کو گنا نہیں کرتے گنتی انہی چیزوں کی ہوتی ہے جو تعداد میں زیادہ ہوں۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ پھر ہم نے ان کو اٹھایا، یعنی بیدار کیا۔

لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿۱۲﴾ تاکہ ہم معلوم کرلیں کہ ان دونوں گروہوں میں کون گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا۔

اَلْحِزْبَيْنِ دو گروہ دو جماعتیں۔

اَمَدًا غایت، مدت۔ علم سے مراد علم حالی جس کا تعلق استقبال سے تھا۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾

ہم آپ سے ان کا واقعہ ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی۔

اَلْحَقّ سچ۔ فِتْيَة کا مفرد فَتًى ہے جیسے صِبْيَة کا مفرد صَبِىّ۔ هُدًى سے مراد ہے ایمان اور بصیرت یعنی ہم نے ان کو حقیقی ایمان عطا کیا تھا، مجازی ایمان تو زبانی اقرار اور قلبی تصدیق کا نام ہے۔ اس میں نفس کا طغیان و کفران باقی رہتا ہے اور حقیقی ایمان کا حصول نفس کو فنا کرنے کے بعد ہوتا ہے (نفس کی سرکشی اور انانیت فنا ہو جاتی ہے تو حقیقی ایمان نصیب ہوتا ہے)۔

وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے۔ یعنی وطن، گھر بار، رشتہ دار، دولت مال

وغیرہ کو ترک کرنے پر ان کو صابر بنایا، اظہار حق کرنے اور دقیانوس کے حکم کو ٹھکرانے کی ان میں جرأت پیدا کر دی، ان کو قیام قلب کا مقام حاصل ہو گیا، ساری مخلوق کا تصور و خیال ان کے دلوں سے مٹ گیا، ہر چیز ان کی نظروں میں ہیچ ہو گئی اور اللہ کی محبت، عظمت اور خشیت ان کے دلوں میں جم گئی۔

اِذْ قَامُوْا　جب وہ کھڑے ہوئے یعنی دقیانوس نے جب بت پرستی ترک کرنے پر ان کو ملامت کی تو اس کے سامنے کھڑے ہو کر فخر کے طور پر۔

فَقَالُوْا　انہوں نے کہا۔

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا　ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے ہم اس کے سوا کسی اور معبود کی ہرگز عبادت نہیں کریں گے۔

لَقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا۝　اگر ہم ایسا کریں گے تو یقیناً حد سے بڑھی ہوئی بے جابات کہیں گے۔

شَطَّ دور ہو گیا۔ یعنی ایسی بات کے قائل ہوں گے جو حق سے دور اور حد (صداقت) سے باہر اور دائرہ ظلم میں داخل ہو گی۔

هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً　ہماری اس قوم نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے یعنی بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔

لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ　بتوں کو پوجنے کی کوئی واضح دلیل یہ کیوں نہیں پیش کرتے۔

بغیر واضح دلیل کے دین کے عقائد ناقابل قبول ہیں، گمان اور باپ دادا کی پیروی عقائد کی صحت کو ثابت نہیں کر سکتی، عقائد میں بلا دلیل اتباع درست نہیں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا۝　جو شخص اللہ پر دروغ بندی کرے اس سے بڑھ کر ظالم بھلا کون ہے۔ یعنی جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو ساجھی مانتا ہو اور کسی کو اللہ کی اولاد قرار دیتا ہو اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں، یوں تو کسی پر بھی دروغ تراشی ظلم ہے لیکن اللہ پر تہمت تراشی تو سب سے بڑا ظلم ہے۔

جب ان جوانوں نے دقیانوس کو دو ٹوک جواب دے دیا (اور اس نے ان کو سوچنے غور کرنے کے لئے مہلت دے کر رخصت کر دیا) اور سب نے شہر سے بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا (بلکہ بھاگ گئے) تو آپس میں کہا۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ　اور جب تم ان (بت پرستوں) سے اور ان کے ان معبودوں (یعنی بتوں) سے جن کو اللہ کے سوا وہ پوجتے ہیں الگ ہو گئے ہو تو چل کر غار میں اپنا ٹھکانا بنالو (تاکہ باہر والا کوئی تم کو دیکھنے ہی نہ پائے) اصحاب کہف کی قوم والے دوسرے مشرکوں کی طرح صنم پرستی کے ساتھ خدا کی بھی پوجا کرتے تھے، اس لئے اصحاب کہف کو اپنے قول میں الا اللہ کہنے کی ضرورت ہوئی (مطلب یہ کہ تم بت پرستوں اور بت پرستی سے تو الگ ہو گئے ہو مگر خدا پرستی سے الگ نہیں ہو۔ خدا پرستی میں ان کے ساتھ ہو اور بت پرستی میں ان سے بیزار)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ اللہ کا قول بطور جملہ معترضہ بیچ میں ذکر کر دیا ہو اور مَا نافیہ ہو اور يَعْبُدُوْنَ کی ضمیر اصحاب کہف کی طرف راجع ہو، یعنی اللہ نے فرمایا کہ اصحاب کہف اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے تھے۔

فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ　یعنی غار کی طرف منتقل ہو جاؤ۔ اسی کو اپنا مسکن اور ٹھکانہ بنالو تاکہ کافروں کے سامنے رہنے سے بھی بچ جاؤ۔

يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا۝　تمہارا رب تم کو رزق کی فراخی عنایت کرے گا اور دونوں جہان میں اپنی رحمت سے تمہارے لئے کشائش فرمادے گا اور تمہارے تمام امور میں فائدہ کا سامان (خود) فراہم کر دے گا۔ مِرْفَقٌ اسم آلہ۔ وہ ذریعہ جس سے فائدہ حاصل ہو۔ اصحاب کہف کا ایمان پختہ اور اللہ کے فضل

پر بھروسہ اکمل تھا، اس لئے انہوں نے یہ بات کی۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۚ اور (اے رسول یا اے مخاطب) تو دیکھے گا کہ دھوپ جب نکلتی ہے تو ان کے غار سے دائیں جانب کو بچی رہتی ہے اور چھپتی ہے تو بائیں طرف کو ہٹی رہتی ہے اور وہ غار کے فراخ مقام میں ہیں۔

تَزٰوَرُ مڑ جاتا ہے، پھر جاتا ہے۔ یہ لفظ زَوَر سے بنا ہے زَوَر کا معنی ہے، جھکاؤ۔ ذَاتَ الْيَمِينِ دائیں جانب ذَاتَ الشِّمَالِ بائیں جانب یعنی غار سے دائیں بائیں جانب۔ تَقْرِضُ کترا جاتا ہے، ان کو کاٹ دیتا ہے، ان کو چھوڑ دیتا ہے۔ فَجْوَةٍ کشادہ جگہ، یعنی وسط غار میں اصحاب کہف پڑے ہیں۔ نسیم وصبا کے جھونکے بھی ان کو لگتے ہیں، دھوپ کی گرمی سے بھی محفوظ ہیں اور غار کا کوئی دکھ ان کو نہیں پہنچتا۔

ابن قتیبہ نے لکھا ہے غار کا رخ بنات النعش کی طرف تھا، غار کے محاذات میں قریب ترین مشرق و مغرب راس سرطان کا مشرق و مغرب تھا جس وقت سورج کا مدار اور سرطان کا مدار ایک ہوتا تو سورج کا طلوع اس کے مقابل بجانب یمین ہوتا اور غروب کے وقت غار کے مقابل سورج بجانب شمال ہوتا، اس طرح غار کے دونوں پہلوؤں پر سورج کی شعاعیں پڑتیں اور عفونت پیدا نہ ہونے پاتی تھی اور ہوا میں اعتدال قائم رہتا تھا اور آفتاب کی کرنیں اصحاب کہف کے جسموں پر نہ پڑنے پاتی تھیں کہ بدن جھلس جائیں، دکھ پائیں اور کپڑے فرسودہ ہو جائیں۔

بعض علماء نے ابن قتیبہ کی اس جغرافیائی وضاحت پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ بنات النعش کے سامنے غار کا ہونا خواہ اثر انداز ہو لیکن حقیقت میں اللہ کی قدرت کار فرما تھی کہ اللہ اصحاب کہف کی طرف سے سورج کو پھیر دیتا تھا۔ اس کی طرف اشارہ آئندہ آیت میں کیا گیا ہے۔

ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ۗ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، یعنی اللہ کی صنعت کی اعجوبہ کاری اور اس کی قدرت کی نشانی ہے۔

یہی مطلب ہوتا ہے کہ یہ یعنی اصحاب کہف کا واقعہ اور غار میں ان کا پناہ گیر ہونا اور ان کی حفاظت کے لئے سامان فراہم کرنا اور پھر یہ صحیح قصہ بیان کرنا، اللہ کی (قدرت صنعت، علم اور قرآن کی صداقت کی) ایک نشانی ہے۔

مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ جس کو اللہ ہدایت کر دے وہی ہدایت پانے والا ہے، یعنی جس کو ہدایت یاب ہونے کی توفیق دے دے وہی کامیاب اور فلاح پانے والا ہوتا ہے، اس جملہ میں اصحاب کہف کی تعریف ہے اور اس امر پر تنبیہ ہے کہ اصحاب کہف کے واقعہ کی طرح آیات قدرت بہت ہیں لیکن ان سے فائدہ اندوز وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو غور و فکر کرنے کی اللہ توفیق عنایت فرمائے۔

وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾ اور جس کو اللہ گمراہ کر دے (یعنی بے مدد چھوڑ دے اور ہدایت نہ کرے) اس کے لئے کوئی ذمہ دار مددگار اور ہدایت کرنے والا تم کو نہیں ملے گا۔ ع ۲ ۱۴

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ ۚ اور (آنکھیں کھلی ہونے اور کثرت سے کروٹیں لینے کی وجہ سے) تم ان کو بیدار سمجھو گے حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔ أَيْقَاظًا يَقِظٌ کی اور رُقُودٌ رَاقِدٌ کی جمع ہے جیسے قُعُودٌ قَاعِدٌ کی جمع ہے۔

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ اور (خواب میں بغیر ان کے ارادے کے) ہم ان کو دائیں بائیں کروٹ دلاتے ہیں۔ یعنی کبھی دائیں پہلو پر اور کبھی بائیں پہلو پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ سوتے میں وہ لوگ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کو کروٹ بدلتے رہتے تھے تاکہ پڑے پڑے زمین ان کے گوشت کو نہ کھالے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ عاشورا کے دن وہ کروٹ لیتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے کہ سال میں ایک مرتبہ ان کی کروٹ ہوتی تھی۔

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۚ اور ان کا کتا غار کے دہانے کے اندر اپنے دونوں اگلے ہاتھ پھیلائے پڑا ہے۔

مجاہد اور ضحاک نے وَصِيد کا ترجمہ کیا ہے غار کا صحن۔ عطاء نے ترجمہ کیا دہلیز۔ سدی نے کہا وصید دروازہ کو کہتے ہیں۔ عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔ اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اصحاب کہف کا کتا واقعی کتا ہی تھا، بعض علماء نے کہا کتا نہ تھا، شیر تھا، کلب ہر درندہ کو کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب کو بد دعا دی تھی اور فرمایا تھا، الٰہی اپنے کسی کلب کو اس پر مسلط کر دے (بد دعا قبول ہوئی) عتبہ کو شیر نے پھاڑ کھایا۔ اول قول معروف ہے۔ اور دوسرا قول ابن جریج کا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ چت کبرا کتا تھا۔ ایک اور روایت میں آیا قلطی سے بڑا اور کردی (کتے) سے چھوٹا۔ مقاتل نے کہا اس کا رنگ زرد تھا، قرطبی نے کہا گہرا زرد مائل بسرخی تھا، کلبی نے کہا اس کا رنگ دھنی ہوئی اون یا روئی کی طرح تھا۔ بعض نے کہا حجری رنگ تھا، حضرت ابن عباسؓ کے قول پر اس کا نام قطمیر اور حضرت علیؓ کے قول پر اس کا نام ریان تھا، اوزاعی نے کہا تقمور تھا۔ سدی نے کہا ثور تھا اور کعب نے کہا صہبا تھا۔ خالد بن معدان نے کہا سوائے اصحاب کے کتے اور بلعم (بن باعورا) کے گدھے کے اور کوئی چوپایہ جنت میں نہیں جائے گا۔ سدی کا قول ہے اصحاب کہف کروٹ لیتے تھے تو کتا بھی ان کے ساتھ کروٹ لیتا تھا۔ اصحاب کہف دائیں طرف کروٹ لیتے تھے تو کتا اپنا دایاں کان موڑ کر (دائیں) بل پر ہو جاتا تھا اور اصحاب کہف بائیں کروٹ لیتے تھے تو کتا اپنا بایاں کان موڑ کر (بائیں) بل پر ہو جاتا تھا۔

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۞ (اے مخاطب) اگر تو ان کو جھانک کر دیکھ پائے تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تیرے اندر ان کی وحشت سما جائے۔ یعنی تمہارا دل خوف زدہ ہو جائے گا اور اس میں رعب بھر جائے گا۔ خوف کی وجہ اس مقام کی وحشت اور سنسان پن ہے۔ کلبی نے کہا، اصحاب کہف کی آنکھیں بیدار آدمیوں کی طرح کھلی ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے، اب بولنے ہی والے ہیں (منظر بڑا خوف آگیں ہے) بعض کا قول ہے ان کے بال بڑھے ہوئے اور ناخن لمبے ہو گئے ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اسی ہولناکی اور رعب آگینی کی وجہ سے کوئی وہاں جا نہیں سکتا۔ اس مقام کی رعب آگینی مانع دخول ہے، یہی قول صحیح بھی ہے۔ سعید بن جبیرؒ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، ہم معاویہ کی معیت میں روم کے جہاد کو گئے۔ راستہ میں اصحاب کہف کے غار کی طرف سے گزر ہوا، معاویہ بولے اگر (غار کے دہانہ یا بیچ کی دیوار کو) کھول دیا جاتا تو ہم اصحاب کہف کو دیکھ لیتے۔ میں نے کہا وہ ذات جو آپ سے بہتر تھی اس کو بھی اس سے روک دیا گیا تھا۔ اللہ نے فرمادیا تھا، لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا۔ معاویہ نے میری بات نہیں سنی اور کچھ لوگوں کو دیکھنے کے لئے بھیج دیا وہ لوگ جب غار میں داخل ہوئے تو اللہ نے کوئی ہوا (زہریلی گیس) ایسی پیدا کر دی کہ سب جل گئے۔ اخرجہ ابن ابی شیبۃ وابن المنذر وابن ابی حاتم۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ اور اسی طرح ہم نے ان کو اٹھایا۔ یعنی جس طرح نشان قدرت بنا کر غار کے اندر ہم نے طویل مدت تک ان کو سلایا اور ان کے اجسام کو سڑنے گلنے سے محفوظ رکھا۔ اسی طرح اس موت نما خواب سے ان کو بیدار کیا تاکہ ان کے بیدار ہونے سے بھی قدرت خداوندی کا مظاہرہ ہو۔

لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ تاکہ وہ آپس میں سوال (وجواب یعنی پوچھ گچھ) کریں اور اپنی حالت کا ان کو علم ہو جائے۔ اور اپنے ساتھ اللہ کے سلوک کو پہچان کر قدر خداوندی کا ان کو مزید یقین ہو جائے اور وقوع قیامت کے عقیدے میں بصیرت آگیں پختگی پیدا ہو جائے۔ اس تفسیر پر لِيَتَسَاءَلُوا میں لام علت کے لئے ہوگا۔ یعنی بیدار کر کے اٹھانے کی علت یہ تھی کہ وہ باہم سوال وجواب کریں۔ بغوی نے اس لام کو لام عاقب (لام نتیجہ) قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کے اٹھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے باہم سوال جواب کئے اصل غرض یہ نہ تھی۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ ان میں سے ایک کہنے

والے نے کہا آپ لوگ کتنی مدت سوتے رہے۔ دوسروں نے جواب دیا (پورے) ایک دن ہم (سوتے) رہے یا کچھ کم ایک دن۔ اصحاب کہف کو بیدار ہونے کے بعد یہ تو محسوس ہوا کہ ہم زیادہ دیر سوئے (لیکن دیر کی مقدار کتنی زیادہ ہوگئی اس میں اختلاف رائے ہونے لگا) بعض اقوال میں آیا ہے کہ زیادہ دیر سونے سے ان کی کچھ نمازیں فوت ہوگئی تھیں اس لئے (بطور افسوس یا بطور تعجب) انہوں نے یہ بات کہی۔

غار میں صبح کو داخل ہوئے اور شام کو بیدار ہوئے اس لئے انہوں نے دن بھر سوتے رہنا ظاہر کیا۔ لیکن آفتاب ڈوبا نہ تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ کم ایک دن کہا، غرض یہ جواب محض تخمینی تھا اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ غالب ظن کی بنیاد پر کوئی بات کہنا جائز ہے۔

اصحاب کہف نے جب اپنے بال اور ناخن بڑھے ہوئے دیکھے تو خیال کیا کہ ایک دن نہیں بلکہ ہم کو سوتے سوتے شاید کوئی لمبی مدت ہوگئی اس لئے،

قالوا ربکم اعلم بما لبثتم بولے تمہارے رب کو بخوبی علم ہے کہ تم لوگ کتنی دیر (سوتے) رہے۔ بعض اقوال میں آیا کہ ان کی جماعت کا سردار مکسلمینا تھا جب اس نے یہ اختلاف دیکھا تو اس نے کہا اس جھگڑے کو چھوڑو۔ اللہ ہی جانے تم کتنا (سوتے) رہے۔

فابعثوا احدکم بورقکم ھذہ الی المدینۃ اپنے میں سے کسی کو (یعنی تملیخا کو) یہ روپیہ دے کر شہر (طرطوس) کو بھیجو۔ دور جاہلیت میں اس شہر کا نام افسوس تھا، عہد اسلامی میں افسوس کی بجائے طرطوس ہوگیا (روپیہ اصحاب کہف کے پاس تھا) اس سے معلوم ہوا کہ روپیہ اور توشہ ساتھ لینا (توکل کے خلاف نہیں بلکہ) متوکلوں کی شان ہے۔

وَرِقٌ، چاندی ٹھپہ دار ہو یا سادہ۔

فلینظر ایھا ازکی طعاما فلیاتکم برزق منہ پھر تحقیق کرے کہ کونسا کھانا حلال ہے سو اس میں سے تمہارے پاس کچھ کھانا لے آئے (مولانا اشرف علی رحمہ اللہ۔ لیکن حضرت مفسرؒ نے حسب ذیل تشریح کی)

ایھا یعنی اس شہر کے رہنے والوں میں کون زیادہ حلال کھانا بیچتا ہے جو کسی سے چھینا ہوا نہ ہو اور کسی حرام ذریعہ سے حاصل کیا ہوا بھی نہ ہو یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا ہو۔ ضحاک نے ازکٰی کا ترجمہ کیا پاکیزہ ترین۔ مقاتل بن حیان نے کہا نہایت عمدہ۔ عکرمہ نے کہا مقدار میں زیادہ۔ ذکوٰۃ کا لغوی معنی ہے، افزونی، زیادتی۔ بعض نے کہا ازکٰی سے مراد ہے بہت سستا۔

ولیتلطف اور خوش تدبیری سے کام لے یعنی منگانہ لے آئے یا یہ مطلب ہے کہ اپنے کو پوشیدہ رکھے کسی کو پتہ نہ ہونے پائے۔

ولا یشعرن بکم احدا ۝۱۹ اور کسی کو تمہاری سن گن نہ ہونے دے یعنی کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے نادانستگی میں تمہارا کچھ پتہ چل جائے۔

انھم ان یظھروا علیکم کیوں کہ ان لوگوں نے اگر تمہاری اطلاع پالی یا تم پر ان کا قابو چل گیا۔ تو

یرجموکم پتھر مار کر وہ تم کو ہلاک کر دیں گے۔ (اگر تم نے مرتد ہونا قبول نہیں کیا اور ان کے بتوں کی پوجا نہ کی)

او یعیدوکم فی ملتھم یا (اگر تم نے ارتداد کو قبول کر لیا تو) تم کو اپنے مذہب ہی لوٹا لیں گے۔ شاید اصحاب کہف پہلے ان کے ہم مذہب تھے پھر مومن بن گئے۔ یا یہ مطلب ہے کہ جبراً تم کو اپنے مذہب میں داخل کر لیں گے۔

اس مطلب پر اعادہ کا معنی (لوٹ لینا نہ ہو گا بلکہ) کو داخل کرنا ہو گا)
وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾ اور اس وقت (یعنی اگر تم نے ان کے مذہب میں داخل ہونا قبول کر لیا تو) کبھی بھی بہبودی نہیں پاؤ گے۔ (کبھی عذاب سے نجات نہیں ملے گی)۔
وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ
اور اسی طرح ہم نے لوگوں کو ان پر مطلع کر دیا تاکہ وہ لوگ اس بات کا یقین کر لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت (کے آنے) میں کوئی شک نہیں ہے۔

یعنی جس طرح ہم نے اصحاب کہف کو سلایا اور بصیرت پیدا کرنے کے لئے جگایا، اٹھایا اسی طرح ہم نے لوگوں کو بھی ان پر مطلع کر دیا تاکہ طویل نیند کے بعد بیدار کر دینے سے وہ اطلاع پانے والے سمجھ جائیں کہ موت کے بعد قبروں سے (زندہ کر کے) اٹھانے کا اللہ نے جو وعدہ کیا ہے وہ حق ہے اور امکان قیامت میں کوئی شک نہیں جس خدا نے اصحاب کہف کی روحوں کو اپنے پاس محفوظ رکھا اور اتنی طویل مدت تک جسموں کو گلنے سڑنے نہ دیا، پھر ان کی روحیں واپس کر دیں اور نیند سے بیدار کر دیا، وہی خدا اس بات پر قادر ہے کہ سب انسانوں کی روحوں کو اپنے پاس روک رکھے اور پھر قیامت کے دن سب کو قبروں سے زندہ کر کے اٹھا دے۔

اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

وہ وقت بھی قابل ذکر ہے، جب اس زمانے کے لوگ اصحاب کہف کے معاملہ میں باہم جھگڑ رہے تھے، سو ان لوگوں نے یہ کہا کہ ان کے پاس کوئی عمارت بنوا دو۔ ان کا رب ان کو خوب جانتا تھا، جو لوگ اپنے کام پر غالب تھے (یعنی حاکم وقت تھے) انہوں نے کہا ہم تو ان کے پاس ایک مسجد بنا دیں گے (مولانا اشرف علی رحمہ اللہ)

حضرت مفسر قدس سرہ، نے تفسیر آیات اس طرح کی ہے۔
اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ کا تعلق اَعْثَرْنَا سے ہے یعنی لوگوں کو ہم نے اصحاب کہف پر مطلع اس وقت کیا جب وہ باہم اپنے دین کے متعلق جھگڑ رہے تھے۔ عکرمہ نے کہا دوبارہ آدمیوں کے حشر کے متعلق ان کا آپس کا اختلاف تھا۔ غیر مسلم کہتے تھے حشر صرف ارواح کا ہو گا اجسام کا نہ ہو گا۔ مسلمانوں کا قول تھا، ارواح کا مع اجسام کے ہو گا۔ اللہ نے اصحاب کہف کو اٹھا کر دکھا دیا کہ حشر، ارواح اور اجسام دونوں کا ہو گا، یا یہ مراد ہے کہ اصحاب کہف کے معاملہ میں لوگوں کا اختلاف ہو گیا جب اصحاب کہف بیدار ہونے کے بعد دوبارہ لیٹ گئے اور غافل ہو گئے تو بعض لوگوں نے کہا، اس مرتبہ بھی وہ سو گئے ہیں مرے نہیں ہیں اور کچھ لوگوں نے کہا اب کی مرتبہ تو مر گئے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، اصحاب کہف کے بعد مسلمانوں میں اور ان کے مخالفوں میں اختلاف رائے ہو گیا، مسلمانوں نے تو کہا ہم یہاں مسجد بنائیں گے یہ لوگ ہمارے ہم مذہب تھے، غیر مسلموں نے کہا ہم یہاں عمارتیں بنائیں گے جن کے اندر لوگ آباد ہوں گے اور ایک بستی آباد کریں گے یا غار کے دروازے پر ایسی عمارت بنائیں گے جس سے لوگوں کا اندر جانا بند ہو جائے، غار والے ہمارے رشتہ دار اور بھائی برادر تھے اس لئے تعمیر کا ہم کو حق ہے۔
رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ اللہ کی طرف سے ایک جملہ معترضہ ہے، جو جھگڑا کرنے والوں کے کلام کے درمیان اللہ نے ذکر کر دیا ہے۔ اس جملہ کا مقصد دونوں فریقوں کے قول کی تردید ہے، ہر فریق نے اصحاب کہف کو اپنے ساتھ ملایا تھا، حالانکہ اصحاب کہف مشرکوں سے اور ان کے شرک سے جس طرح علیحدہ تھے، اسی طرح عام مسلمانوں کے گروہ میں بھی ان کا شمار نہیں تھا، ان کا درجہ بہت اونچا تھا، صوفی سب کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور سب سے الگ بھی۔ شیخ رومیؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

ہر کسے در ظن خود شد یار من　　وز درون من نجست اسرار من

یا یہ انہی اختلاف کرنے والوں کا قول ہے جن کا اختلاف مدت قیام کے متعلق بھی تھا اور نسب کے متعلق بھی اور اصحاب

کہف کے دوسرے احوال کے متعلق بھی لیکن جب کوئی اتحادی رائے قائم نہ ہو سکی تو بولے اللہ ہی کو ان کا صحیح علم ہے (کہ وہ کون تھے ان کے حالات کیا تھے اور کتنی مدت سوتے رہے)

مسئلہ: (حضرت مفسرؒ کے نزدیک) یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ اولیاء کی قبروں کے پاس نماز پڑھنے کے لئے مسجد بنانا جائز ہے تاکہ اولیاء کے مزارات کے قرب سے برکت حاصل ہو۔ شیخ استاد محمد فاخر محدث کے نزدیک مکروہ ہے، کراہت کا ثبوت مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتا ہے۔

مسلم نے ابوالہیاج اسدی کا قول نقل کیا ہے، ابوالہیاج نے کہا مجھ سے حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں تجھے اس کام پر نہ بھیجوں جس کام پر رسول اللہ ﷺ نے مجھے بھیجا، تجھے جو مورتی ملے اس کو مٹا دینا اور جو اونچی قبر ملے اس کو بغیر ہموار کئے، سطح زمین کے برابر کئے نہ چھوڑنا۔

مسلم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ کرنے اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔

شیخین نے حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے، دونوں بزرگوں نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ پر شدت مرض ہوئی کہ (بیہوشی طاری ہو گئی) تو آپ کے چہرہ مبارک پر چادر ڈال دی گئی، لیکن دم گھٹنے لگا تو آپ نے چادر کو چہرہ سے ہٹا دیا اور اسی حالت میں فرما رہے تھے، اللہ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر جنہوں نے اپنے انبیاءؑ کی قبروں کو مسجدیں بنا رکھا تھا۔ حضرت عائشہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ امت کو اہل کتاب کی طرح کرنے سے ڈرا رہے تھے۔

میں کہتا ہوں ان احادیث سے قبروں کو پختہ کرنے اور اونچا کرنے اور ان کے اوپر عمارت بنانے کی ممانعت ثابت ہو رہی ہے، قبروں کے قریب مسجد بنانے کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی، رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب کی مذمت میں فرمایا، انہوں نے اپنے انبیاءؑ کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے قبروں کو سجدے کرنے شروع کر دیئے۔ حضرت ابو مرثد غنوی کی روایت سے یہ مطلب صراحت کے ساتھ آیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبروں پر نہ بیٹھو اور ان کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھو۔ رواہ مسلم۔

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ط بعض لوگ تو کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا ہے اور بعض کہیں گے وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے اور یہ (لوگ) بے تحقیق اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں اور بعض کہیں گے وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے.... یعنی رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اصحاب کہف کی تعداد میں اختلاف کرنے والے کہیں گے کہ وہ تین تھے، چوتھا کتا تھا اور (کچھ لوگ کہیں گے) وہ پانچ تھے، چھٹا کتا تھا، ان کا یہ قول اندھیرے میں تیر چلانے کے طور پر ہے کسی واقعی ثبوت پر مبنی نہیں ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ نجران کے عیسائی جن میں سید (یعقوبی فرقہ کا) اور عاقب (نسطوری فرقہ کا) بھی شامل تھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق ان کے آپس میں اختلاف ہو گیا، سید نے کہا وہ تین تھے چوتھا کتا تھا۔ عاقب نے کہا پانچ تھے چھٹا کتا تھا۔ رَجْم تیر چلانا، پتھر مارنا اَلْغَيْب یعنی ایسا واقعہ جو غائب ہے ان کے علم میں نہیں یعنی ان کے یہ قول اندھیرے میں تیر چلانے کی طرح ہیں، کسی کو صحیح طور پر معلوم نہیں کہ واقعہ میں وہ کتنے تھے، لیکن جبرئیل کی اطلاع اور رسول اللہ ﷺ کے خبر دینے کے بعد مسلمان کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں کتا تھا۔ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ کا جملہ وصفیہ ہے جو سَبْعَةٌ کی صفت ہے۔ صفت اپنے موصوف سے وابستہ ہوتی ہے اور حال اپنے ذوالحال سے متصل ہوتا ہے، جب معرفہ ذوالحال ہو اور جملہ حال ہو تو اس کی باہم وابستگی ایسی ہی ہوتی ہے جیسی صفت کی موصوف کے ساتھ۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ میں واؤ ثمانی ہے۔ عرب کا قاعدہ ہے کہ سات تک کی گنتی تو بغیر حرف

عطف کے کرتے ہیں اور آٹھویں عدد کو واو عطف سے شروع کرتے ہیں، ایک دو، تین، چار ،پانچ، چھ، سات اور آٹھ۔ قرآن میں آیا ہے۔

اَلتَّائِبُوْنَ۔ اَلْعَابِدُوْنَ۔ اَلْحَامِدُوْنَ۔ اَلسَّائِحُوْنَ۔ اَلرَّاكِعُوْنَ۔ اَلسَّاجِدُوْنَ۔ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ ایک اور آیت میں آیا ہے۔

مُسْلِمَاتٍ، مُؤْمِنَاتٍ، قَانِتَاتٍ، تَائِبَاتٍ، عَابِدَاتٍ، سَائِحَاتٍ، ثَيِّبَاتٍ وَّ اَبْكَارًا۔

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ۙ آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی (صحیح) تعداد سے بخوبی واقف ہے اور ان کو (یعنی صحیح گنتی ان لوگوں کی) صرف تھوڑے آدمی جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عیسائیوں میں سے تھوڑے آدمی ان کی صحیح تعداد سے واقف ہیں۔ سب لوگوں میں سے صرف تھوڑے آدمی یعنی مسلمان اصحاب کہف کی صحیح تعداد کو جانتے ہیں۔ حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا، میں ان تھوڑے آدمیوں میں سے ہوں جو اصحاب کہف کی صحیح تعداد سے واقف ہیں وہ سات تھے، رواہ ابن جریر والفریابی وغیرہما۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ سات تھے، آٹھواں کتا تھا۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ تعداد اصحاب کہف کے متعلق اللہ نے صرف تین اقوال بیان فرمائے، کوئی چوتھا قول نہیں نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی چوتھا قول ہی نہ تھا پہلے دونوں قولوں کی رَجْمًا بِالْغَيْبِ کا لفظ کہہ کے تردید کر دی اور تیسرے قول کی تردید نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ تیسرا قول ہی حق ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اصحاب کہف کے نام حضرت ابن عباسؓ کے قول میں اس طرح آئے ہیں، مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، سنونس، ساری نونس، ذونواس، کشفیطیونس، یہ آخری شخص چرواہا تھا (جو اصحاب کہف کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا) رواہ الطبرانی فی الاوسط باسناد صحیح۔ شیخ ابن حجر نے شرح بخاری میں لکھا ہے ان اسماء کے تلفظ میں بڑا اختلاف ہے، کوئی قابل اعتماد تلفظ نہیں۔

فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ سو آپ ان کے بارے میں بجز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے۔

یعنی اصحاب کہف کی تعداد میں ان لوگوں سے آپ صرف سطحی اختلاف و مناظرہ کر سکتے ہیں کوئی گہرا اختلاف نہ کریں، زیادہ غور و خوض کرنے یا ان کو جاہل قرار دینے کی ضرورت نہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں۔

وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ۟ۧ اور اصحاب کہف کے (حالات، تعداد یا قصہ کے) متعلق ان میں سے کسی سے تحصیل علم اور صحیح معلومات کے حصول کے لئے دریافت بھی نہ کریں۔ یعنی اللہ نے جو آپ کو بتادیا ہے وہ کافی ہے ان کو اتنا بھی علم نہیں ہے پھر سوال بے سود ہے، اس کے علاوہ آپ کا مقصد سوال ان لوگوں کو لاجواب یا رسوا کر دینا بھی نہیں یہ مکارم اخلاق کے خلاف ہے، اس لئے ان سے دریافت ہی نہ کریں۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کام کے سلسلے میں پختہ وعدہ کیا تھا (مگر انشاء اللہ نہیں فرمایا تھا) چالیس دن گزر گئے (اور وہ کام نہ ہوا) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۟ۙ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ

اور آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کر دوں گا، مگر مشیت خدا کو ملا دیا کیجئے (یعنی انشاء اللہ ضرور کہہ دیا کیجئے)۔

ابن المنذر نے مجاہد کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے قریش سے کہا تھا ان سے روح اور اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوال کرو۔ قریش نے حضور ﷺ سے یہ سوالات کئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، کل میرے پاس آنا میں بتا

دوں گا لیکن انشاء اللہ نہیں فرمایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ لوپر دس روز تک کوئی وحی ہی نہیں آئی۔ آپ کو اس سے بڑی بے چینی ہو گئی ادھر قریش نے کہا تم جھوٹے ہو، اس موقع پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ شروع سورت کی تشریح میں اس مضمون کی ابن جریر کی روایت کردہ تفصیل ہم لکھ چکے ہیں اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ کے ذیل میں یہ روایت ذکر کر دی گئی ہے۔

آیت مذکورہ میں انشاء اللہ کہے بغیر کسی آئندہ کام کو کرنے کے وعدہ کی ممانعت رسول اللہ ﷺ کی ادب آموزی کے لئے کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو پختہ طور پر کرنے کا ارادہ ہو تو کبھی بھی مشیت الٰہی سے وابستہ کئے بغیر اس کام کو کرنے کا وعدہ نہ کرو۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ اور جب آپ بھول جائیں تو اپنے رب کا ذکر کیا کیجئے۔ یعنی اگر انشاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو تسبیح واستغفار کرو۔ اس جملہ میں انشاء اللہ کہنے کی مزید اہمیت ظاہر کی گئی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے کسی حکم کی تعمیل تم بھول جاؤ تو اللہ کو اور اس کے عذاب کو یاد کرو تاکہ نسیان کی تلافی ہو جائے۔ یا یہ معنی ہے کہ اگر تم کسی بات کو بھول جاؤ تو اللہ کو یاد کرو، تاکہ اللہ تم کو وہ بات یاد دلا دے۔

عکرمہ نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت تم کو غصہ آئے تو اللہ کو یاد کرو۔ وہب کا بیان ہے، انجیل میں آیا ہے، اے ابن آدم تجھے غصہ آئے تو مجھے یاد کر (غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا) جب مجھے غصہ آئے گا تو میں بھی تیری یاد کروں گا (اور تیری کمزوری پر رحم کروں گا)

ضحاک اور سدی کے نزدیک آیت مذکورہ کا حکم نماز سے تعلق رکھتا ہے (نماز میں کچھ بھول جاؤ تو اللہ کو یاد کرو یا یہ معنی کہ نماز پڑھنی بھول جاؤ تو جس وقت یاد آئے پڑھ لو) حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر کوئی شخص نماز پڑھنی بھول جائے تو جس وقت یاد آجائے پڑھ لے۔ رواہ البغوی۔ امام بخاری، مسلم، امام احمد، ترمذی اور نسائی کی روایت میں حدیث ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ جو شخص نماز کو بھول جائے یا سو جائے (یا سوتا رہے) اور نماز نکل جائے تو اس کا اتارہ یہ ہے کہ جب یاد آئے فوراً پڑھ لے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص وتر کی طرف سے سو جائے یعنی سو جانے یا سوتا رہنے کی وجہ سے وتر نہ پڑھ سکے یا وتر پڑھنا بھول جائے تو جب یاد آئے پڑھ لے۔ رواہ احمد والحاکم وصححہ۔

حضرت ابن عباسؓ، مجاہد اور حسن نے کہا، آیت کا معنی یہ ہے کہ انشاء اللہ کہنا اگر بھول جاؤ تو جس وقت بھی یاد آئے انشاء اللہ کہہ لو۔ اسی تشریحی مطلب کی وجہ سے ان حضرات کے نزدیک آج کے کلام سے متعلق ایک سال بعد بھی انشاء اللہ کہنا درست ہے بشرطیکہ انشاء اللہ کہنے سے پہلے کلام کے خلاف کوئی حرکت نہ کی ہو۔ اس مطلب کی تائید ابن مردویہ کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوپر دس روز یا چالیس روز کے بعد انشاء اللہ کہہ لیا۔

جمہور فقہاء کا فتویٰ حضرت ابن عباسؓ کے قول کے خلاف ہے، فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی غیر مستقل کلام ایسا ہو جس سے پہلے کلام کے حکم میں تبدیلی آرہی ہو تو اس کو پہلے کلام کے بالکل متصل اور ساتھ ساتھ ہونا چاہئے۔ مثلاً اگر کلام کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کرتا ہے یا کلام کو انشاء اللہ کے ساتھ متقید کرتا ہے، یا غایت زمانی ومکانی کو ظاہر کرتا ہے یا کسی مبدل منہ کے بعد بدل بعض کو بیان کرتا ہے تو شرط اور انشاء اللہ اور غایت اور بدل بعض پہلے کلام کے بعد حصلاً ذکر کرنا ضروری ہے اگر دیر کے بعد لگائی ہوئی شرط یا قید کو معتبر مانا جائے گا تو نہ کوئی اقرار صحیح ہوگا، نہ طلاق، نہ غلام کی آزادی۔ نہ صدق معلوم ہو گا نہ کذب (مثلاً زید نے اقرار کیا کہ عمر کا مجھ پر اتنا روپیہ قرض ہے اور کچہری سے نکلنے کے بعد اس نے کہا بشرطیکہ عمر مجھے فلاں چیز دے دے یا زید نے بیوی کو طلاق دے دی، یا غلام کو آزاد کر دیا، اور دو گھنٹہ کے بعد کسی شرط کے ساتھ مشروط کر دیا، اسی طرح زید

نے کوئی بات کہہ دی، اب معلوم نہیں کہ اس نے جھوٹ کہا یا سچ۔ ممکن ہے کل کو وہ اپنے گزشتہ کلام کو کسی شرط کے ساتھ مشروط یا کسی قید کے ساتھ مقید کر دے، اور اس وقت کا سچ کل کو جھوٹ ثابت ہو۔ ایک واقعہ منقول ہے کہ خلیفہ منصور کو کسی نے اطلاع دی کہ امام ابو حنیفہؒ آپ کے دادا حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور انشاء اللہ کی شرط کو کلام سے متصل ہونا ضروری قرار دیتے ہیں اور دیر کے بعد انشاء اللہ کہنے کا کوئی اعتبار نہیں کرتے۔ خلیفہ نے امام ابو حنیفہؒ کو طلب کیا، امام ابو حنیفہؒ نے خلیفہ کے سوال کے جواب میں فرمایا، حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ تو آپ کے خلاف پڑتا ہے، آپ رعایا سے فرماں برداری اور وفاداری رہنے کی بیعت لیتے ہیں اور لوگ بیعت کرتے ہیں لیکن آپ کے دربار سے نکلنے کے بعد اگر وہ انشاء اللہ کہہ لیں تو کیا ان کی بیعت قابل اعتبار نہیں رہے گی۔ منصور نے امام ابو حنیفہؒ کے قول کو مان لیا اور امام کے خلاف جس نے مخبری کی تھی اس کو دربار سے نکلوا دیا۔

رہا ابن عباسؓ کا یہ استدلال کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے نزول کے بعد انشاء اللہ فرمایا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے اپنی پچھلی غلطی کی تلافی نزول آیت کے بعد انشاء اللہ کہہ کر کی تھی بلکہ آیت میں جو آپ کو ہر عزم اور قول کے وقت انشاء اللہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا آپ ﷺ نے انشاء اللہ فرما کر یہ ظاہر کر دیا کہ آئندہ انشاء اللہ میں اس حکم کی تعمیل کرتا رہوں گا۔

صوفیاء نے آیت وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ کی ایک بہت ہی پر کیف تشریح کی ہے، آیت کا مطلب بر قول صوفیاء یہ ہے کہ جب اللہ کے سوا تم ہر چیز کو بھول جاؤ، اس وقت خالص دل سے اللہ کی یاد کرو۔ صوفیاء کہتے ہیں اللہ کی ہمہ وقت یاد اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک ماسوا کے تصور کو دل سے مٹا نہ دیا جائے، عام طور پر دل کی حالت بدلتی رہتی ہے، یکسوئی عموماً نہیں رہتی اور ظاہر ہے کہ ایک آدمی کے دو دل تو ہیں نہیں کہ ایک میں یاد خدا جمی رہے اور دوسرے میں مخلوق کا ذکر قائم رہے۔ دل ایک ہی ہے، جب اس میں ماسوی اللہ کا تصور ہوگا تو اللہ کی یاد میں فتور آجائے گا اور اللہ کے سوا اگر ہر چیز کو دل فراموش کر دے گا اور ماسوی اللہ کے تصور کو مٹا دے گا تو دل ہر دم یاد الٰہی میں مشغول اور غرق رہے گا، اسی کو فناء قلب کہتے ہیں۔ جب تک فناء قلب کا درجہ حاصل نہ ہو جائے، صوفی اس کو موحد نہیں کہتے۔ حضرت مفسر نے لکھا ہے کہ صوفیاء کی تشریح ہی کتاب اللہ کی صراحت اور عربی قوانین لغت کے زیادہ مناسب ہے۔ اس قول پر مجازی معنی کی طرف رجوع کرنا بھی نہیں پڑتا۔ دیکھو إِذَا نَسِيتَ کا تعلق اذْكُرْ سے ہے، یعنی بھولنے کے وقت اللہ کی یاد کرو۔ بھولنا اور یاد کرنا دو متضاد فعل ہیں، ایک وقت میں دونوں کا اجتماع نہیں ہو سکتا لامحالہ مجازی معنی مراد لینا ہوگا، دونوں فعل جدا جدا مختلف اوقات اور مختلف حالات میں ظاہر ہوں گے اور آیت میں تاویل کرنی پڑے گی، کوئی بھی تاویل کی جائے مجاز کی طرف رجوع کئے بغیر چارہ کار نہ ہوگا، البتہ صوفیاء کا قول مبنی بر حقیقت ہے ذکر رب، نسیان ماسوا کے وقت ہی ہوتا ہے اور اسی کو ذکر رب کہتے ہیں جس میں ماسوا کا نسیان ہو جائے۔

وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾ اور کہہ دیجئے کہ مجھ کو امید ہے میرا رب نبوت کی صداقت کو اس سے بھی زیادہ قریب الوصول بنا دے گا۔

أَقْرَبَ رَشَدًا سے مراد ہے کوئی ایسی بہتری جو متصل ہی آنے والی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انشاء اللہ کہنا یا اللہ کے کسی حکم کی تعمیل کرنا تم بھول جاؤ تو اللہ کی یاد کرو یعنی تسبیح و استغفار کرو اور کہو کہ امید ہے اللہ مجھے کوئی ایسی راہ بتا دے گا جو فراموش شدہ (لفظ یا حکم) سے افضل اور بہتر ہوگی یہ بہترین راہ کونسی ہے (جس سے گزشتہ شئی کی تلافی اور آئندہ کی ترقی وابستہ ہے) وہ ہے صرف گزشتہ پر ندامت، توبہ، استغفار اور فوت شدہ کی قضاء۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ لوگوں نے جب رسول اللہ ﷺ سے اصحاب کہف کا واقعہ دریافت کیا اور اللہ نے اصحاب کہف کا قصہ بیان کر دیا تو آخر میں اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو یہ بات بتا دیں کہ اصحاب کہف کے واقعہ سے بڑھ کر روشن دلیل اور برہان نبوت اللہ عطا فرمائے گا چنانچہ یہ وعدہ اللہ نے پورا کیا، تمام انبیاء کے علوم بلکہ ماضی و مستقبل کے سارے علمی خزانے اللہ نے آپ کو عطا فرما دیئے، اصحاب کہف کے واقعہ کے اظہار سے آپ کی نبوت کو سچائی کا اتنا قوی ثبوت نہیں ملتا جتنا تمام انبیاء و

مرسلین کے علوم اور گزشتہ و آئندہ کے واقعات و حالات کے علم عطا فرمانے سے ملتا ہے۔ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو اور بواسطۂ رسول اللہ ﷺ ہر مسلمان کو حکم دیا ہے کہ جب انشاء اللہ کہنا بھول جاؤ اور پھر یاد آجائے تو انشاء اللہ کہنے کے بعد یہ بھی کہو عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا یہی گزشتہ قصور کی توبہ ہے۔ صوفیاء کی تشریح پر آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ جب اللہ کے سوا ہر چیز کو بھول جاؤ تو اللہ کی یاد کرو اور یہ بھی کہو کہ امید ہے اللہ مجھے ایسے راستے کی ہدایت کردے گا یا ایسی چیز بتادے گا جو اس ذکر سے بھی زیادہ اقرب ہوگی یعنی اللہ اپنی ذات تک خود پہنچادے گا اللہ کی ذات رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ اور اصحاب کہف اپنے غار میں تین سو برس سے نو برس زیادہ (سوتے) رہے۔ پہلے مجمل طور پر فرمایا تھا فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا اس آیت میں تفصیل فرمادی اور تعداد بتادی۔

قتادہ نے کہا اللہ نے اہل کتاب کا یہ قول نقل کیا ہے، اہل کتاب اصحاب کہف کے سوتے رہنے کی معین تعداد بیان کرتے تھے اس قول کو اللہ نے ذکر کیا اور پھر اس کی تردید میں فرمایا قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا اللہ ہی کو خوب معلوم ہے کہ وہ کتنے زمانہ تک وہاں سوتے رہے۔ اگر مذکورہ بالا آیت کو اللہ کی طرف سے تعداد مدت کی تعیین قرار دیا جائے گا تو اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کا کوئی معنی نہ ہوگا۔

حضرت مفسرؒ نے فرمایا، تفسیر وہی ہے جو پہلے ذکر کی گئی ہے، یعنی اللہ کی طرف سے یہ تعیین مدت کی صراحت ہے، اہل کتاب کے قول کو نقل نہیں کیا گیا ہے۔ رہا بر قول جمہور آیت اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کا مطلب تو یہ پہلے قول کی تردید نہیں ہے ۳۰۹ برس کی تعیین فرمادی اور آخر میں حکم دے دیا کہ اب اگر یہ لوگ تعیین مدت میں نزاع کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو (اس جھگڑے سے کوئی فائدہ ہی نہیں) اللہ ان کی مدت قیام سے بخوبی واقف ہے (تمہارا نزاع تمہارے لئے سودمند نہیں)۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اہل کتاب کا ہی یہ قول ہے، غار میں داخل ہونے سے رسول اللہ ﷺ کے زمانے تک ۳۰۹ برس کی مدت اہل کتاب کے خیال میں گزری تھی، اللہ نے آیت اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا میں اس کی تردید فرمادی۔ یعنی ان کی روحیں قبض ہونے کے بعد سے اب تک جس قدر مدت گزری، اللہ ہی کو اس کا علم ہے، وہی بخوبی واقف ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے اور ابن جریر نے ضحاک کی روایت سے بیان کیا کہ شروع میں وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ نازل ہوا تھا، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ تین سو سال یا تین سو مہینے اس کے جواب میں لفظ سِنِيْنَ اور نازل ہوگیا۔ وَازْدَادُوْا تِسْعًا کی تشریح میں کلبی نے کہا نجران کے عیسائیوں نے کہا تھا، تین سو برس رہنے کا علم تو ہم کو بھی ہے مزید نو برس رہنے کا علم ہم کو نہیں۔ یعنی ہماری کتاب میں نہیں ہے) اس پر۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے زمانہ تک وہ سوتے رہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا، اصحاب کہف شمسی حساب سے تین سو برس سوتے رہے اور اللہ نے قمری حساب سے تین سو نو برس رہنے کی صراحت کی ہے۔ ہر سو سال شمسی کے بحساب قمری ایک سو تین سال ہوتے ہیں۔ تین سو سال کے تین سو نو سال ہوگئے۔

لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۭ (تمام دنیا کی علمی نظر سے جو چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں پوشیدہ ہیں) ان تمام ارضی و سماوی پوشیدہ اشیاء کا علم اللہ ہی کو ہے، سب چیزیں اسی کے دست ملکیت و تصرف میں ہیں، وہ عجیب طرح کا دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔ یعنی اس کی بینائی اور شنوائی دوسروں کے دیکھنے سننے سے الگ اور عجیب ہے اس کو دیکھنے اور سننے سے کوئی چیز حاجب اور مانع نہیں، انتہائی لطافت ہو یا کثافت، باریک سے باریک چیز ہو یا بڑی سے بڑی، پوشیدہ ہو یا ظاہر اس کے نزدیک کوئی فرق نہیں اس کو ہر چیز کا علم سمعی و بصری ہے۔

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ؗ وَّ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا۝ اہل ارض وسما کے لئے اللہ کے سوا کوئی کارساز اور ان کے امور کا ذمہ دار نہیں اور نہ وہ اپنے حکم میں ان میں سے کسی کو شریک کرتا ہے۔ نہ دخیل بناتا ہے۔ حکم سے فیصلہ قضاء یا امرونہی یا علم غیب مراد ہے یعنی اپنے علم غیب میں وہ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

رسول اللہ ﷺ کو اصحاب کہف کا قصہ معلوم نہ تھا وہ آپ کے لئے غیب کے حکم میں داخل تھا لیکن اللہ نے وحی کے ذریعہ سے واقف بنادیا اور قرآن میں ذکر کر دیا گویا غائب اور غیر معلوم واقعہ کو بیان کر دیا ایک معجزہ ہو گیا جو عبارت قرآنی کی شکل میں نمودار کر دیا گیا۔ اس لئے آئندہ آیت میں تلاوتِ قرآن اور اصحابِ قرآن کی مصاحبت کا حکم دیا گیا اور فرمایا۔

وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ۫ اور آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے جو کتاب بذریعہ وحی بھیجی گئی ہے وہ پڑھا کریں اس کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

یعنی قرآن کی تلاوت کرو اور اس کے مفہوم پر عمل کرو اور ان لوگوں کی بات پر کچھ دھیان نہ دو جو اس کے سوا کسی دوسرے قرآن کے خواستگار ہیں یا اسی میں تم سے کچھ ترمیم و تبدیل کرانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اس میں کسی طرح کی تبدیل و ترمیم کرنے کی طاقت رکھنے والا کوئی بھی نہیں ہے کوئی شخص بھی اللہ کے سوا اس کو بدل نہیں سکتا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ گناہ گاروں، نافرمانوں کو جو قرآن کے اندر عذاب کی وعید دی گئی ہے اس کو بدلنے والا کوئی نہیں، عذاب ہو کر رہے گا۔

وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۝ اور اے محمد ﷺ اگر آپ قرآن پر نہ چلے تو اللہ کے سوا آپ کو کوئی پناہ کی جگہ (حضرت ابن عباسؓ) یا چھپنے کی جگہ (حسن بصریؒ) یا جائے قرار نہیں ملے گی۔ لحد کا اصل معنی ہے جھکاؤ، کجی۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ

اور اپنے آپ کو قائم رکھو، جمائے رکھو ان لوگوں کے ساتھ جو صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں دعا اور ذکر کرتے ہیں اس سے ان کا مقصد صرف اپنے رب کی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے کوئی اور غرض نہیں ہوتی۔

اِصْبِرْ نَفْسَكَ اپنے آپ کو روکے رکھو، جمائے رکھو۔ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ صبح شام یا تمام اوقات میں۔ یُرِیْدُوْنَ یعنی ان کی عبادت کی غرض سوائے ذات خداوندی کے اور کچھ نہیں ہوتی۔ وَجْهَهٗ میں لفظ وجہ زائد ہے جیسے آیت وَیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ میں لفظ وجہ زائد ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کو اللہ کی ذات کے سوا اور کوئی مطلوب نہیں، نہ دنیا نہ آخرت۔

بغوی نے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ بالا عیینہ بن حصین فزاری کے حق میں نازل ہوئی، مسلمان ہونے سے پہلے عیینہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت کچھ نادار مسلمان خدمت گرامی میں بیٹھے ہوئے تھے جن میں سلمان فارسی بھی تھے حضرت سلمان ایک چھوٹی سی چادر اوڑھے تھے اور آپ کو پسینہ بھی آرہا تھا، عیینہ بولا، محمد ﷺ! کیا آپ کو ان لوگوں کی بدبو سے دکھ نہیں ہوتا، ہم قبائل مضر کے سردار اور بڑے لوگ ہیں اگر ہم مسلمان ہو گئے تو سب لوگ مسلمان ہو جائیں گے لیکن ہم کو آپ کی اتباع کرنے سے ایسے لوگوں کی آپ کے پاس موجودگی روکتی ہے ان کو آپ ہٹا دیں تو ہم آپ کی اتباع کرنے لگیں گے یا ہمارے لئے ان سے الگ کوئی بیٹھنے کی جگہ مقرر کر دیں اور ان کی مجلس ہم سے الگ کر دیں اس پر آیت نازل ہوئی۔

قتادہ کا بیان ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ الخ سے اصحاب صفہ مراد ہیں جن کی تعداد سات سو تھی یہ سب نادار لوگ تھے اور رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں فروکش تھے، نہ کسی کی کھیتی تھی، نہ دودھ کے جانور، نہ کوئی تجارت، نمازیں پڑھتے رہتے تھے ایک وقت کی نماز پڑھ کر دوسری نماز کے انتظار میں رہتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ستائش ہے اس اللہ کے لئے جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے جن کی معیت میں مجھے جمے رہنے کا حکم دیا۔

اس آیت کی شان نزول کی کچھ تفصیل سورۂ انعام کی آیت وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ الخ کی تفسیر میں ہم نے کر دی ہے۔

وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ اور دنیوی زندگانی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (یعنی توجہات) ان (غریب مسلمانوں) سے ہٹنے نہ پائیں۔ یعنی دولت مندوں کے ساتھ بیٹھنے اور مال دار دنیاداروں کی مصاحبت اختیار کرنے کے لئے تم ہمہ وقت اللہ کا ذکر کرنے والے (نادار) لوگوں سے آنکھیں پھیر لو ایسا نہ کرو۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا اور جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنادیا ہے اس کے کہنے پر نہ چلو۔ بغوی نے لکھا ہے کہ آیت میں جس کا کہا ماننے کی ممانعت کی گئی ہے اس سے مراد عیینہ بن حصین فزاری ہے لیکن ابن مردویہ نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت امیہ بن خلف جمحی کے حق میں نازل ہوئی۔ امیہ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ ان فقیروں کو اپنے پاس سے نکال دیجئے اور سرداران مکہ کو اپنے پاس بٹھائیے، اللہ کو یہ درخواست پسند نہ تھی اس لئے آیت مذکورہ نازل فرمادی۔ ربیع کی روایت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ ابن بریدہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت سلمانؓ بیٹھے ہوئے تھے کہ عیینہ بن حصین آگیا اور کہنے لگا جب ہم آپ کے پاس آیا کریں تو آپ اس کو یعنی اس جیسے غریب لوگوں کو اپنے پاس سے نکال دیا کریں، اس پر آیت وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا نازل ہوئی۔

وَاتَّبَعَ هَوَاهُ اور وہ اپنی خواہش پر چلتا ہے۔ یعنی سرداران قریش کے لئے آپ کی مجلس سے غریب مسلمانوں کو نکال دینے کا خواستگار ہوتا ہے۔ آیت میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اس کی اس درخواست کا موجب دو باتیں ہیں (۱) اس کا دل اللہ کی یاد سے غافل ہے (اللہ کا تصور ہی اس کے دل میں نہیں اور خدا کی طلب ہی اس کو نہیں)۔ (۲) دنیوی لذتوں میں اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ اس کو پتہ ہی نہیں کہ شرافت کا مدار ذلیل باتوں سے نفس کو پاکیزہ رکھنے، دل کو باطنی رذائل کی کثافت سے صاف رکھنے اور انوار معروف سے منور کرنے پر ہے جسمانی آرائش پر نہیں ہے جو اس کے کہنے پر چلے گا وہ بھی غفلت اور حماقت میں اسی کی طرح ہوگا۔

فرقۂ معتزلہ کے نزدیک قبیح افعال کو پیدا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف کرنی درست نہیں اور اس جگہ لفظ أَغْفَلْنَا میں غافل بنانے کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے اس لئے انہوں نے کہا کہ أَغْفَلْنَا کا معنی غافل بنانا نہیں ہے بلکہ غافل پانا ہے۔ ہم نے اس کے دل کو غافل پایا، یا غفلت کی نسبت اس کے دل کی طرف کردی، یعنی غافل چھوڑ دیا، عرب کہتے ہیں أَغْفَلَ إِبِلَهُ اس نے اپنے اونٹوں کو بغیر نشان زدہ کئے چھوڑ دیا۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ أَغْفَلْنَا میں اللہ کی طرف غافل کردینے کی نسبت اور وَاتَّبَعَ هَوَاهُ میں اتباع ہوا کی بندے کی طرف نسبت بتا رہی ہے کہ بندہ نہ مجبور ہے نہ مختار کامل بلکہ بین بین ہے (خالق، اللہ ہے اور کاسب، بندہ)

وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ اور اس کا یہ حال حد سے گزر گیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ اور مجاہد نے فُرُطًا کا ترجمہ ضَيَاعًا یعنی ضائع شدہ کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا اس کا امر ضائع ہو گیا اور زندگی کے دن رائیگاں گئے۔ بعض نے فُرُطًا کا معنی ندامت بیان کیا ہے۔ مقاتل بن حیان اور اخفش نے ترجمہ کیا حد سے آگے بڑھا ہوا، کسی نے باطل، کسی نے مخالف حق ترجمہ کیا ہے، فراء نے متروک کہا ہے، بیضاوی نے لکھا ہے حق کو پس پشت پھینک دینے والا۔ جو گھوڑا سب سے آگے نکل جائے اور سب گھوڑے اس کے پیچھے رہ جائیں اس کو فَرَسٌ فُرُطٌ کہا جاتا ہے فرط (پیش خیمہ، ہراول) اسی سے بنا ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ (اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیں حق (وہ ہے جو) تمہارے رب کی جانب سے ہے۔

یعنی حق وہ ہے جس کو اللہ نے حق قرار دیا ہو۔ اقتضاء خواہشات حق نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ یہ یعنی قرآن یا اسلام حق ہے جو اللہ کی طرف سے آیا ہے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ اب جو (ایمان لانا) چاہے ایمان لے آئے اور جو (کافر رہنا) چاہے وہ کافر رہے۔ یہ کلام وعید آگیں ہے۔ ایمان و کفر دونوں کا اختیار دیا گیا ہے جو اپنے اندر ایک خاص تہدید رکھتا ہے۔ گویا عیینہ کی درخواست کا جواب ہے۔ عیینہ نے کہا تھا ان لوگوں کے لباس اور بدن کی بدبو سے کیا آپ کو تکلیف نہیں ہوتی ہم قبیلہ مضر کے شرفاء اور سردار لوگ ہیں ہم ان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے، اگر ہم مان لیں گے تو سارے لوگ ایمان لے آئیں گے، مناسب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دیجئے تاکہ ہم آپ کے پاس بیٹھ سکیں اور آپ کی بات سنیں اور آپ پر ایمان لے آئیں، اللہ نے اس کے جواب میں غریب مسلمانوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کو پاس بٹھانے کی رسول اللہ ﷺ کو ہدایت فرمائی اور اپنی مجلس سے ان کو نکال دینے کی ممانعت کردی اور صاف صراحت کردی کہ حق رب کی طرف سے آگیا، ماننا چاہو اس کو مانو، نہ ماننا چاہو نہ مانو، اللہ کو کسی کے ماننے نہ ماننے کی پرواہ نہیں، ہر شخص کا اپنا نفع و نقصان ہے جو مان لے گا اسی کو ایمان کا فائدہ پہنچے گا نہ مانے گا تو کفر کی مضرت اسی پر پڑے گی۔

إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظَّٰلِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ اور ظالموں یعنی کافروں کے لئے ہم نے آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو گھیر لیں گی۔ متعدد چھوٹے ڈیروں اور خیموں کے گرداگرد جو احاطہ باڑھ کی طرح کھینچ دیا جاتا ہے اس کو سُرادق کہتے ہیں۔ صاحب نہایہ نے لکھا ہے دیوار ہو یا خیمہ یا کچھ اور چیز بہر حال جو باڑہ کی طرح کسی چیز کو گھیرے ہوئے ہو وہ سُرادق ہے، سُرادق معرب لفظ ہے اور مفرد ہے۔ معرب قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں کوئی مفرد لفظ ایسا نہیں جس کے ابتدائی دو حرفوں کے بعد تیسرا حرف الف ہو اور الف کے بعد دو حرف اور ہوں۔ بعض کے نزدیک سُرادق، سُرادِق کی جمع ہے۔ امام احمد، ترمذی اور حاکم نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، سُرَادِقُ النَّارِ (دوزخ کی قناتیں) چار دیواریں ہوں گی (ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری، تیسری کے بعد چوتھی) ہر دیوار کی موٹائی چالیس سال کی راہ کے برابر ہوگی۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ سُرَادِقُ النَّارِ آگ کی دیوار ہوگی (جو محیط ہوگی) کلبی نے کہا آگ کی لپٹ ہوگی جو کافروں کو ہر طرف سے باڑہ کی طرح گھیرے ہوگی۔ بعض علماء نے کہا ایک دھواں ہوگا جو کافروں کو محیط ہوگا، اللہ نے اسی کا ذکر آیت انْطَلِقُوا إِلَىٰ ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ میں کیا ہے۔

وَإِن يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ اور اگر (شدت پیاس کی وجہ) سے وہ پانی مانگیں گے تو ان کو ایسا پانی دیا جائے گا جو مہل کی طرح ہوگا۔

امام احمد، ترمذی، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ آیت بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ کی تشریح میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا، منہ کے قریب لایا جائے گا تو چہرہ کی کھال اس میں گر پڑے گی۔

امام احمد، ترمذی، نسائی، حاکم، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن ابی الدنیا، اور بیہقی نے حضرت ابو امامہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت وَيُسْقَىٰ مِن مَّآءٍ صَدِيدٍ کی تشریح میں فرمایا، وہ سامنے لایا جائے گا تو دوزخی کو سخت ناگوار ہوگا پھر منہ کے قریب لایا جائے گا تو چہرہ کی اور سر کی کھال جل بھن کر گر پڑے گی جب اس کو پیے گا تو انتڑیاں کٹ کر دبر سے نکل جائیں گی۔ اللہ فرماتا ہے وَإِن يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ۔ ابن ابی حاتم نے ابو طلحہ کے طریق سے حضرت ابن عباسؓ کا قول كَالْمُهْلِ کی تشریح کے متعلق نقل کیا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، وہ سیاہ ہوگا جیسے زیتون کے تیل کی تلچھٹ۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول بغوی کی روایت میں یہ آیا ہے وہ گاڑھا پانی ہوگا، زیتون کے تیل کی گاد کی طرح۔ مجاہد نے مُہل کا ترجمہ کیا ہے، لہو، پیپ، خون۔ حضرت ابن مسعودؓ سے اس کا ترجمہ دریافت کیا گیا تو آپ نے کچھ سونا چاندی منگوا کر پگھلایا، جب پگھل گیا تو فرمایا یہ مُہل کی طرح ہے اس کے ہم شکل ہے۔

يَشْوِي الْوُجُوهَ　وہ چہروں کو بھون ڈالے گا، یعنی جب وہ منہ کے قریب لایا جائے گا تو اتنا گرم ہو گا کہ اس کی گرمی سے چہرے بھن جائیں گے۔

بِئْسَ الشَّرَابُ　(وہ مُہل) برا مشروب ہو گا۔

وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا ۝　اور (آگ) بری آرام گاہ ہو گی۔

مُرْتَفَقًا کا ترجمہ حضرت ابن عباسؓ نے فرود گاہ، مجاہد نے مقام اجتماع، عطاء نے قرار گاہ اور قتیبی نے مجلس کیا ہے۔ اِرْتِفَاق کا لغوی معنی ہے۔ کہنی کھڑی کر کے اس پر رخسار ٹیکنا، پس لغت کے لحاظ سے مُرْتَفَقًا اسم ظرف کا ترجمہ ہوا ٹیک کی جگہ، آرام گاہ۔ دوزخ کوئی آرام گاہ نہیں ہے لیکن جنت کو آگے آرام گاہ فرمایا ہے تقابل کے طور پر نار کو بھی مُرْتَفَق فرما دیا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے تو ہم ان لوگوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے جنہوں نے اچھی طرح کام کیے، ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ رہنے کے باغ ہوں گے جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

عَدْن قیام کرنا، ٹھہرنا۔ عَدَنَ الْمَاءُ بِالْمَكَانِ یانی فلاں جگہ ٹھہر گیا۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ وہ باغ اور جنتیں جہاں مومن ہمیشہ قیام کریں گے۔

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ　وہاں اہل جنت کو سونے کے کنگنوں کا زیور پہنایا جائے گا۔ سِوَار کنگن اس کی جمع اَسْوِرَة یا اَسْوِرَہ ہے اور اَسْوَار یا اَسْوِرَة کی جمع اَسَاوِرَ ہے۔

اَسَاوِرَ اور ذَہَب کو نکرہ لانے سے اس طرح اشارہ ہے۔ کہ وہ کنگن اور سونا نرالی شان کا ہو گا کہ اس کے حسن کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ طبرانی نے الاوسط میں اور بیہقی نے اچھی سند سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ادنیٰ جنتی کے ادنیٰ زیور کا تمام دنیا کے زیوروں سے موازنہ کیا جائے تو جو ادنیٰ زیور آخرت میں اللہ جنتی کو عطا کرے گا وہ دنیا کے تمام زیوروں سے بڑھ چڑھ کر ہو گا۔

ابوالشیخ نے العظمۃ میں کعب احبار کا بیان نقل کیا ہے کہ اللہ کا ایک فرشتہ جو اپنی پیدائش کے آغاز سے اہل جنت کے زیور ڈھال رہا ہے اور قیامت تک ڈھالتا رہے گا اگر اہل جنت کا ایک زیور بھی سامنے لے آیا جائے تو اس کے مقابلے میں سورج کی روشنی ماند پڑ جائے۔

وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ ۚ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝　اور سبز رنگ کے کپڑے باریک اور دبیز ریشم کے پہنیں گے (اور) وہاں مسہریوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے کیسا اچھا صلہ ہو گا اور جنت کیا ہی اچھی آرام گاہ ہو گی۔

ابن السنی اور ابو نعیم نے طب النبی ﷺ میں حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سب سے پسندیدہ رنگ سبز تھا۔

سُنْدُس باریک ریشمی کپڑا۔ اِسْتَبْرَق دبیز ریشمی کپڑا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ جنت کے کپڑوں کے دبیز ہونے سے مراد ہے بناوٹ کی مضبوطی۔ عمر حربی نے کہا سندس زربفت کو کہتے ہیں۔

نسائی، ابوداؤد، بزار اور بیہقی نے بسند حسن حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمائیے اہل جنت کے کپڑے کس قسم کے ہوں گے، کیا (بنے بنائے) پیدا شدہ ہوں گے یا بنے ہوئے ہوں گے جن کو بن کر تیار کیا گیا ہو گا۔ یہ بات سن کر ایک شخص کو ہنسی آگئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ایک ناواقف جب کسی جاننے والے سے

پوچھتا ہے تو تم لوگ ہنستے ہو، پھر دوبارہ فرمایا جنت کے پھلوں سے ان کے پھٹنے پر (تیار شدہ) بر آمد ہوں گے۔ بزار، ابو یعلی اور طبرانی نے جابر کی روایت سے حضرت ابو الخیر مرثد بن عبد اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت کے اندر ایک درخت ہے جس سے سندس اُگتا ہے جنتیوں کا لباس اسی کا ہوگا۔

اَلْاَرَآئِکِ، اَلْاَرِیْکَۃ کی جمع ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، اگر چاروں طرف پردہ ہو اور اندر لیٹنے کی مسہری نہ ہو یا چارپائی لیٹنے کی ہو اور گرد اگرد پردہ نہ ہو تو اس کو اریکہ نہیں کہتے اریکہ پردہ والی مسہری کو کہتے ہیں۔ بیہقی نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ مسہریاں موتی اور یاقوت کی ہوں گی۔

ثواب صلے یعنی جنت اور اس کی نعمتیں، مرتفق بیٹھنے کی جگہ اور قرار گاہ۔ یعنی جنتیں یا مسہریاں کیسی اچھی قرار گاہ ہوں گی۔

وَاضْرِبْ لَہُمْ مَّثَلًا رَّجُلَیْنِ اور ان سے دو آدمیوں کا حال بیان کرو۔ بغوی نے لکھا ہے کہ مکہ میں قبیلہ بنی مخزوم کے دو بھائی رہتے تھے ایک مومن تھا، دوسرا کافر، مومن کا نام ابو سلمہ عبد اللہ (ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے سابق شوہر) بن عبد الاسود بن عبد یالیل تھا اور کافر کا نام اسود بن عبد الاسود بن عبد یالیل۔ انہی دونوں کے حق میں اس آیت کا نزول ہوا۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ عیینہ بن حصین اور اس کے ساتھیوں کے احوال اور حضرت سلمان کے حال کو بطور تمثیل بنی اسرائیل کے دو بھائیوں کے احوال سے تشبیہ دی ہے، جن میں سے ایک کا نام بر قول ابن عباس یہود اور بر قول مجاہد تملیخا تھا اور دوسرے کا نام قطروس اور بقول وہب قطفر تھا، اول مسلمان تھا دوسرا کافر۔ سورۂ والصافات میں بھی انہیں کا قصہ بیان کیا ہے۔ عبد اللہ بن مبارک نے بروایت معمر عطاء خراسانی کا بیان ان دونوں کے متعلق حسب ذیل نقل کیا ہے۔

ایک شخص کے دو بیٹے تھے، دونوں کو باپ کی وراثت سے آٹھ ہزار دینار ملے، دونوں نے تقسیم کر کے اپنا اپنا حصہ لے لیا، ایک بھائی نے ایک ہزار دینار کی زمین خریدی، دوسرے نے ہزار دینار خیرات کر دیئے اور کہا اے اللہ میرے بھائی نے ہزار دینار کی زمین خریدی ہے میں تجھ سے جنت میں ایک ہزار کی زمین خریدتا ہوں، اول شخص نے ہزار دینار صرف کر کے مکان بنایا، دوسرے نے ہزار دینار غریبوں کو تقسیم کر کے دعا کی، اے اللہ! اس نے ہزار دینار خرچ کر کے مکان بنایا ہے میں تجھ سے جنت کے اندر ہزار دینار کا مکان خریدتا ہوں، پھر اول شخص نے ہزار دینار صرف کر کے ایک عورت سے شادی کر لی اور دوسرے نے ہزار دینار راہ خدا میں دے کر کہا اے اللہ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ جنت کے اندر کسی جنت کی عورت سے میرا نکاح کر دے، پھر اول شخص نے ایک ہزار دینار خرچ کر کے باندی، غلام اور گھر کا سامان خرید اور دوسرے نے ہزار دینار خیرات کر کے اللہ سے جنت کے اندر خدام اور سامان ملنے کی درخواست کی۔

جب یہ دوسرا شخص سب مال خیرات کر چکا تو کچھ مدت کے بعد مال کی کوئی سخت ضرورت پیش آئی اور دل میں خیال کیا مجھے بھائی کے پاس جانا چاہئے شاید اس کی طرف سے مجھے کچھ مل جائے، یہ سوچ کر بھائی کے راستہ پر ایک طرف کو جا بیٹھا، اس طرف سے دولت مند بھائی اپنے خادموں کے جھرمٹ میں گزرا اور بھائی کو دیکھ کر پہچان لیا اور پوچھا کیا حال ہے اس شخص نے کہا مجھے ایک حاجت در پیش ہے اور مفلس ہو گیا ہوں، آپ کے پاس کچھ بھلائی کی امید لے کر آیا ہوں، دولت مند بھائی نے کہا تمہارا مال کیا ہوا، تقسیم کے وقت تم نے اپنا حصہ تو لے لیا تھا، غریب بھائی نے اپنی سرگزشت بیان کر دی، دولت مند بھائی بولا، اچھا تو تم خیرات کرنے والوں میں شامل ہو گئے، چلے جاؤ، میں کچھ نہیں دوں گا، غرض اس نے غریب کو دھتکار دیا، آخر دونوں مر گئے اور ان ہی کے متعلق آیت فَاَقْبَلَ بَعْضُہُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ نازل ہوئی۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ مال دار بھائی غریب بھائی کو ہاتھ پکڑ کر اپنے مال کی سیر کرانے لے گیا اور گھما پھرا کر سب طرح کا مال دکھایا۔

وَاضْرِبْ لَہُمْ ہُمْ کی ضمیر کافروں اور مومنوں دونوں کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مَثَلً بمعنی حال، رَّجُلَیْنِ سے مراد ہیں وہ دو آدمی جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے (حضرت ابو سلمہ مخزومی اور اسود مخزومی) یا جو کبھی پہلے گزر گئے

تھے (یعنی دو اسرائیلی بھائی یہود اور قطروس) کوئی مقرر شخص مراد نہیں ہے بلکہ دو شخص جن میں مندرجہ آیت اوصاف ہوں (عبرت دلانے اور نصیحت کرنے کے لئے) فرض کر لئے گئے ہیں اور ان کی حالت بیان کر دی گئی ہے۔

جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ ان دو شخصوں میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دے رکھے تھے اور ان دونوں باغوں کا کھجور کے درختوں سے احاطہ بنا رکھا تھا اور ان دونوں کے درمیان کھیتی بھی پیدا کر دی تھی۔

اَحَدُهُمَا سے مراد کافر ہے۔ انگوروں کے باغوں سے مراد ہیں انگور کے درختوں کے باغ۔ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ یعنی انگور کے باغوں کے گرداگرد باڑھ کی طرح کھجور کے درخت تھے، انگور کے باغ کھجور کے درختوں کے باڑھ کے اندر تھے۔ حَفَّهُ الْقَوْمُ اس کو قوم نے گھیر لیا۔ حَفَفْتُهُ بِقَوْمٍ میں نے اس کو قوم سے گھیر دیا، اس کے گرداگرد قوم کا گھیرا ڈال دیا۔ اس صورت میں بِقَوْمٍ میں بِ زائد ہوگی (کیونکہ حَفَفْتُ خود متعدی بدو مفعول ہے جن میں دوسرا مفعول فاعل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ م)

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا یعنی دونوں باغوں کے درمیان واقع ہونے والی زمین بھی بنجر نہ تھی بلکہ اس میں کھیتی تھی، اس طرح ان باغوں میں پھل بھی تھے اور غلے کی پیداوار بھی تھی اور ترتیب بھی عمدہ تھی۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا ۙ اور دونوں باغ اپنے پورے پھل دیتے تھے اور کسی کی پیداوار میں ذرا بھی کمی نہ تھی، یعنی باغوں کے پھلوں اور پیداوار میں وہ کمی نہ تھی جو معمولاً عام باغوں میں ہوا کرتی ہے کہ ایک سال پھل خوب آتے ہیں اور دوسرے سال کم۔

وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ اور دونوں باغوں کے اندر ہم نے نہر چلا رکھی تھی اور اس شخص کے پاس اور بھی تمول کا سامان تھا۔

فَجَّرْنَا یعنی زمین سے چشمے نکال کر بہا دیئے، تاکہ باغوں میں تر و تازگی اور شادابی باقی رہے۔ لَهٗ ثَمَرٌ ازہری نے کہا ثُمُرٌ بھی جمع ثَمَرٌ ہے اور ثَمَرٌ کی ثِمَارٌ اور ثِمَارٌ کی ثُمُرٌ۔

قاموس میں ہے ثَمَرَةٌ درخت کے پھل اور مختلف انواع کا مال، ثَمَرَةٌ اور ثُمُرَةٌ واحد ہے اس کی جمع ثِمَارٌ ہے اور ثِمَارٌ کی جمع ثُمُرٌ اور ثُمُرٌ کی جمع اَثْمَارٌ۔ سونے چاندی، مویشی اور اولاد کو بھی ثمرۃ کہا جاتا ہے۔

مذکورہ آیت کا مطلب بعض اہل علم نے یہ بیان کیا ہے کہ دو باغوں کے مالک کے پاس باغوں کے علاوہ اور بھی طرح طرح کا بکثرت مال تھا۔ ثَمَرٌ مَالُهٗ اس کا مال بہت ہو گیا۔ مجاہد نے کہا ثمر سے مراد سونا چاندی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے ثُمُر بضم میم جن لوگوں نے پڑھا ہے تو ان کے نزدیک یہ ثَمَرَةٌ کی جمع ہوگی اور مراد ہوں گے درختوں کے پھل جو کھائے جاتے ہیں اور جن لوگوں نے ثُمْر پڑھا ہے ان کے نزدیک طرح طرح کا کثیر مال مراد ہوگا۔

فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

سو اس نے اپنے ساتھی سے دوران گفتگو میں کہا میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور جتھا بھی میرا زبردست ہے۔ یعنی باغوں والے نے نادار مومن سے دوران گفتگو میں کہا، میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور میں نوکروں چاکروں کے اعتبار سے بھی تجھ سے زیادہ باعزت ہوں۔ نَفَر سے مراد ہیں نوکر چاکر خدمت گار۔ بعض نے کہا نرینہ اولاد مراد ہے کیونکہ مومن نے اس کے جواب میں کہا تھا۔ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا اگرچہ تو مجھے اپنے مقابلے میں کم مالدار اور قلیل الاولاد دیکھ رہا ہے۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿۳۵﴾

اور اپنے اوپر جرم قائم کرتے ہوئے اپنے باغ میں پہنچا کہنے لگا میں نہیں خیال کرتا کہ یہ کبھی بھی تباہ ہوگا۔ یعنی اللہ کی طرف سے ڈھیل ملنے، دماغ پر غفلت کے پردے پڑ جانے اور شوق و ہوس کی ہمہ گیری کے سبب وہ خیال کرنے لگا کہ جو کچھ

میرے پاس ہے، وہ زندگی بھر میرے پاس رہے گا، کبھی برباد نہ ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ ان نعمتوں کے ساتھ میں ہمیشہ زندہ رہوں گا کیونکہ کسی کافر کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہو سکتا کہ موت سے ہمیشہ محفوظ رہوں گا کبھی نہیں مروں گا۔ ہاں قول سے مراد اگر دلالت حال لی جائے تو موخر الذکر مطلب بھی ہو سکتا ہے، جو لوگ دنیا اور دنیا کی لذتوں میں غرق ہوتے ہیں ان کے اعمال اور خیالات زبان حال سے پکار کر کہتے ہیں کہ ایسے اعمال و خیالات رکھنے والے اپنی زندگی کو دوامی سمجھے ہوئے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ کبھی موت نہیں آئے گی اور دنیا کی یہ لذتیں ان کو ہمیشہ حاصل رہیں گی۔

وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

اور میں نہیں خیال کرتا کہ قیامت برپا ہونے والی ہے اور بالفرض اگر مرنے اور جی اٹھنے کے بعد مجھے لوٹ کر اپنے رب کی طرف جانا ہی پڑا جیسا کہ تمہارا خیال ہے تو یقیناً اس سے بہتر نتیجہ مجھے (وہاں) ضرور ضرور ملے گا۔

مُنْقَلَبًا، مقام واپسی، نتیجہ، اس کا خیال تھا کہ اللہ کی نظر میں میری عزت زائد ہے اس نے جو کچھ مجھے دیا ہے میری عزت کی وجہ سے دیا ہے اس لئے قیامت کے بعد بھی وہ مجھے ان باغوں سے بہتر مقام و مرتبہ عنایت کرے گا۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾

اس کے مومن ساتھی نے اس کو جواب دیتے ہوئے کہا کیا تو اس خدا کو نہیں مانتا جس نے خاک سے تجھے پیدا کیا پھر (باپ کے) نطفہ سے (پیدا کیا) پھر تجھے پورا ٹھیک مرد بنا دیا۔ مٹی ہر شخص (کے بدن) کا مادہ ہے اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر شخص خاک سے بنایا گیا ہے یا یہ کہ حضرت آدم کا پتلا خاک سے بنایا گیا تھا نطفہ ہر انسان کا مادہ قریب ہے۔ (مٹی سے غذا نباتی و حیوانی پیدا ہوتی ہے اس لئے مٹی بعید مادہ ہے پھر غذا سے خون بنتا ہے خون بھی مادہ بعیدہ ہے پھر خون سے نطفہ اور نطفہ سے انسان، پس نطفہ مادہ قریب ہے۔ مترجم) سَوّٰىكَ تجھے ٹھیک کر کے پورا انسان بنا دیا۔ رَجُلًا یعنی پورا بالغ مرد۔ وجود قیامت میں شک ہونے کی بنیاد ہے اللہ کی قدرت کا انکار تو گویا انکار قیامت حقیقت میں انکار خدا ہے جو شخص اللہ کی قدرت کی ہمہ گیری کو مانتا ہے وہ جانتا ہے کہ جس خدا نے آدمی کو اپنے علم و ارادہ کے ساتھ خاک سے پیدا کیا وہ دوبارہ بھی پیدا کر دے گا۔

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّىْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ لیکن (میں تو کہتا ہوں کہ) اللہ میرا رب ہے میں اس کے ساتھ (عبادت و ربوبیت میں) کسی کو ساجھی نہیں قرار دیتا۔ بقول بغوی، کسائی نے بیان کیا کہ کلام میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے، اصل کلام تھا لٰكِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّىْ اس صورت میں (میں کہتا ہوں کہ) جملہ محذوف ماننے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ) لٰكِنَّا کا الف زائد ہوگا۔

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تھے (اور پھلوں سے لدے درخت تھے) تو مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کیوں نہیں کہا۔ لَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ یعنی داخل ہوتے وقت تم نے کیوں نہیں کہا۔ مَا شَآءَ اللّٰهُ یعنی اللہ جو کچھ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، باغ میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی مشیت سے وابستہ ہے اگر وہ چاہے گا، باقی رکھے گا، باقی رکھنا نہ چاہے گا برباد کر دے گا۔

لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی تو نے اپنی عاجزی اور اللہ کی قدرت کا اقرار کیوں نہیں کیا اور کیوں نہیں کہا کہ اللہ کی مدد کے بغیر میں اس کو محفوظ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا، جو کچھ مجھے اس باغ کو لگانے، پرورش کرنے اور انتظام کرنے کی سہولت حاصل ہوئی ہے وہ اللہ کی توفیق اور اس کی مدد سے حاصل ہوئی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کوئی چیز دیکھی اور اس کے دل کو پسند آئی اور اس نے مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہہ دیا تو پھر اس کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا (نہ نظر لگے گی، نہ غیبی حوادث اس چیز پر آئیں گے) ابن السنی کی روایت میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ اس کو نظر نہیں لگے گی۔

بغوی نے ہشام بن عروہ کی روایت سے بیان کیا کہ عروہ کو جب اپنا کوئی مال پسند آتا اور عجیب معلوم ہوتا تھا یا اپنے کسی باغ میں داخل ہوتے تھے تو کہتے تھے مَاشَآءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ اِلَّابِاللّٰهِ۔

اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا

اگر تو مجھے دیکھ رہا ہے کہ (آج) میں تجھ سے مال و اولاد میں کم ہوں تو امید ہے عنقریب اللہ مجھے تیرے باغ سے بہتر اور بڑھیا چیز عنایت فرمادے اور تیرے باغ پر (تیرے کفر کی وجہ سے) کوئی تقدیری آفت آسمان سے بھیج دے۔

حُسْبَانًا کا ترجمہ قتادہ نے عذاب اور حضرت ابن عباسؓ نے آگ اور قتیبی نے پتھر یا طوفان اور بیضاوی نے کڑک کیا ہے۔ بیضاوی نے کہا حُسْبَان، حُسْبَانَةٌ کی جمع ہے۔ بعض علماء نے اس کو مصدر بمعنی حساب قرار دیا ہے اور حساب سے مراد ہے گناہوں کے برابر عذاب یا تقدیر الٰہی کی بھیجی ہوئی آفت۔

مِّنَ السَّمَآءِ آسمان سے

فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ پھر وہ باغ چٹیل چکنا میدان بن جائے۔ یعنی کوئی درخت اور سبزہ اس میں باقی نہ رہے، صاف میدان ہو جائے۔ مجاہد نے صَعِيْدًا زَلَقًا کا ترجمہ کیا ہولناک ریگستان۔

اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ یا اس کا پانی زمین کے اندر اتنی گہرائی میں چلا جائے کہ تو اس کو تلاش بھی نہ کر سکے (ماننا اور پانا تو دور کنار)

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا اور اس شخص کے (باغ کے) پھلوں یا (سامان تمول) کو آفت نے آگھیرا، پھر اس نے اس باغ پر جو کچھ خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا۔ یعنی عذاب نے اس کے باغ کے پھلوں یا ہر طرح کے مال کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور خلاف امید تباہ کر دیا، اَحَاطَه سے مراد ہے غالب آجانا برباد و تباہ کر دینا، دشمن جب گھیر لیتا ہے تو جو بھی اس کے احاطہ میں آجائے اس پر غالب آجاتا اور تباہ کر دیتا ہے۔

يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ کف افسوس ملنے لگا، ہاتھ پر ہاتھ ملنے لگا یا افسوس و حسرت کے ساتھ ہتھیلیاں اس نے الٹی کر لیں (اور پشت کف کو کاٹنے لگا) تقلیب کفین سے بطور کنایہ مراد ہے، پشیمان ہونا یعنی جو کچھ اس نے باغ میں خرچ کیا تھا اس کے برباد ہو جانے پر وہ (پریشان حسرت زدہ اور) پشیمان ہوا۔

وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا پڑا تھا۔ یعنی انگور کی بیلوں کی چھتریاں زمین پر گر گئیں اس طرح سب بیلیں زمین پر آرہیں (اور سارا انگورستان اجڑ گیا)

وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ اور (قیامت کے دن یا قبر میں جب دیکھے گا کہ اس کا جنتی مقام دوزخ کے مقام سے بدل دیا گیا تو) کہے گا، کاش میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دیتا (یہ ترجمہ مراد ی حضرت مفسرؒ نے کیا ہے۔ مولانا تھانویؒ نے ترجمہ اس طرح کیا ہے اور کہنے لگا کیا خوب ہوتا اگر میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراتا)۔

وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ؕ

اور اس کے پاس کوئی ایسا مجمع نہ ہوا کہ خدا کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود ہم سے بدلہ لے سکا (مولانا تھانویؒ) اور قیامت کے دن عذاب کو دفع کرنے پر قدرت رکھنے والی اس کے لئے اللہ کے سوا کوئی جماعت نہ ہوگی اور نہ وہ تنہا اپنی قوت پر اللہ کے انتقام سے بچ سکے گا۔ (حضرت مفسرؒ)

هُنَالِكَ وہاں اور اس وقت یعنی جب اس کو قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔

الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ مدد کرنا اللہ برحق ہی کا کام ہوگا (مفسرؒ) مدد کرنا اللہ برحق کا ہی کام ہے (مولانا تھانویؒ)

حمزہ اور کسائی کی قرأت اَلْوِلَایَۃُ بکسر واو بمعنی غلبہ آیا ہے اور جمہور کی قرأت اَلْوَلَایَۃُ بفتح واو ہے، جس کا معنی ہے دوستی مدد۔ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں بھی یہی مضمون ولایت (یعنی مدد اور نصرت) ظاہر فرمایا ہے۔ بعض علماء نے کہا وَلَایَتْ کا معنی ہے ربوبیت اور وِلَایَتْ کا معنی ہے حکومت۔

یہ بھی جائز ہے کہ اللہ نے کافر کا یہ قول اسی وقت کا نقل کیا ہو جب اس نے اپنے باغوں کو تباہ دیکھ کر اظہار پشیمانی کیا تھا اور شرک سے توبہ کرلی تھی یا اپنے مومن بھائی کی نصیحت سن کر اور باغ کی اجڑی حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ ساری مصیبت شرک کی وجہ سے آئی ہے۔ یہ حقیقت سمجھ کر اس نے بے اختیار بے تابی کی حالت میں شرک سے بیزاری کا اظہار کردیا (مولانا اشرف علیؒ نے اسی مطلب کے موافق ترجمہ کیا ہے اور شرک سے بیزاری کی تمنا کو اسی وقت اور اسی موقعہ کا قول قرار دیا ہے جب اس کافر نے اپنے سامان تمول کو برباد اور باغ کو اجڑا ہوا دیکھا تھا) یعنی اس موقعہ پر اس اضطراری حالت میں اس کو یقین ہو گیا کہ نصرت یا حکومت اللہ برحق کی ہی ہے۔

ہُوَ خَیْرٌ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ اسی کا ثواب سب سے بہتر اور اسی کا نتیجہ سب سے اچھا ہے۔ ۵ ع ۱۳ ۱۶

یعنی اللہ اپنے اطاعت گذاروں کو سب سے اچھا بدلہ دیتا ہے، کیونکہ دوسرے لوگ جو اطاعت کا دنیا میں بدلہ دیتے ہیں، وہ حقیر اور فنا پذیر ہوتا ہے اور اللہ دنیا میں تو اپنی حکمت کے مطابق اچھا بدلہ دیتا ہی ہے آخرت میں عظیم الشان لازوال ثواب عنایت فرمانے والا ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِیْمًا تَذْرُوْهُ الرِّیٰحُ ؕ اور آپ ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان کیجئے کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا ہو، پھر اس کے ذریعہ سے زمین کی نباتات خوب گنجان ہو گئی ہوں پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے کہ اس کو ہوائیں اڑائے پھرتی ہوں..... یعنی دنیوی زندگی کی رونق اور اس کی زوال پذیری کی کیفیت بیان کردو یا حیات دنیا کی عجیب حالت بیان کرو (مثل کا معنی عجیب کیفیت بھی ہے اور اس حالت کو بھی مثل کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی حالت کے مشابہ ہو خواہ اس میں کوئی ندرت نہ ہو مگر غرض تشبیہ پوری ہو رہی ہو اور مشبہ کی حالت مشبہ بہ کی حالت کے مماثل و مشابہ ہو۔ اس جگہ حیات دنیا اور بارش کے پانی سے پیدا ہونے والے سبزہ کے درمیان مشترک صفت رونق آگینی اور پھر جلد رونق کا فنا ہو جانا ہے۔ مترجم)

فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ یعنی پانی کے سبب زمین کا سبزہ گھنا ہو گیا اور اتنا زیادہ ہوا کہ باہم گتھ گیا یا یہ مطلب ہے کہ پانی نے سبزہ کو متاثر کیا اور سبزہ پانی سے سیر اب و شاداب ہو گیا۔

فَاَصْبَحَ هَشِیْمًا پھر تھوڑی ہی مدت میں سبزہ خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

تَذْرُوْهُ الرِّیٰحُ ابو عبیدہ نے کہا ہوائیں اس کو اِدھر اُدھر منتشر کرنے لگیں۔ آیت میں تشبیہ مفرد بمفرد نہیں ہے نہ پانی مشبہ بہ ہے نہ پانی کی حالت۔ بلکہ مشبہ بہ وہ کیفیت ہے جو مجموعہ سے منتزع ہوتی ہے (یعنی پانی سے سبزہ کا پیدا ہونا گھنا اور شاداب ہونا، پھر خشک ہو جانا اور اس کو ہواؤں کا اِدھر اُدھر اڑائے پھرنا، ان تمام چیزوں سے ایک خاص نمو اور فنا کی کیفیت منتزع ہوتی ہے، اس سے حیات دنیا کی ترقی پذیر اور پھر عنقریب فنا آگیں کیفیت کو تشبیہ دی ہے۔ مترجم)

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ (یعنی قابو پائے ہوئے ہے کامل اقتدار رکھتا ہے۔ مترجم)

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

مال اور اولاد حیات دنیا کی ایک رونق ہے اور جو اعمال صالح باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی بدرجہا بہتر ہیں اور امید کے لحاظ سے بھی سب سے افضل ہیں۔

یعنی وہ مال و اولاد جس پر عیینہ بن حصین اور اس جیسے دوسرے دولت مندوں کو فخر ہے محض دنیوی رونق کی چیزیں ہیں آدمی ان پر فخر کرتا ہے، پھر یہ چیزیں عنقریب فنا ہو جاتی ہیں یہ زاد آخرت نہیں ہیں، لیکن وہ اعمال صالحہ جن کا اچھا نتیجہ دوامی اور غیر فانی ہے وہ اللہ کے نزدیک اس دنیوی مال و اولاد سے ہزاروں درجہ بہتر ہیں اور سب سے بڑی تمنا کے قابل چیز ہے (دنیوی چیزوں کی امید و تمنا فانی کی تمنا ہے اور اعمال صالحہ کے ثواب کی تمنا باقی کی تمنا اور باقی فانی سے بدرجہا افضل ہے۔ مترجم)

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا مال اور اولاد دنیا کی کھیتی ہے اور اعمال صالح آخرت کی کھیتی اور بعض لوگوں کے لئے اللہ دونوں کو جمع کر دیتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، عکرمہ اور مجاہد نے فرمایا، باقیات صالحات سُبْحَانَ اللہ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ اور اَللہُ اَکْبَرُ ہیں۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، باقیات صالحات کو زیادہ پڑھا کرو۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ باقیات صالحات کیا ہیں، فرمایا سُبْحَانَ اللہِ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَللہُ اَکْبَرُ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ۔ پڑھنا۔ رواہ احمد و ابن حبان والحاکم۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ کا ذکر بہت کیا کرو، اس سے ضرر کے ننانوے دروازے بند ہو جاتے ہیں جن میں سے ادنیٰ دروازہ غم ہے۔ رواہ العقیلی۔ عقیلی نے حضرت نعمان بن بشیر کی مرفوع حدیث نقل کی ہے سُبْحَانَ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَاللہُ اَکْبَرُ ہی باقیات صالحات ہیں۔ طبرانی نے اسی طرح کی حدیث حضرت سعد بن عبادہؓ کی روایت سے بھی نقل کی ہے۔

سعید بن جبیر، مسروق اور ابراہیم نخعی کے نزدیک باقیات صالحات سے مراد پنجگانہ نمازیں ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے لیکن دوسری روایت میں آیا ہے کہ باقیات صالحات اعمال صالحہ ہیں، قتادہ کا یہی قول ہے۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۝ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۭ　اور یاد کرو اس دن کو جب ہم پہاڑوں کو ہٹا دیں گے اور آپ زمین کو دیکھیں گے کہ کھلا میدان پڑا ہے اور ہم ان سب کے سب کو (قبروں سے اٹھا کر) جمع کریں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے اور وہ آپ کے رب کے روبرو برابر کھڑے کر کے پیش کئے جائیں گے۔ یعنی ہم پہاڑوں کو اکھاڑ کر خاک بنا دیں گے جو فضا میں اڑی اڑی پھرے گی۔

وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً اور زمین چٹیل میدان کھلی ہوئی صاف نظر آئے گی، نہ اس پر کوئی عمارت ہوگی، نہ پہاڑی، نہ درخت۔ ابن ابی حاتم نے قتادہ کی طرف اس تفسیر کی نسبت کی ہے لیکن عطاء نے بارزۃ کی تشریح میں کہا زمین کا اندرونی حصہ اوپر آجائے گا جو مردے وغیرہ اس کے اندر ہوں گے وہ برآمد ہو جائیں گے۔

وَحَشَرْنٰهُمْ اور ہم لوگوں کو قبروں سے اٹھائیں گے۔ فَلَمْ نُغَادِرْ اور ان میں سے کسی کو قبر سے اٹھائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ غَادَرَ باب مفاعلہ اور غَدَرَ باب ضرب دونوں کا معنی ہے چھوڑ دیا۔ وفاء وعدہ کے ترک کو بھی اسی مناسبت سے غدر کہا جاتا ہے۔

وَعُرِضُوْا جیسے بادشاہ کے سامنے اس کی فوج لائی جاتی ہے، اسی طرح اللہ کے سامنے سب لوگوں کو صف بند شکل میں لایا جائے گا، لیکن بادشاہ کی پیشی معاینہ اور شناخت کے لئے ہوتی ہے، اور اللہ کی پیشی حکم جاری کرنے کے لئے ہوگی۔ صَفًّا یعنی سب ایک قطار میں سامنے آئیں گے، کسی سے کسی کی رکاوٹ نہیں ہوگی، کوئی دوسرے کے سامنے آنے سے مانع نہ ہو سکے گا۔

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ　(دیکھو) آخر تم ہمارے پاس آئے، جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ یعنی جس طرح ہم نے تم کو برہنہ بدن، برہنہ پا، غیر مختون پیدا کیا تھا، پیدائش کے وقت تمہارے پاس دنیا کا مال و دولت کچھ بھی نہ تھا اسی طرح آج نادار، برہنہ، غیر مختون، ہم نے تم کو قبروں سے اٹھایا ہے۔ شیخین نے صحیحین میں اور ترمذی نے سنن میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کھڑے ہوئے

اور فرمایا لوگو تم کو قبروں سے اٹھا کر اللہ کے سامنے برہنہ بدن، برہنہ پا اور غیر مختون حالت میں لے جایا جائے گا، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ پھر سب مخلوق سے پہلے ابراہیم کو لباس پہنایا جائے گا۔

شیخین نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن تم کو برہنہ پا، برہنہ بدن، غیر مختون اٹھایا جائے گا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا مرد بھی ہوں گے، عورتیں بھی۔ کیا ایک دوسرے کو دیکھے گا۔ فرمایا عائشہؓ! اس وقت کا معاملہ بہت سخت ہوگا۔ یعنی کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش ہی نہ ہوگا۔

طبرانی نے الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے اس روایت کے آخر میں ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے کہا یہ تو بڑی خرابی ہوگی، ہم میں سے بعض بعض کو برہنہ دیکھیں گے۔ فرمایا لوگ اپنے ہی شغل میں ہوں گے۔ حضرت ام سلمہؓ نے کہا وہ کس شغل میں ہوں گے، فرمایا اعمال نامے کھول کر سامنے لائے جائیں گے جن کے اندر چھوٹی چیونٹی کے برابر اور رائی کے دانہ کے برابر بھی اعمال کا اندراج ہوگا۔ بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بی بی نے کہا، ہم میں سے بعض بعض کی برہنگی کو دیکھیں گے، فرمایا، اری اس روز ہر شخص اپنے ہی حال میں ہوگا جو (دوسرے کی طرف دیکھنے سے) اس کو بے نیاز بنائے ہوگا۔

طبرانی نے حضرت سہیل بن سعد کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔ اور حضرت امام حسن کی روایت سے مرفوعاً یہ حدیث آئی ہے جس میں مذکور ہے کہ بی بی کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا ہم میں سے بعض بعض کو کیسے دیکھیں گے، آنکھیں تو پھٹی ہوئی اوپر کی طرف حیرت سے دیکھ رہی ہوں گی، یہ بیان کرتے وقت حضور ﷺ نے اپنی نظر اوپر کی طرف اٹھائی۔

طبرانی اور بیہقی نے حضرت سودہ بنت زمعہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں کو برہنہ پا، برہنہ بدن، غیر مختون اٹھایا جائے گا، پسینہ کا سیلاب کسی کے منہ تک لگام کی طرح آیا ہوگا اور کسی کے کانوں کی لو تک۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو بڑی خرابی ہوگی، ہم میں سے ایک دوسرے کو برہنہ دیکھے گا، فرمایا لوگ اپنی ہی حالت میں مبتلا ہوں گے ان کی اپنی حالت دوسرے کی طرف دیکھنے نہ دے گی، اس روز ہر شخص اپنے ہی حال میں ہوگا جو دوسرے کی طرف دیکھنے سے اس کو بے نیاز بنائے ہوگا۔

قرطبی نے لکھا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی تو حدیث میں آیا ہے کہ مردے اپنی قبروں میں کفن پہنے ہوئے باہم ملاقات کرتے ہیں اور احادیث مذکورہ میں برہنہ اٹھائے جانے کی صراحت ہے دونوں میں کھلا ہوا تعارض ہے۔ لیکن حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں احادیث مذکورہ میں قیامت کے دن برہنہ اٹھایا جانا مذکور ہے اور اس حدیث کے اندر عالم برزخ میں کفن پوش ہونے کی حالت میں باہم ملاقات کا تذکرہ ہے۔ بالا احادیث مذکورہ بالا کا تعارض مندرجہ ذیل احادیث سے ضرور ہوتا ہے۔

ابوداؤد، حاکم، ابن حبان اور بیہقی نے بیان کیا کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے نئے کپڑے طلب فرما کر پہنے اور فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا آپ فرما رہے تھے جن کپڑوں میں مردہ مرتا ہے انہی کپڑوں میں اس کو اٹھایا جائے گا۔

ابن ابی الدنیا نے حسن سند سے بیان کیا کہ حضرت معاذ بن جبل نے اپنی ماں کو نئے کپڑوں کا کفن دے کر دفن کیا اور فرمایا اپنے مردوں کو اچھے کفن دیا کرو کیونکہ انہی (کفن کے کپڑوں میں) ان کو اٹھایا جائے گا۔

سعید بن منصور نے سنن میں بیان کیا کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا، اپنے مردوں کو اچھے کفن دیا کرو کیونکہ قیامت کے دن انہی (کفن کے کپڑوں) میں ان کو اٹھایا جائے گا۔ قرطبی نے کہا کچھ علماء نے تو ان احادیث کے ظاہر (یعنی حکم کے عموم) کا اعتبار کیا ہے اور ہر مردہ کو اچھا کفن دینے کا حکم دیا ہے۔ بعض نے ان احادیث کے حکم کو شہیدوں کے ساتھ مخصوص مانا ہے کیونکہ شہیدوں کو انہی کپڑوں میں دفن کرنے کا حکم ہے جن کو پہنے ہوئے وہ شہید ہوئے ہوں۔ حضرت ابو سعیدؓ نے (سمجھنے میں

کچھ غلطی کی) شہید کے متعلق حکم سنا اور عام لوگوں کے واسطے عمومی حکم سمجھ گئے۔

بیہقی نے مختلف روایات کے اختلاف کو دور کرنے کے لئے کہا کہ بعض کو برہنہ اٹھایا جائے گا، اور بعض کو کپڑے پہنے ہوئے۔ میں کہتا ہوں یہ تاویل اچھی ہے۔ رہی آیت مذکورہ بالا تو یہ صرف کفار کے لئے ہے کیونکہ آگے جملہ میں کفار ہی کو خطاب کیا گیا ہے۔

بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ۝ بلکہ تم یہی سمجھتے رہے کہ ہم تمہارے لئے کوئی وقت موعود نہیں لائیں گے۔

مَّوْعِدًا وعدہ حشر پورا کرنے کا وقت۔ لفظ بَلْ اس جملہ میں انتقال بیان کو ظاہر کر رہا ہے۔ ایک بیان سے دوسرے بیان کی طرف منتقل ہونے کا اظہار لفظ بَلْ سے ہو رہا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ برہنہ حالت میں اٹھایا جانا ان لوگوں کے لئے مخصوص ہوگا جو صلحاء نہ ہوں کافر ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے اَلْاَبْصَارُ شَاخِصَةٌ (نظریں اوپر کو اٹھی ہوں گی) فرمایا اور اللہ نے فرمایا لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ دونوں جگہ کافر ہی مراد ہیں خوف کی وجہ سے آنکھوں کا پھٹ جانا اور اوپر کو حیرت سے دیکھتے رہنا کفار کی، خصوصیت ہوگی صلحاء کا یہ حال نہ ہوگا۔ البتہ یہ شبہ اس تاویل کے باوجود باقی رہتا ہے کہ اگر صلحاء عریاں نہیں اٹھیں گے تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ سب مخلوق سے پہلے ابراہیم کو لباس پہنایا جائے گا، اس کے ازالہ کے لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس حدیث میں قبر سے برآمد ہونے سے پہلے کی حالت کو ظاہر کیا گیا ہے قبروں کے اندر صلحاء کو عزت افزائی کے لئے لباس پہنا دیا جائے گا اور حضرت ابراہیمؑ کو سب سے پہلے پہنایا جائے گا۔ یہ جواب ضعف سے خالی نہیں۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ مردہ کو اسی لباس میں اٹھایا جائے گا جس میں وہ مرنے کے وقت ہوگا اس حدیث میں لباس سے مراد اعمال ہیں یعنی مرتے وقت جو عملی حالت اس کی ہوگی، اسی حالت پر اس کو اٹھایا جائے گا۔ دیکھو اللہ نے آیت وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ میں تقویٰ کو لباس فرمایا ہے۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ اور اعمال نامے رکھے جائیں گے۔ الکتاب میں الف لام جنسی ہے (جس کا اطلاق کثیر پر بھی ہوتا ہے اور یہاں کثیر ہی مراد ہیں) لوگوں کے دائیں یا بائیں ہاتھوں میں یا میزان میں یا اللہ کے سامنے اعمال نامے رکھ دیئے جائیں گے۔

فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا

پھر آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہوگا اس سے ڈرتے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی اس نامہ اعمال کی عجیب حالت ہے کہ بغیر لکھے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا۔

الْمُجْرِمِيْنَ یعنی وہ لوگ جن کے بائیں ہاتھوں میں اعمال نامے دیئے جائیں گے۔

مِمَّا فِيْهِ ان گناہوں سے جو اعمال نامے میں لکھے ہوں گے۔

يٰوَيْلَتَنَا ویل، بمعنی ہلاکت وہ اپنی خاص ہلاکت کو پکاریں گے، پکارنے کا مقصد موت کو بلانا نہیں ہوگا بلکہ بے قراری کا اظہار اور دوسروں کو اپنے اوپر نازل ہونے والی مصیبت سے آگاہ کرنا مقصود ہوگا۔

مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ یہ سوال (حقیقۃً استفہام کے لئے نہ ہوگا بلکہ) اظہار تعجب کے لئے ہوگا۔

لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا صغیرہ (بے جا) تبسم اور کبیرہ قہقہہ۔ سعید بن جبیر نے کہا صغیرہ (نامحرم کا) چھولینا و بوسہ لینا اور کبیرہ زنا ہے۔ دونوں بزرگوں نے صغائر و کبائر کی مثالیں دی ہیں ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس آیت کی یہی تفسیر ہے۔ سورۂ نساء کی آیت اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ کی تفسیر

میں ہم نے کبائر کی تفصیل کر دی ہے۔

اِلَّاۤ اَحۡصٰىهَا ۚ مگر اعمالنامے نے اس کی گنتی کر رکھی ہے، اس کا احاطہ کر لیا ہے یعنی کسی چھوٹے بڑے گناہ کو بغیر احاطہ کئے نہیں چھوڑا۔ حضرت سہل بن سعد کا بیان ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان گناہوں سے بھی بچو جن کو حقیر سمجھا جاتا ہے، حقیر گناہوں کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگ کسی وادی کے اندر اترے ہوں پھر کوئی ایک لکڑی لائے، کوئی دوسری لکڑی (اور ان حقیر لکڑیوں کو جمع کر کے) لوگ روٹی پکالیں (مقصد یہ کہ حقیر اور چھوٹے گناہوں کا مجموعہ بڑا ہو جاتا ہے) حقیر گناہ (بھی) ہلاک کرنے والے کبائر (ہو جاتے) ہیں۔ رواہ البغوی۔ طبرانی نے حضرت سعد بن عبادہ کا بیان نقل کیا ہے، حضرت سعدؓ نے فرمایا جب رسول اللہ ﷺ حنین سے فارغ ہو گئے (اور واپس ہوئے) تو ہم ایک ویران بے آب و گیاہ مقام پر اترے جہاں کچھ بھی نہ تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کو جو چیز بھی ملے وہ لے آئے یا جس کے پاس جو چیز موجود ہو وہ لے آئے، تھوڑی دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ ہم نے (تھوڑا تھوڑا لا کر) ڈھیر کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم اس کو دیکھ رہے ہو جس طرح تم نے (تھوڑا تھوڑا) جمع کر کے یہ ڈھیر کر دیا اسی طرح آدمی پر (چھوٹے چھوٹے) گناہوں کا اجتماع ہو جاتا ہے۔ اس لئے تم میں سے ہر شخص پر لازم ہے کہ اللہ سے ڈرے اور چھوٹا بڑا کوئی گناہ نہ کرے (اور سمجھ رکھے کہ) ہر گناہ شمار کر کے اس کے ذمے قائم رکھا جاتا ہے۔

نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جن گناہوں کو حقیر سمجھا جاتا ہے ان سے بھی بچو کیونکہ اللہ کی طرف سے ان کا مطالبہ کرنے والا بھی (قیامت کے دن) ہوگا۔

بخاری نے بیان کیا کہ حضرت انسؓ نے فرمایا تم لوگ کچھ ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نظروں میں بال سے زیادہ باریک اور حقیر ہوتے ہیں، اور ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ان کو ہلاکت انگیز گناہوں میں شمار کرتے تھے، امام احمد نے بھی صحیح سند سے ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ؕ اور جو کچھ انہوں نے کیا ہوگا (اعمالناموں میں لکھا ہوا) موجود پائیں گے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تمام اعمال کا بدلہ پائیں گے۔

وَلَا يَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ع ۱۸

یعنی بن کیا کوئی گناہ نہیں لکھتا یا عمل کے موافق سزا میں اضافہ نہیں کرتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں کی تین پیشیاں ہوں گی دو پیشیاں تو جھگڑنے اور اپنے اپنے عذر پیش کرنے کی ہوں گی اور تیسری پیشی وہ ہوگی کہ اعمال نامے اڑ کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے کوئی دائیں ہاتھ سے اعمال نامے کو لے گا کوئی بائیں ہاتھ سے۔ ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت سے اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کے حوالہ سے موقوفاً بیان کی ہے۔ حکیم ترمذی نے کہا پہلی پیشی جھگڑے کے لئے ہوگی۔ یعنی بندے اپنے گناہوں سے بری ہونے کے لئے جھگڑے کریں گے، وہ رب سے واقف نہیں ہوں گے اس لئے جھگڑے کریں گے اور خیال کریں گے کہ اس طرح ہم حجت پیش کرنے میں غالب ہو جائیں گے اور سزا سے بچ جائیں گے، دوسری پیشی میں اللہ کی طرف سے حضرت آدمؑ اور دوسرے انبیاءؑ کے سامنے اتمام حجت کیا جائے گا اور دشمنوں کو عذاب دینے کی حقانیت ثابت ہو جائے گی اور اللہ ان کو دوزخ میں بھیج دے گا اور تیسری پیشی صرف مومنوں کی ہوگی جو ان کی مغفرت کے لئے ہوگی البتہ تنہائی میں اللہ ان کو طلب کر کے کچھ زیادہ سرزنش کر دے گا۔ مومن کو (اپنا گناہ دیکھ کر) بڑی شرم آئے گی اور خجالت کا مزہ چکھے گا پھر اللہ ان کو معاف کر دے گا اور ان سے راضی ہو جائے گا۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام اعمال نامے عرش کے نیچے جمع ہوتے ہیں جب میدان قیامت ہوگا اور لوگ کھڑے ہوں گے تو اللہ ایک ہوا بھیج دے گا جو اعمال ناموں کو اڑا کر لائے گی اور دائیں بائیں ہاتھوں میں پہنچا دے گی۔ سب سے اول اعمالنامہ میں یہ تحریر ہوگی۔ اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا۔ ابن جریر نے لکھا

ہے کہ قتادہ نے بیان کیا جو شخص دنیا میں پڑھا نہ ہو گا وہ بھی اس وقت نامہ اعمال پڑھ لے گا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ　اور یاد کرو اس واقعہ کو جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو، سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے۔ قرآن مجید میں مختلف متعدد مقامات پر مختلف مقاصد کی تمہید کے طور پر فرشتوں کو آدم کے لئے سجدہ کرنے کا حکم اور ملائکہ کا سجدہ کرنا اور ابلیس کا انکار کرنا بیان کیا گیا ہے۔ اس جگہ بھی خاص مقصد کے لئے اس واقعہ کا تذکرہ کیا (مال دنیا اور شرافت نسب اور عزت قومی پر) فخر کرنے والوں کی جب آیات مذکورہ بالا میں مذمت کی اور ان کی اس حرکت کو ناپسندیدہ قرار دیا تو اس کو پختہ کرنے کے لئے ابلیس کے انکار اور فرشتوں کی تعمیل امر کا تذکرہ کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں غرور کرنا ابلیس کی حرکت ہے یا یوں کہا جائے کہ پہلے ان لوگوں کا ذکر کیا جو دنیا کے شیفتہ اور فریفتہ ہیں اور اس فریب خوردگی کا سبب ہوائے نفس اور اغواء ابلیسی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے دنیوی جمال ظاہری کی طرف سے ان کو نفرت دلائی اور اس کی فناپذیری و ناپائیداری کی طرف اشارہ کر کے اعمال صالحہ کی پائیداری و بقاء کو ظاہر فرمایا، پھر قدیمی دشمنی کا ذکر کر کے شیطان کے اغواء سے بچنے کی دور پر وہ ہدایت کی۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر سجدہ ملائکہ اور انکار ابلیس کا بار بار تذکرہ اسی حکمت کا حامل ہے۔

كَانَ مِنَ الْجِنِّ　وہ تھا جنات میں سے یعنی اس نے سجدہ نہیں کیا اس لئے کہ وہ جنات میں سے تھا۔

فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ　پس وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل اور اس کی اطاعت سے باہر ہو گیا۔ لفظ امر بتا رہا ہے کہ ابلیس بھی ملائکہ کے ساتھ سجدہ کرنے پر مامور تھا۔ فَفَسَقَ میں فاء سببیت کے لئے ہے (یعنی ابلیس کا جنات میں سے ہونا نافرمانی کا سبب تھا۔ مترجم) اس لفظ سے (بطور مفہوم مخالف) یہ بات ظاہر ہوتی کہ فرشتے اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے، ابلیس نے جو نافرمانی کی اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جنات میں سے تھا۔ (ملائکہ میں سے نہ تھا)

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ابلیس ملائکہ کے ہی ایک گروہ میں تھا اس گروہ کو جن کہا جاتا تھا، اور اس کی تخلیق لپٹ والی آگ سے ہوئی تھی۔ اس قول پر إِلَّا إِبْلِيسَ میں استثناء متصل ہو گا۔ (کیونکہ ابلیس نوع ملائکہ سے قرار پائے گا۔ مترجم) حسن بصری نے کہا ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا جنات میں سے تھا اور جس طرح آدم تمام انسانوں کی اصل ہیں اسی طرح ابلیس تمام جنات کی اصل تھا اس قول پر استثناء منقطع ہو گا لیکن یہ قول بہت بعید از عقل ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ میں نے جن و انس کو اپنی عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ یہ آیت اور سورۂ رحمٰن اور سورۂ جن کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرح کچھ جن مومن صالح ہیں اور کچھ ظالم، کافر، جہنم کا ایندھن اور ابلیس اور اس کی نسل کے تمام افراد اعداء خدا ہیں اور اعداء اولیاء خدا ہیں پھر ابلیس تمام جنات کی اصل کیسے ہو سکتا ہے۔

أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ　اس پر بھی کیا تم لوگ اس کو اور اس کی ذریت کو میرے سوا (اپنا) رفیق دوست بناتے ہو حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں۔ استفہام انکاری ہے یعنی تم کو ایسا نہ کرنا چاہئے کہ اپنے کھلے ہوئے دشمنوں کو میرے بجائے اپنا دوست قرار دو اور میری اطاعت کی جگہ ان کی اطاعت کرو۔

بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا　یہ ظالموں کے لئے بہت برا بدل ہے۔

یعنی کافروں نے جو اللہ کے بجائے ابلیس اور اس کی ذریت کو دوست بنا رکھا ہے تو اللہ کے عوض کافروں کا ابلیس اور اس کی ذریت کو اختیار کرنا برا بدل ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد نے شعبی کا بیان نقل کیا، شعبی نے کہا میں ایک روز بیٹھا ہوا تھا ایک قلی آیا اور اس نے مجھ سے دریافت کیا کیا ابلیس کی بیوی ہے، میں نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں، لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ اللہ نے فرمایا ہے أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ اور اولاد بغیر بی بی کے ہو نہیں سکتی (کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ اللہ کے اولاد کہاں سے ہو سکتی ہے جب کہ اس کی بی بی نہیں ہے (مفسر رحمۃ اللہ) یہ یاد آنے کے بعد میں نے کہہ دیا

ہاں (ابلیس کی بی بی ہے)

قتادہ نے کہا شیاطین میں آدمیوں کی طرح توالد و تناسل ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے بیان کیا کہ ابلیس خود اپنی دم اپنے دبر میں داخل کر لیتا ہے اس سے انڈا پیدا ہو جاتا ہے اور ایک انڈا پھٹ کر شیطانوں کی ایک جماعت نکل پڑتی ہے۔

مجاہد نے کہا ابلیس کی اولاد میں سے مندرجہ ذیل شیطان ہیں۔ لاقیس، ولہان، ہفاف، مرہ، زلنبور، اعور، مطوس، بثور، داسم۔ ولہان وضو، غسل اور نماز میں وسوسہ پیدا کرتا ہے۔ مرہ ہی کے نام سے ابلیس کی کنیت ابومرہ مشہور ہے۔ زلنبور بازاروں میں جھوٹی قسمیں کھلواتا اور صاحب مال سے مال کی جھوٹی تعریف کراتا ہے۔ اعور زنا پر آمادہ کرنے والا شیطان ہے۔ مرد کے عضو تناسل اور عورت کے سرینوں میں پھونک مارتا ہے۔ مطوس جھوٹی بے اصل افواہیں لوگوں میں پھیلاتا ہے۔ بثور مردہ کے وارثوں کو منہ پیٹنے اور گریبان پھاڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ داسم وہ شیطان ہے کہ آدمی جب گھر میں جاتا ہے اور کسی کو سلام نہیں کرتا اور اللہ کا ذکر بھی نہیں کرتا تو شیطان اس آدمی کو گھر کی ہر چیز بے محل رکھی ہوئی دکھاتا ہے (جس سے آدمی کو غصہ آجاتا ہے اور وہ گھر والوں کو سخت سست کہنے لگتا ہے) اور بغیر بسم اللہ کئے آدمی کھانے لگتا ہے تو داسم بھی اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتا ہے۔ اعمش نے کہا بعض اوقات میں بغیر بسم اللہ کے گھر میں داخل ہوا اور اندر جا کر کسی کو سلام بھی نہیں کیا تو مجھے (بے جگہ رکھا ہوا) لوٹا نظر آیا میں نے کہا اس کو یہاں سے اٹھاؤ پھر گھر والوں سے جھگڑا کرنے لگا لیکن پھر مجھے یاد آگیا اور میں نے کہا یہ داسم ہے، داسم ہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وضو (میں بہکانے والا) ایک شیطان ہے جس کو ولہان کہا جاتا ہے تم لوگ پانی (کے استعمال) کے وسوسے سے بچتے رہو۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔ اہل حدیث کی نظر میں اس کی سند قوی نہیں ہے۔ خارجہ بن مصعب راوی ضعیف ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ حضرت عثمان بن ابی العاصؓ نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ شیطان میرے اور میری نماز و قرأت کے درمیان دخل انداز ہو جاتا ہے اور نماز کو مشتبہ بنا دیتا ہے (مجھے یاد نہیں رہتا کہ میں نے کتنی رکعتیں پڑھیں) فرمایا یہ شیطان ہے جس کو خنزب کہا جاتا ہے جب تم ایسا محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگو (یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھو) اور بائیں طرف کو تین بار تھتکار دو۔ حضرت عثمانؓ کا بیان ہے، میں نے اس کے بعد ایسا ہی کیا اور اللہ نے اس کو مجھ سے دور کر دیا۔ رواہ مسلم۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے پھر وہاں سے اپنے دستوں کو (اطراف عالم میں) روانہ کرتا ہے۔ ابلیس کا سب سے بڑا مقرب وہی ہوتا ہے جو سب سے زیادہ فتنہ انگیز ہو۔ کوئی آکر کہتا ہے میں نے یہ یہ کام کئے۔ ابلیس کہتا ہے تو نے کچھ نہیں کیا پھر ایک شیطان آتا ہے اور کہتا ہے میں نے میاں بی بی میں علیحدگی کرا دی، ابلیس کہتا ہے تو نے اچھا کام کیا پھر اس کو اپنا مقرب بنا لیتا ہے۔ اعمش کا بیان ہے میرا خیال ہے راوی نے یہ بھی کہا، پھر ابلیس اس کو چمٹا لیتا ہے۔ رواہ مسلم۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ میں نے ان کو (یعنی ابلیس اور اس کی ذریات کو) نہ آسمان و زمین کے پیدا کرنے کے وقت بلایا اور نہ خود ان کو پیدا کرنے کے وقت۔

مقصد یہ ہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنے میں، میں نے ان سے مدد نہیں لی کہ وہ عبادت و اطاعت کے مستحق ہو جائیں۔ عبادت کا استحقاق اسی کو ہو سکتا ہے جو خالق ہو اور عبادت میں شرک کا معنی یہ ہے کہ خالقیت میں شرکت ہو اور خالقیت میں اللہ کے ساتھ کسی کی شرکت نہیں تو معبودیت میں کون اس کا شریک ہو سکتا ہے۔

وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝ اور میں ایسا (عاجز) نہ تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا بازو (یعنی مددگار) بناتا۔

اَلْمُضِلِّيْنَ (گمراہ کرنے والے) سے مراد ہیں شیاطین۔ عَضُدًا (بازو) یعنی مددگار۔

اَلْمُضِلِّيْنَ صراحت کے ساتھ کہا ضمیر غائب ذکر نہیں کی اس سے شیاطین کی مذمت کا اظہار ہو رہا ہے۔

بعض علماء نے کہا مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ میں ہُمْ ضمیر (شیاطین کی طرف راجع نہیں) مشرکوں کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی مشرکوں کو میں نے تخلیق اشیاء کا شاہد نہیں بنایا اور وہ علم عطا نہیں کیا جو دوسروں کو نہ دیا ہو۔ پھر ان کی خصوصیت ہی کیا ہے اگر ان کو خصوصی علم عطا کیا گیا ہوتا تو اس وقت یہ کہہ سکتے تھے کہ اگر ہم مسلمان ہو گئے تو سب لوگ مسلمان ہو جائیں گے (اب تو ان کا یہ دعویٰ ہی غلط ہے) اس لئے آپ ان کے قول کی طرف کوئی توجہ نہ دیں اور ان سے دین میں مدد کرنے کی امید ہی نہ رکھیں۔ میں اپنے دین کا مددگار ایسے گمراہ کرنے والوں کو بنانے والا نہیں۔

کلبی نے کہا ہُمْ ضمیر ملائکہ کی طرف راجع ہے یعنی میں نے ملائکہ کو تخلیق عالم میں شریک نہیں کیا تھا کہ ان کی پوجا کی جانے لگے اور ان کو اللہ کی بیٹیاں سمجھا جانے لگے۔ اس صورت میں وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا علیحدہ جملہ ہوگا اور اس دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے تخلیق عالم میں شیاطین سے مدد نہیں لی تھی۔ خلاصہ یہ کہ نہ میں نے ملائکہ سے مدد لی، نہ شیاطین سے۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا

جس روز اللہ فرمائے گا پکارو میرے ان (مفروضہ) شریکوں کو جن کو تم (میرے شریک) خیال کرتے تھے وہ ان کو پکاریں گے لیکن وہ ان کو جواب ہی نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک آڑ کر دیں گے۔

زَعَمْتُمْ یعنی تم گمان کرتے تھے کہ وہ میرے شریک ہیں یا سفارش کر کے میرے عذاب سے تم کو بچالیں گے۔ بعض علماء کے نزدیک شُرَكَآءِيَ سے مراد ہیں ابلیس اور اس کی ذریات۔

فَدَعَوْهُمْ پس وہ ان کو فریادرسی کے لئے پکاریں گے۔

فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ لیکن وہ فریادرسی نہیں کریں گے۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ اور ہم کافروں اور ان کے معبودوں کے درمیان کر دیں گے۔

مَّوْبِقًا ہلاکت کا مقام اَوْبَقَهٗ اس کو ہلاک کر دیا۔ عطاء اور ضحاک نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مَوْبِق دوزخ کی ایک وادی کا نام ہے۔ مجاہد نے کہا گرم پانی کی ایک وادی ہے۔ عکرمہ نے کہا مَوْبِق آگ کا ایک دریا ہے جس میں آگ بہتی ہے اس کے کناروں پر سیاہ خچروں کے برابر سانپ ہیں۔ ابن الاعرابی نے کہا دو چیزوں کے درمیان جو چیز آڑ اور حاجب ہو اس کو مَوْبِق کہتے ہیں۔

بعض کے نزدیک مَوْبِق مصدر ہے۔ فراء نے کہا بَيْن کا معنی ہے وصل یعنی دنیا میں جو کافروں اور ان کے معبودوں کے درمیان ملاپ اور جوڑ تھا قیامت کے دن ہم اس کو ہلاکت بنا دیں گے۔ یہی مضمون دوسری آیت میں آیا ہے لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ تمہارا باہمی اتصال پارہ پارہ ہو گیا۔

ع ۱۹ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا

اور اس وقت مجرم دوزخ کو دیکھیں گے پھر یقین کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور اس سے کوئی بچنے کی راہ نہیں پائیں گے۔

اَلْمُجْرِمُوْنَ سے مراد ہیں مشرک۔ فَظَنُّوْٓا یعنی وہ یقین کر لیں گے۔ مُّوَاقِعُوْهَا یعنی اس کے اندر گرنے والے ہیں۔

امام احمد نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا کی تشریح میں فرمایا، کافر کو پچاس ہزار برس کے بقدر (یعنی قیامت کے سارے دن) کھڑا رکھا جائے گا جیسے کہ دنیا میں اس نے کچھ کیا ہی نہ تھا اور

وہ جہنم کو دیکھتا رہے گا اور چالیس برس کی مسافت سے بھی یہی خیال کرے گا کہ میں دوزخ میں گرا جا رہا ہوں۔ مَصْرِفًا مصدر ہے لوٹنا، واپس ہونا یا اسم ظرف ہے یعنی کوئی ایسا مقام جس کی طرف وہ لوٹ سکیں (اور دوزخ سے بچ جائیں)

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے واسطے ہر قسم کے (ضروری) عمدہ مضامین طرح طرح سے بیان کیے ہیں اور اس پر بھی انسان جھگڑا کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے۔

بقول حضرت ابن عباسؓ اَلْاِنْسَانُ سے مراد ہے نضر بن حارث اور بر قول کلبی ابی بن خلف جمحی۔ بعض کے نزدیک عام کافر مراد ہیں اللہ نے دوسری جگہ فرمایا ہے وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ۔ بعض کے نزدیک عام انسان مراد ہیں (کافر ہوں یا مومن) حضرت علیؓ کا بیان ہے ایک رات رسول اللہ ﷺ میرے اور اپنی صاحبزادی کے پاس آپہنچے اور فرمایا تم دونوں رات کو نماز نہیں پڑھتے ہو (یعنی تہجد کی نماز یا نفل نماز) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہماری جانیں اللہ کے قبضہ میں ہیں۔ وہ جب ہم کو اٹھانا چاہتا ہے ہم کو اٹھا دیتا ہے۔ میری اس گزارش کے بعد رسول اللہ ﷺ واپس چلے گئے، مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور پشت پھیری ہی تھی کہ میں نے سنا کہ ران پر ہاتھ مار کر فرما رہے تھے، وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾

اور لوگوں کے بعد اس کے کہ ان کو ہدایت پہنچ چکی ایمان لانے سے اور اپنے پروردگار سے (گناہوں کی اور کفر کی) معافی مانگنے سے اور کوئی مانع نہیں رہا بجز اس کے کہ ان کو انتظار ہو کہ گزرے ہوئے لوگوں کا سا معاملہ ان کو بھی پیش آجائے یا اللہ کا عذاب ان کے سامنے آکھڑا ہو۔

اَلْهُدٰى سے مراد ہے قرآن اور اسلام اور اللہ کی طرف سے بیان۔ بعض کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی ذات مراد ہے یعنی حق واضح ہونے کے بعد۔

سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ یعنی اللہ کے عذاب کا وہ طریقہ جو گزشتہ کافروں کے لئے استعمال کیا گیا کہ ان کی جڑ اکھڑ گئی۔ قُبُلًا کا ترجمہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک ہے رو در رو، آمنے سامنے۔ مجاہد نے ترجمہ کیا ناگہانی۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ

اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر (ثواب و جنت کی مومنوں کے لئے) بشارت دینے والے اور (کافروں کو عذاب دوزخ سے) ڈرانے والے (بنا کر) یعنی پیغمبروں کو ہم نے اس بات پر قادر بنا کر نہیں بھیجا کہ کافر جو معجزات طلب کریں وہ پیش کر دیں یا یہ مطلب ہے کہ ہم نے پیغمبروں کو اس امر پر قادر بنا کر نہیں بھیجا کہ وہ ساری مخلوق کو ہدایت یافتہ بنا دیں۔

وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ ۖ

اور کافر لوگ ناحق کی باتیں پکڑ پکڑ کر جھگڑے نکالتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے حق بات کو بچلا دیں۔

مثلاً کافر کہتے ہیں أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا کیا اللہ نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے مَا أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تم تو ہم جیسے انسان ہی ہو اس کے سوا کچھ نہیں۔ لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً اگر اللہ چاہتا تو (ہدایت کے لئے) فرشتوں کو اتار دیتا۔ لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ یہ قرآن ان دونوں بستیوں (مکہ و طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا۔ یہ بھی کافروں نے کہا تھا کہ تم جو ذبح کرتے ہو وہ ذبیحہ تو حلال ہو اور جس کو اللہ (تمہارے ذبح کے بغیر) مار ڈالتا ہے وہ حرام ہو۔ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ (دحض پھسل جانا اور ادحاض (باب افعال) پھسلا دینا یعنی باطل کے ذریعہ سے جھگڑا کر کے حق کو اس کی جگہ سے مٹا دیں۔

وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنذِرُوا هُزُوًا ﴿٥٦﴾

اور انہوں نے میری آیتوں کو اور جس عذاب سے

ان کو ڈرایا گیا تھا اس کو دل لگی بنا رکھا ہے۔

آیات سے مراد ہیں وہ آیات جو قرآن میں نازل کی گئی ہیں۔ ہُزُوًا دل لگی کی چیز مثلاً کہتے ہیں لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کہہ لیں۔ یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ کوئی آدمی ان کو سکھا دیتا ہے۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ اگلوں کی داستانیں ہیں۔ عذاب کے متعلق کہتے تھے لَوْلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ہمارے قول پر اللہ ہم پر عذاب کیوں نہیں بھیج دیتا۔ زقوم کے متعلق کہتے تھے یہ تو عمدہ چھوارے اور مکھن کو کہتے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِیَ مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُ ؕ

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی گئی اور اس نے آیات سے منہ پھیر لیا اور جو کچھ وہ پہلے کر چکا ہے اس (کے نتیجہ) کو بھول گیا۔ یعنی اس شخص سے بڑھ کر اور کوئی ظالم نہیں جس کو قرآن کی آیات سے نصیحت کی گئی اور آیات کے الفاظ و معانی کا معجزہ ہونا اس پر واضح ہو گیا۔ پھر بھی اس نے آیات پر غور نہیں کیا اور نصیحت پذیر نہ ہوا اور جو گناہ پہلے کر چکا ہے اس کے انجام کو نہیں سوچا (سب کو بھلا بسرا کر دیا)

اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَی الْهُدٰی فَلَنْ یَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا (۵۷) ہم نے اس (حق بات) کے سمجھنے سے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اور (اس کے سننے سے) ان کے کانوں میں ڈاٹ دے رکھی ہے اور (یہی وجہ ہے کہ) اگر آپ ان کو راہ راست کی طرف بلائیں تو ایسی حالت میں وہ ہرگز کبھی راہ راست پر نہیں آئیں گے۔

اِنَّا جَعَلْنَا یہ منہ موڑنے اور بھولنے کی علت و سبب کا بیان ہے کہ ان کے دلوں پر کفر کی تاریکیوں کے پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔ ان کی تخلیق ہی کفر پر ہوئی ہے۔ اَنْ یَّفْقَهُوْهُ آیات رب کو سمجھنے سے کفر کے پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔ یعنی تاریکی کے پردے ڈالنے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سمجھ نہیں پاتے، سمجھ نہیں سکتے۔ آیات رب سے مراد چونکہ قرآن ہے۔ اس لئے ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ذکر کی۔

وَقْرًا بوجھ، گرانی۔ مراد یہ ہے کہ ان کے کانوں میں پورے طور پر سننے کی صلاحیت ہی ہم نے نہیں عطا کی۔ اِذًا اس وقت یعنی جب دلوں پر پردے ڈال دیئے اور کانوں میں گرانی پیدا کر دی تو ایسے وقت میں وہ ہرگز ہدایت یاب نہیں ہو سکتے۔ ہدایت یابی کی استعداد و صلاحیت ہی معدوم ہے۔ اس آیت میں وہ کافر مراد ہیں جن کا کبھی بھی ایمان نہ لانا اللہ کے علم میں تھا۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ یُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ یَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا (۵۸) اور آپ کا رب بڑا مغفرت کرنے والا ہے، رحمت والا ہے اگر ان سے ان کے اعمال پر دار و گیر کرنے لگتا تو ان پر فوراً ہی عذاب واقع کر دیتا (مگر ایسا نہیں کرتا) بلکہ ان کے واسطے ایک معین وقت ہے کہ اس سے ورے کوئی پناہ کی جگہ نہیں پا سکتے۔

اَلْغَفُوْرُ (مبالغہ کا صیغہ ہے) بہت زیادہ مغفرت کرنے والا۔

ذُو الرَّحْمَةِ (رحمت والا) یعنی جس کی صفت رحمت ہے۔

یُؤَاخِذُهُمْ الخ اللہ کے غفور و رحیم ہونے کی شہادت یہ ہے کہ قریش کو اس نے مہلت اور چھوٹ دے رکھی ہے باوجودیکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی عداوت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ مَوْعِدٌ یعنی قیامت کا دن اور (دنیا میں) جنگ بدر کا دن۔ مَوْئِلًا نجات اور پناہ کا ٹھکانہ۔ اٰلَ نجات پائی۔ اٰلَ اِلَیْهِ اس کے پاس پناہ پکڑی۔

ع ۸　وَتِلْكَ الْقُرٰۤی اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا (۵۹)

اور یہ بستیاں (جن کے واقعات مشہور و مذکور ہیں) جب انہوں نے شرارت کی تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا تھا۔

اَلْقُرٰی سے مراد ہیں قوم نوح، عاد، ثمود اور دوسری گزشتہ کافر اقوام کی تباہ شدہ بستیاں۔

لَمَّا ظَلَمُوْا جب انہوں نے ظلم کیا یعنی کفار قریش کی طرح انہوں نے کفر کیا (ظلم سے مراد ہے کفر و معصیت) مَّهْلِكِ (مصدر میمی) ہلاک ہونا یا ہلاک کرنا۔

مَّوْعِدًا یعنی معین مقرر وقت جس سے کوئی بھی آگے بڑھ سکا، نہ پیچھے ہٹ سکا۔ یعنی جس طرح گزشتہ اقوام ہالکہ کے ہلاک کرنے کا اللہ نے ایک وقت مقرر کر دیا تھا جو اٹل تھا اسی طرح کفار قریش کے لئے ایک خاص وقت مقرر کر دیا ہے جو اٹل ہے یہ اس سے آگے بڑھ نہیں سکتے نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ　اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا میں (اس سفر میں) برابر چلا جاؤں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچ جاؤں۔

حضرت موسیٰ کے باپ کا نام عمران تھا، صحیح حدیث میں یہی آیا ہے۔ فَتٰى سے مراد ہیں یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف علیہ السلام (حضرت مفسرؒ نے فرمایا) میں کہتا ہوں شاید یوشع کے باپ نون، افرائیم کے نسل میں سے تھے (بیٹے نہیں تھے) کیونکہ افرائیم کا زمانہ نون کے زمانہ سے بہت پہلے تھا۔ لَآ اَبْرَحُ یعنی برابر مسلسل چلتا رہوں گا۔

مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ دو سمندروں کا سنگم یعنی مشرقی جانب خلیج فارس و بحر روم کا سنگم (قتادہ) محمد بن کعب نے کہا اس سے مراد طنجہ ہے۔ حضرت ابی بن کعب کے نزدیک افریقہ مراد ہے۔

اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۝　یا یونہی زمانۂ دراز تک چلتا رہوں گا۔ حُقُبًا یعنی طویل زمانہ تک۔ قاموس میں ہے حقب اسی سال یا اس سے زیادہ کی مدت، زمانہ طویل، سال، بہت سال۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے حقب طویل زمانہ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا حقب اسی سال۔ بعض کے نزدیک ستر سال کو ایک حقب کہتے ہیں۔

بخاری اور مسلم نے لکھا ہے سعید بن جبیرؓ نے فرمایا میں نے حضرت ابن عباسؓ سے عرض کیا نوف بکالی کا خیال ہے کہ خضر والے موسیٰؑ بنی اسرائیل والے موسیٰؑ نہ تھے (دونوں الگ الگ تھے) فرمایا دشمن خدا جھوٹ کہتا ہے ہم سے ابی بن کعب نے بیان کیا کہ انہوں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ (ایک روز) موسیٰؑ بنی اسرائیل کے سامنے تقریر کرنے کھڑے ہوئے، کسی نے سوال کر لیا (آج) سب سے زیادہ عالم کون ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا میں۔ اللہ کو موسیٰؑ کی یہ بات ناپسند ہوئی کیونکہ انہوں نے اللہ کی طرف جاننے کی نسبت نہیں کی (اور یوں نہیں کہا کہ اللہ جانے کون سب سے بڑا عالم ہے) اللہ نے وحی بھیجی، موسیٰؑ تم سے زیادہ عالم میرا ایک اور بندہ ہے جو دو سمندروں کے سنگم میں ہے۔ موسیٰؑ نے عرض کیا میرے رب اس سے میری ملاقات کیسے ہوگی۔ اللہ نے فرمایا ایک ٹوکری میں اپنے ساتھ ایک مچھلی رکھ لو (اور کنارے کنارے چلدو) جہاں مچھلی (اچھل کر پانی میں چلی جائے اور) غائب ہو جائے وہیں تمہاری ملاقات ہوگی موسیٰؑ توشہ دان یا ٹوکری میں ایک مچھلی (جو بھنی ہوئی تھی) لے کر چل دیئے اور ان کے خادم یوشع بن نون بھی ساتھ ہو گئے۔ چلتے چلتے ایک پتھر کے قریب پہنچے، وہاں ٹھہر گئے اور پتھر پر سر رکھ کر دونوں سو گئے، مچھلی تڑپ کر ٹوکری سے نکل کر دریا میں جا گری اور پانی کے اندر اس نے اپنا راستہ (سرنگ کی طرح) بنا لیا۔ اللہ نے پانی کی رفتار کو روک دیا اور پانی کی محراب بن گئی (اس واقعہ کے وقت یوشع بیدار تھے اور ان کی نظر کے سامنے مچھلی سمندر میں جا گری تھی) موسیٰؑ بیدار ہوئے تو دن کے باقی حصہ میں بھی چلتے رہے (یعنی سو کر اٹھے اور پھر چل دیئے اور شام تک چلتے رہے) یوشع اس واقعہ کا حضرت موسیٰؑ سے ذکر کرنا بھول گئے۔ موسیٰؑ دن بھر چلتے رہے اور رات بھر بھی چلتے رہے دوسرے دن کی صبح ہوئی تو یوشع سے کہا ہم اس سفر سے تھک گئے کھانا لاؤ، جب تک موسیٰؑ مچھلی کے تڑپنے کے مقرر مقام سے آگے نہیں بڑھے تھے، آپ کو تھکان نہیں ہوئی تھی، جب اس جگہ سے آگے بڑھے تو تھکان کا احساس ہوا، یوشع نے کہا حضرت جب ہم پتھر کے پاس ٹھہرے تھے (وہاں مچھلی تڑپ کر سمندر میں جا گری تھی) میں آپ سے مچھلی کا تذکرہ کرنا بھول گیا۔ شیطان نے مجھے بھلا دیا۔ مچھلی نے تو سمندر کے اندر عجیب طرح سے اپنا راستہ لے لیا تھا۔ موسیٰؑ نے

کہا اسی (جگہ) کی تو ہم تلاش میں تھے۔ پھر دونوں اپنے نقش قدم پر لوٹ پڑے، یہاں تک کہ مقررہ پتھر کے مقام پر آ گئے، وہاں ایک آدمی ملا جو کپڑے سے منہ چھپائے ہوئے تھا موسیٰؑ نے اس کو سلام کیا۔ خضرؑ نے کہا تمہاری اس زمین میں سلام کا طریقہ کہاں ہے۔ موسیٰؑ نے کہا میں موسیٰؑ ہوں۔ خضرؑ نے کہا بنی اسرائیل والے موسیٰؑ۔ موسیٰؑ نے کہا جی ہاں۔ میں آپ کے پاس اس غرض سے آیا ہوں کہ جو علم آپ کو دیا گیا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی بتائیں۔ خضرؑ نے کہا، موسیٰؑ آپ میرے ساتھ ٹھہر نہ سکیں گے، مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم دیا گیا ہے جس سے آپ واقف نہیں اور جو علم اللہ نے آپ کو دیا ہے اس سے میں واقف نہیں۔ موسیٰؑ نے کہا انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے، میں آپ کے حکم کے خلاف نہیں کروں گا۔ خضرؑ نے کہا اگر آپ میرے ساتھ چلنا ہی چاہتے ہیں تو جب تک میں خود بیان نہ کروں آپ مجھ سے (کسی پیش آنے والے واقعہ کے متعلق) کچھ دریافت نہ کریں۔ عہد و پیمان کے بعد دونوں چل دیئے۔ چلتے چلتے سمندر کے کنارے پہنچے۔ ادھر سے ایک کشتی گزری۔ کشتی والوں سے ان بزرگوں نے سوار کر لینے کے لئے کہا، کشتی والے خضر کو پہچانتے تھے، انہوں نے بغیر کرایہ کے دونوں کو سوار کر لیا۔ سوار ہو گئے (اور چل دیئے تو اثناء راہ میں) اچانک موسیٰؑ نے دیکھا کہ خضر بسولے سے کشتی کا ایک تختہ توڑ رہے ہیں۔ کہنے لگے آپ یہ عجیب حرکت کر رہے ہیں ان لوگوں نے تو ہم کو بغیر کرایہ کے سوار کر لیا اور آپ ان کی کشتی کو پھاڑ رہے ہیں کہ سب کشتی والے ڈوب جائیں۔ خضرؑ نے کہا کیا میں نے پہلے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ موسیٰؑ نے کہا میں بھول گیا تھا آپ بھول چوک پر میری پکڑ نہ کیجئے اور میرے معاملہ میں مجھ پر تنگی اور دشواری نہ ڈالئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ موسیٰؑ سے پہلی حرکت بھول کر ہوئی تھی اور دوسری حرکت بطور شرط اور تیسری حرکت قصداً بالارادہ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک چڑیا آ کر کشتی کے کنارے پر بیٹھ گئی اور چونچ ڈال کر دریا سے اس نے پانی لیا۔ خضرؑ نے موسیٰؑ سے کہا میرا اور آپ کا علم، علم خدا کے مقابلہ میں اس سے زیادہ نہیں جتنا اس چڑیا نے چونچ سے سمندر کا پانی لیا۔ اس چڑیا نے چونچ میں پانی لے کر سمندر کے پانی میں کوئی کمی نہیں کر دی (میرا اور آپ کا علم بھی اللہ کے علم کے بحر بے کراں میں کوئی کمی نہیں کر سکتا) پھر (کشتی سے اتر کر) دونوں چل دیئے خضر کو راستہ میں ایک لڑکا نظر آیا جو لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ خضرؑ نے اس کو پکڑ کر اس کا سر اپنے ہاتھ سے اکھاڑ دیا اور قتل کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا آپ نے یہ بری حرکت کی ایک معصوم کو بے قصور قتل کر دیا، خضرؑ نے کہا کیا میں نے آپ سے نہیں کہہ دیا تھا کہ آپ میرے ساتھ رک نہیں سکیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خضر کی یہ حرکت پہلی حرکت سے زیادہ سخت تھی (اس لئے موسیٰؑ نے بیتاب ہو کر دریافت کر ہی لیا) موسیٰؑ نے کہا اگر اس کے بعد میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا، آپ کے لئے میری طرف سے معذرت کا کوئی موقع نہیں رہے گا۔ اس کے بعد پھر دونوں چل دیئے ایک گاؤں میں پہنچے، بستی والوں سے کھانا مانگا، انہوں نے کچھ کھانے کو نہیں دیا۔ وہاں ایک دیوار نظر آئی جو گرنے ہی والی تھی، خضرؑ نے اپنے ہاتھ کے اشارے) سے اس کو ٹھیک کر دیا، موسیٰؑ نے کہا ہم اس بستی میں آئے بستی والوں سے کھانا مانگا، کسی نے کھانا نہیں دیا نہ ہماری میزبانی کی (اور آپ نے ان کی دیوار ٹھیک کر دی) اگر آپ چاہتے تو اس کی مزدوری ان سے لے سکتے تھے، خضرؑ نے کہا اب میرے اور آپ کے درمیان فراق ہے (اس کے بعد اپنی تینوں حرکتوں کی مصلحت و حکمت بیان کی) اور کہا یہ ان باتوں کی تشریح ہے جن کو پوچھے بغیر آپ رہ نہ سکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کاش موسیٰؑ صبر کئے رہتے اور آئندہ اور واقعات ظہور پذیر ہوتے) یہاں تک کہ اللہ ہم کو ان کی تفصیل سے آگاہ فرماتا۔

ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیروں میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے رب سے دریافت کیا (اے اللہ) تجھے اپنے بندوں میں کون بندہ سب سے زیادہ پیارا ہے۔ اللہ نے فرمایا (مجھے سب سے زیادہ پیارا وہ بندہ ہے) جو مجھے یاد رکھتا ہے اور بھولتا نہیں ہے۔ موسیٰؑ نے عرض کیا سب سے اچھا حاکم تیرے بندوں میں کون ہے۔ اللہ نے فرمایا جو نفسانی میلان پر نہیں چلتا، حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے موسیٰؑ نے عرض کیا تیرے بندوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے فرمایا جو اپنے علم کے ساتھ دوسرے لوگوں کا علم بھی ملا لیتا ہے (یعنی اپنے علم میں دوسروں سے پوچھ کر یا دوسروں سے

سیکھ کر اضافہ کر لیتا ہے) اس غرض سے کہ شاید اس کو کوئی بات ایسی معلوم ہو جو ہدایت کا راستہ بتا دے اور ہلاکت (کے راستہ) سے موڑ دے۔ موسیٰ نے کہا تیرے بندوں میں اگر کوئی مجھ سے زیادہ جاننے والا ہو تو مجھے اس کا پتہ اور راستہ بتا دے، اللہ نے فرمایا، تجھ سے زیادہ عالم خضر ہے، موسیٰ نے کہا میں خضر کو کہاں تلاش کروں، اللہ نے فرمایا پتھر کے قریب سمندر کے کنارے پر۔ موسیٰ نے کہا مجھے اس کا نشان کیسے معلوم ہوگا، اللہ نے فرمایا ایک مچھلی لے کر (بھون کر) ٹوکری میں رکھ لے جہاں وہ مچھلی کھو جائے اسی جگہ خضر ملے گا۔ حضرت موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا جس جگہ مچھلی کھو جائے مجھے بتا دینا، اس کے بعد حضرت موسیٰ اور ان کا خادم دونوں چل دیئے۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا پس جب دونوں مجمع البحرین پر پہنچے (وہ دریاؤں کے سنگم پر پہنچے) یعنی مقرر پتھر تک پہنچ گئے۔ موسیٰ وہاں سو گئے اور بھونی ہوئی مچھلی تڑپ کر زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی۔

سفیان نے کہا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس پتھر کے پاس آب حیات کا چشمہ تھا (جس کی خاصیت یہ تھی کہ) جس چیز پر (یعنی جس مردہ پر) اس کا پانی لگ جاتا تھا وہ زندہ ہو کر سمندر میں جا کودتی تھی۔ کلبی نے کہا یوشع بن نون نے آب حیات سے وضو کر کے ٹوکری میں رکھی ہوئی نمکین مچھلی پر چھینٹا دیا جس سے مچھلی زندہ ہو کر پانی میں جا کودی اور پانی کے اندر دم مارتی چلی گئی پانی کے جس حصہ پر وہ دم مارتی تھی پانی خشک ہو (کر راستہ بن) جاتا تھا۔

نَسِيَا حُوتَهُمَا تو دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے یعنی موسیٰ مچھلی مانگنا اور دریافت حال کرنا بھول گئے اور یوشع مچھلی کے زندہ ہو کر سمندر میں جا گرنے کا تذکرہ کرنا بھول گئے۔

بغوی نے لکھا ہے مچھلی یوشع کے پاس تھی حقیقت میں وہ ہی مچھلی کا تذکرہ کرنا بھولے تھے لیکن چونکہ دونوں نے زاد راہ کے لئے اس کو رکھا تھا اس لئے بھولنے کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی۔ جیسے کہا جاتا ہے فلاں لوگ سفر کو نکلے اور کھانے کے لئے انہوں نے کھانا ساتھ لے لیا حالانکہ ساتھ لینے والا اور اٹھانے والا صرف ایک آدمی ہوتا ہے، لیکن رکھنے والے سب ہوتے ہیں اس لئے سب کی طرف ساتھ لینے اور اٹھانے کی نسبت کر دی جاتی ہے۔

فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی اور چل دی یعنی بحکم خدا مچھلی نے سمندر کے اندر اپنا راستہ بنا لیا۔ سَرَب چلنے کا راستہ سَارِبٌ بِالنَّهَارِ دن میں چلنے والا۔ بعض اہل لغت نے کہا سَرَب کا معنی ہے لمبائی میں چیرنا (یعنی مچھلی نے پانی کو چیر کر راستہ بنا لیا) صحیح روایت میں آیا ہے کہ مچھلی پانی میں گھسی تو اللہ نے پانی کی رفتار کو اس کے گرد و پیش سے روک دیا اور پانی کے اندر محراب سی بن گئی۔ یہ روایت پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾

اس کے بعد جب دونوں (مجمع البحرین سے) آگے بڑھے (اور دوسرے دن دوپہر تک چلتے رہے) تو موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا کھانا لاؤ، اس سفر میں ہم بہت تھک گئے۔

غَدَآء صبح کے وقت کا کھانا۔ عَشَاء شام کے وقت کا کھانا، نَصَب سخت تھکان۔ جب حضرت موسیٰ مقررہ پتھر سے آگے بڑھے تو اللہ کی طرف سے آپ پر بھوک کا دورہ پڑا، تاکہ کھانے کی خواہش ہو اور مچھلی یاد آ جائے اور اپنے مقصد کی طرف لوٹ آئیں۔ صحیحین کی حدیث میں آیا ہے کہ جب تک مقررہ مقام سے حضرت موسیٰ آگے نہیں بڑھے تھے آپ کو تھکان نہیں ہوئی تھی۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ

خادم نے کہا دیکھئے تو جب ہم اس پتھر کے پاس قیام پذیر ہوئے تھے تو مچھلی (کا تذکرہ کرنا اور زندہ ہو کر دریا میں جا کودنا) میں بھول ہی گیا اور (یہ حرکت صرف شیطان کی ہے) شیطان نے ہی مجھے بھلا دیا۔

اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾ کہ اس کا تذکرہ آپ سے کرتا اور (بیان

کرتا کہ) مچھلی نے سمندر کے اندر (کود کر) اپنا راستہ عجیب طرح سے بنالیا۔
اَلصَّخْرَةِ یعنی وہ پتھر جس کے پاس ہم سوئے تھے۔ بغوی نے ہقل بن زیاد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ پتھر وہی تھا جو دریاء زیت سے ورے تھا۔

نَسِیْتُ الْحُوْتَ اس کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ایک مطلب وہی ہے جو ترجمہ میں ذکر کر دیا گیا کہ میں آپ سے مچھلی کا واقعہ بیان کرنا بھول گیا۔ دوسرا ترجمہ نَسِیْتُ کا تَرَکْتُ ہے یعنی میں نے مچھلی کھودی، مچھلی چھوڑ آیا۔ بغوی نے لکھا ہے یوشع نے مچھلی کو جب کود کر سمندر میں گرتے دیکھا تو حضرت موسیٰ کو مطلع کرنے کا ارادہ کیا لیکن حضرت موسیٰ کی بیداری کے بعد ذکر کرنا بھول گئے اور دن بھر بھولے رہے، یہاں تک کہ دوسرے روز ظہر کی نماز پڑھ لی اور حضرت موسیٰ نے کھانا طلب کیا تو حضرت یوشع کو مچھلی یاد آئی اور آپ نے عذر پیش کیا۔ اِلَّا الشَّیْطٰنُ یعنی شیطانی وسوسہ آفرینی اور اغواء قلبی نے مجھے مچھلی کا تذکرہ کرنا بھلا دیا۔ بیضاوی نے لکھا ہے حضرت یوشع آیات قدرت کے مشاہدے میں غرق ہو گئے تھے، مچھلی کا واقعہ دیکھ کر یکسر بارگاہ قدس کی طرف ان کی ساری توجہ کھنچ گئی تھی اور اسی مقام فنا میں پہنچ جانے سے ان کو مچھلی کا تذکرہ بھلا دیا تھا لیکن فروتنی اور انکسار طبع کی وجہ سے انہوں نے بھولنے کی نسبت اپنی طرف اور فراموش کرانے (یعنی شیطانی اثر اندازی) کی نسبت شیطان کی طرف کی۔

عَجَبًا کا موصوف محذوف ہے یعنی سَبِیْلًا عَجَبًا یا اِتِّخَاذًا عَجَبًا۔ بعض نے کہا لفظ عَجَبًا حضرت موسیٰ نے کہا تھا یوشع نے جب ان سے مچھلی کا تذکرہ کیا اور سمندر میں اپنی راہ لینے کا اظہار کیا تو حضرت موسیٰ نے فرمایا، عجیب۔ بعض نے کہا اِتَّخَذَ کی ضمیر حضرت موسیٰ کی طرف راجع ہے یعنی مچھلی کا سمندر کے اندر راستہ اختیار کرنے کو موسیٰ نے عجیب قرار دیا۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ موسیٰ نے کہا یہی تو وہ چیز ہے جس کے ہم خواستگار تھے چنانچہ دونوں نقش قدم پر لوٹ پڑے یہاں تک کہ مقرر پتھر تک آگئے۔ وہی مقام حضرت خضر سے ملاقات کے لئے مقرر تھا۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ (وہاں) ان دونوں نے ہمارے ایک بندہ کو پایا۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ خضر تھے۔ صحیح حدیث میں یہی آیا ہے۔ خضر کا نام بلیا بن ملکان یا الیسع یا الیاس کہا گیا ہے خضر لقب تھا اس لقب کی وجہ بغوی نے ہمام ابن منبہ کی روایت کو قرار دیا ہے۔ ہمام راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا خضر کو خضر کہنے کی یہ وجہ تھی کہ خضر جب خشک زمین یا خشک گھاس پر بیٹھ جاتے تو وہ سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی تھی۔ مجاہد نے کہا جس جگہ خضر نماز پڑھتے تھے اس کے گرداگرد سبزہ ہی سبزہ ہو جاتا تھا۔

بغوی نے خضر کو اسرائیلی نسل سے قرار دیا ہے کسی نے کہا شاہزادہ تھے جو تارک الدنیا ہو گئے تھے۔ حضرت مفسر نے فرمایا میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ خضر اسرائیلی نہیں تھے ورنہ موسیٰ کا اتباع کرنا ان پر لازم ہوتا۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے۔ صحیح حدیث ابھی اوپر گزر چکی ہے کہ خضر کے سوال کے جواب میں حضرت موسیٰ نے کہا میں موسیٰ ہوں خضر نے کہا بنی اسرائیل والے موسیٰ۔ حضرت موسیٰ نے کہا جی ہاں۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص کپڑا اوڑھے چت لیٹا ہے کپڑے کا کچھ حصہ سر کے نیچے دبا ہے اور کچھ ٹانگوں کے نیچے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس وقت خضر وسط سمندر میں ایک جھالر دار سبز مسند بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔

اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا جس کو ہم نے اپنی طرف سے رحمت (یعنی نبوت اور وحی عطا کی تھی)۔
وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾ اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا تھا یعنی ایسا علم دیا تھا جو صرف ہمارے لئے خاص تھا، بغیر ہماری توفیق کے اس کا حاصل ہونا ناممکن تھا، اس جگہ علم سے مراد ہے ذات و صفات کا علم۔ بغوی نے

لکھا ہے اکثر علماء خضر کو نبی تسلیم نہیں کرتے۔ (حضرت مفسر نے فرمایا) میرے نزدیک علماء کا یہ قول غور طلب ہے کیونکہ اولیاء کو جو علم الہام سے حاصل ہوتا ہے وہ ظنی ہوتا ہے یقینی نہیں ہوتا (قرینہ سے اس کو الہام رحمانی کہا جاسکتا ہے، لیکن ہو سکتا ہے وہ القاء شیطانی ہو خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ تعلیم شریعت کے خلاف ہو اس صورت میں تو اس کا القاء شیطانی ہونا تقریباً یقینی ہوتا ہے۔ مترجم) یہی وجہ ہے کہ الہامی علوم باہمی متعارض اور مختلف ہوتے ہیں، اب اگر خضر کا نبی نہ ہونا مان لیا جائے تو کیا جواب ہوگا معصوم بچہ کو بے قصور قتل کردینے کا محض اس وجہ سے کہ خضر کو الہام سے معلوم ہو گیا کہ ماں باپ اس کی محبت میں پڑ کر گناہ گار اور بے راہ ہو جائیں گے اس لئے اس کو قتل کردیا جائے (یہ الہام تو شریعت کے خلاف تھا پھر خضر نے اس پر عمل کیوں کیا مترجم)

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾

موسیٰؑ نے اس سے کہا کیا میں آپ کے ساتھ اس شرط پر رہ سکتا ہوں کہ اللہ کی طرف سے جو علم مفید آپ کو سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ آپ مجھ کو بھی سکھا دیں۔ اصل کلام اس طرح ہونا چاہئے کہ موسیٰؑ نے کہا میں آپ کے پاس آپ کے ساتھ رہنے کے لئے آیا ہوں تاکہ ساتھ رہ کر آپ سے کچھ علم حاصل کروں لیکن (ادب و تہذیب کو پیش نظر رکھ کر) طلب اجازت کے طور پر کلام کا رنگ بدلا اور سوالیہ طرز اختیار کیا۔

رُشد خیر کو پانا، رُشْدًا اور رَشَدًا دونوں ہم معنی ہیں۔ رُشْدًا تُعَلِّمَنِیْ کا مفعول دوئم ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَتَّبِعُکَ کا مفعول لہ (علت) ہو۔ آیت بتا رہی ہے کہ بعض چیزوں میں مفضول کو فاضل پر برتری حاصل ہو سکتی ہے اگر مفضول کے اندر کوئی کمال ایسا ہو جو فاضل میں نہ ہو تو اعلیٰ کے لئے مناسب ہے کہ اپنے سے کم درجہ والے سے وہ کمال حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اس کو اپنے لئے کسر شان نہ سمجھے۔ آیت کی تفسیر میں اوپر حدیث نقل کردی گئی ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے سوال کیا سب سے بڑا عالم کون ہے تو اللہ نے فرمایا وہ شخص سب سے بڑا عالم ہے جو دوسروں کا علم لے کر اپنے علم میں اضافہ کرلے، ممکن ہے اس کو کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو تباہی سے بچالے یا سیدھا راستہ دکھا دے۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے اچھی سند سے بروایت ابوہریرہؓ اور ابن عساکر نے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حکمت کی بات مومن کی گم شدہ (کھوئی ہوئی امانت) ہے جہاں ملے مومن اس کا سب سے بڑا مستحق ہے (فوراً لے لے)

رسول اللہ ﷺ سے جو درود منقول ہے (جس میں حضور ﷺ نے اپنے اور اپنی آل کے لئے وہ رحمت طلب کی ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ کو عطا کی گئی تھی) وہ بھی اسی (گمشدہ رحمت) کے ذیل میں داخل ہے۔ بغوی نے لکھا ہے بعض احادیث میں آیا ہے کہ موسیٰؑ نے خضر سے جب یہ بات کہی (یعنی ساتھ رہنے کی درخواست کی) تو خضر نے کہا علم کے لئے توریت کافی ہے اور عمل کے لحاظ سے بنی اسرائیل (کی ہدایت) کا مشغلہ کافی ہے (مزید علم و عمل کی آپ کو ضرورت نہیں) موسیٰؑ نے کہا اللہ نے مجھے اس کا حکم دیا ہے (کہ آپ کے ساتھ رہ کر علم میں اضافہ کروں) حضرت موسیٰؑ نے اپنے اس کلام میں ادب و تہذیب کو ملحوظ رکھا اور بطور انکسار اپنے کو بے علم قرار دیا اور خضر سے درخواست کی کہ مجھے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دیجئے اور جو علم اللہ نے آپ کو عطا کیا ہے اس کا کچھ حصہ مجھے بھی بتائیے۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ یہ امر یقینی ہے کہ آپ میرے ساتھ رہ کر ہرگز صبر نہیں کرسکیں گے خضر نے استطاعت صبر کی نفی سخت تاکیدی طور پر کی (اِنَّ لَنْ وغیرہ نفی میں زور پیدا کر رہے ہیں) اس کے آگے خود ہی حضرت موسیٰؑ کے معذور ہونے کی تصویر کشی بھی کردی (تاکہ حضرت موسیٰؑ کی شان میں سوء ادب اور گستاخی کا تصور بھی نہ ہو سکے۔ مترجم)

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ اور جس بات کا آپ کو پورا علم نہ ہو اس پر آپ صبر

کیسے کر سکتے ہیں۔ خُبْرًا کا معنی ہے علم، اطلاع، امتیاز۔ خضر کو معلوم تھا کہ ایسے واقعات سامنے آئیں گے جو (بظاہر) ممنوع اور برے ہوں گے اور انبیاء امور ممنوعہ پر اس وقت تک خاموش نہیں رہتے جب تک ان کے جواز کی کوئی وجہ ان پر ظاہر نہ ہو جائے۔

میں کہتا ہوں وہ انبیاء اور رسل جن کو اصلاح عامہ کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ ان کی شریعتوں کے احکام ایسے اصول اور ضوابط پر مبنی ہوتے ہیں جن کی اصلاحات کا تعلق عوام سے ہوتا ہے، اس لئے ان کی حکمت و مصلحت عوام کے ذہنوں پر منکشف ہو جاتی ہے اور ہونا چاہئے بھی لیکن جو انبیاء کسی امت کی اصلاح کے لئے مبعوث نہیں ہوتے ان کے پاس وحی کے ذریعہ سے آنے والے احکام کا مقصد صرف انبیاء کے نفوس کی اصلاح یا اللہ کے ساتھ انبیاء کے معاملات کی براہ راست درستی ہوتا ہے۔ موسیٰؑ (نبی دعوت تھے ان) کے انکار اور خضر کے فعل پر اعتراض کی وجہ یہی تھی کہ خضر کا عمل شریعت موسوی کے خلاف تھا دونوں کا مسلک جدا جدا تھا اتحاد مسلک اور ترک اعتراض استفادہ کے لئے ضروری ہے۔ موسیٰؑ کو اسی لئے خضر بھی سمجھ گئے کہ ان سے برداشت نہ ہو سکے گی یہ خاموش نہیں رہیں گے کیونکہ میری مصاحبت ان کو سود مند نہ ہوگی۔ اسی لئے صوفیاء کا قول ہے کہ اگر مرید کو یقین ہو کہ پیر عارف کامل ہے تو اسکے کسی فعل پر اعتراض نہ کرے خواہ اس کا فعل بظاہر شریعت کے خلاف ہو اور اگر اختلاف مسلک کی وجہ سے مرید اعتراض کئے بغیر نہیں رہ سکتا تو پیر کی صحبت ترک کر دے (یعنی مرید پر اگر ظاہر شریعت کا غلبہ ہو اور خلاف شرع بات دیکھ کر وہ روکنے ٹوکنے سے باز نہ رہ سکتا ہو تو پیر کو کامل العرفان سمجھنے کے باوجود اس کو پیر کی صحبت سے ہٹ جانا چاہئے۔ مترجم)

ایک شبہ

شریعت محمدیہ عام ہے قیامت تک اس کے احکام میں کوئی تبدیلی و تنسیخ ممکن نہیں (نہ کوئی دوسرا نبی آئے گا کہ براہ راست اسکا تعلق اللہ سے ہو اور راست تعلق کی وجہ سے وہ اسلامی شریعت کے خلاف کر سکے۔ پھر پیر کو شریعت کے خلاف کرتے دیکھ کر کامل العرفان سمجھنا یا کسی کامل عارف کا شریعت کے خلاف کرنا کیسے ممکن ہے۔ اولیاء و عرفاء کو انبیاء پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے، انبیاء براہ راست مامور ہوتے ہیں اور اولیاء کا شرعی تعلق اللہ سے براہ راست نہیں ہوتا۔ مترجم)

جواب

بیشک منصوص، محکم احکام کی خلاف ورزی کرنا اور خلاف ورزی کے ثبوت میں اپنے ذاتی الہام کو پیش کرنا جائز نہیں، خضر نے لڑکے کو قتل کر دیا ان کے لئے جائز تھا۔ لیکن شریعت محمدیہ کو ماننے والے اولیاء امت ایسا نہیں کر سکتے، الہام کو بہانہ بنا کر کسی کو بے قصور قتل نہیں کر سکتے اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس بے قصور کو اس لئے مار ڈال تاکہ آئندہ اس کے والدین اس کی محبت کی وجہ سے تباہ نہ ہو سکیں، لیکن اختلافی مسائل میں مثبت و منفی ہر پہلو کی ایک وجہ ہوتی ہے اگر اللہ کا کوئی ولی اور عارف کسی ایک قول کو اختیار کرے (جو جمہور کے مسلک کے خلاف ہو) تو اس کو حکم شریعت کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جہری ذکر اور سماع و غناء کے مسائل اسی طرح کے ہیں۔ (مجوزین کے پاس بھی کوئی علت جواز ہے) اگر اللہ کا کوئی عارف سماع یا جہری ذکر کا شغل کرتا ہے تو نکتہ چینی نہ کرنی چاہئے۔ بعض چیزیں بظاہر ممنوع نظر آتی ہیں لیکن واقع میں ایسی نہیں ہوتیں۔ ایک شخص گلاس میں شراب نما شربت پیتا ہو اور لوگوں کو دکھاتا ہو کہ یہ شراب ہے اور اس کی غرض صرف یہ ہے کہ لوگوں کا ہجوم بدگمان ہو کر اس کے پاس سے چھٹ جائے تاکہ اس کے ذکر و فکر میں خلل نہ پڑے تو اس میں کیا خرابی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ باوجود ولی کامل اور عارف ہونے کے کسی صغیرہ گناہ کا اس سے صدور ہو جائے اور وہ اس کے گناہ ہونے کا اقرار بھی کر رہا ہو۔ عصمت تو انبیاءؑ کے ساتھ خاص ہے۔ پھر بدگمانی اور نکتہ چینی کی کیا وجہ، مرید پر لازم ہے کہ اگر اس

کے شیخ سے کوئی اس قسم کی کوئی حرکت صادر ہو رہی ہے تو خود اس کا مرتکب نہ ہو لیکن شیخ کی تردید بھی نہ کرے۔ اور اسکے عارف کامل ہونے میں شک نہ کرے۔

اولیاء اللہ (جیسے شیخ ابن عربی، ابن سبعین، ابن فارض وغیرہ) کے بعض مقالات مشاہدہ اور کشف پر مبنی ہیں (اور شریعت کے خلاف نظر آتے ہیں) مناسب ہے کہ ان کی کوئی صحیح تاویل کی جائے اور شریعت کے موافق بنانے کی کوشش کی جائے اور بدگمانی کو راہ نہ دی جائے۔ اللہ نے فرمایا ہے لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا اگر صحیح تاویل ممکن ہی نہ ہو تو ان مقالات کو حالت سکر پر محمول کیا جائے۔ فقہاء کا فتویٰ ہے کہ مباح چیز سے اگر سکر پیدا ہو جائے اور اس سکر کی حالت میں طلاق دیدے تو طلاق واقع نہ ہو گی۔ تو اولیاء اللہ جو اللہ کی محبت میں ڈوبے رہتے ہیں ان کے اس غلبہ حال کے مقالات کیسے قابل گرفت ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے ان کے مقالات کا مرادی مطلب ہی نہ سمجھے ہوں ان کی اصلی مراد کچھ اور ہو اور سننے پڑھنے والے کچھ اور سمجھ جائیں۔ بات یہ ہے کہ تمام عبادات محسوس معانی یا محسوس معانی سے استنباط کئے ہوئے عقلی معانی کے بیان پر موقوف ہیں انہی محسوس یا مستنبط از محسوس معانی کے اظہار پر تمام عبادات کا انحصار ہے لیکن جب ذات و صفات الٰہیہ کی ایسی (جن کی نہ کوئی محسوس نظیر ہو نہ شبیہ) کا کسی عارف کے دل پر تو پڑ رہا ہو اور وہ ان کو بیان کرنا چاہے لیکن نہیں سادہ غیر محسوس حقائق کے اظہار کے لئے کسی زبان میں الفاظ وضع ہی نہیں کئے گئے ہیں، پھر کس طرح سوائے استعارہ، مجاز اور ناقص تشبیہ کے واردات قلب بیان کرے، ایسی تعبیر کو سن کر سننے والے کے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ وہ اس تعبیر کا ظاہری معنی مراد لے کر عقائد اہل سنت کے خلاف قرار دیدے، مناسب یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے کلام میں متشابہات کا جس طرح استعمال کیا گیا ہے (جن کی حقیقت نا قابل فہم وانہام ہے) اسی طرح صفات وذات کی جلوہ ریزیوں کا الفاظ میں اظہار بھی ظاہری الفاظ کی تعبیر میں بطور استعارہ ومجاز کیا جاتا ہے (حقیقی وضعی معنی مراد نہیں ہوتے) اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى اور يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ عرش پر ٹھیک ٹھیک مقیم ہو گیا۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) دونوں آیات قرآن کی ہیں جو ان کو آیات قرآن نہ کہے وہ کافر ہے (لیکن ان کے ظاہری الفاظ سے تو اللہ کا جسم ہونا ثابت ہوتا ہے) اور اللہ کے جسم ہونے کا عقیدہ رکھنا قریب قریب کفر کے ہے اسی طرح بعض اولیاء اللہ کا کلام بھی اگر بظاہر شرع کے خلاف ہو تو ظاہری معنی مراد نہ لئے جائیں اور ان کی تردید بھی نہ کی جائے۔

حضرت موسیٰؑ کو اپنے صابر رہنے کا چونکہ قطعی اعتماد نہ تھا اس لئے اللہ کی مشیت کے ساتھ آپ نے اپنے صابر رہنے کو مشروط کر کے جواب دیا۔

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ موسیٰؑ نے کہا آپ انشاء اللہ مجھے آئندہ صابر پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کے خلاف نہیں کروں گا۔ حضرت موسیٰؑ نے صابر رہنے کا وعدہ کیا۔ کیونکہ صحبت خضر اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتی تھی، جب موسیٰؑ خضر کے فعل پر اعتراض نہ کرتے اور خضر کے ساتھ رہنے کا حکم اللہ سے مل چکا تھا لیکن ان کو اپنے صابر رہنے میں شک تھا کیونکہ حضرت خضر کے مسلک سے آپ کا مسلک جدا تھا اور اختلاف مسلک صابر نہ رہنے اور اعتراض کر بیٹھنے کا موجب تھا اسی لئے۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ع ۲۲

خضر نے کہا اگر میرے ساتھ آپ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی بات کے متعلق (پہلے سے) نہ پوچھنا جب تک میں خود اس کے متعلق ابتداءً ذکر نہ کر دوں۔

یعنی اگر میں کوئی ایسا کام کروں جو آپ کو ناپسند ہو تو جب تک میں خود ہی ابتداءً اپنی طرف سے اس کا ذکر آپ سے نہ کروں آپ مجھ سے کوئی سوال نہ کریں کیونکہ سوال کرنے سے اعتراض کرنے کا گمان ہوتا ہے اور اعتراض کرنے سے استفادہ نا ممکن ہو جاتا ہے۔

فَانْطَلَقَا ٙ پس دونوں چل دیئے یعنی ساحل پر کشتی پر سوار ہونے کے ارادے سے کشتی کی تلاش میں چل دیئے، وہاں ایک کشتی مل گئی اور دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ بغوی نے لکھا ہے جو لوگ کشتی میں سوار تھے، انہوں نے کہا، دونوں چور ہیں ان کو کشتی سے نکال دو، کشتی کے مالک نے کہا یہ لوگ چور نہیں ہیں مجھے ان کے چہرے انبیاء کے چہرے دکھائی دے رہے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب کی روایت سے صحیحین کی حدیث ہم نقل کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک کشتی ان کی طرف سے گزری موسیٰؑ اور خضر نے کشتی والوں سے سوار کر لینے کی درخواست کی۔ کشتی والوں نے خضر کو پہچان لیا اور بلا کرایہ دونوں کو سوار کر لیا۔

حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ٙ یہاں تک کہ جب دونوں کشتی میں سوار ہو گئے تو خضر نے کشتی کو پھاڑ دیا۔ صحیحین کی روایت میں آیا ہے جو ہم نقل کر چکے ہیں کہ خضر نے کشتی کا ایک تختہ بسولے سے اکھاڑ دیا (یعنی پھاڑنے سے مراد ہے اکھاڑ دینا)

قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ٙ موسیٰؑ نے کہا کیا کشتی والوں کو ڈبونے کے لئے آپ نے کشتی کو پھاڑ دیا۔ انہوں نے تو ہم کو بلا کرایہ سوار کر لیا اور آپ نے کشتی کو توڑ دیا۔ اب پانی اندر آجائے گا اور سب ڈوب جائیں گے۔

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ۝ آپ نے یہ بڑی (بری) حرکت کی۔

بغوی نے لکھا ہے عربی زبان میں اِمْر کا معنی ہے بڑی مصیبت، ہر بڑی سخت چیز۔ اَمِرَ الْاَمْرُ بات بڑی سخت ہو گئی، معاملہ بڑا ہو گیا۔ قتیبی نے اِمْرًا کا ترجمہ کیا ہے عجیب۔ بغوی نے لکھا ہے خضر نے ایک بڑا شیشے کا پیالہ لے کر کشتی کے سوراخ پر ڈھانک دیا پیالہ سوراخ میں اڑ گیا (اور پانی اندر نہ آسکا) جلال الدین محلی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ کشتی کے اندر پانی نہیں آیا یعنی یہ خضر کا معجزہ تھا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ۝ خضر نے کہا کیا آپ سے میں نے (پہلے ہی) نہیں کہہ دیا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکیں گے۔ یہ گزشتہ واقعہ کی حضرت خضر کی طرف سے یاد دہانی ہے حضرت موسیٰ نے جب دیکھا کہ سوراخ سے کشتی میں سوار ہونے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، پانی اندر داخل ہی نہیں ہوا تو۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِىْ بِمَا نَسِيْتُ کہنے لگے (میں بھول گیا تھا) بھول پر آپ میری گرفت نہ کریں یعنی میں معاہدہ بھول گیا تھا مجھے یاد ہی نہ رہا کہ سوال نہ کرنے کا میں نے آپ سے وعدہ کر لیا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ نسیان سے مراد ہے یعنی میں نے آپ کی پہلی نصیحت پر جو عمل نہیں کیا اس کا آپ مواخذہ نہ کریں۔ حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت کردہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موسیٰؑ کی پہلی حرکت از روئے نسیان تھی اور دوسری حرکت بطور شرط اور تیسری حرکت قصداً۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت موسیٰ بھولے نہ تھے، نسیان کا تذکرہ عمومی طور پر آگیا ہے، گویا حضرت موسیٰ کچھ اور بھولے تھے (اپنے سابق معاہدہ کو نہیں بھولے تھے)

وَلَا تُرْهِقْنِىْ مِنْ اَمْرِىْ عُسْرًا ۝ اور میرے اس معاملہ میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے یعنی تنگی اور مواخذہ کر کے مجھ پر مشقت اور دشواری نہ ڈالئے، مطلب یہ ہے کہ آپ کے اس سلوک سے میرے لئے آپ کے ساتھ رہنا دشوار ہو جائے گا۔ رَهِقَهٗ (ثلاثی مجرد) اس کو ڈھانک لیا اَرْهَقَهٗ اِيَّاهُ اس پر کسی چیز کو ڈھانک دیا۔ بعض نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ آپ میرے ساتھ سختی کا برتاؤ نہ کیجئے، آسانی کا سلوک کیجئے۔

فَانْطَلَقَا ٙ اس کے بعد (کشتی سے اتر کر) دونوں چل دیئے۔

حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ٙ یہاں تک کہ جب دونوں کو ایک لڑکا ملا تو خضر نے اس کو مار ڈالا۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے لڑکوں کے ساتھ مل کر ایک لڑکا کھیل رہا تھا جو خوش کلام اور حسین تھا۔ سدی نے کہا وہ سب سے زیادہ حسین تھا اس کا چہرہ چمکیلا تھا خضر نے اس کو پکڑ کر مار ڈالا۔ بعض علماء نے کہا پچھاڑ کر چھری سے ذبح کر دیا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ پکڑ کر اس

کا سر گردن کی جڑ سے اکھاڑ دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پتھر مار کر اس کا سر کچل دیا۔ کسی نے کہا اس کا سر اکھاڑ دیا۔ حضرت ابن عباسؓ اور اکثر مفسرین کے نزدیک وہ لڑکا نابالغ تھا۔ قرآن مجید کے لفظ غلام سے یہی مستفاد ہو رہا ہے۔ بالغ ہونے کے بعد لفظ غلام کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً آپ نے معصوم جان کو قتل کر دیا، اگر وہ نابالغ بچہ نہ ہوتا تو حضرت موسیٰ نَفْسًا زَكِيَّةً نہ فرماتے۔ حسن نے کہا وہ پورا مرد تھا، کلبی نے کہا نوجوان تھا جو راستہ لوٹتا تھا اور پھر اپنے والدین کے پاس پناہ گزین ہو جاتا تھا۔ ضحاک نے کہا لڑکا تھا جو بگاڑ کے کام کرتا تھا اور ماں باپ اس سے دکھ پاتے تھے۔ مسلم نے حضرت ابی بن کعب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس لڑکے کو خضر نے قتل کیا تھا وہ سرشتی کافر تھا اگر زندہ رہتا تو ماں باپ کو اللہ کی نافرمانی اور کفر میں مبتلا کر دیتا۔ فَقَتَلَهٗ میں فَ بتا رہی ہے کہ حضرت خضر نے جونہی لڑکے کو دیکھا فوراً تفتیش حال کے بغیر قتل کر دیا۔

قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ۝ موسیٰؑ نے کہا کیا آپ نے ایک معصوم جان کو بغیر جرم قصاص کے مار ڈالا۔ آپ نے بلاشبہ یہ ناجائز کام کیا۔

بعض روایات میں زَاكِيَةً آیا ہے۔ عام قراء کوفہ اور ابن عامر کی قرأت میں زَكِيَّةً اور باقی قراء کی روایت زَاكِيَةً آیا ہے۔ کسائی اور فراء نے کہا دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔ ابو عمرو بن علاء نے کہا زَاكِيَةً وہ نفس معصوم جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو اور زَكِيَّةً وہ نفس جس نے گناہ کے بعد توبہ کر لی ہو۔ بِغَيْرِ نَفْسٍ کا یہ مطلب ہے کہ اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو موجب قتل ہو۔ یعنی نہ وہ قاتل ہے نہ مرتد۔ نُكْرًا وہ امر جو شرعاً ناجائز ہو۔ قتادہ نے کہا نُکر کی برائی اِمْر سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے پہلی مرتبہ حضرت موسیٰؑ نے اِمْرًا فرمایا کشتی کو توڑنے سے لوگوں کے ڈوبنے کا صرف خطرہ تھا اور دوسری مرتبہ نُكْرًا فرمایا کیونکہ حقیقت میں قتل کا صدور ہو چکا تھا۔ بعض نے کہا اِمْر کا درجہ نُکر سے بڑھ کر ہے، کشتی توڑنے سے ایک جماعت کے ڈوبنے کا خطرہ تھا۔ اس لئے وہاں اِمْرًا کہا اور دوسری بار صرف ایک شخص کا قتل تھا اس لئے نُكْرًا کہا۔

☆......☆......☆......☆......☆......☆......☆......☆......☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

پارہ

قال الم اقل لک

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ خضر نے کہا کیا میں نے آپ سے نہیں کہہ دیا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں رکھ سکیں گے۔ اس مرتبہ خضر نے اپنے کلام میں لَكَ بڑھا دیا تا کہ خطاب سے ترک معاہدہ پر عتاب کا اظہار پُر زور طور پر ہو جائے۔

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝ موسیٰ نے کہا اس (مرتبہ) کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا (مجھ سے الگ ہو جانا) آپ بے شک میری طرف سے عذر کی انتہا کو پہنچ گئے کہ تین بار مجھ سے آپ کے معاہدہ کی خلاف ورزی ہو چکی ہے۔
مسلم نے حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم پر اور موسیٰؑ پر اللہ کی رحمت ہو اگر وہ عجلت سے کام نہ لیتے تو عجیب (واقعات) دیکھتے لیکن ان کو اپنے ساتھی سے شرم آئی اور انہوں نے اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا فرمایا۔ ابن مردویہ کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں میرے بھائی موسیٰؑ پر اللہ رحمت فرمائے ان کو شرم آگئی اور انہوں نے یہ بات کہہ دی اگر وہ اپنے ساتھی کے ساتھ ٹھہرے رہتے تو بڑی عجیب باتیں دیکھتے۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ پھر دونوں چل دیئے یہاں تک کہ جب ایک بستی والوں کے پاس پہنچے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ بستی انطاکیہ تھی۔ ابن سیرین نے کہا ایکہ تھی۔ کسی نے اس کا نام برقہ کہا ہے۔ بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ اندلس میں ایک شہر تھا وہی مراد ہے۔

اِسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا تو دونوں نے وہاں کے باشندوں سے کھانا طلب کیا مگر انہوں نے میزبانی کرنے سے انکار کر دیا (کھانا نہ دیا) بغوی نے حضرت ابی بن کعب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ بستی والے کنجوس تھے۔ دونوں حضرات ان کے پاس پہنچے ان کی مجلسوں میں گشت کیا اور کھانا طلب کیا لیکن انہوں نے نہیں دیا، حق مہمانی طلب کیا تو کسی نے مہمان بھی نہ بنایا۔ قتادہ کا قول ہے وہ بدترین بستی ہے جو مہمان کی میزبانی نہ کرے۔ بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے دونوں بزرگوں نے بستی کے مردوں سے کھانا طلب کیا لیکن کسی نے نہیں دیا، آخر عورتوں سے مانگا تو ایک عورت نے دیدیا اس پر دونوں نے وہاں کے مردوں پر لعنت (کی بددعا) کی۔ یہ عورت بربر والوں میں سے تھی۔

فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ پھر دونوں کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا چاہتی تھی، خضر نے اس کو سیدھا کر دیا۔ دیوار کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، اس لئے مجازی معنی مراد ہے یعنی گرنے کے قریب تھی (بہت

جھکی ہوئی تھی) عرب بولتے ہیں میرا گھر اس کے گھر کو دیکھتا ہے یعنی دونوں آمنے سامنے ہیں۔

بغوی نے حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے حضور ﷺ نے فرمایا خضرؑ نے ہاتھ کے اشارے سے دیوار کو سیدھا کر دیا۔ سعید بن جبیر نے کہا دیوار کو ہاتھ لگا دیا فوراً دیوار سیدھی ہو گئی۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ خضرؑ نے اس دیوار کو ڈھا کر دوبارہ بنا دیا۔ سدی نے کہا گارا بنایا پھر دیوار کو بنا دیا۔

قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ﴿۷۷﴾ موسیٰؑ نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس کی اجرت لے سکتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ کو اجرت طلب کرنے کی ترغیب دی تاکہ مزدوری کی رقم سے دونوں کے کھانے کا کچھ سامان ہو جائے اس کلام سے درپردہ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کی نظر میں خضرؑ نے بیکار کام کیا۔ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت خضرؑ نے دیوار کو بڑی محنت کر کے ٹھیک کیا تھا اگر محنت کا کام نہ کرتے تو اجرت کے مستحق نہ قرار پاتے اگر بطور معجزہ دیوار کو ٹھیک کر دیتے تو اجرت کس طرح طلب کر سکتے تھے بلکہ لینے کا بھی استحقاق کیسے ہوتا۔

قَالَ هَٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۚ خضرؑ نے کہا یہ (تیسرا اعتراض) میرے اور آپ کے درمیان جدائی (کا سبب) ہے۔

تیسرے اعتراض میں خواہش نفس کا کسی قدر دخل تھا جو سابق دونوں اعتراضوں میں نہ تھا اس لئے حضرت خضرؑ نے تیسرے اعتراض کو موجب فراق قرار دیا۔[ا] مطلب یہ ہے کہ اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی ہونے کا وقت آگیا۔ کیونکہ آپ نے ایک ایسا اعتراض کیا جس میں خواہش نفس کا دخل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہٰذا سے اشارہ اس فراق کی جانب ہو جس کی صراحت اِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي میں کی گئی ہے۔

سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾ اب میں آپ کو ان چیزوں کی اندرونی تشریح بتاتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا تھا کیونکہ بظاہر وہ خلاف شریعت نظر آتی تھیں حالانکہ واقع میں مآل اور انجام کے لحاظ سے وہ بری اور غلط نہ تھیں۔ بغوی نے لکھا ہے بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ کا دامن پکڑ لیا اور کہا ان واقعات کا جو علم اللہ نے آپ کو دیا ہے جدا ہونے سے پہلے مجھے بھی بتائیے۔ اس پر حضرت خضرؑ نے کہا۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾ کشتی تو تھی چند غریبوں کی جو دریا میں کمائی کرتے تھے (لوگوں کو دریائی سفر کراتے اور کرایہ لیتے تھے) میں نے کشتی کو (توڑ کر) عیب دار کرنا چاہا (اور عیب دار کر دیا) کیونکہ ان سے پرے (راستہ میں) ایک بادشاہ تھا جو ہر (عمدہ سالم اچھی) کشتی کو چھین لیتا ہے۔

کعب نے کہا یہ کشتی دس غریبوں کی تھی جو بھائی بھائی تھے پانچ تو اپاہج تھے اور پانچ کام کرتے تھے۔ آیت بتا رہی ہے کہ مسکین کا اطلاق اس شخص پر بھی ہوتا ہے جس کے پاس مال تو ہو مگر ناکافی ہو۔ بقدر ضرورت نہ ہو یا اصلی ضرورتوں سے زائد نہ ہو۔

وَرَاءَ سے مراد ہے سامنے جیسے مِنْ وَرَائِهِمْ جَهَنَّمُ میں وَرَاء سے مراد ہے آگے۔ بعض کے نزدیک وَرَاء سے

[ا] بعض غالی صوفیاء نے بھی یہی کہا ہے حضرت مفسر نے انہی کا اتباع کیا اور طلب اجرت کو خواہش نفس کی آمیزش قرار دیا لیکن صاحب کتاب جلیل القدر معصوم پیغمبر کی شان میں یہ غلط فہمی سوء ادب ہے۔ بعض اہل تفسیر کو بھی حضرت ابن عباسؓ کے ایک اثر کی بنا پر یہ غلط فہمی ہوئی ہے اور تیسرے سوال میں انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی خواہش نفس کا دخل قرار دیا ہے۔ مگر صاحب روح المعانی نے اس کو ہی بے بنیاد قرار دیا ہے۔ زمخشری مفسر کشاف نے ان اہل تفسیر کی تردید کی ہے جو تیسرے اعتراض کے اندر خواہش نفس کو دخیل سمجھتے ہیں۔ معتزلہ باوجودیکہ عصمت انبیاء کے قائل نہیں لیکن زمخشری نے باوجود معتزلی ہونے کے اس جگہ خواہش نفس کے دخل ہونے کی تردید کی ہے۔ واللہ اعلم

مراد پیچھے ہے۔ واپسی میں اس ظالم بادشاہ کے حدود سے ان مسکینوں کو گزرنا تھا۔ اول تفسیر صحیح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی قرات میں وَرَآءَهُمْ کی جگہ اَمَامَهُمْ (ان کے آگے) آیا بھی ہے۔

کُلَّ سَفِیْنَةٍ سے مراد ہے ہر عمدہ سالم اچھی کشتی۔ خضر نے کشتی کا تختہ پھاڑ کر عیب دار کر دیا تاکہ ڈاکو بادشاہ اس کو نہ چھین لے۔ اس شخص کا نام جلیدی بن کرکر تھا۔ محمد بن اسحاق نے سولہ بن جلید ازدی لکھا ہے اور شعیب جبائی نے ہدد بن بدد کہا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت خضر نے کشتی توڑنے کی وجہ بطور معذرت کشتی والوں کے سامنے بیان کی اور ظالم غاصب بادشاہ کے واقعہ کی اطلاع دی۔ خضر کے بتانے سے پہلے ان کو کچھ معلوم نہ تھا۔ جب اس بادشاہ کی حدود سے کشتی والے آگے بڑھ گئے تو انہوں نے کشتی کو درست کر لیا۔ کسی نے کہا روغن قیر کا پالش کر لیا (یا رال سے جوڑ دیا) کسی نے کہا سوراخ میں شیشی اڑا دی۔ قوم کے سامنے حضرت خضرؑ کی معذرت کی روایت عبارت قرآن کے خلاف ہے، قرآن کی صراحت ہے کہ اپنے کئے ہوئے کاموں کی وجوہ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے اس وقت بیان کیں جب کشتی سے اتر کر لڑکے کو قتل کر کے دیوار کو سیدھا کر چکے تھے اور دونوں کے الگ ہونے کا وقت آگیا تھا اگر حضرت خضرؑ کشتی والوں کو کشتی کے اندر ہی اپنے فعل کی وجہ بتا چکے ہوتے تو حضرت موسیٰؑ بھی اس سے ضرور واقف ہو جاتے، پھر دوبارہ موسیٰؑ سے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝

اور رہا وہ لڑکا تو اس کے ماں باپ ایمان دار تھے ہم کو اندیشہ ہوا کہ یہ ان پر سرکشی اور کفر کا اثر (نہ) ڈال دے۔ یعنی اپنی نافرمانی اور بدسلوکی کی وجہ سے ماں باپ پر چھا جائے گا اور بے چارے والدین دکھ اور مصیبت میں پڑ جائیں گے یا یہ مطلب ہے کہ ماں باپ کے ایمان کے ساتھ اپنے کفر اور طغیان کو جمع کر دے گا۔ ایک ہی گھر میں ماں باپ کا ایمان بھی ہو گا اور بیٹے کا کفر و طغیان بھی۔ یا یہ مطلب ہے کہ ماں باپ پر ایسا غلبہ پالے گا کہ زبردستی ان کو کافر بنا دے گا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مومن ماں باپ بیٹے کی محبت کی وجہ سے آئندہ گمراہ اور کافر ہو جائیں گے۔ سعید بن جبیر نے یہ مطلب بیان کیا کہ محبت اولاد مومن والدین کو تبدیل مذہب تک لے جائے گی ہم کو اس کا اندیشہ تھا اس لئے ہم نے لڑکے کو قتل کر دیا۔ حضرت خضرؑ کا یہ اندیشہ محض عقلی نہ تھا (جس کے خلاف ہونا بھی ممکن تھا) بلکہ اللہ کی طرف سے خضر کے پاس وحی آگئی ہو گی کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہا تو اس کے مومن ماں باپ گمراہ ہو جائیں گے اور یہ دونوں کو گمراہ ہو جانے پر مجبور کر دے گا۔

ابن ابی شیبہ نے زید بن ہرمز کی روایت سے بیان کیا ہے کہ نجدہ خارجی نے حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک تحریر بھیجی جس میں سوال کیا کہ حضرت خضر نے لڑکے کو کیسے قتل کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے تو لڑکوں کو قتل کرنے کی ممانعت فرمائی ہے (کیا پہلے بچوں کا قتل جائز تھا) حضرت ابن عباسؓ نے جواب میں لکھا اگر تجھے لڑکوں کی آئندہ حالت کا ویسا ہی علم ہو جائے جو موسیٰؑ کے علم والے ساتھی کو تھا تو تیرے لئے بھی بچوں کو قتل کرنا جائز ہو جائے گا، آپ کی مراد یہ تھی کہ عام مسلمانوں کے پاس تو وحی نہیں آتی (اور براہ راست اللہ کی طرف سے ان کو بچوں کے احوال بذریعہ وحی بتائے نہیں جاتے) رسول اللہ ﷺ کے بعد سلسلہ وحی منقطع ہو چکا ہے اس لئے اب امت اسلامیہ کے لئے بچوں کو قتل کرنا جائز نہیں (عقلی قرائن اور الہام وجہ جواز نہیں ہو سکتے) اور حضرت خضر کے پاس وحی آئی تھی اور ان کو حکم دیا گیا تھا پس رسول اللہ ﷺ کی ممانعت حضرت خضرؑ پر لاگو نہیں ہوتا ہے۔

ایک شبہ

علم معلوم کے تابع ہوتا ہے صحیح علم کے لئے معلوم کا خارج میں وجود اور تحقق ہونا ضروری ہے، اللہ جانتا تھا کہ وہ لڑکا اگر زندہ رہا تو کافر سرکش ہو گا لیکن وہ لڑکا زندہ ہی نہیں رہا نہ کفر و طغیان اس سے سرزد ہوا، خضر نے اس کو جوان ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا۔ اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ کا علم معلوم خارجی کے مطابق نہیں ہوا کیونکہ معلوم کا تحقق خارج میں ہوا ہی نہیں پھر کس طرح ایسے علم کو صحیح قرار دیا جا سکتا ہے جو معلوم خارجی کے مطابق نہیں تھا۔

جواب

مخلوق کا علم معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ معلوم خارجی سے مستفاد ہوتا ہے لیکن اللہ کا علم اس کے برعکس ہے وجود اشیاء اللہ کے علم کے تابع ہے اللہ کا علم اصل ہے اور معلوم خارجی اس کا تابع۔

حضرت مفسرؒ نے فرمایا

یہ جواب غیر مفید ہے اس سے اعتراض دفع نہیں ہوتا، علم تابع ہو اور معلوم اس کا متبوع یا معلوم تابع ہو اور علم متبوع، بہر صورت صحت علم کے لئے علم اور معلوم کی مطابقت ضروری ہے اور جب معلوم کا خارج میں وجود ہی نہ ہو تو مطابقت کا تصور ہی کس طرح ہو سکتا ہے۔ قضیہ شرطیہ کا خارج میں وجود ہی نہیں ہوا، لڑکا بالغ نہیں ہوا کفر و طغیان کا اس سے صدور نہیں ہوا تو ایسے معلوم سے جس کا خارجی وجود ہی نہیں ہوا علم کا صحیح تعلق کس طرح ممکن ہے۔ اس لئے صحیح جواب یہ ہے کہ قضیہ شرطیہ کا صدق اور اس سے علم کا صحیح تعلق صرف علاقہ لزوم پر موقوف ہے اگر شرط وجزا میں علاقہ لزوم ہے تو قضیہ سچا ہو گا خواہ شرط کا وجود محال ہی ہو اور جزا کا بھی وقوع نہ ہوا ہو صرف تعلق لزوم صحیح ہو جیسے آیت لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا قضیہ شرطیہ ہے اور صادق ہے اگر چند الٰہ ہوں گے یا ہوتے تو ضرور آسمان و زمین کی بربادی ہو جاتی یا ہو جائے گی۔ اس قضیہ کی سچائی میں آلہہ کا نہ ہونا اور آسمان و زمین میں تباہی واقع نہ ہونا مانع نہیں کیونکہ وجود آلہہ اور وقوع فساد کے درمیان تعلق صحیح ہے۔ اِنْ كَانَتِ الشَّمْسُ طَالِعَةً فَالنَّهَارُ مَوْجُودٌ میں علاقہ ملازمت صحیح ہے۔ جب سورج نکلے گا دن ہو جائے گا لیکن اس قضیہ شرطیہ کی صداقت نہیں چاہتی کہ سورج کبھی ضرور نکلے یا دن ضرور موجود ہو، طلوع آفتاب کبھی بھی نہ ہو اور دن کبھی بھی موجود نہ ہو تب بھی یہ قضیہ سچا ہو گا کیونکہ طلوع آفتاب اور وجود نہار میں تعلق لزوم صحیح ہے۔

ایک جدید شبہ اور اس کا جواب

دو چیزوں میں اگر لزوم کا تعلق ہو تو اس کا تقاضا ہے کہ ایک چیز کا وجود دوسری چیز کے وجود کی علت تامہ ہو (جیسے طلوع آفتاب وجود نہار کی علت ہے) یا دونوں کسی تیسری علت کے محتاج اور معلول ہوں اور اس تیسری علت نے ان دونوں کے درمیان لزوم پیدا کرا دیا ہو (جیسے دو اینٹیں محرابی شکل بنا کر کھڑی کر دی جائیں تو ہر اینٹ دوسری اینٹ کے سہارے سے قائم ہوتی ہے اگر دونوں میں سے کسی اینٹ کو ہٹا دیا جائے اور سہارا ختم ہو جائے تو دوسری اینٹ گر پڑے گی، مگر دونوں اینٹوں میں سے کسی کی بقاء بذات خود دوسری پر موقوف نہیں ہے بلکہ کسی معمار نے ان دونوں کو اس طرح کھڑا کر دیا ہے کہ ہر ایک دوسری کے سہارے سے قائم ہے۔ یہ معمار دونوں میں لزوم پیدا کرانے کی علت ہے) اب بتاؤ اس لڑکے کے زندہ رہنے اور کفر کرنے میں لزوم کس طرح کا تھا۔ لڑکا خود کفر کی علت تامہ نہیں ہو سکتا اور نہ کسی تیسرے نے ان دونوں کے درمیان لزوم کا تعلق پیدا کر لیا کہ لڑکا زندہ ہی بغیر کفر کے نہ رہ سکتا ہو۔

اس کے جواب کے لئے ہم کو اہل تصوف کی تحقیقات سے استفادہ کرنا ہو گا۔ اہل تصوف کہتے ہیں کہ اشیاء کے وجود خارجی سے مقدم اور اصل اشیاء کی ماہیات کا ثبوت ہے ان ہی ماہیات ثابتہ کو حقائق امکانیہ اور اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے۔ اعیان ثابتہ اللہ کی صفات کا عکس پرتو اور ظل ہیں اور اشیاء کا وجود خارجی اعیان ثابتہ کا پرتو اور ظل ہے، اعیان ثابتہ کا مبدء اور اصل اللہ کی صفات ہیں اور اللہ کی صفات مختلف اور متعدد ہیں۔ ہادی ہونا اور گمراہ کرنا بھی اللہ کی صفات ہیں۔ اعیان ثابتہ میں سے جس عین ثابت پر صفت ہدایت اثر انداز ہوتی ہے وہ ہدایت یاب ہوتا ہے اور جس پر صفت اضلال پر تو فگن ہوتی ہے وہ گمراہ ہوتا ہے اور اسی پر اشیاء کے وجود خارجی کی بنا ہوتی ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ علم الٰہی میں معلوم تابع ہوتا ہے اور علم متبوع (جیسا علم ہوتا ہے خارجی وجود ویسا ہی ہو جاتا ہے علم اصل ہے اور موجودات خارجیہ اس کا فوٹو اور کاپی) پس جن اشیاء کا مبدأ تعین صفت اضلال ہے اور وہ صفت اضلال کی پرتو ہیں ان کا گمراہ ہونا اور گمراہی کا ان سے ظاہر ہونا لازم ہے اور جن اشیاء کا مبدأ تعین صفت

ہدایت ہے ان کا ہدایت یاب ہونا ضروری ہے۔ صفت اضلال کے مظہر کا گمراہ اور شقی ہونا اور صفت ہدایت کے مظہر کا ہدایت یاب اور سعید ہونا لازم ہے، یہی مطلب ہے اس فرمان نبوی ﷺ کا جس کے راوی حضرت علیؓ ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا ہر ایک کے لئے وہی (راہ) آسان کر دی جاتی ہے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے جو شخص اہل سعادت میں سے ہوتا ہے اس کے لئے اہل سعادت کے اعمال آسان کر دیے جاتے ہیں (اہل سعادت کے عمل کی اس کو توفیق دیدی جاتی ہے)

اور جو اہل شقاوت میں سے ہوتا ہے اس کے لئے اہل شقاوت کا عمل آسان کر دیا جاتا ہے (اہل شقاوت کے اعمال کی توفیق دیدی جاتی ہے) متفق علیہ۔

اس لڑکے کی تخلیق کفر پر ہونے کا یہی معنی ہے کہ اس کا مبداء تعین ضلال تھا (لامحالہ اس کو گمراہ ہونا تھا) ظہور ضلالت سے پہلے اس کا مر جانا اس کے لئے بھی مفید تھا اور اس کے والدین کے لئے بھی اور یہ سب کچھ اللہ کی مہربانی سے ہوا۔ اللہ پر لازم نہیں کہ بندہ کے لئے جو زیادہ مفید ہو وہی کام کرے۔ یہ مسلک تو معتزلہ کا ہے جو وجوب اصلح کے قائل ہیں۔ اگر اللہ پر زیادہ مفید کام کو واجب قرار دیا جائے گا تو آئندہ ہونے والے ہر کافر کو بچپن میں مار ڈالنا بھی اللہ پر واجب قرار پائے گا۔ حقیقت میں یہ اللہ کی مہربانی ہے وجوب نہیں کہ بندہ کے لئے جو بات زیادہ مفید ہو اللہ وہی کرے۔ واللہ اعلم

فَاَرَدْنَآ پس ہم نے چاہا، حضرت خضرؑ نے جمع کا صیغہ بول کر اپنے ساتھ ارادہ کرنے میں اللہ کو شریک بنالیا اور ظاہر ہے کہ اللہ کے ارادے کا تعلق اللہ کے فعل سے ہو سکتا ہے، لیکن خضر کے ارادے کا تعلق اللہ کے فعل سے ہو جائے یا ناممکن ہے خضر کے ارادے سے اللہ کا فعل نہیں ہو سکتا اس لئے ارادہ کا معنی اس جگہ حقیقی نہیں بلکہ چاہنا مراد ہے۔

اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا کہ ان کا رب (اس لڑکے کا) عوض عطا فرمادے۔ اول لڑکے کو ہلاک کرنے کی جگہ دوسرے لڑکے کو پیدا کر دینا، پہلے لڑکے کے ہلاک ہونے کا عوض اور بدل تھا اور ہلاک کرنے کے مرتکب حضرت خضرؑ تھے مگر دوسرے لڑکے کو پیدا کرنا خالص اللہ کا کام تھا اس میں حضرت خضرؑ کے فعل کو دخل نہ تھا اس لئے يُبْدِلَ فعل کی نسبت خالص اللہ کی طرف کی۔ يُبْدِلَ کی بجائے يُبَدِّلَ بھی متواتر قرأت ہے۔ اِبْدَال اور تَبْدِيْل دونوں ہم معنی ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ تبدیل عام ہے۔

نفس شئی کو ہی بدل دینا یا اس کی حالت کو بدل دینا دونوں کو تبدیل کہتے ہیں اور ابدال اصل شئی کے بدلنے کو کہتے ہیں مگر بغوی کی یہ تحقیق غلط ہے اگر ایسا ہوتا تو دوسری قرأت متواتر نہ ہوتی دونوں قرأتوں کو جمع کرنا ناممکن ہو جائے گا (کیونکہ اختلاف قرأت سے معنی میں تغیر آجائے گا)

خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً جو اس سے زیادہ (گناہوں اور بدکاریوں سے) پاک ہو۔

وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾ اور (ماں باپ پر) مہربانی اور رحم کرنے کے لحاظ سے (والدین سے) بڑا قرب رکھنے والا ہو۔ رُحْم بمعنی رحمت ہے۔

بعض علماء نے رُحْمًا کو رَحِم سے مشتق مان کر قرابت ترجمہ کیا ہے۔ قتادہ نے کہا بڑا اصل رحم کرنے والا اور ماں باپ کا بڑا فرماں بردار خدمت گزار بغوی نے کلبی کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے اس لڑکے کے عوض اس کے والدین کو ایک لڑکی عطا فرمائی جس سے ایک پیغمبر نے نکاح کیا اور اس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوا جس نے ایک امت کو ہدایت یافتہ بنا دیا۔ حضرت جعفر بن محمدؒ نے فرمایا اللہ نے والدین کو ایک لڑکی دی جس کی نسل سے ستر پیغمبر پیدا ہوئے۔ ابن جریجؒ نے کہا اس کے عوض اللہ نے ایک فرماں بردار مسلم لڑکا عنایت کیا۔ ابن ابی شیبہ، ابن المنذر اور ابن ابی حاتمؒ نے عطیہ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک لڑکی اللہ نے ان کو دی جس کے بطن سے پیغمبر پیدا ہوا۔ حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول بھی اسی طرح روایت میں آیا ہے۔ ابن المنذر نے دوسری سند سے یوسف بن عمر کے حوالہ سے بیان کیا کہ اللہ نے اس لڑکے کے عوض ایک لڑکی عطا فرمائی جس سے بہت پیغمبر پیدا ہوئے۔ یہ قول بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ترمذی و حاکم نے حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا ہے اور

حاکم نے حضرت ابودرداءؓ کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی قرار دیا ہے۔

مطرف نے کہا جب وہ لڑکا پیدا ہوا تھا تو اس کے ماں باپ خوش ہوئے تھے پھر جب وہ قتل ہو گیا تو والدین کو غم ہوا اگر وہ زندہ رہتا تو ماں باپ کی تباہی کی یقینی تھی۔ آدمی کو چاہئے کہ اللہ کے حکم پر راضی رہے، اللہ مومن کے لئے اگر نا گوار فیصلہ بھی کرتا ہے جب بھی مومن کے لئے اس بات سے بہتر ہوتا ہے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں مومن پر لازم ہے کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند دونوں میں اللہ کی مخفی تدبیر سے ڈرتا ہے اس کی رحمت کا امیدوار رہے اور اسی سے پناہ کا طلب گار رہے، اللہ کے حکم پر اعتراض نہ کرے، ہر حال میں اس کے فیصلہ پر راضی رہے۔

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا

اور دیوار کا قصہ یہ تھا کہ وہ بستی کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور دیوار کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا۔

بغوی نے لکھا ہے ان دونوں لڑکوں کے نام اصرم اور صریم تھے۔ کَنْزٌ کا ترجمہ عکرمہ نے مال کیا ہے۔ حضرت ابودرداءؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا سونے چاندی کا خزانہ تھا۔ یہ حدیث بخاری نے تاریخ میں اور حاکم نے بیان کی ہے اور حاکم نے اسکو صحیح بھی کہا ہے۔ طبرانی نے اس آیت کی تشریح میں حضرت ابودرداءؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ ان کیلئے کنز (نا معلوم دفینے) حلال کر دیئے گئے تھے اور مال غنیمت حرام کر دیا گیا تھا اور ہمارے لئے کنز حرام کر دیئے گئے اور مال غنیمت حلال کر دیا گیا۔

(حضرت مفسرؒ نے فرمایا) میں کہتا ہوں ہمارے لئے کنز حرام کر دیئے جانے کا یہ مطلب ہے کہ سونا چاندی بغیر زکوٰۃ ادا کئے جمع کر کے رکھنا ہمارے لئے حرام کر دیا گیا ہے، اللہ نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اس کو خرچ نہیں کرتے ان کو دکھ والے عذاب کی خوش خبری دیدو۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا جس مال کی زکوٰۃ دیدی جائے وہ کنز نہیں ہے، خواہ اس کو دفینہ بنا کر ہی رکھا جائے اور جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو وہ کنز ہے خواہ اس کو زمین میں دفن نہ کیا گیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی والوں پر زکوٰۃ فرض نہ تھی جب ہی تو حضرت ابودرداءؓ نے فرمایا کہ ان کے لئے مال کو کنز بنا کر رکھنا حلال کر دیا گیا تھا۔

بغوی نے سعید بن جبیرؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ کنز کچھ صحیفوں کی شکل میں تھا جس میں علم تھا (گویا علمی خزانہ تھا) حاکم نے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ کنز سونے چاندی کا نہ تھا بلکہ علمی صحیفے تھے۔ ابن ابی حاتم نے ربیع بن انس کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ بروایت بغوی حضرت ابن عباسؓ کا دوسرا قول آیا ہے کہ وہ سونے کی ایک تختی تھی جس میں تحریر تھا، تعجب ہے کہ جس کو رزق (مقدر) ملنے کا یقین ہو وہ (تلاش رزق میں) تھکتا کیوں ہے (کیوں کمائی کے لئے سرگرداں پھرتا ہے) تعجب ہے کہ جس کو (آخرت کے) حساب پر یقین ہے وہ غافل کیسے رہتا ہے۔ تعجب ہے کہ جو زوال دنیا کا یقین رکھتا ہے وہ (حاصل شدہ) دنیا پر مطمئن ہو کر کیسے بیٹھ جاتا ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ تختی کے دوسری طرف لکھا تھا میں ہی اللہ ہوں میں اکیلا ہوں میرا کوئی ساجھی نہیں۔ میں نے خیر و شر کو پیدا کیا خوشی ہے اس شخص کے لئے جس کو میں نے خیر کے واسطے پیدا کیا اور اس کے ہاتھوں سے خیر کو جاری کرایا اور ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جس کو میں نے شر کے لئے پیدا کیا اور شر کو اس کے ہاتھوں سے جاری کیا۔ بزار نے یہ حدیث ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابوذرؓ کی روایت سے مرفوعاً بیان کی ہے۔ ابن مردویہ نے بھی حضرت علیؓ کی روایت سے اس کو مرفوع قرار دیا ہے لیکن خرائطی نے قمع الحرص میں اس کو حضرت ابن عباسؓ کا قول کہا ہے۔ زجاج نے کہا لفظ کَنْزٌ اگر بے قید (بغیر مضاف الیہ کے) بولا جاتا ہے تو اس سے مالی خزانہ مراد ہوتا ہے اور قید (مضاف الیہ) کے ساتھ بولا جاتا ہے تو دوسری چیزوں کا خزانہ بھی مراد ہوتا ہے جیسے کَنْزُ الْعِلْمِ علم کا خزانہ اور تختی میں دونوں باتیں تھیں (وہ سونے کی بھی تھی اور وہ علم کا خزانہ بھی تھی)

وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا اور ان دونوں یتیموں کا باپ نیک تھا۔ بعض اہل علم نے اس شخص کا نام کاشح بیان کیا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا باپ کی نیکی کی وجہ سے (اللہ کی طرف سے) دونوں یتیموں کی حفاظت کی گئی یعنی باپ کی نیکی کی وجہ سے یتیموں کی حفاظت کے لئے اللہ نے دیوار درست کر دینے کا حکم خضر کو دیا۔ محمد بن منکدر کا قول ہے کہ بندہ کے نیک ہونے کے سبب اللہ اس کی اولاد کی اولاد، کنبہ، خاندان اور ہمسایوں کی بھی حفاظت فرماتا ہے۔ سعید بن مسیب نے بیان کیا میں نماز پڑھتا ہوں اور اولاد کا خیال آجاتا ہے تو نماز اور بڑھا دیتا ہوں (تاکہ میری نماز کی وجہ سے اولاد کی حفاظت رہے)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرد صالح دونوں یتیموں کا باپ نہیں تھا بلکہ ساتواں دادا تھا (یعنی سات نسلوں تک ایک شخص کی نیکی کا اثر باقی رہا) ابن ابی حاتم نے سلیمان بن سلیم کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ توریت میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کسی نیک کی نیکی کی وجہ سے سات صدیوں تک (اس کی نسل اور قوم کی) حفاظت کرتا اور (کسی کی بدکرداری کی وجہ سے) سات صدیوں تک تباہی قائم رکھتا ہے۔

آیت دلالت کر رہی ہے کہ صلحاء کی اولاد کی رعایت اور ان کے فائدے کے لئے امکانی کوشش مسلمانوں پر لازم ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ کافر اور اللہ سے سرکش نہ ہوں اگر کافر یا سرکش ہوں تو وہ زیادہ سزا کے مستحق ہیں دوسرے لوگوں کی سرکش اولاد سے صلحاء کی طاغی اولاد پر زیادہ سختی کی جائے۔ حضرت خضرؑ کا اس لڑکے کو قتل کر دینا جس کے آئندہ کافر ہونے اور ماں باپ پر وبال پڑنے کا اندیشہ تھا اس قول کی تائید کر رہا ہے۔

فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا پس آپ کے رب نے چاہا کہ وہ اپنی بھرپور جوانی کو پہنچ جائیں۔ اَشُدّ کا معنی ہے پوری پوری سوجھ بوجھ (کمال رُشد) اور قوت۔ کہا گیا ہے کہ اَشُدّ کی عمر ۱۸ سال ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا ظاہر قول یہ ہے کہ پچیس کی عمر میں آدمی حدِ اَشُدّ (کمال رُشد) کو پہنچ جاتا ہے (یعنی اس کے بعد کمال رشد کو پہنچنے کی امید نہیں رہتی اگر پچیس سال تک کوئی کمال رشد کو نہیں پہنچا تو پھر اس سے زیادہ عمر میں بھی اس کو پورا رشد حاصل نہیں ہوگا) اسی لئے اگر کسی سادہ لوح سبک سر کی عمر پچیس سال ہو جائے (سمجھا جائے گا کہ اس کو جتنی سمجھ بوجھ ملنی تھی مل گئی آئندہ انتظار غیر ضروری ہے) اس کا مال اس کو دیدیا جائے گا کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ۔ حضرت مفسرؒ نے فرمایا میرے نزدیک چالیس سال کی عمر میں آدمی حدِ اَشُدّ کو پہنچتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً

وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ اور اپنا دفینہ نکال لیں میں نے یہ سارے کام آپ کے رب کی مہربانی (یعنی الہام یا وحی) سے کئے ہیں۔

بیضاوی نے لکھا ہے حضرت خضرؑ نے کشتی کو عیب دار بنانے کے ارادے کی نسبت صرف اپنی ذات کی طرف کی، کیونکہ عیب دار بنانا انہی کا فعل تھا، اپنے فعل کا ارادہ خود انہوں نے ہی کیا تھا اس کے بعد اَرَدْنَا کہنے میں اپنے ساتھ اللہ کو بھی فاعل ارادہ قرار دیا۔ کیونکہ ہلاک یعنی قتل کرنا حضرت خضرؑ کا فعل تھا۔ قتل کے فاعل وہ خود تھے اور مقتول لڑکے کی جگہ دوسری اولاد کو پیدا کرنا اللہ ہی کا کام تھا اور اللہ کے کام کا ارادہ اللہ کے سوا کون کر سکتا ہے، اسی لئے تیسری جگہ فَاَرَادَ رَبُّكَ میں ارادہ کی نسبت صرف اللہ کی طرف کی کیونکہ یتیم لڑکوں کے بالغ اور جوان ہونے میں اللہ کے ارادہ کے علاوہ کسی اور کا دخل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

یا یوں کہا جائے کہ کشتی توڑنا فی نفسہ شر ہے (اگر اس میں خیر تھی تو اضافی تھی) اس لئے اپنی ذات کی طرف نسبت کی اور تیسرا فعل سراسر خیر ہے اس لئے اس کی نسبت اللہ کی طرف کی اور دوسرے فعل میں شر اور خیر مخلوط تھی اس لئے اپنے ساتھ اللہ کی طرف بھی نسبت کی۔ یا یوں کہا جائے کہ اسباب و وسائط کی طرف توجہ کرنے میں عارف کا حال مختلف ہوتا ہے (کبھی خالص وسائط کی طرف توجہ ہوتی ہے کبھی وسائط سے بالکل منہ موڑ لیتا ہے، کبھی مخلوط التفات ہوتی ہے)

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ؕ اور (جو کچھ آپ نے دیکھا) میں نے اس میں سے کوئی حرکت اپنی رائے سے نہیں کی۔ بلکہ اللہ کے حکم سے کی۔

ع ۱۰/۱۲/۱ ذٰلِكَ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا ؕ۝۸۲ یہ تشریح ہے ان باتوں کی جن پر آپ صبر نہیں کر سکتے تھے۔

بغوی کا بیان ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ حضرت خضرؑ سے جدا ہونے لگے تو فرمایا مجھے کچھ نصیحت کیجئے، حضرت خضرؑ نے کہا علم کی طلب لوگوں سے بیان کرنے کے لئے نہ کرنا بلکہ عمل کرنے کے لئے علم کی طلب کرنا۔ بیضاوی نے لکھا ہے اس قصہ سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آدمی کو اپنے علم پر غرور نہ کرنا چاہئے اور جو بات پسند نہ آئے اور صحیح نہ معلوم ہو اس کے انکار میں عجلت نہ کرے ممکن ہے اس کی تہ میں ایک ایسی پوشیدہ حقیقت ہو جس سے یہ شخص ناواقف ہو۔ میں کہتا ہوں جس شخص کی بات کو صحیح نہ سمجھا جارہا ہو، اگر وہ عالم ہو دیندار ہو اور متقی ہو تب تو اس کے فعل کا فوری انکار کر دینا اور بھی نامناسب ہے۔ اس سے برابر سیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے، معلم کا ادب کیا جائے، گفتگو میں تہذیب رکھی جائے۔ قصوروار کو اس کے قصور پر متنبہ کرنا اور پھر معاف کر دینا چاہئے اور جب اس سے بار بار قصور سرزد ہو تو اس سے جدائی اختیار کر لی جائے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے اس قصہ سے ان تمام امور کی تعلیم مستفاد ہو رہی ہے۔

کیا حضرت خضرؑ اب بھی زندہ ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے اس سلسلہ میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض کا خیال ہے خضر والیاس دونوں زندہ ہیں، ہر سال حج میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے، خضر نے آب حیات پی لیا تھا، ذوالقرنین جب آب حیات کی تلاش میں ظلمات میں داخل ہوا تو خضر کو اپنے ساتھ لے گیا، خضر ہراول دستہ میں آگے آگے تھے، چلتے چلتے خضر چشمے پر پہنچ گئے اتر کر انہوں نے چشمہ کے پانی سے غسل کیا اور کچھ پی لیا اور اللہ کا شکر ادا کیا، ذوالقرنین راستہ بھٹک گیا اور نامراد واپس آگیا۔

(اکثر) علماء کا خیال ہے کہ خضر وفات پاچکے، اللہ نے فرمایا ہے وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ آپ سے پہلے ہم نے کسی انسان کو بقاءِ دوامی نہیں دی۔ ایک رات عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے یہ بات دکھادی گئی (اب سے (آئندہ) سو برس کی انتہا تک ہر وہ شخص جو اس وقت روئے زمین پر زندہ ہے (مرجائے گا) زندہ نہیں رہے گا۔ مولف حصن حصین نے التعزیہ میں یہ حدیث نقل کی ہے۔ حاکم نے مستدرک میں حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ایک (اجنبی) شخص آگیا، سپید داڑھی، کھلتا ہوا رنگ، جسامت میں بھاری آتے ہی لوگوں کی گردنیں پھلانگتا آگے بڑھ گیا اور رونے لگا۔ پھر صحابہ کی طرف رخ کر کے کہا ہر مصیبت کی تسلی اور ہر فوت شدہ کا عوض اور ہر مرنے والے کا جانشین اللہ ہی کے پاس ہے اسی کی طرف رجوع کرو، وہ تمہاری اس مصیبت میں تم کو دیکھ رہا ہے۔ تم انتظار کرو دکھ ایسے شخص کا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی اس کے بعد وہ آدمی واپس چلا گیا۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ نے فرمایا، یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

حضرت خضرؑ سے اولیاء کرام کی ملاقات اور تحصیل فیض کی حکایتیں تو مشہور ہی ہیں، یہ روایات بتاتی ہیں کہ خضر زندہ ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ خضر اگر زندہ ہوتے تو رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے کنارہ کش نہ رہتے۔ حضور ﷺ کی بعثت تو سب ہی لوگوں کے لئے تھی۔ خضر کیسے مستثنیٰ ہو سکتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، اگر موسیٰؑ میرے زمانہ میں زندہ ہوتے تو میری اتباع کے بغیر ان کے لئے بھی کوئی چارہ نہ ہوتا (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان عن جابر بن عبد اللہ) آسمان سے اترنے کے بعد حضرت عیسیٰؑ بھی امت اسلامیہ ہی کے ایک فرد کے پیچھے نماز پڑھیں گے (یعنی امام مہدی کی اقتداء کریں گے) رواہ مسلم عن ابی ہریرۃؓ و جابر بن عبد اللہؓ

اس مسئلہ کا واحد حل حضرت مجددؒ کے بیان سے ہو سکتا ہے۔ حضرت مجددؒ صاحب سے جب حضرت خضرؑ کے زندہ یا

مردہ ہونے کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے اللہ کی طرف توجہ کی اور بارگاہ قدس سے اس کا جواب ملنے کی دعا کی۔ چنانچہ عالم مراقبہ میں آپ نے دیکھا کہ خضر سامنے آگئے ہیں۔ حضرت مجدد صاحب نے حضرت خضرؑ سے خود ان کی حالت دریافت کی۔ حضرت خضر نے فرمایا میں اور الیاس دونوں زندہ نہیں ہیں لیکن اللہ نے ہماری روحوں کو ایسی طاقت عطا فرمادی ہے کہ ہم جسم کا لباس پہن کر بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتاتے اور مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں اگر اللہ چاہتا ہے (بعض لوگوں کو) علم لدنی بھی تعلیم کرتے اور نسبت بھی عطا کرتے ہیں۔ ہم کو اللہ نے قطب مدار کا مددگار بنایا ہے۔ قطب مدار کو اللہ نے مدار عالم بنایا ہے انہی کی برکت سے یہ عالم قائم ہے، ہم ان کی مدد کرتے ہیں اس زمانہ میں ان کا مسکن ملک یمن ہے، وہ فقہ شافعی کے پیرو ہیں، ہم بھی قطب مدار کے ساتھ شافعی فقہ کے موافق نماز پڑھتے ہیں۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَن ذِى ٱلْقَرْنَيْنِ ۖ اور وہ (یہودی یا مکہ کے مشرک بطور امتحان) آپ سے ذوالقرنین کے متعلق سوال کررہے ہیں۔ بغوی نے کہا ہے بعض علماء کے نزدیک ذوالقرنین کا نام مرزبان بن مرزبہ تھا یہ یونانی تھا اور یافث بن نوحؑ کی نسل میں سے تھا بعض نے کہا وہ رومی تھا سکندر بن فیلبس بن فیلقوس نام تھا میرے نزدیک مؤخر الذکر قول زیادہ صحیح ہے۔ شیرازی نے الالقاب میں اور ابن اسحاق و ابن المنذر و ابن ابی حاتم نے وہب بن منبہ یمنی کا بیان نقل کیا ہے، وہب بن منبہ گزشتہ واقعات تاریخی کا بڑا عالم تھا کہ ذوالقرنین رومی تھا ایک بڑھیا کا اکلوتا بیٹا تھا، بڑھیا کی کوئی اور اولاد نہ تھی ذوالقرنین کا نام سکندر تھا۔ ابن المنذر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ سکندر ہی ذوالقرنین تھا۔

بغوی نے لکھا ہے ذوالقرنین نبی تھا یا نہیں، یہ اختلافی مسئلہ ہے کچھ لوگ کہتے ہیں نبی تھا۔ ابوالطفیل کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ سے ذوالقرنین کے متعلق دریافت کیا گیا کہ وہ نبی تھا یا بادشاہ تھا، حضرت علیؓ نے فرمایا، نہ وہ نبی تھا نہ بادشاہ تھا، ایک ایسا بندہ تھا جو اللہ سے محبت کرتا تھا اور اللہ اس سے محبت کرتا تھا اس نے اللہ کی فرمانبرداری خلوص سے کی اللہ نے اس کو خیر عطا فرمائی۔ ابن مردویہ نے سالم بن ابی الجعد کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا، کیا ذوالقرنین نبی تھا۔ فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا تھا کہ ذوالقرنین اللہ کا مخلص فرماں بردار بندہ تھا۔ اللہ نے بھی اس کے خلوص کی قدردانی کی۔ بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے سنا ایک شخص دوسرے کو ذوالقرنین کہہ کر پکار رہا ہے۔ فرمایا پیغمبروں کے ناموں پر اپنے نام رکھنے پر تم نے قناعت نہیں کی کہ اب فرشتوں کے ناموں پر اپنے نام رکھنے لگے، اکثر علماء کا خیال ہے کہ ذوالقرنین ایک عادل نیک بادشاہ تھا۔ ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ کیا تھی بغوی نے اس کے متعلق مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔

(۱) آفتاب کے دو کنارے ہیں مشرق اور مغرب ذوالقرنین دونوں کناروں تک جا پہنچا تھا۔

(۲) روم اور فارس دونوں کا بادشاہ تھا۔

(۳) روشن دنیا میں بھی وہ رہا اور ظلمات میں بھی داخل ہوا (شاید یہ مراد ہے کہ افریقہ بلادِ سوڈان اور روم دونوں جگہ گیا۔ نور سے مراد گوروں کا ملک اور ظلمت سے مراد کالوں کا ملک)

(۴) اس نے خواب دیکھا تھا کہ آفتاب کے دونوں کنارے اس نے پکڑ لئے ہیں۔

(۵) اس کے دو خوبصورت گیسو تھے (قرن گیسو یا زلف)

(۶) اس کے دو سینگ (یعنی سر میں دو ابھار) تھے جن کو عمامہ سے چھپائے رکھتا تھا۔ ابن عبدالحکم نے یونس بن عبید کی روایت سے اور شیرازی نے الالقاب میں قتادہ کے حوالہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔

(۷) ابوالطفیل کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ یہ بیان فرمائی کہ اس نے اپنی قوم کو اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کی، قوم نے اس کے سر کے دائیں طرف ایسی چوٹ ماری کہ وہ مر گیا پھر اللہ نے اس کو زندہ کر دیا اور اس نے قوم کو اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کی، قوم نے پھر اس کے سر کے بائیں جانب ایسی ضرب لگائی کہ وہ مر گیا، مگر اللہ نے اس کو پھر زندہ کر دیا (قرن کھوپڑی کا دایاں بایاں ابھار یا پیشانی کا دایاں بایاں رخ)

احمد نے الزہد میں اور ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے العظمۃ میں ابوالورقاء کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا۔ ذوالقرنین کے دو سینگ کیسے تھے فرمایا تم خیال کرتے ہو گے کہ سونے یا چاندی کے دو سینگ تھے ایسا نہ تھا بلکہ وہ نبی تھے اللہ نے امت کو ہدایت کرنے کے لئے ان کو مبعوث فرمایا تھا انہوں نے امت کو دعوت دی لوگوں نے ان کے سر کے بائیں جانب ایسی چوٹ ماری کہ وہ مر گئے پھر اللہ نے ان کو زندہ کر دیا اور دعوت کا حکم دیا انہوں نے قوم کو دعوت دی لوگوں نے ان کے سر کے دائیں جانب ایسی ضرب رسید کی کہ وہ مر گئے اور اللہ نے ان کا نام ذوالقرنین رکھ دیا۔

قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾ آپ کہہ دیجئے (اے سائلو) میں اس کے حال کا کچھ تذکرہ تمہارے سامنے (اللہ کا بیان کیا ہوا) تلاوت کرتا ہوں۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِی الْاَرْضِ ہم نے ہی اس کو زمین میں اقتدار عطا کیا تھا۔ وہ جس طرح چاہتا تھا حکم چلاتا تھا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا بادل کو ذوالقرنین کے حکم کے تابع بنا دیا گیا تھا، ابر پر وہ سوار ہوتا تھا اس کے ذرائع دراز کر دیئے گئے تھے، اس کے لئے روشنی پھیلا دی گئی تھی (یعنی رات بھی اس کے لئے روشن کر دی گئی تھی) کہ رات دن اس کے لئے برابر تھے تَمْكِيْن فِي الْاَرْض کا یہی معنی ہے، مطلب یہ ہے کہ زمین پر رفتار اس کے لئے آسان کر دی گئی اور سارے راستے اس کے لئے کھول دیئے گئے تھے (راستے آسان کرنے کا شاید یہ مقصود ہو کہ ہر طرح کی سواری اس کو میسر تھی اور رات دن یا موسم کا اختلاف اس کی رفتار پر اثر انداز نہ ہوتا تھا)

وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ اور ہر قسم کا سامان ہم نے اس کو عطا کر دیا تھا یعنی جو چیز وہ چاہتا تھا اور جس طرف رخ کرتا تھا اس کا علم، قدرت اور دوسرے کار برآری کے ذرائع ہم نے اس کو عطا کر دیئے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ مخلوق کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے ذوالقرنین کو اس کے حصول کے ذرائع ہم نے دیدیئے تھے یا یہ مقصد ہے کہ بادشاہوں کو دشمنوں سے لڑنے اور ملک فتح کرنے میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب ذوالقرنین کو ہم نے دیدی تھیں۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ زمین کے کناروں کو ہم نے اس کے لئے قریب کر دیا تھا۔ بغوی نے لکھا ہے حسن بصری نے سَبَبًا کا ترجمہ بلاغاً کیا ہے یعنی مقصد تک پہنچانے والے اسباب ہم نے ذوالقرنین کو دیدیئے تھے۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ سو وہ ایک راہ پر ہو لیا۔

اَتْبَعَ پہنچ گیا۔ مَارِلْتُ اَتْبَعُهٗ حَتّٰی اَتْبَعْتُهٗ میں نے برابر اس کا پیچھا کیا یہاں تک کہ اس تک پہنچ گیا۔ کذا روی عن الاصمعی۔ سَبَبًا سے اس جگہ مراد ہے راستہ یعنی مغرب کی طرف، حضرت ابن عباسؓ نے ترجمہ کیا فرودگاہ، منزل۔

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ یہاں تک کہ جب وہ (ارض مسکونہ کے انتہائی پچھمی جانب) آفتاب غروب ہونے کے مقام پر پہنچا۔

وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ تو دلدلی چشمہ میں سورج کو ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ حَمِئَةٍ سیاہ دلدل۔ حَمِأَتِ الْبِئْرُ کنوئیں میں کالی کیچڑ ہو گئی۔ بغوی کا بیان ہے حضرت معاویہؓ نے کعب احبارؓ سے پوچھا سورج کیسے غروب ہوتا ہے توریت میں تم نے اس کے متعلق کیا پڑھا، کعب نے کہا ہم نے توریت میں پایا ہے کہ سورج پانی اور کیچڑ میں غروب ہوتا ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے شاید ذوالقرنین سمندر کے کنارے پہنچ گیا ہو گا اور وہاں اس کو ایسا لگا ہو گا جیسے سورج دلدل میں غروب ہو رہا ہے کیونکہ جہاں تک اس کی نظر پہنچی ہو گی پانی اور کیچڑ ہی دکھائی دی ہو گی۔ اسی لئے اللہ نے وَجَدَهَا تَغْرُبُ (سورج کو دلدل میں ڈوبتا محسوس کیا) فرمایا کَانَتْ تَغْرُبُ (سورج دلدل میں ڈوبتا تھا) نہیں فرمایا۔ کذا قال القتیبی۔

وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ۬ اور اس چشمے کے پاس ذوالقرنین نے ایک قوم کو پایا۔ بیضاوی نے کہا وہ لوگ کھال کا لباس پہنتے تھے اور کافر تھے اور سمندر جو مردہ مچھلیاں یا دوسرے بحری جانور کنارے پر پھینک دیتا تھا وہی ان کی غذا تھی۔

قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾

ہم نے کہا اے ذوالقرنین تو (چاہے تو) ان کو سزا دے اور چاہے تو ان کے معاملے میں نرمی کا سلوک کرے (تجھے دونوں طرح کا اختیار ہے)

یعنی پہلے اس قوم کو توحید کی دعوت دو اگر نہ مانیں اور کفر پر جمے رہیں تو ان کو سزا دو قتل کر دو، اگر توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو ان کی عزت کرو، ہدایت کرو، شرائع الٰہیہ سکھاؤ۔ اس جگہ اِمَّا تقسیم کے لئے ہے (تردید کے لئے نہیں ہے) جیسے آیت ذیل میں لفظ اَوْ تقسیم کے لئے ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (یعنی مختلف حالات کے لئے مختلف احکام ہیں توبہ کر لیں تو درگزر کرو، کفر پر جمے رہیں تو عذاب دو) بعض علماء کے نزدیک اِمَّا تخییر کے لئے ہے یعنی اللہ نے ذوالقرنین کو اختیار دے دیا کہ تم چاہو تو ان کے کافر ہونے کی وجہ سے ان کو قتل کر دو اور چاہو تو ان کو اسلام کی دعوت دو۔ اسلام کی دعوت ہی اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا سے مراد ہے۔ بعض نے کہا ذوالقرنین کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ چاہیں تو ان لوگوں کو قتل کر دیں اور چاہیں تو قید کر لیں، قتل کرنے کے مقابلہ میں قید کر دینا حسن سلوک ہے، اول الذکر دونوں مطلبوں کی تائید آئندہ آیات سے ہو رہی ہے۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ِۨ الْحُسْنٰى ۚ

ذوالقرنین نے کہا جو ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے، پھر اس کو اس کے رب کے پاس لوٹا کر لے جایا جائے گا وہ اس کو سخت ترین سزا دے گا اور جو ایمان لے آئے گا اور اچھے کام کرے گا اس کے لئے نیکی کا اچھا بدلہ ہوگا، یعنی اللہ کے حکم کی تعمیل میں یا اللہ کی طرف سے اختیار لینے کے بعد جب اس نے دعوت اسلام دیدی تو کہا کہ میری اس دعوت کے بعد جو کوئی کفر پر جما رہا اور شرک کی صورت میں اپنے اوپر خود ظلم کرتا رہا تو میں اور میرے ساتھی اس کو قتل کر دیں گے اور آخرت میں اللہ اس کو ایسا عذاب دے گا جو کسی کے قلم میں نہیں، وہ انتہا عظیم ترین اور غیر معمولی ہوگا کہ اس دنیا میں کسی کے سامنے نہیں آیا۔ نیک کام کرنے سے مراد ہے تقاضاء ایمان کے موافق عمل کرنا۔

وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝ اور ہم اپنے برتاؤ میں اس کے لئے آسان بات کہیں گے۔

یُسْر آسان سہولت والا جو دشوار نہ ہو۔ مجاہد نے یُسْرًا کا ترجمہ کیا مَعْرُوْفًا اچھا بھلا۔ اللہ نے ذوالقرنین کو (براہ راست) خطاب کیا اور وحی بھیجی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نبی تھا، صاحب وحی تھا۔

بغوی نے لکھا ہے صحیح ترین بات یہ ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھا اور وحی سے مراد اس جگہ الہام ہے (جیسا کہ اولیاء اللہ کو ہوتا ہے)

میں کہتا ہوں ممکن ہے کسی پیغمبر کی معرفت ذوالقرنین کو یہ پیام ملا ہو اور بعض انبیاء بنی اسرائیل میں سے اس کے ساتھ بھی کسی نبی کو اس کی اصلاح اور درستگی قائم رکھنے کے لئے لگا دیا گیا ہو۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ پھر وہ (مشرق کی طرف جانے والے) راستہ پر پہنچ گیا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ یہاں تک کہ جب (اس ارض معمورہ کے پورب کی طرف) سورج کے طلوع ہونے کے مقام تک پہنچ گیا۔

وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ تو سورج کو ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے سورج سے ورے کوئی آڑ نہیں بنائی تھی یعنی ان کا کوئی لباس نہیں تھا، نہ مکان کی کوئی آڑ تھی وہاں کی زمین تعمیر کا بار اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔

كَذٰلِكَ ؕ (ذوالقرنین کا واقعہ) یوں ہی تھا یعنی ذوالقرنین کی وسعتِ اقتدار، حکومت کی پہنائی اور اس کے مرتبہ کی

رفعت اسی طرح تھی جس طرح ہم نے بیان کر دی۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس کا اہل مشرق کے ساتھ سلوک ایسا ہی تھا جیسا مغرب والوں کے ساتھ تھا۔ یا یہ مطلب ہے کہ جس طرح ذوالقرنین نے سورج کو دلدلی چشمہ میں ڈوبتا محسوس کیا تھا اسی طرح دلدل سے برآمد ہوتے پایا تھا۔ یا یہ مطلب ہے کہ جس طرح مغرب والوں کے لئے ہم نے سورج سے کوئی آڑ نہیں بنائی اسی طرح مشرق والوں کے لئے بھی سورج سے کوئی آڑ نہیں تھی۔

وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝ اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ سامان تھا ہم کو اس کی پوری خبر تھی۔

یعنی ذوالقرنین کے پاس کتنی فوج تھی، کتنا مال و اسباب تھا اور کتنے آلات جنگ اور علمی ذرائع تھے۔ غرض اس کی ساری بیرونی اور اندرونی طاقت و سر و سامان سے ہم واقف ہیں، مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس اتنا لشکر اور سامان اور مال و اسباب تھا کہ کسی کو معلوم نہیں ہم ہی اس سے واقف ہیں۔ اَحَطْنَا کے لفظ سے فوج کی کثرت اور سامان و حکومت کی وسعت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ پھر ذوالقرنین ایک تیسرے راستہ پر چل دیا۔ یعنی مغرب و مشرق کے درمیان جنوب سے شمال کی طرف۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝

یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو دونوں پہاڑوں سے ورے اس کو ایک ایسی قوم ملی جو تقریباً کوئی بات بھی سمجھتی نہ تھی۔

سُد اور سَد ہم معنی ہیں، عکرمہ نے کہا انسان کی بنائی بندش کو سَد کہتے ہیں اور قدرتی رکاوٹ و آڑ کو سُد۔ سَدَّیْن سے مراد اس جگہ وہ دو پہاڑ ہیں جن کے درمیان ذوالقرنین نے ایک دیوار بنا دی تھی تاکہ یاجوج وماجوج پرے سے دیوار کے ورے نہ آسکیں، بیچ میں دیوار حائل ہو جائے۔ یہ دونوں پہاڑ آرمینیا اور آذربائیجان کے تھے۔ ابن المنذر نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ ترکوں کی حدود جہاں ختم ہوتی ہیں۔ اس کے بالکل آخری شمال میں دو پہاڑ تھے جن سے پرے یاجوج وماجوج تھے وہی دونوں پہاڑ مراد ہیں۔ یہ قول سعید بن منصور نے سنن میں اور ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے۔

مِنْ دُوْنِهِمَا یعنی دونوں پہاڑوں کے سامنے۔

لَا يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا یعنی کسی دوسرے کی بات نہیں سمجھتے تھے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ کسی دوسرے کی بات سمجھتے تھے نہ کوئی دوسرا ان کی بات سمجھتا تھا۔

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ

انہوں نے کہا اے ذوالقرنین یاجوج وماجوج ہمارے ملک میں آکر تباہی مچاتے ہیں۔ یعنی قتل و غارت کرتے اور ہماری کھیتیوں کو اجاڑ دیتے ہیں۔ کلبی نے کہا موسم بہار میں یاجوج وماجوج گھس آتے تھے، تمام سبز چیزوں (سرسبز کھیتیوں اور پھلوں ترکاریوں) کو تو کھا لیتے تھے اور خشک چیزوں کو اٹھا کر اپنے ملک کو لے جاتے تھے، ان لوگوں کو ان سے بڑا دکھ پہنچتا تھا۔ بعض نے کہا وہ آدم خور تھے آدمیوں کو کھا جاتے تھے۔

یاجوج وماجوج عجمی لفظ ہیں، بعض کے نزدیک عربی ہیں، عرب بولتے ہیں آج الظلم یعنی اَسْرَعَ۔ بغوی نے لکھا ہے یہ دونوں لفظ اَجِيْجُ النَّار (آگ کا شعلہ، بھڑک، شرارہ) سے ماخوذ ہیں کثرت تعداد کی وجہ سے ان کو آگ کے شعلوں اور چنگاریوں سے تشبیہ دی گئی۔

بغوی نے لکھا ہے یاجوج وماجوج یافث بن نوحؑ کی نسل سے ہیں۔ ضحاک نے کہا وہ ترکوں کی ایک نسل ہے۔ سدی نے کہا ترک یاجوج کا ایک فوجی دستہ تھا جو (پہاڑوں سے ورے) نکل آیا تھا، جب ذوالقرنین نے دیوار (سد) بنا دی تو وہ راستہ پہاڑوں سے ادھر ہی رہ گیا تمام ترک اسی کی نسل سے ہیں۔ قتادہ نے کہا یاجوج کے ۲۲ قبائل تھے ذوالقرنین نے سد بنائی تو ایک قبیلہ ادھر ہی

رہ گیا ۲۱ قبائل ادھر چلے گئے اسی ایک قبیلہ کو ترک کہا جاتا ہے کیونکہ سد سے ورے اس کو ترک کر دیا (چھوڑ دیا) گیا تھا۔

لال تاریخ نے لکھا ہے حضرت نوحؑ کے تین بیٹے تھے سام، حام، یافث۔ سارے عرب فارس اور روم والے سام کی نسل سے ہیں اور حام کی نسل سے حبش زنج اور نوبہ کے لوگ ہیں (یعنی سارا افریقہ حام کی نسل سے ہے) اور یافث کی نسل سے ترک خزر صقالبہ اور یاجوج وماجوج ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول عطاء کی روایت میں آیا ہے کہ سارے آدمی تو ایک حصہ ہیں اور یاجوج وماجوج دس حصے (یعنی یاجوج وماجوج کی تعداد باقی انسانوں سے دس گنا و زائد ہے)

حضرت حذیفہ کی مرفوع روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یاجوج (ایک الگ) قوم ہے اور ماجوج (دوسری) قوم ہے ہر ایک کی تعداد چار سو ہزار (چار لاکھ) ہے وہ سب آدم کی اولاد ہیں ان میں سے کوئی بھی اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اپنی پشت (یعنی نسل) سے پیدا شدہ ایک ہزار آدمی ایسے نہ دیکھ لے جو ہتھیار اٹھانے کے قابل ہوں (یعنی جوان ہوں) یہ لوگ غیر آباد دنیا کی طرف پھیلتے جائیں گے۔

میں کہتا ہوں شاید حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب ذوالقرنین نے دیوار بنوائی تھی اور یاجوج وماجوج کی ادھر آنے سے بندش کر دی تھی تو اس وقت ان کے دو گروہ تھے ہر گروہ کی تعداد چار لاکھ تک پہنچ چکی تھی اس کے بعد کتنی ہو گئی تو ظاہر ہے کہ جب ہر شخص اپنی نسل کے ایک ہزار آدمی چھوڑ کر مرتا ہے تو ان کی گنتی کون کر سکتا ہے۔

(یَسِیْرُوْنَ اِلٰی خَرَابِ الدُّنْیَا کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو اس فقیر مترجم نے کیا، دوسرا ترجمہ حضرت مفسرؒ نے فرمایا کہ) یَسِیْرُوْنَ اِلٰی خَرَابِ الدُّنْیَا کا یہ معنی ہے کہ قیامت کے قریب وہ سد کو توڑ کر نکلیں گے اور ویران دنیا کی طرف آئیں گے (یہ فقیر اس ترجمہ کو بعید از فہم جانتا ہے) واللہ اعلم۔

بغوی نے لکھا ہے یاجوج وماجوج تین طرح ہیں ایک قسم تو درخت ارز کے برابر ہے، ان میں سے ہر شخص کا قد ایک سو بیس ہاتھ لمبا ہے۔ دوسری قسم کا طول وعرض برابر ہوتا ہے۔ ۱۲۰ ہاتھ لمبا اور اتنا ہی چوڑا، ان کے سامنے کوئی پہاڑ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ تیسری قسم وہ ہے جو ایک کان بچھاتے اور ایک کان اوڑھتے ہیں (قیامت کے قریب جب یہ برآمد ہوں گے تو) جو گھوڑا یا خنزیر یا جنگلی وحشی جانور ان کے سامنے آ جائے گا اس کو بغیر کھائے نہیں چھوڑیں گے ان میں سے جو کوئی مر جاتا ہے اس کو کھا لیتے ہیں ان کا اگلا دستہ شام میں اور پچھلا حصہ خراسان میں ہو گا، مشرق کے تمام دریاؤں اور بحیرہ طبریہ (بحیرہ مردار) کا پانی پی جائیں گے۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت علیؓ نے فرمایا ان میں سے بعض کا طول ایک بالشت اور عرض ایک ہاتھ ہے اور بعض بہت زیادہ لمبے ہیں۔

کعب احبار نے کہا وہ اولاد آدم میں ایک عجیب مخلوق ہیں۔ ایک روز حضرت آدمؑ کو احتلام ہوا اور نطفہ مٹی کے ساتھ مخلوط ہو گیا اس نطفہ سے اللہ نے یاجوج وماجوج کو پیدا کر دیا وہ باپ کی طرف سے تو ہمارے (علاتی) بھائی ہیں لیکن ہماری ماں کی نسل سے نہیں ہیں۔

بغوی نے وہب بن منبہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ذوالقرنین رومی تھا اور ایک بڑھیا کا بیٹا تھا جوان ہوا تو نیک مومن بندہ ہوا اور اللہ نے اس سے فرمایا میں تجھے ایسی قوموں کی اصلاح کے لئے بھیجوں گا جن کی زبانیں مختلف ہوں گی ان میں سے دو قومیں ایسی ہوں گی جن کے درمیان پوری زمین کے طول کا فاصلہ ہو گا ایک غروب آفتاب کے مقام پر ہو گی جس کو ناسک کہا جائے گا اور دوسری سورج نکلنے کے مقام پر ہو گی، جس کو منسک کہا جائے گا اور دو قومیں اور ہوں گی جن کے درمیان پوری زمین کا عرض فاصل ہو گا جنوب کی طرف والی قوم کو ہاویل کہا جائے گا اور شمال والی کو تاویل، باقی اقوام وسط ارض پر آباد ہوں گی جن میں جنات بھی ہوں گے، اور انسان بھی اور یاجوج وماجوج بھی۔ ذوالقرنین نے عرض کیا پھر کس قوم کو ساتھ لے کر میں ان سے قوت اور

کثرت میں مقابلہ کروں گا اور کس زبان میں ان سے گفتگو کروں گا، اللہ نے فرمایا میں تجھے طاقت عطا کروں گا، تیری زبان میں پھیلا دوں گا اور تیرا بازو مضبوط کر دوں گا تجھے کوئی چیز خوف زدہ نہ کرے گی تجھے ہیبت کا لباس پہناؤں گا کہ تجھے کوئی شے روک نہ سکے گی، میں نور و ظلمت کو تیرا فرماں بردار بنا دوں گا اور دونوں کو تیرا مددگار کر دوں گا۔ نور تجھے آگے آگے راستہ دکھائے گا اور تاریکی پیچھے سے تجھے گھیرے میں لیتی رہے گی۔ حسب الحکم ذوالقرنین چلدیا اور آفتاب کے غروب ہونے کے مقام تک پہنچ گیا، وہاں اس کو دشمنوں کی ایک جماعت ملی جو بیشمار تھی ان کی گنتی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ ذوالقرنین نے ظلمت سے مدد لے کر ان سے مقابلہ کیا سب کو ایک جگہ جمع کر کے اللہ کی عبادت کی ان کو دعوت دی کچھ لوگوں نے دعوت کو مان لیا کچھ کترا گئے جو لوگ روگرداں ہو گئے، ان پر ذوالقرنین نے ظلمت کو مسلط کر دیا تاریکی ان کے پیٹوں اور گھروں کے اندر گھس گئی، آخر وہ ذوالقرنین کی دعوت میں داخل ہو گئے، اسی جگہ مغرب والوں کا ذوالقرنین نے ایک لشکر تیار کیا اور اس کو ساتھ لے کر ہاویل (جنوبی قوم) کے پاس پہنچ گیا اور یہاں بھی وہی سلوک کیا جیسا ناسک کے ساتھ کیا تھا پھر منسک کی طرف گیا جو طلوع آفتاب کے مقام کے قریب آباد تھے، یہاں پہنچ کر ذوالقرنین اور اسکے لشکر نے وہی عمل کیا جو مذکورہ دونوں قوموں کے ساتھ کر چکا تھا، پھر قاویل (شمالی قوم) کی طرف رخ کیا اور ان سے بھی وہی معاملہ کیا جو مندرجہ بالا اقوام کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد وسطی اقوام کی طرف توجہ کی مشرقی جانب ترکوں کی سرحد پر پہنچا تو وہاں نیک ایمان دار آدمیوں کا ایک گروہ اس کے پاس آیا اور کہا ذوالقرنین ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک مخلوق ایسی ہے جو بہائم (چوپایوں) کی طرح ہے اور درندوں کی طرح ان کے نوکیلے دانت اور کچلیاں ہیں، سانپوں اور بچھوؤں کو کھا جاتے ہیں اور گھوڑوں، گدھوں اور جنگلی جانوروں کو پھاڑ کھاتے ہیں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کسی مخلوق کی اتنی تعداد نہیں ہے اور اتنی ہی ان کی افزونی ہے کہ کسی مخلوق کی نہیں ہے، وہ ہماری سرزمین پر آجاتے ہیں، تسلط جماتے ہیں اور تباہی مچاتے ہیں، کیا ہم آپ کیلئے چندہ کر کے رقم جمع کر دیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند بنا دیں، ذوالقرنین نے کہا میرے رب نے جو مجھے طاقت (دولت وغیرہ) عطا فرمائی ہے وہ (تمہارے چندہ سے) بہتر ہے تم لوگ میرے لئے پتھر کی چٹانیں اور لوہا اور تانبا فراہم کر دو اور میں جا کر ان کے حالات معلوم کرتا ہوں۔ یہاں سے ذوالقرنین ان لوگوں کے احوال دریافت کرنے کیلئے چلا اور ان کی بستیوں کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ سب لوگ ایک ہی قد کے ہیں ہمارے متوسط القامت آدمی کے طول سے ان کا طول قامت آدھا ہے ان کے پنجے اور نوکیلے دانت اور کچلیاں درندوں کی طرح ہیں۔ اور سارے بدن پر سخت بال اتنی کثرت سے ہیں کہ جسم کو چھپائے ہوئے ہیں، سردی گرمی سے بچاؤ ان کو ان بالوں ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ہر شخص کے دو بڑے بڑے کان ہیں ایک کان بچھاتا ہے ایک اوڑھتا ہے۔ ان کانوں ہی سے موسم گرما و سرما میں کام چلاتا ہے، جہاں جمع ہوتے ہیں آپس میں جانوروں کی طرح جماع کرتے ہیں۔ ذوالقرنین یہ کیفیت دیکھ کر لوٹ گیا اور دونوں پہاڑوں کے درمیان پہنچ کر اس نے پیمائش کی پھر پانی تک بنیاد کھدوا کر پتھر کی چٹانوں سے اس کو بھر دیا اور تانبا پگھلا کر اس سے مصالحہ کا کام لیا، اس طرح دیوار مکمل ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین کے نیچے سے ایک پہاڑ پھوٹ آیا ہے (یہ سب اسرائیلی خرافات ہیں۔ بیضاوی)

فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

سو کیا ہم لوگ آپ کے لئے کچھ چندہ جمع کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں (کہ وہ ہماری طرف نہ آسکیں)

خرج اور خراج دونوں ہم معنی ہیں، مزدوری، اجرت، ابو عمرو نے کہا خراج وہ چیز ہے جس کا ادا کرنا تم پر لازم ہو اور خرج وہ چیز ہے جس کو دے کر تم دوسرے کو راغب بناتے ہو۔ بعض نے کہا خراج زمین کا ٹیکس اور خرج فی کس شخصی ٹیکس ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں اَدِّ خَرْجَ رَاسِكَ وَخَرَاجَ مَدِيْنَتِكَ اپنی ذات کا خرج (پر سن ٹیکس) ادا کرو اور اپنے شہر کا خراج۔ بعض نے کہا جو چیز زمین پر لازم ہو یا شخصی طور پر وہ خراج ہے اور خرج مصدر ہے۔

سَدًّا یعنی ایسی دیوار اور بندش کہ یاجوج وماجوج پھر ادھر نہ آسکیں۔

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ذوالقرنین نے کہا جس مال میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے وہ بہت کچھ ہے (سو مال کی تو مجھے ضرورت نہیں) البتہ ہاتھ پاؤں سے تم لوگ میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنادوں گا تم لوگ مجھے لوہے کی چادریں لادو۔

مَا مَكَّنِّي یعنی مال اور دولت سے اللہ نے جو کچھ مجھے عنایت کیا ہے وہ اس مال سے بہتر ہے جو بطور معاوضہ تم مجھے دینے کو کہہ رہے ہو۔

قُوَّةٍ سے مراد معمار، مزدور، کارکن یا آلات

رَدْمًا بہت مضبوط دیوار (تہ بہ تہ جی ہوئی)

زُبَرَ الْحَدِيدِ لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے، زُبَر کا واحد زُبْرَة ہے زُبْرَة بڑا ٹکڑا۔

آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ مجھے لوہے کے ٹکڑے لادو، مطلب یہ کہ مالی مدد کی اور معاوضہ کی مجھے ضرورت نہیں، تم لوگ جسمانی اور آلاتی مدد کرو۔ لوگ لوہے کی چادریں یا ٹکڑے لے آئے، لکڑیاں اور کوئلے بھی ساتھ لائے۔ ذوالقرنین نے لوہے لکڑی اور کوئلوں کو تہ بہ تہ چنا اوپر لوہا پھر نیچے لکڑی پھر کوئلے پھر لوہا پھر لکڑی۔

حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ یہاں تک کہ جب (ردے ملاتے ملاتے) اُن کے دونوں سروں (کے بیچ کے خلا) کو برابر کر دیا تو کہا دھونکو (دھونکنا شروع ہو گیا)، یہاں تک کہ جب (دھونکتے دھونکتے) اس کو لال انگارہ کر دیا تو کہا اب میرے پاس پگھلا ہوا تانبہ لاؤ کہ اس پر میں ڈال دوں۔

صَدَفَيْنِ دونوں کنارے۔ صَدَفٌ جھکاؤ، میلان۔ تصادف آمنے سامنے ہونا۔ أُفْرِغْ میں ڈال دوں۔ اِفْرَاغ بہونا، بہادینا۔ قِطْر پگھلا ہوا تانبہ۔ لوگ تانبہ لے آئے، پھر پگھلا ہوا تانبہ دہکتے ہوئے لوہے پر ڈال دیا گیا، آگ سے لکڑی اور کوئلہ جل گیا، پگھلے ہوئے تانبے نے اس کی جگہ لے لی اس طرح لوہے کی اینٹیں پگھلے ہوئے تانبے کے مصالحہ سے باہم پیوست ہو گئیں اور ایک آہنی دیوار پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئی۔ بغوی نے لکھا ہے اس دیوار کی چوڑائی، پچاس ہاتھ، اونچائی سو ہاتھ اور لمبائی ایک فرسخ تھی۔

یہ کام تمام کاریگروں اور معماروں کا تھا، لیکن ذوالقرنین کی تدبیر اور حکم سے ہوا اس لئے آیت میں دیوار تیار کرنے کی نسبت اس کی طرف کی گئی۔

فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ اس کے بعد یاجوج و ماجوج (دیوار اونچی اور چکنی ہونے کی وجہ سے) اس پر چڑھ نہ سکے اور نہ (سخت مضبوط آہنی ہونے کی وجہ سے) اس میں سوراخ کر سکے۔

قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي ۖ ذوالقرنین نے کہا یہ (یعنی دیوار اور اس کو بنانے کی قدرت دینا) میرے رب کی (اپنے بندوں پر) رحمت ہے۔

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ پھر جب میرے رب کا وعدہ آجائے گا تو اس دیوار کو وہ زمین کے ساتھ ہموار کر دے گا۔ وعدہ رب سے مراد ہے یاجوج وماجوج کے خروج کا وقت یا قرب قیامت۔ دَكّ مصدر ہے بمعنی مَدْكُوك۔ یعنی زمین پر پھیلا کر اس کو ہموار کر دے گا۔

وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ﴿۹۸﴾ اور میرے رب کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ بغوی نے لکھا ہے ذوالقرنین کے قصہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ذوالقرنین ظلمات میں گھس گیا پھر لوٹ کر آیا تو شہر زور میں اس کی وفات ہو گئی۔

بعض کا قول ہے کہ ذوالقرنین کی عمر کچھ اوپر تیس برس کی ہوئی۔

بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کا مرفوع بیان نقل کیا ہے کہ یاجوج ماجوج روز دیوار کو کاٹتے ہیں اور اتنا کھود چکتے ہیں کہ سورج کی کرنیں (دوسری طرف کی) چمکنے کے قریب ہو جاتی ہیں تو ان کا سردار کہتا ہے اب لوٹ چلو، باقی کل کو کھود لیں گے لوگ چلے جاتے ہیں۔ رات میں اللہ دیوار کو پھر حسب سابق کر دیتا ہے، دوسرے دن آکر وہ پھر کھودتے ہیں اور اتنا کھودتے ہیں کہ دوسری طرف کی روشنی نظر آنے کے قریب ہو جاتی ہے تو سردار روک دیتا ہے اور کہتا ہے اب واپس چلو کل کو اس کی تکمیل کرلیں گے سب واپس چلے جاتے ہیں۔ اللہ رات میں پھر دیوار کو پہلے کی طرح کر دیتا ہے روزانہ ایسا ہی کرتے ہیں جب مقررہ وقت آجائے گا اور حسب معمول دیوار کو کھود کر اتنا کر دیں گے کہ ایک ورق رہ جائے گا۔ قریب ہو گا کہ پار کی روشنی نظر آجائے اور سرداران سے کہے گا اب واپس چلو کل کو انشاء اللہ ہم اس کو کھود دیں گے۔ انشاء اللہ کہنے کا یہ اثر ہو گا کہ واقعی دوسرے دن آکر دیکھیں گے کہ دیوار کو جس طرح (ورق کی برابر) چھوڑ کر گئے تھے ویسی ہی ہے۔ پس بقیہ دیوار کو بھی کھود دیں گے اور پار نکل آئیں گے۔ اور جہاں جہاں پانی ہو گا ان مقامات کی تلاش کر کے پہنچیں گے (سارے تالابوں، چشموں، کنوؤں اور جھیلوں دریاؤں کا پانی پی جائیں گے) لوگ ان کے خوف سے قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہیں گے وہ آسمان کی طرف تیر چلائیں گے اور اللہ ان کے تیر وں کو ایسا سرخ کر کے لوٹا دے گا جیسے وہ خون آلود ہوں (اور کسی شکار کے لگ کر واپس لوٹے ہوں) وہ خوش ہو کر کہیں گے ہم زمین والوں پر بھی غالب آگئے اور آسمان والوں پر بھی اس کے بعد اللہ ان کی گدیوں (گردنوں کے پچھلے حصہ) میں گلٹیاں (یعنی وہ کیڑے جو اونٹ، بکری وغیرہ کی ناک میں پیدا ہو کر باعث ہلاکت ہوتے ہیں اور انسان کی گردن بغل وغیرہ میں داخل ہو کر گلٹیوں اور سرطانی زخموں کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں) برآمد کر دے گا۔ سب مر جائیں گے۔

مسلم نے حضرت نواس بن سمعان کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار صبح کے وقت دجال کا ذکر کیا (دوران ذکر میں) حضور ﷺ کی آواز پست بھی ہو جاتی تھی اور اٹھ بھی جاتی تھی یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا کہ دجال (یہیں) نخلستان میں موجود ہے۔ پھر (دوسرے وقت) جب ہم حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے (خوف کا اثر ہمارے اندر پہچان لیا اور) فرمایا تم لوگوں کا کیا حال ہے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے دجال کا تذکرہ کیا تھا اور حضور کی آواز میں پستی بھی تھی اور بلندی بھی اس سے ہمارا خیال ہوا کہ وہ کہیں (اسی جگہ) نخلستان میں ہی ہے۔ فرمایا دجال کے علاوہ ایک اور چیز ہے جو تمہارے لئے زیادہ خوفناک ہے دجال تو میری زندگی میں اگر برآمد ہو گیا تو تمہاری طرف سے میں اس کا مقابلہ کر لوں گا اور میں نہ ہوا تو اس وقت ہر شخص خود اپنی طرف سے اس کا مقابلہ کرے گا اور اللہ میری طرف سے ہر مسلمان کا محافظ ہے۔ دجال ایک ژولیدہ نوجوان ہو گا اس کی ایک آنکھ پٹ ہو گی۔ میرے نزدیک وہ عبدالعزیٰ بن قطن سے ملتا جلتا ہو گا، جو شخص اس کو پائے تو سورۂ کہف کی ابتدائی آیات اس کے سامنے پڑھے۔ وہ عراق اور شام کے درمیان برآمد ہو گا اور دائیں بائیں لوٹ اور تباہی مچائے گا۔ اللہ کے بندو تم (ایمان پر) ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس کا قیام زمین پر کتنی مدت رہے گا۔ فرمایا چالیس دن۔ جن میں ایک دن ایک سال کے برابر ہو گا۔ ایک دن ایک مہینے کی برابر، ایک دن ایک ہفتہ کی برابر اور باقی ایام تمہارے دنوں کی طرح ہوں گے۔ ہم نے عرض کیا جو دن سال کے برابر ہو گا کیا اس میں ہمارے لئے صرف ایک دن کی نمازیں کافی ہوں گی۔ فرمایا نہیں مقدار کا اندازہ کر لینا، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس کی سرعت رفتار کی کیا حالت ہو گی، فرمایا جیسے بادل جس کے پیچھے آندھی ہو۔ کچھ لوگوں کی طرف سے اس کا گزر ہو گا۔ ان کو وہ اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دے گا وہ مان لیں گے۔ دجال آسمان کو حکم دے گا ان پر بارش ہو جائے۔ فوراً بارش ہو جائے گی۔ زمین کو حکم دے گا سبزہ پیدا کر۔ فوراً زمین سرسبز ہو جائے گی۔ ان کے اونٹ جنگل سے چر کر واپس لوٹیں گے تو ان کے کوہان خوب اونچے، تھن خوب لمبے دودھ سے بھرے ہوئے اور کوکھیں (چارہ کھانے کی وجہ سے) پھولی ہوں گی۔ اس کے بعد دجال کا گزر ایک اور قوم کی طرف ہو گا اور وہ ان کو دعوت دے گا وہ لوگ دجال کی دعوت کو رد کر دیں گے۔ جب دجال ان کے پاس سے لوٹے گا تو فوراً وہ

سب قحط زدہ ہو جائیں گے۔ کوئی چیز ان کے مال میں سے باقی نہیں رہے گا دجال ویرانے کی طرف سے گزرے گا اور حکم دے گا اپنے دفینے بر آمد کر دے۔ فوراً ویرانے سے دفینے نکل کر شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے ہو جائیں گے۔ پھر دجال ایک شخص کو طلب کرے گا جو جوانی سے بھرپور ہو گا اور تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر کے علیحدہ علیحدہ دو طرف کو رسائی تیر کے فاصلے پر رکھ دے گا اور (اس شخص کو) آواز دے گا (دونوں ٹکڑے جڑ کر) وہ شخص زندہ ہو جائے گا، اور ہنستا کھلکھلاتا چلا آئے گا، دجال اسی حال میں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ، عیسیٰ بن مریم کو بھیج دے گا۔ آپ دمشق کے مشرقی جانب سفید میناروں کے پاس (یا منارے پر) دو فرشتوں کے بازؤوں پر اپنے ہاتھ رکھے اتریں گے، سر جھکائیں گے تب اور سر اٹھائیں گے تب پسینے کے قطرے چاندی کے موتیوں کی طرح آپ کے چہرے سے لڑھک کر گریں گے آپ کے سانس کی خوشبو وہاں تک پہنچے گی جہاں تک آپ کی نگاہ پہنچے گی۔ حضرت عیسیٰؑ دجال کی تلاش کریں گے اور لد (ایک بستی کا نام جو فلسطین میں ہے) کے پاس پہنچ کر دجال کو قتل کریں گے اس کے بعد آپ ان لوگوں کے پاس پہنچیں گے جن کو اللہ نے دجال کے شر سے محفوظ رکھا ہو گا ان کے چہروں سے غبار صاف کریں گے اور جنت میں ان کے درجات جو اللہ نے مقرر فرمائے ہیں اس کی بشارت دیں گے، اسی دوران میں حضرت عیسیٰؑ کے پاس وحی آئے گی کہ میں (سد ذوالقرنین سے) اپنے ان بندوں کو نکال کر لے آیا ہوں جن سے لڑنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے (یعنی سد ٹوٹ گیا اور یاجوج ماجوج اندر آ گئے ہیں) آپ میرے بندوں کو کوہ طور پر لے جا کر حصار بند ہو جائیں۔ حضرت عیسیٰؑ حکم کی تعمیل کریں گے یاجوج وماجوج آجائیں گے ہر ٹیلہ کی آڑ سے نکل کر پھیل پڑیں گے ان کا اگلا گروہ بحیرہ طبریہ (بحیرہ مردار) پر پہنچ کر تمام پانی پی جائے گا۔ پچھلا گروہ جب بحیرہ طبریہ پر پہنچے گا تو وہ کہے گا یہاں کبھی پانی ضرور تھا (یعنی صرف نمی کو دیکھ کر ان کی یہ رائے ہوگی کہ ہاں کبھی پانی ضرور تھا) حضرت عیسیٰؑ اپنے ساتھیوں کو لئے حصار بند رہیں گے (اور پہاڑ پر اتنی غذائی قلت ہو جائے گی کہ) جتنی سو دینار کی تم لوگوں کی نظر میں آج قیمت تھی اس سے زیادہ اس زمانہ میں گائے بیل کی ایک سری کی ان کی نظر میں قدر ہوگی۔ حضرت عیسیٰؑ اور آپ کے ساتھی اللہ سے دعا کرتے رہیں گے، آخر اللہ یاجوج ماجوج کی گردنوں میں جراثیمی پھنسیاں پیدا کر دے گا جن کی وجہ سے وہ سب کے سب یکدم ایک آدمی کی طرح مر جائیں گے۔ حضرت عیسیٰؑ ساتھیوں کو لے کر پہاڑ سے نیچے اتریں گے لیکن ان کو زمین پر ایک بالشت جگہ بھی ایسی نہیں ملے گی جس میں (یاجوج وماجوج کی لاشوں کی) عفونت اور سڑاند پھیلی ہوئی نہ ہو آپؑ اور آپ کے ساتھی دعا کریں گے اللہ ایسے پرندے بھیج دے گا جو بختی اونٹوں کی گردنوں جیسے ہوں گے یہ پرندے تمام لاشوں کو اٹھا کر وہاں پھینک دیں گے جہاں اللہ کی مرضی ہوگی، پھر بحکم خدا ایک عظیم بارش ہو گی جو ہر گھر میں پہنچے گی ڈیرہ، خیمہ ہو یا مٹی کا بنا ہوا مکان، بارش کو کوئی آڑ روک نہ سکے گی بارش سے ساری زمین دھل کر صاف چکنی ہو جائے گی، پھر اللہ کے حکم سے زمین میں غلہ اور پھلوں کی خوب پیداوار ہو گی اور حاصل ارضی میں بڑی برکت ہو گی اور یہ حالت ہو جائے گی کہ ایک انار ایک گروہ کے کھانے کے لئے کافی ہو گا اور اس کا چھلکا ایک جماعت کے لئے سائبان کا کام دے گا۔ دودھ میں بھی بڑی برکت ہو گی ایک اونٹنی کا دودھ ڈھیروں آدمیوں کے لئے کافی ہو گا اور ایک گائے کا دودھ پورے قبیلہ کو اور ایک بکری کا دودھ قبیلہ کی ایک شاخ کے لئے کفایت کرے گا۔ اسی حالت میں اللہ ایک خوشگوار خوشبودار ہوا چلا دے گا اور یہ ہوا ہر شخص کے بغل کے نیچے (یعنی پہلو پر) لگے گی جو مومن اور مسلم ہو گا اس کی روح ہوا کا جھونکا لگتے ہی پرواز کر جائے گی اور صرف برے لوگ زمین پر رہ جائیں گے جو گدھوں کی طرح لڑتے رہیں گے انہی پر قیامت برپا ہوگی۔ مسلم کی دوسری روایت میں اتنا اور آیا ہے کہ طبریہ جھیل پر پہنچ کر پچھلا گروہ کہے گا یہاں کبھی پانی تھا۔ اس کے بعد یاجوج وماجوج کوہ خمر پر پہنچیں گے کوہ خمر بیت المقدس کے ایک پہاڑ کا نام ہے وہاں پہنچ کر کہیں گے ہم نے زمین والوں کو تو قتل کر دیا آؤ اب آسمان والوں کو قتل کریں یہ کہہ کر آسمان کی طرف چھوٹے تیر پھینکیں گے اللہ ان کے تیروں کو خون سے رنگین کر کے لوٹا دے گا (تیروں کو خون سے رنگا ہوا دیکھ کر وہ خوش ہو جائیں گے) ترمذی کی روایت میں ہے کہ پرندے ان کی لاشوں کو اٹھا کر گڑھوں اور غاروں میں پھینک دیں گے اور مسلمان ان کے تیروں، کمانوں اور ترکشوں کو سات برس تک ایندھن

کے طور پر جلائیں گے۔ بغوی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ وہب نے بیان کیا پھر یاجوج وماجوج سمندر پر پہنچ کر اس کا پانی پی جائیں گے اور سارے سمندری چوپائے اور جانور کھا جائیں گے۔ یہاں تک کہ لکڑیاں اور درخت بھی اور جو آدمی ان کے پنجے میں آجائے گا اس کو بھی کھا جائیں گے لیکن مکہ اور مدینہ اور بیت المقدس میں نہیں پہنچ سکیں گے۔ بخاری نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یاجوج وماجوج کے بعد کعبہ کا حج اور عمرہ کیا جائے گا۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ اور ہم اس روز ان کی یہ حالت کریں گے کہ ایک میں ایک گڈمڈ ہو جائیں گے۔

بعض علماء نے کہا یہ واقعہ اس وقت ہوگا جب یاجوج وماجوج سد کو توڑ چکے ہوں گے یعنی دیوار توڑ کر یاجوج وماجوج پانی کی طرح لہریں مارتے داخل ہوں گے کثرت اور ریل پیل کی وجہ سے ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہے گا اور آپس میں گڈمڈ ہو جائیں گے۔ بعض کا قول ہے کہ ایسا واقعہ اس وقت ہوگا کہ قیامت بپا ہو جائے گی اور لوگ قبروں سے باہر آجائیں گے۔ اور جنات بھی انسانوں کے ساتھ گڈمڈ ہو جائیں گے اور سب حیرت میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ اس تفسیر کی تائید آئندہ آیت سے ہو رہی ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ اور (قبروں سے مردوں کو زندہ کر کے اٹھانے کے لئے) صور پھونکا جائے گا۔ یہ وقت قیامت برپا ہونے کا ہوگا۔

فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ اور (حساب وسزا وجزا کیلئے) ہم سب مخلوق کو ایک ہموار میدان میں جمع کریں گے۔

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِينَ عَرْضًا ﴿۱۰۰﴾ اور اس روز جہنم کو ہم کافروں کے بالکل سامنے لے آئیں گے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر لیں گے۔

الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَن ذِكْرِي جن کی آنکھوں پر میری یاد کی طرف سے پردہ پڑا ہوا تھا۔ غِطَاء کسی چیز کو چھپانے والا پردہ۔ ذکر سے مراد ہے ان دلائل و براہین کو دیکھنا جن سے اللہ کی ذات وصفات کا ثبوت ہو رہا ہے (یعنی ان کی آنکھوں پر غفلت اور ضد اور جہالت کے پردے پڑے ہوئے تھے ان کو اللہ کی ذات وصفات کی توحید و عظمت دکھائی نہیں دیتی تھی)

وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾ اور (ان کے کانوں میں ڈاٹیں تھیں) وہ سن نہیں سکتے تھے یعنی میری توحید، الوہیت اور ربوبیت کو یاد دلانے والے دلائل اور میرے کلام اور ہدایت آفریں بات کو سن بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ اللہ نے ان کے لئے شقاوت لکھ دی تھی اور رسول اللہ ﷺ کی اور آپ کے ساتھیوں کی دشمنی اور عناد وضد کو ان کے دلوں میں ڈال دیا تھا۔ کافروں کا مبدأ تعین اللہ کا اسم مُضِل تھا (یعنی اسم مُضِل کا پرتو ان پر پڑا تھا پس تخلیقاً وہ مظہر ضلالت تھے اس لئے ان کا ہدایت یاب ہونا ناممکن تھا مکمل تشریح ہم کئی مقامات پر کر چکے۔ تعین خلق کے مبادی صفات الٰہیہ ہیں۔ صفات الٰہیہ کا پرتو مخلوق پر پڑا ہے جس کی وجہ سے کوئی ہدایت یافتہ اور کوئی گمراہ ہو گیا، یہ تفصیل کئی جگہ کر دی گئی ہے)

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِن دُونِي أَوْلِيَاءَ سو کیا پھر بھی ان کافروں کا خیال ہے کہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز (یعنی معبود و حاجت روا) قرار دیں۔

عِبَادِي سے مراد ہیں فرشتے، مسیح، عزیز۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ شیطان مراد ہیں جن کی اطاعت اللہ کے سوا کفار کرتے ہیں۔ مقاتل کے نزدیک بت مراد ہیں بتوں کو اس جگہ اصنام کہا گیا اسی طرح جس طرح آیت إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ میں بتوں کو اصنام کہا گیا ہے۔ أَوْلِيَاءَ یعنی کارساز، رب یا سفارشی، شفاعت کرنے والے۔ استفہام انکاری ہے یعنی کافر جیسا خیال کرتے ہیں واقعہ ایسا نہیں ہے ان کے معبود ان کے دشمن ہیں قیامت کے دن ان سے بیزاری کا اظہار کریں گے، نیک بندے تو کافروں کے دشمن ہی ہیں اس میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ رہے شیاطین اور بت تو یہ بھی

قیامت کے دن باہم تکفیر کریں گے، ایک دوسرے پر لعنت بھیجے گا اور اپنے پرستاروں سے سب اظہار نفرت و براءت کریں گے۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ ہم نے تو ان کافروں کی دعوت کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے۔

نُزُل مقام نزول یا طعام مہمانی۔ آیت میں کافروں کے لئے استہزاء کے طور پر جہنم کو طعام ضیافت قرار دیا گیا ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

آپ کہہ دیجئے کیا ہم تم کو بتائیں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون لوگ ہوں گے۔ سب سے زیادہ خسارے میں وہ لوگ ہوں گے کہ دنیوی زندگی میں کی ہوئی ان کی ساری کوششیں (اکارت اور رائیگاں) جائیں گی اور وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم اچھے کام کر رہے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمایا آیت میں سب سے زیادہ خسارہ پانے والوں سے مراد ہیں عیسائی اور یہودی جو اپنے گروہ کو حق پر سمجھتے ہیں حالانکہ ان کی شریعت منسوخ ہو چکی۔ بعض کے نزدیک وہ تارک الدنیا خانقاہ نشین راہب مراد ہیں جو اپنے خیال میں آخرت کے طالب اور لذائذ دنیا سے رو گرداں ہیں حالانکہ وہ شریعت اسلامیہ کے منکر ہیں ان کی یہ ساری کوششیں سراب اور ناکارہ ثابت ہوں گی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا حروراء والے (یعنی خارجی) مراد ہیں خارجیوں کا فرقہ ہی سب سے پہلا گروہ تھا جس نے صحابہ کرامؓ اور صحابہ کے رفقاء کے خلاف بغاوت کی اور بغاوت کو حق سمجھا۔ حضرت علیؓ کے اس کلام کا مقصد یہ ہے کہ آیت میں بدعتی اور نفسانی میلانات کے پرستار مراد ہیں (جن کے سرگروہ اور موسس خارجی تھے) پس معتزلہ، روافض اور اہل سنت کے تمام مخالف اسی حکم میں داخل ہیں۔ میں کہتا ہوں آیت کا کھلا ہوا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں کفار مراد ہیں جو قیامت قائم ہونے اور دوسری جسمانی زندگی پانے کے منکر تھے اور دنیوی فائدہ ہی ان کا مقصود زندگی تھا اس زندگی کے منافع جن طریقوں سے وابستہ ان کو نظر آتے تھے انہی راستوں پر چلتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ اس دنیا کے سوا کوئی اور زندگی نہیں اگر کوئی شخص آخرت کی تمنا میں ایسے کام کرتا ہے جن سے دنیوی منافع میں نقصان ہوتا ہے تو ایسا آدمی بیوقوف ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اللہ سے ملنے کا انکار کیا۔ یعنی مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے منکر ہوئے۔ آیت میں (در پردہ ان لوگوں پر بھی تشنیع ہے جو قیامت اور حشر و نشر کے تو قائل ہیں، لیکن اعمال دنیوی کو اعمال اخروی پر ترجیح دیتے ہیں، ہمیشہ ساری زندگی دنیا کو سنبھالنے اور سنوارنے میں لگائے رکھتے ہیں، آخرت کا ان کو تصور بھی نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہوشیار وہ آدمی ہے جس نے اپنے نفس کو اپنے حکم کا تابع رکھا اور مرنے کے بعد (والی زندگی) کے لئے کام کئے اور بے عقل وہ آدمی ہے جو نفس کا پیرو رہا اور اللہ پر اس نے (جھوٹی) آرزو بندی کی (یعنی اللہ کی قہاریت اور عذاب دینے کی طرف سے غافل رہا اور جو دل چاہا وہ کیا اور یہ خیال کر لیا کہ اللہ رحیم ہے کریم ہے وہ یقیناً معاف کر ہی دے گا) رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ والحاکم بسند صحیح عن انسؓ۔

اگر آیت میں یہودی اور عیسائی مراد ہوں تو آیات رب اور ملاقات رب کے انکار کا یہ مطلب ہوگا کہ (اگرچہ یہ لوگ قیامت کا اقرار کرتے ہیں مگر) قیامت کی جو واقعی تشریح ہے اس کے منکر ہیں یا (اپنے گروہ کے لئے) عذاب پانے کے منکر ہیں۔

فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ سو اس لئے ان کے سارے اعمال غارت ہو گئے قیامت کے روز ہم ان کے نیک اعمال کا ذرا بھی وزن قائم نہیں کریں گے۔

اَعْمَالُهُمْ یعنی وہ کام جو دنیا کمانے کے لئے انہوں نے کئے تھے یا وہ اعمال جو اخروی ثواب کی خاطر انہوں نے کئے تھے، لیکن ثواب سے محروم رہیں گے، کیونکہ نیک اعمال قبول ہونے کی بنیادی شرط ایمان ہے اور وہ کافر تھے، وزن قائم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ان کی کوئی قدر نہ ہوگی۔ اللہ ان کے ان اعمال کا اعتبار نہیں کرے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (قیامت کے دن) بعض بڑے موٹے آدمی ایسے آئیں گے کہ مچھر کے پر کی برابر بھی اللہ کے نزدیک ان کا وزن نہ ہوگا (اس کی تصدیق کے لئے) پڑھو فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا رواہ البخاری و مسلم وفی الصحیحین۔

ابو نعیم اور اجری نے اس آیت کی تشریح میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ بعض طاقت ور، مضبوط، پرخور آدمیوں کو (قیامت کے دن میزان (کے پلڑہ) میں رکھا جائے گا لیکن اس کا وزن جو برابر بھی نہ ہوگا، فرشتہ ایسے ستر ہزار آدمیوں کو ایک ہی دھکا دے کر پھینک دے گا۔ یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ ایسے لوگوں کے اعمال تولنے کے لئے میزان قائم ہی نہیں کی جائے گی۔ ان کے اعمال کی وزن کشی ہی نہیں ہوگی بلکہ بغیر وزن کئے ان کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ جن اعمال کو وہ نیکیاں خیال کرتے ہیں میزان عدل میں ان اعمال کا کوئی وزن نہ ہوگا۔

بغوی نے ابو سعید خدریؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگ اپنے اعمال لے کر آئیں گے جو ان کی نظر میں اتنے بڑے ہوں گے جیسے تہامہ کے پہاڑ، لیکن تولنے کے بعد ان کا کوئی وزن ہی نہ ہوگا، یہی مطلب ہے آیت فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا کا۔

سیوطی نے لکھا ہے کیا اعمال کی وزن کشی صرف اہل ایمان کیلئے ہوگی اور کافروں کے اعمال تولے ہی نہ جائیں گے۔ یا کافروں کے اعمال کی بھی وزن کشی ہوگی۔ یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ کچھ علماء اول قول کے قائل ہیں اور کچھ علماء وزن کشی کے عموم کے قائل ہیں۔ اول گروہ اپنے قول کی تائید میں آیت فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا کو پیش کرتا ہے۔ دوسرا گروہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ آیت کا مقصد یہ نہیں کہ ان کے اعمال تولے نہیں جائیں گے بلکہ مجازی معنی مراد ہے یعنی ان کے اعمال قابل اعتبار نہ ہوں گے۔ کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ سے فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ تک۔ سیوطی نے قرطبی کا قول نقل کیا ہے کہ ہر شخص کے اعمال کا وزن ہونا ضروری نہیں (نہ ہر مومن کے اعمال کا، نہ ہر کافر کے اعمال کا) جو لوگ بلا حساب کے جنت میں چلے جائیں گے ان کے اعمال کا وزن بھی نہ ہوگا (جب حساب ہی نہیں تو وزن کیسا) اسی طرح کچھ لوگ بلا حساب دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے ان کے اعمال کا بھی وزن نہ ہوگا۔ انہی کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ الخ۔ علامہ سیوطی نے فرمایا قرطبی کا یہ قول جامع ہے اور دونوں آیات میں تضاد کو دور کرتا ہے، جس فریق کو فوراً جہنم میں بھیج دیا جائے گا اس کے اعمال کا وزن بھی نہ ہوگا۔ باقی کافروں کے اعمال تولنے کیلئے میزان قائم کی جائے گی۔

(حضرت مفسرؒ نے فرمایا) میں کہتا ہوں شاید جن کافروں کا آیت مذکورہ میں ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد منافق اور اہل کتاب ہوں۔ منافق تو قیامت کے دن (شروع میں چھٹائی سے پہلے) مسلمانوں کے گروہ میں شامل رہیں گے اور اہل کتاب کسی دوسرے معبود کی طرف مشرکوں کی طرح نہیں جائیں گے۔ ہر مشرک اس معبود کے پیچھے چلا جائے گا جس کو وہ پوجا کرتا تھا اہل کتاب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

(بلکہ ان کی سزا وہی ہوگی یعنی دوزخ اس سبب سے کہ انہوں نے کفر کیا تھا اور میری آیتوں اور پیغمبروں کا مذاق بنایا تھا۔

ذَٰلِكَ یعنی بات یہی ہے۔ بِمَا كَفَرُوا میں مَا مصدری ہے اور بَا سببی۔ یعنی کفر کرنے اور میرے احکام اور میرے پیغمبروں کا مذاق بنانے کے سبب ان کی سزا جہنم ہوگی۔ هُزُوًا وہ چیز یا شخص جس کا مذاق بنایا جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کی مہمانی کے لئے فردوس کے باغ ہوں گے۔

كَانَتْ لَهُمْ یعنی اللہ کے سابق حکم اور وعدہ میں جنات فردوس نیکوکار مومنوں کا مسکن ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم اللہ سے مانگا کرو تو فردوس ملنے کی دعا کیا کرو کیونکہ وہ جنت کے وسط میں ہے اور دوسری

جنتوں سے اعلیٰ ہے، اس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔ متفق علیہ۔

ترمذی اور حاکم نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت سے اور بیہقی نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے حوالہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کے سو درجات ہیں ہر دو درجوں کے درمیان فاصلہ اتنا ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان، فردوس جنت کا سب سے اونچا درجہ ہے اسی سے جنت کی چاروں نہریں نکلتی ہیں اس سے اوپر عرش ہے جب اللہ سے تم (جنت ملنے کی) دعا کیا کرو تو فردوس کی دعا کیا کرو۔

بزار نے حضرت عرباض بن ساریہؓ کے حوالہ سے اور طبرانی نے حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ سے تم دعا کرو تو (جنت) فردوس مانگا کرو وہ دوسری ساری جنتوں سے اونچی ہے۔ حضرت ابوامامہؓ کی روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ فردوس والے عرش کی چرچراہٹ سنتے ہیں (یعنی فردوس اور عرش کے درمیان کوئی دوسری جنت حائل نہیں ہے)

بغوی نے حضرت کعبؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جنتوں میں فردوس سے اونچی کوئی جنت نہیں ہے۔ بھلائی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اسی میں داخل ہوں گے۔ مقاتل نے کہا فردوس جنت کا ٹیلہ (یعنی سب سے بلند) سب سے اعلیٰ، سب سے افضل اور سب سے زیادہ پر نعمت ہے۔ امام احمد طیالسی اور بیہقی نے حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فردوس کی چار جنتیں ہیں دو سونے کی جن کی آرائش کی چیزیں اور مکان اور ہر چیز سونے کی ہے اور دو جنتیں چاندی کی ہیں۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جنت کا نام فردوس ہے لیکن صحیح اول قول ہے (کہ فردوس ایک خاص جنت کا نام ہے) اور اس حدیث میں راوی سے کچھ سہو ہو گیا ہے (اس لئے ناقابل اعتبار ہے) یا فردوس سے اس کا لغوی معنی مراد ہے۔ کعب نے کہا فردوس لغت میں انگوروں کے باغ کو کہتے ہیں۔ عکرمہ نے کہا حبشی زبان میں فردوس گھنے باغ کو کہا جاتا ہے۔ زجاج نے کہا یہ لفظ رومی ہے منقول ہو کر عربی میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔ ضحاک نے کہا فردوس اس گھنے باغ کو کہتے ہیں جس کے درخت باہم گتھے ہوئے ہوں۔ بعض علماء نے کہا ہر پسندیدہ خوبصورت باغ کو فردوس کہا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک فردوس ایسے باغ کو کہتے ہیں جس میں طرح طرح کا سبزہ اگا ہوا ہو فردوس کی جمع فرادیس آتی ہے۔

فردوس کے یہ تمام لغوی معانی ہیں جو حدیث مذکور میں مراد ہے۔ رہا علمی اور معین اسمی معنی تو وہی ہے جو اول الذکر حدیث اور آیت میں مراد ہے یعنی فردوس ایک ایسی جنت کا نام ہے جو سب سے اونچی اور افضل ہے۔

اگر آیت میں فردوس کا لغوی معنی مراد ہو تو نیکوکار اہل ایمان سے بھی عام اہل ایمان مراد ہوں گے اور اگر فردوس سے مراد کوئی مخصوص جنت ہو تو اہل ایمان سے مراد کامل حقیقی ایماندار ہوں گے۔ بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے اپنے ہاتھ سے فردوس کو پیدا کیا اور مشرک نیز دوامی عادی شراب خور کے لئے اس کو ممنوع کر دیا۔

ابن ابی الدنیا نے صفت الجنۃ میں حضرت عبداللہ بن حارث بن نوفلؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے تین چیزیں اپنے دست (خاص) سے بنائیں آدم کو اپنے ہاتھ سے بنایا، توریت کو اپنے ہاتھ سے لکھا اور فردوس کو اپنے ہاتھ سے لگایا اور فرمایا قسم ہے اپنی عزت و جلال کی اسکے اندر نہ کوئی دوامی خوگر شراب داخل ہوگا، نہ دیوث (بھاڑو) صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ دیوث کا کیا مطلب فرمایا وہ شخص جو اپنی بیوی کے اندر برے کام (یعنی زنا) کو ٹھہرائے (یعنی بیوی کی بھاڑ کھائے)

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝ وہ جنات الفردوس میں ہمیشہ رہیں گے اس سے ہٹنا نہ چاہیں گے۔ کیونکہ جنت سے زیادہ نفیس، اعلیٰ، عمدہ کوئی چیز ہی نہیں ہوگی کہ وہ جنت کو چھوڑ کر اس کی طرف راغب ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَا يَبْغُوْنَ سے خٰلِدِيْنَ کی صرف تائید مقصود ہو۔

حاکم وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قریش نے یہودیوں سے (مدینہ میں جاکر) کہا ہم کو کچھ ایسے

سوال بتاؤ کہ ہم جا کر اس شخص سے یعنی رسول اللہ سے بطور امتحان دریافت کریں۔ یہودیوں نے کہا آپ لوگ اس شخص سے روح کے متعلق دریافت کریں۔ قریش نے آکر رسول اللہ سے روح کے متعلق سوال کیا اس پر آیت یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا نازل ہوئی یہودی کہنے لگے ہم کو تو علم کثیر حاصل ہے ہم کو توریت دی گئی ہے اور جس کو توریت دی گئی اس کو خیر کثیر مل گئی اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

آپ کہہ دیجئے کہ سمندر (کا سارا پانی) اگر میرے رب کے (علم وحکمت کے) کلمات (لکھنے) کے لئے روشنائی ہو جائے (اور کلمات رب قلم سے لکھے جائیں) تو کلمات رب کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا (کیونکہ سمندر کا پانی متناہی ہے اس کی مقدار محدود ہے اور کلمات رب لامتناہی اور غیر محدود ہیں) خواہ ہم اس موجود سمندر کی طرح اتنی ہی اس میں زیادتی بھی کر دیں۔ کیونکہ متناہی کا مجموعہ متناہی ہوتا ہے، سمندر متناہی ہے اگر اتنا ہی بڑا ایک اور سمندر اس کے ساتھ ملا دیا جائے اور تمام پانی روشنائی بن جائے تو وہ مجموعہ بھی متناہی ہوگا۔ بلکہ عالم امکان میں جو چیز موجود ہے یا موجود ہونے والی ہے جب وہ موجود ہوگی تو متناہی ہوگی غیر متناہی مقدار کا وجود ہی محال ہے۔

مِدَادًا وہ چیز جس سے دوسری چیز کو مدد پہنچائی جائے جیسے دوات کے لئے روشنائی، چراغ کے لئے تیل، اصل لغت کے لحاظ سے مدد کا معنی ہے زیادتی اور کسی چیز کا تواتر۔

میں کہتا ہوں سات سمندر اور اتنے ہی اور اگر روشنائی بن جائیں اور قلم کے ذریعہ سے اس روشنائی سے اللہ کے کلمات لکھے جائیں تو ناممکن ہے کہ کلمات کے ایک حصہ کے بھی تمام گزشتہ احوال لکھے جاسکیں۔ (کیونکہ جانب ماضی میں ہر حصہ کے احوال انگنت اور نامحدود ہیں) متناہی غیر متناہی کا احاطہ کیسے کر سکتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہودیوں نے کہا تھا آپ کا خیال ہے کہ ہم کو حکمت عطا کی گئی ہے اور آپ ہی کی کتاب میں یہ بھی ہے کہ جس کو حکمت دی گئی اسکو خیر کثیر عطا کر دی گئی۔ پھر اب یہ اختلاف کیسا ہے اس شبہ کو دور کرنے کے لئے اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کے علم میں یقیناً خیر کثیر ہے درستی معاش و معاد کی اس کے اندر ہے، لیکن کلمات خداوندی کے سمندر تو اتھاہ اور ناپیدا کنار ہیں ان کے مقابلہ میں تو یہ سارا علم ایک قطرہ ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ

آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہاری طرح انسان ہی ہوں (فرق یہ ہے کہ) میرے پاس وحی آتی کہ تمہارا معبود اکیلا معبود ہے (کوئی اس کا شریک نہیں) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے اپنے رسول کو تواضع کی تعلیم دی تاکہ آپ مغرور نہ ہو جائیں اور حکم دیا کہ اپنے آدمی ہونے کا اقرار کریں لیکن اقرار بشریت کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیں کہ میرے اندر صاحب وحی ہونے کی خصوصیت بھی ہے میرے پاس وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود اکیلا معبود ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

میں کہتا ہوں اس حکم سے ایک بہت بڑے فتنہ کا دروازہ بند ہو گیا جس میں نصاری مبتلا ہو گئے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات امت عیسیٰؑ نے دیکھے اندھوں کو بینا ہوتے، لاعلاج بیماروں کو تندرست ہوتے اور مردوں کو زندہ ہوتے دیکھا، اللہ نے یہ معجزات حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ سے ظاہر فرمائے تو عیسائی چکر میں پھنس گئے (کسی نے عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا اور کسی نے جزء الوہیت قرار دیا) رسول اللہ ﷺ کو تو اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کے معجزات سے زیادہ معجزات عطا فرمائے تھے لوگوں کا فتنہ میں پڑ جانا غالب تھا۔ اس لئے حکم دیا کہ اپنی عبودیت اور اللہ کی توحید کا اعلان کر دیں۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ ع ۱۲

پس جو شخص اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اس کو چاہئے کہ نیک کام کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

یَرْجُوْ یعنی جو شخص اللہ کے سامنے جانے سے ڈرتا ہو اور اس کے ثواب اور دیدار کا خواہشمند ہو۔ بغوی نے لکھا ہے رَجَاء کا معنی خوف بھی ہے اور امید بھی۔ ایک شاعر نے دونوں معنی کے لئے ایک شعر میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔

فَلَا کُلُّ مَا تَرْجُوْ مِنَ الْخَیْرِ کَائِنٌ
وَلَا کُلُّ مَا تَرْجُوْ مِنَ الشَّرِّ وَاقِعٌ

یہ ضروری نہیں کہ جس خیر کے تم امیدوار ہو وہ ہو ہی جائے اور نہ یہ لازم ہے کہ جس شر سے تم ڈرتے ہو وہ شر واقع ہی ہو جائے، کبھی خیر کی جگہ شر واقع ہو جاتی ہے اور کبھی شر کی جگہ خیر مل جاتی ہے۔ عَمَلًا صَالِحًا یعنی اللہ کی پسند کا کام کرے۔ وَلَا یُشْرِکْ یعنی لوگوں کو دکھانے کیلئے نیک کام نہ کرے، نہ سوائے اللہ کے کسی عمل صالح کی تعریف اور جزا کا کسی سے امیدوار ہو۔

ابن ابی الدنیا نے کتاب الاخلاص میں اور ابن ابی حاتم نے طاؤس کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں موقف (حج) میں کھڑا ہوتا ہوں اللہ کی خوشنودی کا خواستگار ہوتا ہے لیکن یہ بھی پسند کرتا ہوں کہ میرا اس جگہ موجود ہونا دیکھ لیا جائے۔ (یعنی لوگ مجھے اس جگہ کھڑا دیکھ لیں) حضور ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ آیت فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا الخ نازل ہوئی۔ حدیث مرسل ہے، حاکم نے مستدرک میں اس کو موصولاً حضرت ابن عباسؓ کی روایت قرار دیا ہے اور شرط شیخین کے مطابق کہا ہے۔

ابن ابی حاتم نے مجاہد کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک مسلمان جہاد کرتا تھا، لیکن اس بات کو پسند کرتا تھا کہ جہاد کے اندر اس کی موجودگی کو لوگ دیکھ لیں اس پر آیت فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا الخ نازل ہوئی۔

ابن عساکر نے تاریخ میں اور ابو نعیم نے سدی صغیر کے سلسلہ سے بروایت کلبی از ابو صالح بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، جندب بن زہیر جب نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ و خیرات کرتے اور لوگوں میں آپ کی نیکی کا تذکرہ ہوتا تو آپ خوش ہوتے تھے اور خوش ہو کر عمل خیر میں اور زیادتی کرتے تھے اس پر آیت فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا الخ نازل ہوئی۔

ایک شبہ

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے گھر کے اندر جانماز پر تھا، اچانک ایک آدمی آگیا اور مجھے اس کے آنے سے اس بات پر خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے اس حالت میں یعنی جانماز پر دیکھا، حضور ﷺ نے فرمایا ابوہریرہؓ تیرے اوپر اللہ رحمت کرے تمہارے لئے دو ثواب ہیں ایک ثواب چھپ کر عبادت کرنے کا اور دوسرا ثواب ظاہر ہو جانے کا، ترمذی۔

مسلم نے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ خدمت گرامی میں عرض کیا گیا، فرمائیے اگر کوئی شخص نیک کام کرتا ہے اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں تو کیا اس کا عمل رائیگاں ہو جائے گا، فرمایا مومن کے لئے یہ فوری دنیوی بشارت ہے۔ یہ دونوں حدیثیں ان احادیث کے خلاف ہیں جو آیت مذکورہ کے سبب نزول کے سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں۔

ازالہ

دونوں میں کوئی تضاد نہیں، آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی عمل اللہ کے لئے کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ لوگ اس کو نیکی کرتے دیکھیں یا لوگوں کے سامنے زیادہ نیکی کرتا ہے تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں تو ریاکاری اور شرک خفی ہے، باقی جو شخص کوئی نیک کام اللہ کے واسطے کرتا ہے اور لوگ اس کو دیکھ پاتے ہیں اور تعریف کرنے لگتے ہیں اور وہ اس سے خوشی محسوس کرتا ہے تو چونکہ وہ نیکی لوگوں کو دکھانے اور تعریف کرانے کے لئے نہیں کرتا، نہ لوگوں سے

کوئی معاوضہ چاہتا ہے۔ نہ لوگوں کے دکھانے کے لئے عمل خیر میں اضافہ کرتا ہے، اس لئے یہ ریاکاری نہیں بلکہ یہ اس کے لئے فوری خوشی ہے اور اس کے لئے دوہرا اجر ہے ایک چھپا کر عبادت کرنے کا دوسرا اظہار ہو جانے کا۔ واللہ اعلم۔

حضرت جندبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص لوگوں کو سنانے کے لئے نیکی کرتا ہے اللہ بھی اس کے ساتھ سنانے کا برتاؤ کرتا اور جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے نیکی کرتا ہے اللہ بھی اس کے ساتھ دکھاوٹ کا برتاؤ کرتا ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت محمود بن لبید راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر جس چیز کا سب سے زیادہ مجھے خوف ہے وہ شرک اصغر ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ شرک اصغر کیا ہے، فرمایا، ریاکاری۔ رواہ احمد۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اتنا زیادہ نقل کیا ہے کہ جس وقت اللہ اپنے بندوں کو ان کے اعمال کے موافق بدلہ دے گا ان سے فرمادے گا انہیں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لئے تم نیکی کرتے تھے جا کر دیکھو کیا ان کے پاس تم کو نیکی کی جزا یا کوئی خیر ملتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا، شرک اصغر سے بچو لوگوں نے کہا شرک اصغر کیا ہے، حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا، ریاکاری، اخرجہ ابن مردویہ فی التفسیر والاصبہانی فی الترغیب والترہیب۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ فرماتا ہے، میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں جو شخص کسی نیک عمل میں میرے ساتھ کسی کو ساجھے دار بناتا ہے یعنی نیک عمل سے کسی اور کی بھی خوشنودی چاہتا ہے میں اس کو اس کے شرک کے ساتھ چھوڑ دیتا ہوں، دوسری روایت میں ہے، میں اس سے بیزار ہوں اس کا عمل اسی کے لئے ہوگا جس کے لئے اس نے کیا ہوگا۔ رواہ مسلم۔ حضرت ابوسعید بن ابی فضالہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے ناقابل شک دن میں جب لوگوں کو اللہ جمع کرے گا تو اللہ کی طرف سے ایک منادی ندا دے گا جس نے اپنے کئے ہوئے نیک عمل میں کسی کو اللہ کا ساجھی بنایا ہو وہ اپنا ثواب اسی کے پاس جا کر طلب کرے، اللہ شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہے، رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ وابن حبان والبیہقی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا، میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا، جو شخص اپنا نیک عمل لوگوں کو سنانے کے لئے کرے گا اللہ بھی اس کے ساتھ سنانے کا برتاؤ کرے گا، اس کو خفیف کرے گا، حقیر کرے گا اور اس کی توہین کرے گا۔ رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان۔

حضرت شداد بن اوسؓ نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ جس نے دکھاوٹ کے لئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوٹ کے لئے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوٹ کے لئے خیرات کی اس نے شرک کیا۔

امام احمد نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سربمہر اعمال نامے لا کر بارگاہ الٰہی میں حاضر کئے جائیں گے، اللہ فرمائے گا ان کو پھینک دو اور ان کو قبول کر لو (یعنی بعض اعمال ناموں کو پھینک دینے اور بعض کو قبول کرنے کا حکم دے گا) فرشتے عرض کریں گے تیری عزت کی قسم ہم نے تو وہی لکھا ہے جو اس نے کیا تھا (یعنی اندراج غلط نہیں ہے) اللہ فرمائے گا (یہ ساقط کردہ) اعمال میرے سوا دوسروں کے لئے کئے گئے تھے اور میں آج وہی اعمال قبول کروں گا جو محض میرے لئے کئے گئے ہوں۔

طبرانی نے الاوسط میں اور اصبہانی نے الترغیب میں اور بزار نیز دار قطنی نے شہر بن عطیہ کی روایت سے بیان کیا کہ قیامت کے دن بعض لوگوں کو حساب کے لئے پیش کیا جائے گا اور ان کے اعمال ناموں میں پہاڑوں جیسی نیکیاں درج ہوں گی، رب العزت فرمائے گا تو نے فلاں دن نماز پڑھی تھی اور اس لئے پڑھی تھی کہ تجھے لوگوں میں نمازی کہا جائے، میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں، اطاعت خالص میرے ہی لئے ہونی چاہئے۔ تو نے فلاں دن روزہ رکھا تھا تاکہ لوگ کہیں فلاں شخص نے روزہ رکھا، میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں اطاعت خالص میرے ہی لئے ہونی چاہئے۔ اس طرح ایک کے بعد ایک اس

کے اعمال مٹادیئے جائیں گے اور فرشتے اس سے کہیں گے تو اللہ کے سوا دوسروں کے لئے یہ نیک کام کرتا تھا۔ حضرت شداد بن اوسؓ کا بیان ہے کہ اللہ ایک میدان میں اگلوں پچھلوں کو سب کو تا حد نظر جمع کرے گا اور ایک پکارنے والا پکارے گا جس کی آواز سب سنیں گے، میں جھوٹے مفروضہ شرکاء سے بہتر ہوں، دار دنیا میں جو نیک کام ایسا کیا گیا جس میں کسی شریک کو بھی ملادیا گیا تو میں اس کام کو اس شریک کے لئے چھوڑ دوں گا اور آج صرف اسی عمل کو قبول کروں گا جو خالص میرے لئے کیا گیا ہوگا۔ رواہ ابو الاصبہانی۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے جس نے دوسروں کو دکھانے کے لئے کچھ نیک کام کیا تو اللہ قیامت کے دن اس کام کو اسی کے (جس کے لئے وہ کام کیا گیا ہوگا) سپرد کردے گا اور فرمائے گا دیکھ یہ جھوٹا شریک تجھے کچھ بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

اہل تصوف کے نزدیک آیت مذکورہ کی تشریح

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ جو اللہ کا بے کیف قرب اور نزول خداوندی کا خواستگار ہے اور اس بے کیف وصل کا امیدوار ہے کہ مرتبہ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى پر پہنچ جائے فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا تو نیک کام کرے یعنی پہلے نفس اور نفس کے عیوب کو فنا کردے اس کے بعد نیک کام کرے، عیوب نفس نیک عمل کو تباہ کردیتے ہیں، عمل میں صلاح فناء نفس کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے، وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے یعنی اللہ کے سوا اس کے دل کا تعلق کسی سے نہ رہے، نہ علمی تعلق، نہ محبت کا تعلق (نہ عقلی تعلق، نہ جذباتی تعلق) علمی تعلق کا نام ذکر ہے اور ذکر عبادت ہے۔ اور محبت مقتضی عبادت ہے، محبوب معبود ہوتا ہے، عبادت کا معنی ہے انتہائی فروتنی اور اپنے کو حقیر سمجھنا اور محبوب کے سامنے انتہائی فروتنی کرتا ہے (گویا اس کی پوجا کرتا ہے) پس عبادت میں شرک نہ کرنے کا مطلب ہوا، دل کا کسی قسم کا تعلق غیر اللہ سے نہ رکھنا۔

ایک شبہ

اللہ کے سوا دوسروں سے دل کا علمی تعلق تو اولیاء وانبیاء کا بھی ہوتا ہے۔

ازالہ

فناء قلب کے بعد جو علم حاصل ہوتا ہے اس کا محل قلب نہیں ہوتا اس وقت تو قلب پر تجلیات رحمٰن کا نزول ہوتا ہے لیکن مادہ تکلیف چونکہ باقی رہتا ہے (بندہ اس وقت بھی مکلف ہی ہوتا ہے) اس لئے دوسری چیز سے اس کا تعلق باقی رہتا ہے (حقیقی آویختگی تو کسی چیز سے باقی نہیں رہتی)۔

فصل

حضرت ابو درداءؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، سورۂ کہف کے شروع کی دس آیات جو یاد رکھے گا اللہ اس کو فتنۂ دجال سے محفوظ رکھے گا۔ رواہ احمد وابوداؤد و مسلم والنسائی۔ ترمذی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے، سورۂ کہف کے شروع کی تین آیات جو شخص پڑھے گا (یعنی پڑھتا رہے گا) فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔ احمد، مسلم اور نسائی کی دوسری روایت اس طرح ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، جو شخص سورۂ کہف کے آخر کی دس آیات پڑھے گا دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

سہل بن معاذؓ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص سورۂ کہف کے شروع (کی آیات) اور آخر (کی آیات) کو پڑھے گا، قدم سے لے کر سر تک اس کے لئے نور ہی نور ہوگا (یعنی وہ سراسر نور ہوگا) اور جو پوری سورت پڑھے گا اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہوگا، رواہ البغوی۔ ابن السنی نے عمل الیوم واللیلۃ میں اور امام احمد نے مسند میں بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص خواب گاہ میں (سوتے وقت) سورۂ کہف پڑھے گا اس کے لئے سونے کی

پوری حالت میں ایک نور ہوگا جو خواب گاہ سے مکہ تک جگمگائے گا، اس نور کے اندر فرشتے بھرے ہوں گے جو اٹھنے کے وقت تک اس کے لئے دعائے رحمت کرتے رہیں گے، اگر اس کی خواب گاہ مکہ میں ہوگی تو خواب گاہ سے بیت المعمور تک اس کے لئے نور جگمگائے گا جس کے اندر فرشتے بھرے ہوں گے جو بیدار ہونے تک اس کے لئے دعائے رحمت کرتے رہیں گے۔ اخرجہ ابن مردویہ۔ حضرت عمر بن خطابؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے رات کو فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ سے آخر تک پڑھا اس کے لئے عدن سے مکہ تک نور ہوگا جس کے اندر فرشتے بھرے ہوں گے۔ (ازالة الخفاء)

حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے جمعہ کے روز سورۂ کہف پڑھی اس کے لئے اس جمعہ سے اگلے جمعہ تک ایک نور چمکتا رہے گا۔ رواہ الحاکم وصححہ والبیہقی فی الدعوات الکبیر۔ بیہقی نے شعب الایمان میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے۔ جس نے جمعہ کے روز سورۂ کہف پڑھی تو اس کے پاس سے کعبہ تک اس کے لئے نور چمکتا رہے گا۔

حضرت براء بن عازبؓ راوی ہیں کہ ایک شخص سورۂ کہف پڑھ رہا تھا اس پر ایک نورانی بادل چھایا ہوا تھا، جو چکر کھا رہا تھا اور اس شخص کے قریب آرہا تھا۔ ایک گھوڑا قریب ہی رسیوں سے بندھا ہوا تھا، وہ یہ منظر دیکھ کر بدکنے لگا (جب وہ شخص پڑھنے سے رکتا تھا گھوڑا بھی بدکنا موقوف کر دیتا تھا، پھر وہ شخص پڑھتا تھا تو گھوڑا بھی بدکتا تھا۔ صبح کو خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اس شخص نے یہ سرگزشت بیان کی فرمایا، وہ (نور) سکینہ تھا جو قرآن کی وجہ سے نازل ہوا تھا۔ متفق علیہ۔

اللہ کی مدد سے سورۂ کہف کی تفسیر بروز چہار شنبہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۰۲ھ کو ختم ہوئی۔

بِحَمْدِ اللّٰهِ وَعَوْنِهٖ

تفسیر سورۂ کہف کا ترجمہ مع تشریحی اضافات ۶ رجب ۱۳۸۸ھ کو ختم ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سورۂ مریم

سورۂ مریم مکی ہے اس میں (۹۸) آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

كٓهٰيٰعٓصٓ ۞ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۞ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۞
یہ تذکرہ ہے آپ کے رب کے مہربانی فرمانے کا اپنے بندے زکریا پر۔ جب کہ انہوں نے اپنے رب کو پوشیدہ طور پر پکارا۔

اگر کٓهٰيٰعٓصٓ سے مراد قرآن یا سورت ہو تو ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ خبر ہو گی اور کٓهٰيٰعٓصٓ مبتدا یا مبتداء محذوف ہے یعنی ہٰذَا ذِكْرُ رَحْمَةِ یا ذِكْرُ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے یعنی ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ يَتْلٰى عَلَيْكَ عَبْدَهٗ رَحْمَتِ یا ذِكْر کا مفعول ہے اور زَكَرِيَّا عَبْدَهٗ سے بدل ہے۔

نِدَآءً خَفِيًّا یعنی زکریا نے اپنے عبادت خانہ میں پوشیدہ طور پر رات کو اپنے رب کو پکارا۔ پوشیدہ دعا میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے، پوشیدہ دعا کرنا سنت ہے، دعا کا طریقہ ہی یہ ہے کہ پوشیدہ طور پر کرے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا ۞ (اور) عرض کیا اے میرے رب میری ہڈیاں پیری کی وجہ سے کمزور ہو گئیں اور سر میں بالوں کی سفیدی پھیل گئی۔

وَهَنَ الْعَظْمُ ہڈی کمزور ہو گئی یعنی میں ضعیف ہو گیا، ہڈیاں سارے بدن کے ستون ہیں، ڈھانچہ ہیں۔ ہڈیاں کمزور ہو گئیں تو سارے اعضاء کمزور ہو گئے ہڈیاں باقی اجزاء بدن سے سخت ہیں، جب ہڈیاں کمزور ہو گئیں تو دوسرے اجزاء کا زیادہ کمزور ہو جانا ضروری ہے۔ اَلْعَظْمُ اسم جنس ہے کثیر پر بھی جنس کا اطلاق ہوتا ہے یعنی فی نفسہٖ ہڈی کمزور ہو گئی کسی جگہ کی ہو۔

وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا یعنی سارا سر سفید ہو گیا۔ سفیدی بالوں میں ایسی پھیل گئی کہ گویا آگ بھڑک اٹھی۔ حضرت زکریا کی اس وقت عمر کیا تھی، اس سلسلہ میں علماء کے اقوال مختلف ہیں عبداللہ بن مبارک نے ساٹھ برس کہا ہے (ابن ابی حاتم) ثوری کے نزدیک ستر برس تھی (عبدالرزاق و ابن ابی حاتم نے ایک سو دس سال بتائی ہے۔ بیوی کی عمر اٹھانوے سال تھی)۔

وَلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۞ اور اے میرے رب میں تجھے پکار کر کبھی نامراد نہیں رہا، یعنی گزشتہ زندگی میں جب اور جو دعائیں نے تجھ سے کی تو نے قبول فرمائی، میری دعا کو قبول کرنا تیرا معمول رہا ہے اس لئے اب بھی مجھے تجھ سے دعا قبول ہونے کی امید ہے کیونکہ قبول دعا کا تو نے مجھے عادی بنا دیا ہے اور کریم اپنے امیدوار کو نامراد نہیں چھوڑتا۔ اس مطلب پر دُعَاء کی کَ کی طرف اضافت۔ اضافت الی المفعول ہو گی، یعنی کَ دُعاء کا مفعول ہو گا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضمیر کَ فاعل دعا ہو اور دعا کی اضافت اضافت الی الفاعل ہو گی۔ اس صورت میں یہ مطلب ہو گا کہ جب تو نے مجھے (ایمان کی طرف) دعوت دی میں نے تیری دعوت قبول کی، ایمان کو ترک کر کے بدبخت اور نامراد نہ ہوا، اب میرے ایمان کی برکت سے میری دعا قبول فرما۔

وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۞ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۞

اور میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں کی طرف سے اندیشہ رکھتا ہوں اور میری بی بی بانجھ ہے سو (اس صورت میں) تو مجھے خاص اپنی عنایت سے ایک میرا وارث یعنی بیٹا ایسا مرحمت فرمادے جو میرا (یعنی میرے علم کا) اور یعقوب کے خاندان (کے علم) کا وارث ہو جائے اور اے میرے رب اس کو اپنا پسندیدہ بنانا۔

اَلْمَوَالِیَ، مولی کی جمع یعنی چچا کے بیٹے یا وہ لوگ جو میرے بعد میری امت کی درستگی کے متولی ہوں گے اور میرے جانشین بنیں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری جانشینی اچھی طرح نہ کریں گے اور امت کے لئے دین کو بگاڑ دیں گے اور میری بیوی بانجھ ہے، نا قابل تولید ہے اور ضرورت ہے صحیح جانشین کی جو میری امت کو درست رکھ سکے اس لئے تو محض اپنے فضل اور اپنی قدرت سے مجھے بیٹا عنایت فرما جو میرے بعد میرے کاموں کو درست رکھنے کا ذمہ دار اور متولی ہو اور خاندان یعقوب کے علم و نبوت کا بھی صحیح متولی ہو۔ میراث سے مراد مالی میراث نہیں، علم و نبوت مراد ہے۔ انبیاء کے مال کا وارث کوئی نہیں ہوتا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں اور انبیاءؑ نے اپنی میراث میں درہم و دینار نہیں چھوڑے بلکہ علم کی میراث چھوڑی ہے، اس میراث کو جس نے لیا اس نے بڑی میراث پائی وہ بڑا خوش نصیب ہے، رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجۃ و الدارمی من حدیث کثیر بن قیس۔ ترمذی نے راوی کا نام قیس بن کثیر لکھا ہے۔ حضرت سیدہ فاطمہؓ نے جب بر شتہ پدری رسول اللہ ﷺ کی میراث حضرت ابو بکر صدیقؓ سے طلب کی تو صدیق اکبرؓ نے اسی حدیث کی بنا پر حضرت سیدہؓ کو رسول اللہ ﷺ کی کوئی میراث نہیں دی۔ اجماع بھی اس پر منعقد ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ترکہ میراث میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ بخاری نے صحیح میں حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ، ابو بکرؓ کے پاس آئے اور رسول اللہ ﷺ کے ترکہ سے اپنا میراثی حصہ طلب کیا، حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا، میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے، ہم میراث نہیں چھوڑتے جو کچھ ہم چھوڑیں گے وہ خیرات کے طور پر مسلمانوں کا حق ہوگا، یہ بھی بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد امہات المومنین، نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ کے ترکہ میں سے اپنی میراث طلب کرنے حضرت عثمانؓ کو حضرت ابو بکرؓ کے پاس بھیجیں حضرت عائشہؓ نے کہا کیا رسول اللہ ﷺ نے نہیں فرمایا تھا کہ ہم میراث نہیں چھوڑتے جو کچھ ہم چھوڑیں گے وہ خیرات ہے۔

بخاری کی روایت ہے کہ مالک بن اوس بن الحدثان نے کہا، میں حضرت عمرؓ کے پاس گیا، میں آپ کے پاس موجود ہی تھا کہ آپ کے دربان یرفاء نے آکر کہا (امیر المومنین) کیا حضرت عثمانؓ حضرت عبد الرحمنؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت سعدؓ کو داخلہ کی اجازت ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، ہاں یرفاء نے سب حضرات کو بلا لیا، پھر یرفاء نے آکر کہا حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تشریف لائے ہیں، کیا داخل ہونے کی اجازت ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، ہاں یہ دونوں بزرگ بھی تشریف لے آئے۔ حضرت عباسؓ نے فرمایا امیر المومنین میرا اور ان کا تصفیہ کرا دیجئے، حضرت عمرؓ نے جماعت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا میں آپ لوگوں کو اس اللہ کی قسم جس کے حکم سے آسمان و زمین قائم ہیں دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا ہم میراث نہیں چھوڑیں گے جو کچھ ہم چھوڑیں گے وہ (سب مسلمانوں کے لئے) خیرات ہوگا، پوری جماعت نے کہا بے شک ایسا فرمایا، کیا آپ دونوں حضرات بھی اس سے واقف ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا (دونوں نے اقرار کیا) الحدیث۔

بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میرے وارث میراث میں ایک دینار بھی تقسیم نہ کریں، اپنی بیبیوں کے خرچ اور کارندوں کی اجرت کے بعد اگر میں کچھ چھوڑ کر جاؤں تو وہ خیرات ہے۔

اس موضوع کی روایات حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ اور حضرت ابو الدرداءؓ سے بھی آئی ہیں۔ شیعہ اس حدیث کا ہی انکار کرتے ہیں، حالانکہ محمد بن یعقوب کلینی نے اپنی جامع میں حدیث مذکور حضرت ابو عبد اللہ امام جعفر صادق کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، انبیاءؑ نے میراث میں نہ کوئی درہم چھوڑا نہ دینار بلکہ میراث میں اپنی احادیث چھوڑی ہیں۔ الحدیث۔

آیت زیر تفسیر کی رفتار بھی چاہتی ہے کہ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ، میں میراث سے مراد مالی میراث نہیں ہے کیونکہ تمام نسل یعقوبؑ کا میراث کا وارث ہونا تو ممکن ہی نہیں تھا، پھر حضرت زکریاؑ نبی برحق تھے آپ کی شان سے بعید تھا کہ اپنے چچا کے بیٹوں کے پاس اپنے مال کے پہنچنے کا ان کو ایسا اندیشہ ہو کہ وہ اس اندیشہ سے بیٹا ہونے کی دعا کریں تاکہ چچا کے بیٹوں کو میراث میں ان کا مال نہ پہنچ جائے۔

وَّاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا۔ رَضِیًّا بمعنی مَرْضِیًّا یعنی تو اس کو اپنا پسندیدہ بنا، اس کے قول و عمل کو پسند فرمانا یا رَاضِیًا کے معنی میں ہے یعنی تو اس کو ایسا کر دے تاکہ وہ دکھ سکھ ہر حال میں راضی رہے (تیرا شکوہ نہ کرنے لگے)۔

یٰزَكَرِیَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ﹰاسْمُهٗ یَحْیٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا۝

(اللہ نے فرمایا) اے زکریا ہم تجھے ایک لڑکا (ہونے) کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام (ہماری طرف سے) یحییٰ ہے ہم نے اس سے پہلے کوئی اس کا (ہم نام یا نظیر اور مثل) نہیں بنایا، یعنی تیری دعا کے موافق تیرا وارث ایک لڑکا ہوگا جس کا نام (بطور عزت افزائی) ہم نے یحییٰ رکھا ہے۔ قتادہ اور کلبی نے سَمِیًّا کا ترجمہ ہم نام کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ حضرت یحییٰؑ سے پہلے کسی کا نام یحییٰ نہیں رکھا گیا، آیت میں اس امر پر دلالت ہے کہ نادر نام رکھنے میں مسمّی کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ سعید بن جبیرؒ اور عطاءؒ نے سَمِیًّا کا ترجمہ شبیہ اور مثل کیا ہے، جس طرح آیت هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا میں سَمِیًّا کا معنی ہے مثل اور مشابہ۔ اس صورت میں بر قول بغوی یہ معنی ہوگا کہ یحییٰ سے پہلے کوئی شخص ایسا نہیں ہوا کہ اس نے گناہ کبھی نہ کیا ہو اور گناہ کی طرف اس کا میلان بھی نہ ہوا ہو۔ میں کہتا ہوں شاید اس سے یہ مراد ہے کہ بیشتر فضائل اس کے اندر موجود ہوں گے جن میں بعض جزئی فضائل دوسرے پیغمبروں کے مقابلہ میں امتیازی ہوں گے جیسے حصور ہونا۔ یہ مراد نہیں ہے کہ یحییٰ بحیثیت مجموعی تمام گزشتہ انبیاءؑ سے افضل ہوں گے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ، حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ، حضرت یحییٰؑ سے پہلے گزر چکے تھے اور حضرت یحییٰ سے افضل تھے۔

علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباسؓ کا تفسیری قول یہ نقل کیا ہے کہ حضرت یحییٰؑ سے پہلے کسی بانجھ کے ایسا لڑکا پیدا نہیں ہوا، جو حضرت یحییٰ کی مثل ہوتا۔ (یہ قول بھی محل تامل ہے۔ حضرت اسحاقؑ کی والدہ بھی بانجھ تھیں اور کسی آیت یا حدیث سے حضرت اسحاقؑ سے حضرت یحییٰ کی برتری ثابت نہیں)۔

بیضاوی نے لکھا ہے یحییٰ عجمی نام ہے اور اگر عربی ہو تو فعل سے منقول ہوگا جیسے یعیش اور یعمر۔ بعض نے کہا، آپ کی وجہ سے والدہ کی رحم میں زندگی پیدا ہو گئی تھی یا آپ کی دعوت سے دین الٰہی زندہ ہو گیا تھا۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِیًّا۝

زکریا نے کہا اے میرے رب میرے لڑکا کہاں سے ہوگا میری تو بیوی بھی بانجھ ہے اور (ادھر) میں بڑھاپے کے انتہائی درجہ کو پہنچ چکا ہوں۔ اَنّٰى یعنی کیسے ہوگا، یہ سوال انکاری نہیں، طلب کیفیت کے لئے ہے، مطلب یہ ہے کہ بچہ کیسے ہوگا ہم دونوں کو جوان کر دیا جائے گا، یا دونوں بوڑھے ہی رہیں گے اور بچہ ہو جائے گا۔

حضرت زکریا کو بنظر اسباب تعجب ہوا قدرت خدا میں ان کو کوئی کلام نہ تھا، عِتِیًّا میں عُتُوٌّ تھا، عُتُوٌّ کا معنی ہے سرکشی اطاعت سے انکار، یہاں مراد ہے کمال پیری، زیادہ بوڑھا آدمی بے قابو ہو جاتا ہے اس کے اعضاء حسب منشاء کام دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ قتادہ نے کہا ہڈیوں کی لاغری مراد ہے۔ عَاتِی وہ بوڑھا آدمی جس کی ہڈیاں خشکی کی طرف مائل ہو گئی ہوں، سوکھنے لگی ہوں۔ عَتَا الشَّیْخُ اس بوڑھے کی عمر انتہا کو پہنچ گئی۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ (اللہ نے یا بشارت دینے والے فرشتے نے کہا) بات یونہی ہے (جیسی تم نے کہی بنظر اسباب بچہ کی پیدائش عجیب بھی ہے اور بعید بھی)۔

قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ (اور) تیرے رب نے کہا میرے لئے یہ بات آسان ہے۔ مجھے اپنی منشاء کے

موافق کرنے میں ظاہری اسباب کی ضرورت نہیں۔ قَالَ كَذٰلِكَ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ زکریاؑ نے کہا واقعہ یہی ہے جو میں نے عرض کر دیا۔

وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ۝ اور اس سے پہلے ہم نے تجھے بھی تو پیدا کیا تھا جبکہ تو کچھ بھی نہ تھا، بالکل معدوم تھا اور معدوم کا معنی ہی کچھ نہ ہونا، آیت بتا رہی ہے کہ معدوم شئی نہیں (یعنی شَيْئٌ کا اطلاق صرف موجود پر ہوتا ہے معدوم کو شَيْئِي نہیں کہا جاتا۔ مترجم)

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ زکریاؑ نے کہا، اے میرے رب میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر دے، جس سے میری بیوی کا حاملہ ہونا معلوم ہو جائے۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ اللہ نے (یا فرشتہ نے) کہا تیرے لئے (حمل کی) نشانی یہ ہے کہ تو تین راتیں (اور تین دن) لوگوں سے کلام نہ کر سکے گا۔ سورۂ آل عمران میں بھی یہ قصہ آیا ہے وہاں بیان کر دیا گیا کہ حضرت زکریاؑ تین دن تین رات کسی آدمی سے بات نہ کر سکے لیکن اللہ کا ذکر کرتے تھے تو زبان رواں ہو جاتی تھی اس لئے مسلسل تین روز ذکر و شکر میں مشغول رہے۔

سَوِيًّا ۝ ایسی حالت میں کہ صحیح سالم ہو گا یعنی کوئی بیماری لاحق نہ ہو گی، نہ گونگا پن ہو گا (نہ زبان کا فالج لقوہ۔ مترجم) مجاہد نے کہا، کلام سے روکنے والا کوئی مرض نہ ہو گا۔ بعض علماء نے سَوِيًّا کا ترجمہ کیا ہے مسلسل متواتر۔ اول ترجمہ زیادہ صحیح ہے۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝

اس کے بعد زکریا مسجد سے نکل کر قوم کے پاس آئے اور اشاروں سے ان سے کہا کہ صبح و شام اللہ کی پاکی بیان کرو۔

اَلْمِحْرَابِ (اسم ظرف لڑائی کی جگہ) مراد مسجد کیونکہ مسجد شیطان سے لڑنے کی جگہ ہے۔ صاحب قاموس نے محراب کے متعدد معانی لکھے ہیں، بالاخانہ، گھر کے اندر صدر مقام، مسجد میں امام کے کھڑا ہونے کی جگہ، وہ مقام جہاں بادشاہ تنہائی میں سب سے الگ لوگوں سے دور رہتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے لوگ مسجد کے باہر منتظر تھے کہ زکریاؑ اندر سے دروازہ کھول دیں تو وہ اندر جا کر نماز پڑھیں، اچانک زکریاؑ دروازہ کھول کر باہر آگئے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا لوگوں نے کیفیت دریافت کی تو آپ نے اشارہ سے ان کو تسبیح و تنزیہ کا حکم دیا، مجاہد نے اَوْحٰى کی تشریح میں کہا کہ زمین پر لکھ دیا۔ سَبِّحُوْا یعنی نماز پڑھو اور اللہ کی پاکی بیان کرو۔

يٰيَحْيٰى اے یحییٰ، پورا کلام اس طرح تھا زکریا کی بیوی حاملہ ہو گئی، پھر یحییٰ پیدا ہو گئے اور جب مخاطب بنانے کے قابل ہو گئے تو ہم نے کہا اے یحییٰ۔ محلی نے لکھا ہے جب یحییٰ کی عمر دو سال کی ہو گئی تو ان سے خطاب کیا گیا۔

خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ کتاب کو قوت کے ساتھ پکڑ لے۔ کتاب سے مراد ہے توریت۔ قوت سے مراد کوشش اور توفیق الٰہی سے استعانت۔

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ اور ہم نے بچپن میں ہی اس کو حکم یعنی حکمت اور کتاب کی سمجھ عطا کر دی تھی، تین سال کی عمر میں حضرت یحییٰ نے توریت پڑھ لی اور سمجھ لی تھی، آیت کے اسی جملہ کے پیش نظر کہا گیا ہے کہ جس نے قرآن پڑھ لیا وہ اس آیت کے حکم کا مصداق ہو گیا۔ روایت میں آیا ہے کہ بچے حضرت یحییٰ کو کھیلنے کیلئے بلاتے تھے تو آپ جواب دیتے تھے، ہم کو اس کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔

بعض علماء کا قول ہے کہ حکم سے مراد نبوت ہے، بچپن میں ہی اللہ نے یحییٰ کو نبی بنا دیا تھا۔

وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ اور (ہم نے دی یحییٰ کو) اپنے پاس سے رحمت اور گناہوں سے طہارت۔ رحمت دینے کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے۔

(۱) یحییٰ پر اللہ نے رحم کیا ان پر رحمت نازل کی۔
(۲) ان کے دل میں ماں باپ پر رحم کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ بعض علماء نے حَنَانًا کا ترجمہ ہیبت و وقار یا رزق یا برکت کیا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے حَنَانٌ بروزن سَحَابٌ، رحمت، رزق، ہیبت، وقار اور دل کی نرمی۔ حَنَّان بمعنی رَحِیْم صفت کا صیغہ لفظ حَنَان سے ہی بنایا گیا ہے۔ اور اللہ کا وصفی نام ہے۔
زَکٰوۃً یعنی گناہوں سے پاک دامن رہنا، بعض کے نزدیک طاعت و اخلاص، قتادہ و ضحاک کے نزدیک عمل صالح مراد ہے، کلبی نے کہا زَکٰوۃً سے مراد ہے محض عطیہ الٰہی جو حضرت یحییٰ کے والدین کو بصورت یحییٰ عطا ہوا تھا۔
وَكَانَ تَقِيًّا ۝ اور وہ تھا پرہیزگار، یعنی اطاعت شعار، مخلص، طاعت گزار جس نے نہ کبھی گناہ کیا، نہ گناہ کا ارادہ۔
وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ اور پاک تھا والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا اور مہربان تھا۔
وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ اور متکبر، رب کا نافرمان نہ تھا، بعض علماء کا قول ہے کہ جبار وہ شخص ہے جو شدت غضب میں مارتا اور قتل کرتا ہو۔
وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝
سَلٰمٌ عَلَیْهِ ہر دکھ اور اذیت سے اللہ کی طرف سے اس کے لئے سلامتی ہے، یہ جملہ معترضہ ہے۔ یَوْمَ وُلِدَ یعنی پیدائش کے وقت یحییٰ کو شیطان کی دسترس سے محفوظ رکھا گیا، شیطان پیدائش کے وقت جو اثر بچے پر ڈالتا ہے، کچوکا دیتا ہے، یحییٰ کو اس سے بچایا گیا۔ یَوْمَ یَمُوْتُ اور مرنے کے دن یعنی عذاب قبر سے بھی اسے محفوظ رکھا گیا۔ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا اور قیامت کے دن دوزخ کے عذاب سے اس کو محفوظ کر دیا گیا۔
سفیان بن عیینہؒ نے کہا انسان کے یہی تین عجیب احوال ہوتے ہیں۔ (۱) ماں کے پیٹ کو چھوڑ کر باہر اس دنیا میں آتا ہے۔ (۲) دنیا سے نکل کر دوسرے عالم میں پہنچتا ہے جہاں اس کو وہ اشخاص ملتے ہیں جو اس دنیا میں اس کو کبھی نظر نہیں آئے۔ (۳) زندہ ہو کر میدان حشر میں پہنچے گا اور ایسا میدان اور اجتماع اس نے کبھی نہ دیکھا ہو گا (نہ دنیا میں نہ عالم برزخ میں) ان تینوں حالات و مقامات میں محفوظ رہنے کی خصوصیت اللہ نے یحییٰ کو عطا فرمائی۔
یَوْمَ وُلِدَ اور یَوْمَ یَمُوْتُ اور یَوْمَ یُبْعَثُ کا تعلق ظرف مستقر محذوف سے ہے، جس سے لفظ عَلَیْهِ متعلق ہے۔

ایک شبہ

اہل کوفہ کہتے ہیں کہ ظرف مستقر کا تعلق صفت کے صیغہ سے ہوتا ہے اور صفت کا صیغہ محذوف ہوتا ہے، یعنی مُسْتَقِرٌّ عَلَیْهِ یا حَاصِلٌ عَلَیْهِ۔
اہل بصرہ کہتے ہیں کہ ظرف مستقر کا تعلق فعل محذوف سے ہوتا ہے یعنی اِسْتَقَرَّ عَلَیْهِ یا حَصَلَ عَلَیْهِ۔ ماضی کے صیغہ سے اگر یَوْمَ کا تعلق مانا جائے تو بے شک یَوْمَ وُلِدَ کا مطلب ٹھیک ہو جائے گا، یحییٰ پر سلامتی نے قرار پکڑا جس روز وہ پیدا ہوئے۔ لیکن یَمُوْتُ اور یُبْعَثُ تو مضارع کے صیغے ہیں جن کا زمانہ ابھی نہیں آیا پھر یہ کہنا کس طرح صحیح ہو گا کہ یحییٰ پر سلامتی نے قرار پکڑا جس روز وہ مریں گے اور جس روز وہ اٹھائے جائیں گے، اور کوفیوں کے مسلک پر صفت کا صیغہ محذوف ہو گا جو حال کے معنی میں ہو گا اس صورت میں مستقر علیہ یَوْمَ یَمُوْتُ اور یَوْمَ یُبْعَثُ کہنا تو صحیح ہو جائے گا لیکن یَوْمَ وُلِدَ کہنا صحیح نہ ہو گا وُلِدَ ماضی کا صیغہ ہے اور مستقر بمعنی حال ہے۔

جواب

محققین نحو کہتے ہیں کہ ظرف پر عامل معنوی عمل کرتا ہے یعنی صرف مصدری معنی عامل ہوتا ہے کسی زمانہ کا لحاظ نہیں

کیا جاتا، اسی لئے ھٰذَا زَیْدٌ قَائِمًا میں حال یعنی قَائِمًا کا عامل معنوی مانا جاتا ہے، کسی خاص زمانہ پر دلالت بالکل نہیں ہوتی۔ اِسْتَقَرَّ (بر قول اہل بصرہ) اور مُسْتَقِرٌّ (بر قول اہل کوفہ) کو عامل مجاز اً قرار دیا جاتا ہے (کیونکہ عامل معنوی کے لئے کوئی لفظ نہیں بنایا گیا) اور بالفرض اگر حقیقت میں حَصَلَ فعل یا حَاصِلٌ (صیغہ صفت) کے متعلق ہم مان بھی لیں، تب بھی عَلَیْہِ کی ظرفیت زمانیت سے خالی ہو جائے گی، کیونکہ یہ ظرف فعل حَصَلَ یا صیغہ صفت حَاصِلٌ کے قائم مقام ہو گیا ہے اور ہر فعل کی بو اس کے اندر آگئی ہے لیکن کسی زمانہ کے ساتھ خصوصی اقتران نہیں ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اور اس کتاب میں مریم کا بھی ذکر کرو۔ اَلْکِتَابُ سے مراد قرآن ہے اور مریم سے مراد قصہ مریم ہے۔ وقف لازم

اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫

جب کہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو کر ایک ایسے مکان میں جو مشرقی جانب میں تھا (غسل کرنے کے لئے) گئیں پھر ان گھر والوں سے اوٹ کرنے کے لئے انہوں نے پردہ ڈال لیا۔

اِنْتَبَذَتْ الگ ہو گئی، دور ہو گئی، نَبْذٌ پھینک دینا، پھینک دینے سے کسی چیز کا دور ہو جانا لازم ہے۔ پس اِنْتَبَذَتْ کا مرادی ترجمہ ہو گیا دور ہو گئی۔

مَكَانًا شَرْقِيًّا مکان کے مشرقی حصہ میں ایک جگہ، چونکہ سردی کا زمانہ اور سرد دن تھا اس لئے حضرت مریم مکان کے شرقی جانب سر میں کنگھا کرنے کے لئے بیٹھیں۔ بعض اہل علم نے لکھا ہے حیض سے طہارت کا غسل کرنے سب سے الگ کسی جانب چلی گئی تھیں، بعض کا خیال ہے عبادت کے لئے یکسو ہو کر تنہائی میں چلی گئی تھیں۔ حسن نے کہا اسی وجہ سے عیسائی مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کرتے ہیں۔

حِجَابًا حضرت ابن عباسؓ نے حجاب کا ترجمہ کیا پردہ، بعض نے کہا دیوار کی آڑ میں بیٹھ گئیں، مقاتل نے کہا پہاڑی کے پار چلی گئیں۔ عکرمہ نے کہا حضرت مریمؑ مسجد میں رہتی تھیں لیکن ایام حیض میں مسجد سے ہٹ کر اپنی خالہ کے گھر چلی جاتی تھیں اور فراغت کے بعد پھر مسجد میں آجاتی تھیں، اتفاقاً ایک روز کپڑے اتارے غسل کر رہی تھیں کہ حضرت جبرئیلؑ ایک خوش رو بے ریش وبروت روشن چہرہ، گھونگھریالے بالوں والے، متناسب القامت نوجوان کے بھیس میں آکھڑے ہوئے جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ پس اس حالت میں ہم نے ان کے پاس اپنے فرشتہ جبرئیلؑ کو بھیجا اور وہ ان کے سامنے ایک پورا آدمی بن کر نمودار ہوا، روح سے جبرئیلؑ مراد ہیں جبرئیلؑ ہی کی لائی ہوئی وحی سے دین کی حیات وابستہ ہوتی ہے۔ اللہ نے روح کی اضافت اپنی جانب روح کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے کی کیونکہ اضافت سے کبھی مضاف کی تعظیم یا توہین مقصود ہوتی ہے، بادشاہ کا خادم کہنے سے خادم کی عظمت اور ولد الحجام کہنے سے ولد کی اہانت کا اظہار ہوتا ہے۔

سَوِيًّا یعنی نوجوان امرد، کامل الاعضاء مرد۔ بعض علماء کے نزدیک روح سے مراد عیسیٰؑ کی روح ہے جو بشر کی شکل میں آئی تھی، اول تفسیر زیادہ صحیح ہے۔

مریمؑ نے جبرئیلؑ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا اور ان کو آدمی ہی خیال کیا تو دور سے ہی پکار اٹھیں۔

قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ کہنے لگیں میں تجھ سے اپنے خدا رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو خدا ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جا)۔

اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا شرط ہے اس کی جزا محذوف ہے یعنی اگر تو تقویٰ والا اور پرہیزگار ہے تو مجھ سے دور رہ، مجھ سے تعرض نہ کر۔ تیرے تقویٰ کا یہ تقاضا ہونا چاہئے کہ تو بدکاری کی طرف اقدام نہ کرے یا اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ جزا مقدم ہے اور

کلام کی بناء مبالغہ پر ہے یعنی اگر تو پرہیز گار بھی ہے تب بھی میں تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتی ہوں اور پرہیز گار نہیں ہے بدکار ہے تب تو اللہ کی پناہ کی خواستگار بدرجہ اولیٰ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اِنْ نافیہ ہے یعنی پرہیز گار نہیں ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ جبرئیل نے کہا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں تیرے رب کا فرستادہ ہوں تیرے رب نے مجھے بھیجا ہے تاکہ ایک پاک دامن لڑکا تجھے عطا کروں۔ یعنی میں کوئی نہیں ہوں جس سے تو ڈر رہی ہے اور اللہ کی پناہ مانگ رہی ہے، میں فرشتہ ہوں اللہ نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے تاکہ تجھے ایسا فرزند تیرے کرتے میں پھونک مار کر عطا کروں جو گناہوں سے پاک اور معصوم ہوگا۔ زَكِيًّا پاک، معصوم، یا خیر وصلاح میں ترقی کرنے والا اور ہر دم بھلائی کی طرف چڑھنے والا۔ صوفیا کا قول ہے جس کے دونوں دن برابر ہوں (یعنی جتنی خیر وصلاح اس کو کل حاصل تھی اتنی ہی آج حاصل ہو، ترقی نہ ہوئی ہو) وہ گھاٹے میں ہے۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾

مریم نے تعجب سے کہا، میرے لڑکا کیسے ہوگا مجھے تو کسی بشر نے نہیں چھوا۔ مس کرنے سے بطور کنایہ نکاح کے بعد جماع کرنا مراد ہے، زنا کے موقع پر مساس کا لفظ نہیں بولا جاتا بلکہ یوں کہا جاتا ہے کہ میں نے برا کام نہیں کیا، میں نے خباثت نہیں کی زنا کی نفی کا اظہار حضرت مریم نے لَمْ اَكُ بَغِيًّا کہہ کر کر دیا۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ میں نے کسی انسان سے نہ قربت بالنکاح کی، نہ زنا۔ پھر میرے لڑکا کہاں سے ہوگا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ جبرئیل نے کہا یونہی ہو جائے گا، یعنی اللہ بغیر باپ کے لڑکا پیدا کر دے گا۔

قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ تیرے رب نے فرمایا ہے کہ وہ یعنی بغیر باپ کے بچہ کا پیدا کرنا میرے لئے آسان ہے۔

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾ (ہم ایسا کر دیں گے اس لئے کہ یہ ہمارے لئے کچھ دشوار نہیں) اور اس لئے کہ ہم اس کو لوگوں کے لئے اپنی قدرت کاملہ کی نشانی اور رحمت بنا دیں اور یہ کام طے شدہ ہے۔

اٰيَةً لِّلنَّاسِ یعنی ہماری قدرت کاملہ پر ایمان رکھنے کی نشانی۔

وَرَحْمَةً یعنی ہم اس کو بندوں کے لئے رحمت بنا دیں گے۔

وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا یعنی ازل میں فیصلہ خداوندی اس کام کا ہو چکا ہے یا لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے یا اَمْرًا مَّقْضِيًّا کا یہ مطلب ہے کہ یہ بات ہونی ضروری ہے اس قابل ہے کہ اس کا وقوع ہو جائے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ پھر ان کے پیٹ میں لڑکا رہ گیا پھر اس (حمل) کو لئے ہوئے کسی دور جگہ میں الگ چلی گئیں۔

اس کا عطف فعل محذوف پر ہے فرشتہ کے قول پر مریم کو اطمینان ہو گیا اور فرشتے نے ان کے کرتے کے گریبان میں پھونک مار دی پھر مریم نے وہ کرتہ پہنا تو حاملہ ہو گئیں۔ بعض کا قول ہے کہ جبرئیل نے کرتے کے گریبان کو چٹکی سے پکڑ کر کھینچا اور پھر گریبان پر پھونک ماری، بعض نے کہا کرتے کی آستین پر پھونک مار دی، بعض نے کہا مریم حاملہ ہو گئیں اور حمل کو لئے گھر والوں سے دور ایک جگہ پر گوشہ گیر ہو گئیں، حضرت ابن عباس ؓ نے کہا وادی بیت المقدس کے آخری حصہ میں چلی گئیں، تاکہ لوگ بدنام نہ کریں، تہمت سے بچنے کے لئے وہ سب سے الگ چلی گئیں۔ مدت حمل کتنی ہوئی بقول بغوی علماء کے اقوال اس سلسلہ میں مختلف ہیں، حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا حمل اور ولادت سب کچھ ایک ہی ساعت میں ہو گیا، بعض نے کہا دوسری عورتوں کی طرح نو مہینے کے بعد حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے کسی نے آٹھ ماہ اور کسی نے چھ ماہ کی مدت بیان کی ہے، مقاتل بن سلیمان نے کہا ایک ساعت میں وہ حاملہ ہوئیں، دوسری ساعت میں حضرت عیسیٰ کی صورت بنی اور تیسری ساعت میں زوال

کے بعد حضرت عیسیٰ پیدا ہو گئے۔ اس وقت حضرت مریمؑ دس سال کی تھیں اور حاملہ ہونے سے پہلے دو بار حیض ہو چکا تھا۔

فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ پھر درد زہ ان کو کھجور کے ایک درخت کی طرف لے آیا۔

اَجَاءَ (باب افعال کا ماضی) جَاءَ (ثلاثی مجرد) بہ زیادتی ہمزہ متعدی بنایا گیا ہے، لیکن اس کا ترجمہ فقط لانا نہیں بلکہ مجبور کر کے زبردستی لانا ہے یعنی درد ولادت نے اس کو مجبور کیا اور مجبور کر کے اس کو ایک درخت کے تنا کی طرف لے آیا۔ مَخَاض مصدر ہے مَخَضَتِ الْمَرْأَةُ عورت کے پیٹ کے اندر بچہ نے باہر نکلنے کے لئے حرکت کی، مَخَاض کی طرف لانے کی نسبت بطور مجازی الاسناد ہے یعنی مخاض کے وقت اللہ اس کو لے آیا، یہ مطلب ہے کہ مخاضؔ کے سبب سے وہ آگئی درخت کے پاس، اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ درخت کے تنے کی طرف مریم آگئیں پردہ کرنے کی غرض سے بھی اور سہارا لینے کی غرض سے بھی، جِذْعٌ کسی درخت کی رگیں گدے (تنا) جو درخت الگ صحراء میں خشک کھڑا تھا۔ بقول ابن ابی حاتم ابوروق نے بیان کیا کہ مریم ایسے درخت کھجور کے تنے کے پاس پہنچیں جس کے سر پر کوئی پتہ نہ تھا، مریمؑ نے اس کو ہلایا تو چوٹی پر شاخیں بھی پتوں کے ساتھ نکل آئیں اور کھجوریں بھی۔ بیضاوی نے لکھا ہے اللہ نے یہ بات حضرت مریمؑ کے دل میں ڈال دی تھی کہ وہ درخت کے پاس جائیں، اللہ کو ایسی نشانیاں دکھانی تھیں جس سے مریم کا خوف جاتا رہے اور کھانے کو کھجوریں بھی مل جائیں۔ عورتوں کے لئے کھجور بڑی اچھی مرغوب غذا ہے۔

قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَٰذَا وَكُنتُ نَسْيًا مَّنسِيًّا ﴿۲۳﴾ گھبرا کر کہنے لگے کاش میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور بھولی بسری ہو جاتی۔ حضرت مریم کو لوگوں کی شرم تھی قوم والوں کے ملامت کرنے کا خوف تھا، اس لئے انہوں نے تمنائے موت کی۔ نسیان بھول جانا یاد نہ ہونا، محفوظ نہ رکھنا خواہ ضعف قوت حافظہ کی وجہ سے ہو یا غفلت کی وجہ سے یا قصد اً بالارادہ دل سے فراموش کر دیا گیا ہو۔

جس نسیان کی اللہ نے مذمت فرمائی اور قابل مواخذہ قرار دیا وہ وہی نسیان ہے جو قصداً بالارادہ ہو خود اپنے اوپر فراموشی طاری کر لی گئی ہو، اللہ نے فرمایا فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا۔ اور جس نسیان کو قابل قبول عذر قرار دیا وہ بے اختیاری نسیان ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ وہ اللہ کو بالقصد بھول گئے، پس اللہ نے بھی تحقیر کرنے کے لئے ان کو ترک کر دیا۔ نَسْیٌ عربی لغت کے اعتبار سے فراموش شدہ چیز کو کہا جاتا ہے جیسے نقض وہ جس کو توڑا جائے (ریزے) عرف عام میں نَسْیٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس کی طرف التفات نہ کی جائے، نا قابل التفات چیز، یعنی فراموش کر دیئے جانے کے قابل چیز جو التفات و توجہ کے قابل نہ ہو۔ نَسْیٌ بالفتح بھی نِسْیٌ کا ہم معنی ہے جیسے وِتر اور وَتر اور جِنس و جَنس، بعض کے نزدیک بالفتح مصدر ہے بمعنی مفعول۔ آیت میں لغوی معنی مراد ہے لیکن عرفی معنی کا احتمال تھا اس لئے نَسْيًا کی تاکید مَنسِيًّا کے لفظ سے کر دی تاکہ عرفی معنی کا احتمال باقی نہ رہے اب ترجمہ ہو گیا، بھولی بسری۔

بغوی نے لکھا ہے نَسْیٌ وہ چیز جو پھینک دی گئی ہو حقیر ہونے کی وجہ سے ذکر کے قابل نہ ہو۔ اور مَنسِيًّا کا ترجمہ ہے ترک کردہ، متروک۔ قتادہ نے کہا نَسْيًا یعنی ایسی چیز جو ذکر نہ کی جائے اور نہ اس کو کوئی جانے۔ عکرمہ، ضحاک اور مجاہد نے کہا مراد جو پھینک دیا گیا ہے۔ بعض نے کہا كُنتُ نَسْيًا کا مطلب یہ ہے کہ کاش میں پیدا ہی نہ ہوتی۔

ایک شبہ

حضرت مریمؑ نے موت کی تمنا کی حالانکہ کسی دکھ یا مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا جائز نہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیت فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ کی تفسیر میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

ازالہ شبہ

شریعت بنی اسرائیل میں تمنائے موت کی ممانعت بعد کو ہوئی اور یہ واقعہ پہلے کا تھا یا بے اختیاری کی حالت میں بلا ارادہ

حضرت مریم کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے، یا حضرت مریم کو اپنے دین کی تباہی کا خیال پیدا ہو گیا اور یہ الفاظ دینی تحفظ کے پیش نظر انہوں نے کہہ دیئے، رسوائی کے اندیشے سے انسان کبھی جھوٹ بولتا ہے جس سے اس کی دینی تباہی ہو جاتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہم لکھ چکے ہیں کہ فتنہ کے خوف سے موت کی تمنا جائز ہے اس میں کوئی گناہ نہیں۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ پس جبرئیلؑ نے ان کے پائین (مکان) سے ان کو پکارا کہ تو مغموم مت ہو۔

حضرت ابن عباسؓ، ضحاک، سدی اور قتادہ کا بیان ہے کہ حضرت مریمؑ ایک ٹیلہ پر تھیں اور حضرت جبرئیلؑ ٹیلے سے پیچھے نشیبی جانب کہ مریمؑ کی بے صبری و بے قراری سن کر جبرئیلؑ نے پکار کر کہا غمگین نہ ہو۔ مجاہد اور حسن نے کہا جب حضرت عیسیٰؑ پیٹ سے باہر آگئے تو انہوں نے پکار کر کہا غمگین نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں تَحْتِهَا کی ضمیر مریمؑ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے کہا نخلہ کی طرف راجع ہے۔

اَلَّا تَحْزَنِيْ لیعنی تنہائی اور کھانے پینے کی چیز نہ ہونے اور لوگوں کے ملامت کے خوف سے تو رنجیدہ نہ ہو۔

قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ تیرے رب نے تیرے پائین سے ایک نہر پیدا کر دی ہے۔ سَرِی چھوٹی نہر۔ طبرانی نے معجم صغیر میں حضرت براء بن عازبؓ کی مرفوع روایت سے یہی نقل کیا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ ابو اسحاق کی روایت سے سوائے ابوسنان کے اور کسی نے اس کو مرفوعاً نہیں بیان کیا۔ ابن عدی نے الکامل میں بیان کیا کہ معاویہ بن یحییٰ نے اس روایت کو معلل قرار دیا ہے اور ابن معین و نسائی و ابن المدینی نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ بخاری نے حضرت براءؓ کی روایت سے اس حدیث کو معلق کہا ہے، ابتدائی راوی معلوم نہیں اور عبد الرزاق و ابن جریر و ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں حضرت براءؓ کی روایت کو موقوف کہا ہے۔ حاکم نے بھی مستدرک میں اس کو نقل کیا ہے اور شرط مسلم کے مطابق صحیح کہا ہے۔ طبرانی نے اور حلیہ میں ابو نعیم نے حضرت ابن عمرؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ اللہ نے سَرِی کو برآمد کر دیا زمین سے نکال دیا تاکہ عیسیٰؑ کی والدہ پانی پی سکیں۔ اس روایت کے سلسلہ میں ایوب بن نہیک ضعیف راوی ہے ابوزرعہ اور ابو حاتم نے اس کو ضعیف کہا ہے۔

بعض علماء نے تَحْتَكِ کا ترجمہ کیا ہے تیرے حکم کے ماتحت یعنی اگر تو حکم دے گی تو چشمہ جاری ہو جائے گا اور رکنے کا حکم دے گی تو رک جائے گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، حضرت جبرئیلؑ نے (ایک روایت میں حضرت عیسیٰؑ نے) زمین پر اپنا پاؤں مارا جس سے شیریں پانی کا چشمہ برآمد ہو گیا اور بہنے لگا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہاں ایک خشک نہر تھی اللہ نے اس کو جاری کر دیا اور خشک درخت تروتازہ ہو کر سرسبز ہو گیا اور ثمر دار بن گیا۔

بعض علماء کے نزدیک سَرِی کا ترجمہ سردار ہے، سَرْو سے مشتق ہے اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ ہیں۔ حسن بصریؒ نے کہا خدا کی قسم عیسیٰؑ سَرِی تھے، یعنی عالی قدر سردار تھے۔

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ اور اس کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف کو ہلا اس سے تیرے اوپر خرما تروتازہ جھڑیں گے۔

هُزِّيْٓ اِلَيْكِ یعنی ہلا اور اپنی طرف جھکا، بِجِذْعِ میں بَ زائد ہے۔

رُطَبًا جَنِيًّا تروتازہ پختہ کھجوریں جو توڑنے کی حد کو پہنچ گئی ہیں۔

فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ پھر اس کو کھا اور پی اور آنکھیں ٹھنڈی کر۔ یعنی کھجوریں کھا اور نہر کا پانی اور کھجوروں کا عرق پی اور آنکھ ٹھنڈی کر یعنی دل خوش کر۔ قَرِّيْ، قَرَار سے مشتق ہے آنکھ جب کوئی خوش کن منظر دیکھتی ہے تو اس پر ٹھہر جاتی ہے دوسری طرف نہیں ہٹتی۔ قَرَّ اللّٰهُ عَيْنَكَ اللہ تیری آنکھ کو قرار دے، یعنی آنکھ کو صاف رکھے۔ قَرَّ اللّٰهُ فُؤَادَكَ اللہ تیرے دل کو قرار دے، یعنی خوش کرے، خوش کن منظر دکھائے کہ دل اس سے دوسری طرف نہ ہٹے۔ اَقَرَّ اللّٰهُ

عَیْنَہٗ اللہ نے اس کی آنکھ ٹھہرا دی یعنی سلا دیا۔ یا قرٌ بمعنی خنکی سے ماخوذ ہے خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور غم کے آنسو گرم، اسی لئے قُرَّۃُ الْعَیْنِ (آنکھ کی ٹھنڈک) محبوب کو کہتے ہیں اور سُخْنَۃُ الْعَیْنِ (آنکھ کی گرمی) ناگوار چیز کو کہتے ہیں۔

فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِیْۤ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ﴿۲۶﴾

پس اگر تو کسی آدمی کو دیکھے تو اس سے کہہ دینا کہ میں نے آج اللہ کے لئے خاموش رہنے کی نذر مانی ہے اس لئے کسی آدمی سے آج کلام نہیں کروں گی۔

صَوْمًا یعنی خاموشی، مطلب یہ کہ عیسیٰ کا معاملہ ہو یا کچھ اور کسی چیز کے متعلق میں کسی انسان سے کلام نہیں کروں گی، میں نے آج ہر معاملہ میں خاموش رہنے اور آدمیوں سے کلام نہ کرنے کی اللہ کے واسطے نذر مانی ہے۔ سدی نے کہا بنی اسرائیل میں جو لوگ زیادہ مجاہدہ کرتے تھے وہ جس طرح روزہ میں کھانا نہیں کھاتے تھے، کلام بھی کسی سے نہیں کرتے تھے، شام تک خاموش رہتے تھے۔

بعض علماء نے کہا کہ اللہ نے مریم کو یہ بات اشارہ سے کہنے کا حکم دیا تھا، کیونکہ کلام قولی سے جھگڑا پیدا ہوتا اور حضرت عیسیٰ سے جواب دلوانا تھا ان کا قول ہر طعن و تشنیع کا قاطع تھا۔ بعض لوگوں نے کہا زبان سے صرف اتنی ہی بات کہنے کا اللہ کی طرف سے حکم ہوا تھا اس کے بعد خاموش رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ یعنی جب اپنی نذر کی میں نے تم کو اطلاع دے دی تو اس کے بعد کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت مریم ملائکہ سے کلام کرتی تھیں۔ انسان سے بات نہیں کرتی تھیں۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ پھر اس کو یعنی عیسیٰ کو گود میں اٹھائے مریم اپنی قوم والوں کے پاس آئی۔

روایت میں آیا ہے کہ ولادت کے بعد فوراً حضرت عیسیٰ کو اٹھائے قوم والوں کے پاس حضرت مریم آئی تھیں۔ کلبی کا بیان ہے کہ یوسف نجار نے حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے عیسیٰ کو ایک غار میں لیجا کر رکھا تھا، وہاں آپ چالیس دن تک رہیں، جب ایام نفاس ختم ہوگئے تو عیسیٰ کو لے کر نکلیں راستہ میں حضرت عیسیٰؑ نے کہا اماں تم کو بشارت ہو میں اللہ کا بندہ اور مسیح ہوں، غرض عیسیٰؑ کو اٹھائے قوم والوں کے پاس پہنچیں، وہ لوگ بڑے دیندار، نیکوکار تھے، مریمؑ کے پاس بچہ کو دیکھ کر اتنے رنجیدہ ہوئے کہ رو پڑے اور۔

قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ﴿۲۷﴾ کہنے لگے مریم تو نے یہ بہت برا کام کیا۔ فَرِیٌّ الجلد کھال کو چیرنا۔ حضرت حسانؓ نے فرمایا لَاَفْرِیَنَّهُمْ میں ان کی کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا، یعنی سخت ہجا کروں گا۔ قرآن مجید میں بہت جگہ اِفْتِرَاء کا لفظ دروغ تراشی، شرک اور ظلم کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ اس سے بڑا ظالم کون جس نے اللہ پر دروغ تراشی کی۔ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤی اِثْمًا عَظِیْمًا اور جو شخص کسی کو اللہ کا شریک قرار دیتا ہے وہ بہت بڑا گناہ تراشتا ہے۔

آدمی کی عصمت اور صلاح میں جب شگاف پڑ جاتا ہے تو شرک و معصیت کا اس سے ظہور ہوتا ہے (اس لئے شرک و معصیت کو افتراء فرمایا) بعض علماء نے فَرِیًّا کا ترجمہ عجیب عظیم لکھا ہے، عجیب اور عظیم ترین چیز خارق عادت ہوتی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا کلام ہو یا عمل جو بھی فائق اور عجیب ہو اس کو فَرِیٌّ کہا جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کے متعلق فرمایا تھا فَلَمْ اَرَ عَبْقَرِیًّا یَفْرِیْ فَرِیَّهٗ میں نے کوئی کامل حاذق ایسا نہیں دیکھا جو عمرؓ کے عمل کی طرح عجیب تعجب آفریں عمل کرتا ہو۔

یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا ﴿۲۸﴾

اے ہارون کی بہن نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں زانیہ تھی۔ سدی نے کہا اُخْتَ ہَارُوْنَ کہنے سے ان کی مراد تھی، حضرت موسیٰ کے بھائی حضرت ہارون کی نسل میں سے ہونا۔ تمیم کے قبیلہ کے ہر فرد کو اخو تمیم کہا جاتا ہے۔ حضرت مریم حضرت ہارون کی نسل سے تھیں اس لئے ان کو اُخْتَ ہَارُوْنَ کہا۔ ابن ابی حاتم نے اس قول کی نسبت علی بن ابی طلحہ کی طرف

کی ہے۔ کلبی نے کہا حضرت مریم کے علاتی بھائی کا نام ہارون تھا، بنی اسرائیل میں وہ بہت ہی بزرگ اور نیک آدمی تھا۔ بغوی نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت سے لکھا ہے مغیرہ کا بیان ہے جب میں نجران میں پہنچا تو اہل نجران نے مجھ سے کہا تم قرآن میں یا اُخْتَ ہٰرُوْنَ پڑھتے ہو حالانکہ موسیٰؑ کا زمانہ عیسیٰؑ سے اتنا اتنا (یعنی بہت مدت) پہلے تھا (پھر مریم ہارون کی بہن کیسے ہو گئیں) میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے دریافت کی حضور ﷺ نے فرمایا وہ لوگ اپنے انبیاء اور گزشتہ نیک لوگوں کے ناموں پر اپنے نام رکھتے تھے (یعنی ہارون سے مراد حضرت موسیٰؑ کے بھائی نہیں ہیں بلکہ ان کا ہم نام کوئی اور شخص تھا جس کو مریم کا بھائی کہا گیا ہے۔ رواہ مسلم)۔

بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ قتادہ وغیرہ نے کہا بنی اسرائیل میں ایک بڑا نیک عبادت گزار آدمی تھا، روایت میں آیا ہے کہ جب وہ مرا تو اس کے جنازہ میں علاوہ دوسرے لوگوں کے چوبیس ہزار آدمی ہارون کے نام کے شریک ہوئے اس مرد صالح کا نام ہارون تھا، حضرت مریم بھی بڑی عبادت گزار تھیں نیکی اور عبادت کی وجہ سے ان لوگوں نے مریم کو ہارون کی بہن کہہ دیا، نسبی بہن مراد نہیں ہے جس طرح اللہ نے اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ فرمایا ہے اور فضول مال برباد کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے، یعنی شیطانوں کی طرح، کذا اخرج عبدالرزاق و عبد بن حمید عن قتادہ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بطور مزاح اور استہزاء کے حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ سابقہ عبادت اور نیکی کو دیکھ کر ایسا کہہ دیا ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بڑا بد چلن آدمی تھا جس کا نام ہارون تھا، حضرت مریم کو گالی دینے کے لئے ہارون کی بہن کہا، کذا اخرج ابن ابی حاتم عبد سعید بن جبیرؒ۔

حضرت مریم کے باپ کا نام عمران تھا، مَا كَانَ اَبُوْكِ الخ پورا جملہ توبیخ اور زجر یہ ہے کیونکہ نیک لوگوں کی اولاد سے بدکاری کا صدور بہت زیادہ برا ہوتا ہے۔

فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ ؕ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ﴿۲۹﴾　　مریمؑ نے عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے بات کرو لوگوں نے کہا پالنے کے بچہ سے ہم کیسے بات کریں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا حضرت مریمؑ کے پاس بن باپ کے بچہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں تھی اس لئے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا تاکہ عیسیٰؑ کا کلام ان کی صداقت کی دلیل بن جائے۔

روایت میں آیا ہے کہ مریمؑ نے جب عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے بات کرو تو لوگوں کو غصہ آیا اور کہنے لگے ایک تو تو نے جرم کیا پھر ہم سے مذاق بھی کر رہی ہے۔

مَنْ كَانَ میں كَانَ زائد ہے جیسے هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا میں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ كَانَ تامہ ہو یا دوام کے لئے ہو۔

مَهْد سے مراد ہے ماں کی گود یا گہوارہ۔ مراد یہ تھی کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی عاقل کسی شیر خوار گہوارہ میں رہنے والے بچہ سے باتیں کرتا ہو۔ فِی الْمَهْدِ کہنے سے نا سمجھ بچہ جو بات نہیں کر سکتا۔ سدی نے کہا جب حضرت عیسیٰؑ نے ان کا کلام سنا تو دودھ پینا چھوڑ دیا اور قوم کی طرف رخ کر کے بول اٹھے۔ بعض روایات میں کیا ہے کہ جونہی حضرت مریمؑ نے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا آپ نے فوراً منہ پستان سے ہٹا لیا اور بائیں طرف کو ذرا سہارا لے کر قوم کی طرف متوجہ ہو کر دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۟ؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ　　کہا بلاشبہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی ہے۔ عَبْدُ اللّٰهِ کہنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ میں بارگاہ الٰہی میں معترز ہوں، اس کا خاص بندہ ہوں اور چونکہ قوم منکر تھی اس لئے آپ نے پرزور طریقہ سے اپنی عبدیت کا اظہار کیا۔

وہب نے کہا جب حضرت مریمؑ کی قوم سے گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت زکریاؑ آ گئے اور حضرت عیسیٰؑ سے فرمایا اگر تجھے

حکم دیا گیا ہے تو خود اپنی دلیل بیان کر اور بول اس پر حضرت عیسیٰ بول اٹھے، اس وقت آپ چالیس دن کے تھے۔ مقاتل نے کہا پیدا ہوتے ہی آپ نے اپنی عبدیت کا اظہار کیا تھا اور سب سے پہلے یہی کلام کیا تھا تاکہ لوگ آپ کو الٰہ نہ سمجھنے لگیں۔

اَلْکِتٰبَ سے حسن کے نزدیک توریت مراد ہے۔ آپ ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ اللہ نے آپ کے دل میں توریت القاء کر دی تھی، اکثر علماء قائل ہیں کہ انجیل مراد ہے بچپن میں ہی آپ کو انجیل عطا کر دی گئی تھی جب کہ آپ مردانہ عقل کی حد تک پہنچے بھی نہ تھے۔ بعض علماء کے نزدیک ماضی بمعنی مستقبل ہے۔ یعنی اللہ مجھ کتاب عطا فرمائے گا۔

وَّجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾ اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے یعنی یقیناً آئندہ وہ مجھے نبی بنائے گا۔ بعض علماء نے کہا، حضرت عیسیٰ نے تحریر لوح محفوظ کی اطلاع دی تھی (یعنی میں لوح محفوظ کی تحریر کے بموجب نبی بنایا جا چکا ہوں) جیسے رسول اللہ ﷺ سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ نبی کب ہوئے تو آپ نے فرمایا، میں اس وقت نبی تھا جب آدم روح اور جسم کے درمیان تھے (یعنی مٹی اور پانی سے آدمؑ کے پتلے کا خمیر ہی بنا تھا، روح پڑی بھی نہ تھی) رواہ ابن سعد وابو نعیم فی الحلیۃ عن میسرہ بن سعد عن ابی الجدعاء۔ والطبرانی عن ابن عباسؓ۔

وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ ۪ اور اس نے مجھے برکت والا بنایا ہے میں جہاں بھی ہوں۔ یعنی آسمان میں ہوں یا زمین میں اللہ نے مجھے نفع رساں بنایا ہے۔ اس جملہ سے حضرت عیسیٰ کی نفع رسانی ثابت ہو رہی ہے، زمین میں انسانوں کو اور آسمان میں ملائکہ کو۔ لفظ برکت کا معنی یا ثبات خیر ہے اس پر یہ بَرَکَ الْبَعِیْرُ اونٹ بیٹھ گیا کے محاورہ سے ماخوذ ہو گا۔ یا زیادتی عطا برکت کا معنی ہے۔ دعا میں کہا جاتا ہے اَللّٰھُمَّ بَارِکْ فِیْ عَطَائِکَ اے اللہ اپنی عطا میں زیادتی فرما یا اس کا معنی ہے عظمت و بزرگی جیسے بولتے ہیں یہ فلاں شخص کی برکت سے ہے، اس جگہ مبارک کا سے بعض علماء کے نزدیک نفع رساں مراد ہے۔ مجاہد نے کہا معلم خیر ہونا مراد ہے، عطا نے کہا اللہ کی توحید و عبادت کی طرف بلانے والا، بعض نے کہا مجھے اللہ نے ان لوگوں کے لئے جو میری پیروی کریں، مبارک بنایا ہے۔

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾ اور زندگی بھر اس نے مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے۔ زکوٰۃ سے مراد ہے اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرائض مالیہ کو ادا کرنا اور نفس کو بری خصلتوں سے پاک کر لینا۔

بغوی نے لکھا ہے شبہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے پاس کبھی مال تھا ہی نہیں پھر ان کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم کیا معنی رکھتا ہے اس کے جواب میں بعض لوگوں نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر میرے پاس مال ہو تو زکوٰۃ ادا کرنے کا اس نے مجھے حکم دیا ہے۔ بعض نے کہا زکوٰۃ سے مراد اس جگہ مالی زکوٰۃ نہیں بلکہ بکثرت بھلائی کرنا مراد ہے۔ بعض نے کہا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم لوگوں کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دوں۔ مَا دُمْتُ حَیًّا یعنی جب تک میں زندہ رہوں نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا رہوں۔

وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ ۫ اور اس نے مجھے اپنی والدہ کا فرماں بردار بنایا ہے یا یہ ترجمہ ہے کہ اس نے مجھے والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اول ترجمہ پر بَرًّا بمعنی بَارًّا اسم فاعل ہو گا اور دوسرے ترجمہ پر مصدر۔

وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾ اور اس نے مجھ کو سرکش بدبخت نہیں بنایا۔ جَبَّارًا، سرکش، مغرور۔ شَقِیًّا اللہ کا نافرمان یا وہ شخص جو گناہ کرے اور توبہ نہ کرے۔

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾

اور مجھ پر اللہ کی طرف سے سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز مروں گا اور جس روز زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔

اَلسَّلٰمُ، سلامتی، حفاظت، پیدائش کے وقت شیطان کے کچوکا دینے سے اور مرنے کے بعد عذاب قبر سے اور قیامت کے دن ہول قیامت اور عذاب دوزخ سے یا السلام سے مراد ہے اللہ کی طرف سے تحیت و رحمت ہر تغیر حالت کے وقت یعنی

پیدائش پھر موت پھر قیامت کے دن دوسری زندگی یہ تینوں انقلابی حالات ہیں ان میں سے ہر حالت کے وقت مجھ پر اللہ کی رحمت ہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیَّ کہنے میں درپردہ دشمنوں پر لعنت ہے جب حضرت عیسیٰ نے اپنے اور اپنے مومن ساتھیوں کے لئے سلامتی کا اعلان کر دیا تو لامحالہ دشمنوں پر لعنت ہونے کی طرف درپردہ اشارہ کر دیا، جیسے اللہ نے جب وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی فرمایا تو درپردہ اس امر پر تعریض ہو گئی کہ جو سیدھے راستہ پر نہ چلیں اور ہدایت سے روگرداں ہوں اور تکذیب کریں ان کے لئے عذاب ہو گا۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت عیسیٰ کے اس کلام کے بعد سب لوگ سمجھ گئے کہ مریم گناہ سے پاک ہیں اس کے بعد عیسیٰ خاموش ہو گئے اور اس عمر تک کوئی بات نہیں کی جس عمر تک معمولاً بچے بات نہیں کرتے۔

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ یہ ہیں عیسیٰ مریم کے بیٹے۔

ذٰلِکَ یعنی یہ جس کا ذکر اوپر کے بیان میں کیا گیا اور جو پیدائشی طور پر اپنی بندگی اور عبدیت کا معترف تھا، عیسیٰ تھا مریم کا بیٹا، وہ ایسا نہیں تھا جیسا عیسائی اس کو کہتے ہیں وہ نہ خدا تھا اور نہ خدا کا بیٹا۔ اس مختصر جملہ میں نصاریٰ کے عقائد کی پر زور تردید ہے اور برہانی طور پر عقیدۂ نصاریٰ کے غلط ہونے کا اظہار ہے۔

قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ ہم نے وہ صحیح بات کہہ دی جس کے متعلق لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں اور باہم جھگڑے کرتے ہیں۔ یہودی عیسیٰ کو جھوٹا جادوگر کہتے ہیں اور عیسائی خدا یا خدا کا بیٹا۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اللہ کے لئے کسی طرح زیبا نہیں کہ وہ اپنے لئے کوئی اولاد اختیار کرے اس کی ذات پاک ہے۔

اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اس کو فرمادیتا ہے ہو جا وہ فوراً ہو جاتا ہے۔ یعنی جب اللہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے (قضا سے مراد ارادہ ہے) تو کن (ہو جا) کہتا ہے وہ چیز فوراً ہو جاتی ہے، عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کرنا بھی اسی طرح ہوا، پس جو خدا ایسا (قادر مطلق) ہے وہ یقیناً مشابہت خلق سے پاک ہے اس کو حاجت نہیں کہ عورتوں کو حاملہ کر کے اپنی اولاد پیدا کرے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ اور (عیسیٰ نے یہ بھی کہا کہ) اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی پس اس کی عبادت کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ کہنے سے عقیدہ کو درست کرنے اور قوت نظریہ کا کمال حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہے، اور قوت عملیہ کا کمال حاصل کرنے کی طرف بھی کہ عملی ممنوعات سے پرہیز رکھو اور مامورات کو ادا کرو یعنی اللہ کے احکام کے پابند ہو جاؤ۔

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ یہ سیدھا راستہ ہے یعنی عقیدہ اور عمل دونوں کو درست کرنا سیدھا راستہ ہے، جس کے صحیح ہونے کی اللہ کی طرف سے شہادت دی گئی ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ سو پھر بھی مختلف گروہوں نے (اس کے بارے میں) باہم اختلاف ڈال دیا۔

اَلْاَحْزَابُ سے مراد ہیں یہودی اور عیسائی یا نصاریٰ کے تینوں فرقے، عیسائیوں کے تین بڑے فرقے ہو گئے۔

(۱) نسطوریہ فرقہ کہتا تھا کہ عیسیٰ ابن اللہ تھے۔ (۲) یعقوبیہ فرقہ قائل تھا کہ عیسیٰ بعینہ خدا تھے، خدا زمین پر اتر آیا تھا پھر آسمان پر چڑھ گیا۔ (۳) ملکانیہ فرقہ کہتا تھا کہ عیسیٰ اللہ کے بندے اور رسول تھے۔

مِنْۢ بَيْنِهِمْ میں مِنْ زائد ہے یعنی عیسیٰ کے صحابیوں کے متعلق لوگوں کا اختلاف ہو گیا یا عیسیٰ کی قوت کے متعلق

اختلاف ہو گیا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ سو ان کافروں کے لئے ایک بڑے دن کے آنے سے بڑی خرابی ہونے والی ہے۔

وَیْلٌ اصل میں مصدر تھا بمعنی ہلاک۔ یہ جملہ فعلیہ کے قائم مقام ہے اور مبتدا ہونے کی حیثیت سے مبتداء ہے۔ جملہ فعلیہ کی جگہ جملہ اسمیہ کو دینے کی غرض یہ ہے کہ فعل کا دوام اور استمرار ظاہر ہو کسی زمانہ سے اقتران باقی نہ رہے۔ یَوْمٍ عَظِيمٍ یعنی روز قیامت، مَشْهَد، بمعنی مصدر ہے، یعنی جس روز کہ جزاء وسزا اور حساب سامنے حاضر ہو گا یا مَشْهَد ظرف زمان ہے یعنی وقت شہود یا ظرف مکان ہے، یعنی جس روز کہ ملائکہ اور ان کے انبیاء اور ہاتھ پاؤں اور بدن کی کھالیں ان کے کافر اور فاسق ہونے کی شہادت دیں گی۔

أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا جس روز یہ لوگ ہمارے پاس (حساب وجزا کے لئے) آئیں گے، کیسے کچھ شنوا اور بینا ہوں گے۔

أَسْمِعْ بِهِمْ اور أَبْصِرْ دونوں فعل تعجب ہیں اور اللہ ہر تعجب سے پاک ہے (وہ کسی بات پر تعجب نہیں کرتا اس کے کوئی بات عجیب نہیں) اس لئے جمہور اہل تفسیر کے نزدیک آیت میں جس تعجب کا اظہار کیا گیا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ ان کی حالت قابل تعجب ہو گی، دنیا میں تو اندھے بہرے بنے رہے، نہ حق کی بات سنی نہ صورت حق آنکھوں سے دیکھی اگر وہاں کلمۂ حق گوش قبول سے سنتے اور تصویر حق نظر قبول سے دیکھتے تو ان کو فائدہ ہوتا لیکن قیامت کے دن جب حق کی صورت سامنے آئی اور آواز حق سنی تو ایسے وقت کہ کوئی فائدہ نہ تھا یا فعل تعجب سے مراد اظہار تعجب نہیں بلکہ تہدید اور ڈرانا مقصود ہے کہ قیامت کے دن یقیناً وہ اس عذاب کو دیکھیں گے اور وہ مایوس انگیز جھڑکیاں سنیں گے جن کا ان سے وعدہ کر لیا گیا ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ أَسْمِعْ اور أَبْصِرْ اس جگہ فعل تعجب نہیں ہیں امر کے صیغے ہیں رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے کہ مواعید قیامت ان کافروں کو سناؤ اور دکھاؤ۔

لَٰكِنِ الظَّالِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ لیکن یہ ظالم آج دنیا میں کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ لفظ الظَّالِمُونَ ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں انہوں نے اپنی آنکھوں اور کانوں کا صحیح استعمال نہیں کیا اور حق کی طرف سے اپنے کو غافل بنائے رکھا۔ یہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ اور آپ ان لوگوں کو حسرت کے دن سے ڈرائیے جب کہ آخری فیصلہ کر دیا جائے گا۔

یہ حسرت اس وقت ہو گی جب حساب ہو چکے گا، اہل جنت جنت میں چلے جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں اور موت کو ذبح کر دیا جائے گا، پھر جنت کے اندر اہل جنت اور دوزخ کے اندر دوزخی کبھی نہیں مریں گے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، موت کو چت کبرے مینڈھے کی شکل میں قیامت کے دن سب کے سامنے لایا جائے گا پھر ایک منادی پکارے گا، اے اہل جنت، جنت والے سر اٹھا کر جھانک کر دیکھیں گے، منادی کہے گا کیا اس کو پہچانتے ہو، اہل جنت کہیں گے ہاں یہ موت ہے، پھر سب کی نظروں کے سامنے اس کو ذبح کر دیا جائے گا اور منادی کہے گا، اے جنت والو یہاں تمہاری دوامی زندگی ہے موت نہیں۔ پھر وہی منادی دوزخیوں کو پکارے گا دوزخ والو تم کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے موت نہیں آئے گی۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ تلاوت فرمائی۔ رواہ البخاری

شیخین نے صحیحین میں بھی حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے ایسی ہی حدیث نقل کی ہے، شیخین نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے لیکن اس میں آیت کو تلاوت فرمانے کا ذکر نہیں ہے۔

ابو یعلی، بزار اور طبرانی نے الاوسط میں حضرت انسؓ کی روایت سے اور حاکم وابن حبان نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے اس میں بھی قرأت آیت کا ذکر نہیں ہے۔

يَوْمَ الْحَسْرَةِ کی تشریح میں بیضاوی نے لکھا ہے اس روز سب لوگ افسوس کریں گے، بدکار اپنی بدکاری پر اور نیکوکار اپنے نیکی کم کرنے پر۔

طبرانی اور ابو یعلی نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت کو صرف اس ساعت پر افسوس ہوگا جس میں دنیا کے اندر انہوں نے اللہ کی یاد نہیں کی اور وہ گھڑی یونہی گزر گئی۔

بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر مرنے والے کو پشیمانی ضرور ہوگی، صحابہؓ نے عرض کیا پشیمانی کیسی۔ فرمایا اگر نیکوکار ہوگا تو اس کو اس بات کی پشیمانی ہوگی کہ اس نے اس سے زیادہ نیکی کیوں نہیں کی اور بدکار کو اس بات کی پشیمانی ہوگی کہ وہ بدکاری سے باز کیوں نہ رہا۔

وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ اور وہ لوگ آج دنیا میں غفلت میں پڑے ہوئے ہیں یعنی جس گمراہی میں وہ پڑے ہوئے ہیں اس سے بھی غافل ہیں اور آخرت میں ان سے جو معاملہ کیا جائے گا اس کی طرف سے بھی غافل ہیں۔

وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۹﴾ اور وہ ایمان نہیں لاتے۔ یعنی سچے مخبر (رسول اللہ ﷺ) کی خبر کی تصدیق نہیں کرتے۔

إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا (لیکن آخر ایک دن سب مر جائیں گے) اور تمام زمین اور زمین کے رہنے والوں کے ہم ہی وارث (آخر مالک) رہ جائیں گے یعنی زمین اور زمین کے رہنے والے سب فنا ہو جائیں گے، صرف اللہ باقی رہ جائے گا، جس طرح مورث کے مرنے کے بعد وارث رہ جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی کی مالکیت باقی نہیں رہے گی صرف اللہ کا اقتدار باقی رہ جائے گا۔ مَنْ (جو لوگ) سے مراد عام ہے جو لوگ ہوں یا جو چیز ہو تغلیباً مَنْ (جو اہل عقل کے لئے استعمال ہوتا ہے) ذکر کیا گیا ہے ورنہ مراد عام ہے۔

وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿۴۰﴾ اور ہماری ہی طرف ان کو لوٹا کر لایا جائے گا۔ یعنی قبروں سے اٹھائے جانے کے بعد ہماری طرف سب کو لوٹا کر لایا جائے گا اور ہم اعمال کے مطابق ان کو سزا و جزا دیں گے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اور کتاب (قرآن) میں ابراہیم (کے واقعہ) کو یاد کرو بلاشبہ وہ صدیق اور نبی تھا۔ صدیق کس کو کہتے ہیں، مختلف علماء نے مختلف معانی بیان کئے ہیں۔ (۱) بہت سچ بولنے والا۔ (۲) جو کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ (۳) سچ بولنے کا عادی ہو، صدق کی عادت کی وجہ سے اس سے کذب کا صدور نہ ہوا ہو۔ (۴) جس کا اعتقاد بھی صحیح ہو اور قول بھی سچا اور اس نے اپنے عمل سے اپنے قول کی تصدیق کی ہو اور قول کے مطابق عملی مظاہرہ کرتا ہو۔ (۵) اللہ کی تمام غیبی صفات اللہ کے انبیاء اور ملائکہ اور قیامت جن کا بیان اللہ نے کیا ہے سب کی تصدیق کرتا ہو۔ اللہ نے جن کاموں کو کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا ہے ان امور کو اللہ کے حکم کے مطابق اچھا یا برا جانتا ہو اور احکام خداوندی کی عملی پابندی بھی کرتا ہو اور اپنے عمل سے تصدیق قلبی و لسانی کو ثابت کرتا ہو، ایسا آدمی صدیق ہے۔

میں کہتا ہوں کثرت تصدیق سے یہ مراد نہیں ہے کہ زیادہ اور کثیر امور کی تفصیل وار تصدیق کی جائے جیسا کہ بغوی کی عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے پورے دین کی اور تمام عقائد و اعمال کی تصدیق ہر مومن کے لئے ضروری ہے اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے کسی ایک مسئلہ کے انکار سے بھی کافر ہو جاتا ہے۔ ہاں مومنوں میں سے کچھ لوگ تمام اوامر و نواہی کے عملی پابند ہوتے ہیں، ہر حکم شرعی کو بجا لاتے ہیں ایسے لوگ صالحین کہلاتے ہیں لیکن ہر صالح کو صدیق نہیں کہا جا سکتا۔ حقیقت میں صدیقیت کا مرتبہ تصدیق و ایمان کی قوت و شدت سے حاصل ہوتا ہے ایمان کی قوت درجۂ صدیقیت پر فائز کرتی ہے۔ ایمان و تصدیق کی قوت انبیاءؑ کو تو براہ راست بلا کسی توسط کے حاصل ہوتی ہے

اور امت والوں کو انبیاء کی کامل پیروی کرنے اور ظاہر و باطن ہر طرح کے پورے پورے اتباع سے۔ امتی کمالات نبوت میں جب ڈوب جاتا ہے اور انبیاء کی وراثت و تبعیت سے اس پر ذاتی خالص تجلیات کا ظہور ہوتا ہے تو درجہ صدیقیت تک اس کی رسائی ہوتی ہے۔

آیت اُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّھَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ۔ میں اپنے فیضان و انعام کا حامل چار قسم کے لوگوں کو قرار دیا، انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔ دوسرے مومنوں کو انہی کی معیت و ہمرکابی کی بشارت دی۔ سورۃ النساء میں اس آیت کی تفصیلی توضیح ہم کر چکے ہیں، صدیق وہی جماعت ہے، جن کا ذکر سورۂ واقعہ کی آیت ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَ قَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ میں کیا ہے اور ہم نے اس کی تشریح اسی مقام پر کر دی ہے۔

انبیاء کے بعد رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ سب سے بڑے صدیق تھے اور صحابہؓ میں سے جلیل القدر صحابہ سب سے اونچے تھے اور جلیل القدر صحابہ میں بھی حضرت ابوبکرؓ سب سے بڑے صدیق تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو صدیق فرمایا تھا اور اسی پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا تھا کہ میں ہی صدیق اکبر ہوں۔ میرے بعد جو صدیق اکبر ہونے کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے یعنی میرے مرتبہ کے بعد نچلے درجہ پر رہتے ہوئے جو شخص صدیق اکبر ہونے کا مدعی ہوگا وہ کاذب ہے۔ بعد ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ میرے بعد جو مدعی ہوگا بلکہ بعدیت سے مراد ہے مرتبہ کی بعدیت اور درجہ میں پیچھے رہنا۔

نَبِی کا لفظ یا نُبُوَّۃٌ سے ماخوذ ہے یعنی عالی قدر، اونچے مرتبہ والا، اللہ کی طرف سے پیغمبر بنایا ہوا نُبُوَّۃٌ ٹیلہ، زمین کا ابھرا ہوا اونچا حصہ۔ یا نَبَاءٌ خبر سے ماخوذ ہے یعنی اللہ کی طرف سے دین حق سے باخبر۔ جس کو براہ راست اللہ کی طرف سے خبر دی جائے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ یٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَ لَا یُبْصِرُ وَ لَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًا۝

جب اس نے اپنے باپ سے کہا، میرے باپ آپ کیوں ایسی چیزوں کی پوجا کرتے ہیں جو نہ کچھ سنتی ہیں (ان کے پاس سننے کی طاقت نہیں ہے) نہ کچھ دیکھتی ہیں (ان کے پاس نور نظر نہیں ہے) نہ آپ کے کام آتی ہیں (ان میں نفع پہنچانے اور ضرر کو دفع کرنے کی طاقت ہی نہیں ہے) یعنی ان کے پاس سننے والے کان نہیں کہ آپ کی دعا اور پکار کو سن سکیں، نہ دیکھنے والی آنکھیں کہ تمہاری پوجا اور تمہاری حالت دیکھ سکیں، نہ ان میں نفع پہنچانے یا دکھ کو دور کرنے کی طاقت ہے کہ تمہارے کام آسکیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے باپ کو نہایت ادب، احترام اور شفقت و محبت کے لہجہ میں بے راہ روی اور گمراہی پر متنبہ کیا اور بے دھڑک یہ نہیں کہہ دیا کہ تو گمراہی میں پڑا ہوا ہے بلکہ باپ کے معبودوں کی بے بسی، کمزوری اور بے حسی کو مدلل طور پر ظاہر کیا اور دریافت کیا کہ آخر ان کی عبادت کرنے سے آپ کی کیا غرض ہے یہ تو بے حس اور بے طاقت ہیں ان کے سامنے جھکنا ہی تقاضائے دانش کے خلاف ہے، پوجا کرنی تو بجائے خود رہی پوجا تو اس ذات کی ہونی چاہئے جو خود محتاج نہ ہو، اس کو کسی چیز کی ضرورت نہ ہو، دکھ سکھ پہنچانے کی اس کو پوری قدرت ہو، نفع پہنچا سکے اور ضرر کو دفع کر سکے، زندگی، موت اور رزق دینا نہ دینا اس کے اختیار میں ہو، سزا جزا دینا اس کے قبضہ میں ہو، اس کو ہر چیز پر کامل اقتدار حاصل ہو۔ وہ ممکن محتاج جو خود اپنی ہستی و بقاء ہستی اور لوازم ہستی میں دوسرے کا دست نگر اور محتاج ہے معبود ہونے کا مستحق نہیں ہو سکتا خواہ اس کے پاس سننے والے کان، دیکھنے والی آنکھیں اور دکھ سکھ پہنچانے اور ضرر دفع کرنے کی بظاہر ناقص قوت بھی ہو، یہاں تک کہ فرشتہ یا پیغمبر ہو تب بھی معبود ہونے کا اس کو استحقاق نہیں۔ عقل سلیم اس کی پوجا کرنے کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ وہ کچھ بھی ہو بہر حال اس کا وجود اس کا اپنا وجود نہیں۔ مانگا ہوا اور دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ پھر وہ ممکن جو بے سمع، بے بصر اور بے طاقت و بے حس ہو اس کو تو بدرجہ اولیٰ معبود بننے یا معبود قرار دیئے جانے کا کوئی حق نہیں، ایسے بے علم، بے طاقت، بے حس، بے بس کی پوجا تو سراسر کور دانشی

ا۔ معلوم نہیں حضرت مفسر رحمۃ اللہ علیہ کو یہ اثر کہاں سے ملا۔ (مترجم)

یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا۝
اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم پہنچا ہے جو آپ کے پاس نہیں پہنچا آپ میرے کہنے پر چلیے، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ یعنی اللہ کی ذات، صفات اور اس کے احکام کا جو علم مجھے ملا ہے وہ آپ کو نہیں ملا لہٰذا دین و مذہب کے معاملہ میں آپ میری بات مانیں اور اس کے موافق چلیں میں آپ کو مذہبی راستہ سیدھا بتاؤں گا جو آپ کو فلاح دارین تک لے جائے گا۔ حضرت ابراہیم نے اپنے آپ کو ہر طرح سے اونچا عالم اور باپ کو صراحت کے ساتھ جاہل نہیں فرمایا، بلکہ ایک ہم سفر رفیق کی طرح راستہ بتانے کا اظہار کیا اور اپنے کو زیادہ راہ شناس بتلایا۔ اس سے آگے ذیل کی آیت میں بیان کیا کہ جس راستہ پر آپ چل رہے ہیں نہ فقط یہ کہ وہ نفع رساں نہیں ہے بلکہ ضرر رساں بھی ہے، وہ شیطان کا راستہ ہے اور شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ اس لئے اس کی پوجا نہ کرو۔

یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا۝ اے میرے باپ آپ شیطان کی پوجا نہ کریں، بے شک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ یعنی شیطان کفر اور بت پرستی کو تمہاری نظر کے سامنے آراستہ اور دلکش بنا کر لاتا ہے تم اس کا کہنا مانو، اس کے بتائے ہوئے راستہ پر نہ چلو، کیونکہ شیطان اس خدا کا جو منعم، محسن مہربان ہے سخت نافرمان ہے اور ظاہر ہے کہ رب کے نافرمان کا اتباع کرنے والا بھی رب کا نافرمان قرار پائے گا اور جو رب کا نافرمان ہوگا اس سے رب منعم اپنی نعمتیں چھین لے گا اور ایسے احسان فراموش سے انتقام لے گا۔

یٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ اے میرے باپ مجھے ڈر ہے کہ رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب آپ پر (نہ) آجائے۔ یعنی اگر آپ کفر اور شیطان کی اطاعت پر قائم رہیں گے تو رحمٰن کی طرف سے (باوجودیکہ اس کی رحمت رحمت کاملہ ہے) کوئی سخت عذاب آجائے گا مجھے اس کا اندیشہ ہے اس کی رحمت اگرچہ فرماں برداروں پر بہت زیادہ ہے لیکن سرکش نافرمانوں پر اس کا عذاب بھی بہت سخت ہے۔

فَتَكُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا۝ پھر آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں گے۔ شیطان پر دنیا میں جو لعنت ہے وہ آپ پر بھی ہو جائے گی اور آخرت میں جو عذاب شیطان پر ہوگا وہ آپ پر بھی ہوگا اس طرح آپ کے ساتھ شیطان اور شیطان کے ساتھ آپ کا جوڑ اور اتصال ہو جائے گا۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ آیت میں شیطان کے صرف نافرمان ہونے کا ذکر کیا، دوسرے جرائم کا ذکر نہیں کیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اللہ کی نافرمانی ہی تمام جرائم کی جڑ ہے اسی سے سب جرائم پیدا ہوتے ہیں یا یہ وجہ ہو کہ حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد سے دشمنی کا نتیجہ بصورت معصیت نکلا (پس جو شیطان رب کا نافرمان انسان کی دشمنی کی وجہ سے ہو اس کی پوجا انسان کے لئے کسی طرح زیبا نہیں وہ تو دشمن ہے)

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ ابراہیمؑ کے باپ نے کہا ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے نفرت کرتا ہے (اس لئے ان کی مذمت کر رہا ہے) حضرت ابراہیمؑ نے تو نرمی، ادب اور اخلاق کے ساتھ باپ کو مشورہ دیا تھا لیکن باپ نے (انتہائی کفر و جہالت کی وجہ سے) درشت کلامی، بد خلقی اور تلخی کا مظاہرہ کیا۔ ابراہیم نے کہا تھا اے میرے باپ لیکن باپ نے میرے بیٹے کہنے کی جگہ بیٹے کا نام لے کر خطاب کیا پھر دھمکی آمیز کلام کیا اور بطور تہدید کہا کیا تو میرے معبودوں سے نفرت کرتا ہے۔

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا۝ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے پتھر ماروں گا اور تو ہمیشہ کے لئے (میرے پاس سے چلا جا) مجھے چھوڑ جا۔

کلبی، مقاتل اور ضحاک نے لَاَرْجُمَنَّكَ کا ترجمہ کیا، میں تجھے گالیاں دوں گا، سخت سست کہوں گا، برا بھلا کہہ کر تجھے نکال دوں گا۔ حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے، حسن نے ترجمہ کیا میں تجھے ضرور سنگسار کر دوں گا۔

وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا کا مطلب کلبی نے بیان کیا مجھ سے الگ ہو جا طویل مدت تک۔ مجاہد اور عکرمہ نے مَلِيًّا کا ترجمہ کیا وقت طویل اور سعید بن جبیر نے کہا ہمیشہ۔ مَلِيّ کا لغوی معنی ہے ٹھیرنا، تَمَلَّيْتُ حِيْنًا میں ایک وقت تک ٹھہرا رہا۔ مَلَوَان رات دن۔ قتادہ اور عطا نے کہا صحیح سالم الگ ہو جا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، میرے پاس سے صحیح سالم چلا جا ورنہ تجھے میری طرف سے دکھ پہنچ جائے گا۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾ ابراہیمؑ نے کہا سَلَامٌ عَلَيْكَ میں اپنے رب سے آپ کے لئے معافی طلب کروں گا، بلاشبہ وہ مجھ پر مہربان ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے یہ سلام رخصت تھا۔ اہل حلم، کم ظرف جاہلوں کی بدسلوکی کے بدلہ میں بھلائی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ سَلَامٌ عَلَيْكَ کہنے کا یہ مطلب ہے کہ میری طرف سے آپ کو دکھ نہیں پہنچے گا، آپ کچھ بھی میرے ساتھ کریں میں تو آپ کے لئے اپنے رب سے معافی کی درخواست کروں گا۔ اکثر اہل تفسیر نے سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اللہ سے مشرک باپ کی مغفرت کی دعا کروں گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کو شرک و کفر سے توبہ کرنے اور اسلام و ایمان اختیار کرنے کی توفیق عنایت کر دے، جو امر موجب مغفرت ہو اس کے حاصل ہونے کی توفیق ملنے کی دعا مشرک کے لئے کی جا سکتی ہے ایمان و اسلام موجب مغفرت ہے پس توفیق ایمان کی دعا مشرک کے لئے ناجائز نہیں۔

میں کہتا ہوں آیت کی یہ تشریح غلط ہے اللہ نے دوسری جگہ فرمایا ہے قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرٰهِيْمَ الخ اس آیت میں اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کے طریقہ پر چلنے کی ہدایت فرمائی ہے اور آخر میں یہ بھی فرما دیا کہ مشرک کے لئے استغفار کرنے کے معاملہ میں تم ابراہیمؑ کی پیروی نہ کرو، باوجودیکہ ہر مشرک کے لئے ایمان کی توفیق ملنے کی دعا کی جا سکتی ہے اگر استغفار کا مطلب آیت مذکورہ میں دعاء توفیق ایمان ہوتا تو ایسے استغفار کرنے میں ابراہیمؑ کی پیروی کیوں ناجائز قرار دی جاتی ایسا استغفار تو ہر مشرک کے لئے ہو سکتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو باپ سے کہا سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ یہ اس وقت کہا تھا جب مشرک کے لئے دعائے مغفرت کرنے کی ممانعت آپ کو معلوم نہ تھی، جب ممانعت کا حکم ہو گیا تو پھر آپ نے باپ سے اظہار براءت کیا، رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب سے فرمایا تھا خدا کی قسم میں ضرور آپ کے لئے دعاء مغفرت کرتا رہوں گا، جب تک مجھے اس سے منع نہ کر دیا جائے، آخر آیت مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ الخ نازل ہو گئی، اس آیت کی تشریح سورہ براءۃ میں گزر چکی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ہر نبی کی خاص دعا قبول کی جاتی ہے اگر حضرت ابراہیمؑ باپ کے لئے توفیق ایمان کی درخواست کرتے تو اللہ ضرور اس کو توفیق ایمان فرما دیتا، لیکن آزر کے لئے ایمان مقدر ہی نہ تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے اس کو ایمان نصیب ہونے کی دعا ہی نہیں کی۔

كَانَ بِيْ حَفِيًّا کا یہ مطلب ہے کہ وہ مجھ پر بڑی مہربانیاں اور کرم کرنے والا ہے۔ کلبی نے کہا وہ عالم ہے میری دعا کو جانتا اور قبول فرماتا ہے۔ مجاہد نے کہا اس نے مجھے قبول دعا کا عادی بنا دیا ہے۔ (وہ میری بد دعا بھی قبول فرما لیتا ہے)۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور میں (اپنے دین کو لے کر) تم لوگوں سے اور ان چیزوں سے جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو الگ ہو جاؤں گا۔ مقاتل نے کہا حضرت ابراہیمؑ کوثی سے ہجرت کر کے ارض پاک کو چلے گئے، الگ ہونے کی آپ نے یہی شکل اختیار کی۔

وَاَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾ اور اپنے رب کی عبادت کروں گا، امید ہے کہ اپنے رب کی عبادت کر کے محروم نہیں رہوں گا، یعنی جس طرح تم لوگ بتوں کی پوجا کر کے اور ان کو پکار کے ناکام رہتے ہو اس طرح میں اپنے رب کو پکار کر اور اس کی عبادت کر کے نامراد نہیں رہوں گا۔ لفظ عَسٰى امید ہے، قریب ہے کا استعمال محض تواضع اور انکسار نفس و اظہار عجز کے طور پر کیا ورنہ اللہ کی عبادت اور اس سے دعا کرنے میں حضرت ابراہیمؑ

یقیناً ناکام نہیں تھے، مقدر ہو چکے تھے۔ اس لفظ سے اس امر کی طرف ایماء بھی ہے کہ دعا کا قبول کرنا اور عبادت کا ثواب دینا محض اللہ کی مہربانی پر موقوف ہے اس پر لازم نہیں ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ خاتمہ پر دارومدار ہے اور خاتمہ کا علم کسی کو نہیں۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾

پھر جب ابراہیمؑ ان لوگوں سے اور اللہ کے سوا جن کی وہ عبادت کرتے تھے ان سے علیحدہ ہو گئے تو ہم نے اس کو اسحاق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عطا کیا اور (ان دونوں میں سے) ہر ایک کو نبی بنایا۔

یعنی جب سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ ملک شام کو چلے گئے تو چھوٹے ہوئے کافر قرابت داروں کے عوض میں ہم نے ان کو اسحاقؑ و یعقوبؑ عطا فرمائے اور عزت مند اولاد دے کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی کیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک کو پیغمبر بنایا۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ صرف حضرت اسحاقؑ و حضرت یعقوبؑ کا ذکر شاید اس لئے خصوصیت کے ساتھ کیا کہ یہ دونوں بزرگ آئندہ پیغمبروں کی اصل تھے۔ (حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں تو سوائے رسول اللہ ﷺ کے اور کوئی نبی نہیں ہوا) یا یہ وجہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کا مستقل ذکر علیحدہ کرنا تھا۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا اور ہم نے ان (تینوں) کو اپنی رحمت کا ایک حصہ عطا فرمایا۔ کلبی کے نزدیک رحمت سے مال اور عزت مند اولاد مراد ہے، بعض نے کہا کتاب و نبوت مراد ہے۔

وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ اور (آئندہ نسلوں میں) ہم نے ان کا نام نیک اور اونچا کیا۔

لِسَانٌ (زبان) سے مراد وہ الفاظ ہیں جو زبان سے نکلتے ہیں لِسَانُ الْعَرَبِ، لغت عرب، عرب کا کلام۔ لِسَانَ صِدْقٍ یعنی وہ باتیں جن کی تمام مذاہب والے تعریف کرتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِيْنَ اللہ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ صِدْق کی طرف لِسَان کی اضافت اور پھر لِسَان کی صفت عُلُو کا ذکر بتا رہا ہے اس بات کو کہ جو کچھ ان کی تعریف و ثنا کی جاتی ہے اس کے وہ مستحق ہیں ان کی ایسی خوبیاں ہیں جو امتداد زمانہ کے باوجود پوشیدہ نہیں ہیں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوسٰىۤ ۚ إِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ﴿٥١﴾ اور کتاب میں موسیٰؑ کا ذکر کر پڑھو، بلاشبہ وہ (اللہ کا) منتخب اور عالی قدر پیغمبر تھا۔ مُخْلَصًا یعنی اللہ نے ان کو چن لیا تھا اور اپنے لئے منتخب کر لیا تھا اور غیر کی طرف توجہ کرنے سے پاک کر دیا تھا۔

رَسُوْلًا نَّبِيًّا رسالت کا مرتبہ نبوت سے اونچا اور افضل ہے اسلئے رَسُوْلًا کے بعد نَبِيًّا کہنے کی بظاہر ضرورت نہیں تھی، ہم صِدِّيْقًا نَّبِيًّا کی تشریح میں لکھ چکے ہیں کہ لفظ نبی جس طرح نَبَأ سے مشتق ہے اسی طرح نَبُوَة بمعنی رفعت و علو سے بھی ماخوذ ہے، پس نبی کا ترجمہ ہوا عالی قدر، اونچے مرتبہ والا، لیکن اللہ جس کو رسول بناتا ہے اس کو اپنی پیغمبری کا مرتبہ دے کر عالی قدر بھی بناتا ہے اور اپنے احکام سے براہ راست باخبر بھی فرماتا ہے پس موسیٰؑ کو اللہ نے اپنے لئے چن لیا تھا ان کو ذی قدر رسول بنایا تھا۔

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ اور ہم نے ان کو طور کے دائیں جانب سے پکارا۔ مصر اور مدین کے درمیان ایک پہاڑ تھا جس کو طور کہا جاتا تھا۔ بعض علماء نے اس کا نام زبیر بتایا ہے۔ حضرت موسیٰؑ مدین سے آرہے تھے، مصر کی طرف جانے کا ارادہ تھا، آپ کے دائیں جانب کوہ طور واقع تھا، دور سے آپ نے آگ روشن دیکھی اور ندا آئی يٰمُوْسٰى إِنِّيْ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ پہاڑ کا تو کوئی دایاں بایاں رخ نہیں ہوتا اس لئے موسیٰ کا دایاں جانب مراد ہے یعنی وہ مقام جہاں کوہ طور موسیٰ کے دائیں جانب تھا۔ یا اَيْمَن کا معنی ہے يُمْن برکت والا یعنی طور کے مبارک جانب سے ہم نے موسیٰ کو پکارا، مبارک جانب سے مراد ہے وہ رخ جہاں سے اللہ کا کلام آرہا تھا۔

وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿٥٢﴾ اور راز کی باتیں کرنے کے لئے ان کو مقرب بنایا۔ اللہ نے موسیٰؑ کو اپنا بے کیف قرب

عنایت کیا جو وجدانی ہے، بیانی نہیں نَجِیًّا سے یہ مراد ہے کہ اللہ نے اس کو اپنا کلام سنایا اور اس نے اللہ سے کلام کیا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝ اور ہم نے اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارونؑ کو نبی بنا کر ان کو عطا فرمایا۔ حضرت ہارونؑ عمر میں حضرت موسیٰؑ سے بڑے تھے، اس لئے یہ مطلب تو ہو نہیں سکتا کہ موسیٰؑ کے لئے ہم نے ہارونؑ کو پیدا کیا (بلکہ مراد یہ ہے کہ موسیٰؑ کی وجہ سے ہارونؑ کو نبوت عطا کی اور یہ عطاء نبوت موسیٰؑ کی درخواست پر ہوا) بغوی نے لکھا ہے اسی لئے حضرت ہارونؑ کا نام ہِبَةُ اللّٰهِ (عطیہ خداوندی) ہو گیا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝

اور کتاب میں اسمٰعیلؑ کا تذکرہ پڑھو بلاشبہ وہ وعدہ کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کا نام اسمٰعیل تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ رسول اللہ ﷺ کے جد اعلیٰ تھے، آپ وعدے کے سچے تھے، بقول مجاہد جو وعدہ کیا اس کو پورا کیا۔

مقاتل نے کہا حضرت اسمٰعیلؑ نے ایک شخص سے وعدہ کیا کہ جب تک تو واپس نہ آئے گا میں اس جگہ سے نہیں ہٹوں گا وہ شخص تین روز میں یا بقول کلبی سال کے بعد واپس آیا اور حضرت اسمٰعیلؑ کو اسی جگہ منتظر پایا۔ وعدے کی سچائی اس سے بڑھ کر اور کونسی ہو سکتی ہے کہ آپ نے اپنے والد محترم حضرت ابراہیمؑ سے کہا سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے، اللہ نے جو کچھ آپ کو حکم دیا بجالائیے، چنانچہ ذبح ہونے پر ثابت قدم رہے بے تابی کا اظہار نہیں کیا۔

بیضاوی نے لکھا ہے آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ رسول کا صاحب شریعت ہونا ضروری نہیں، حضرت اسمٰعیلؑ رسول تھے اور ابراہیمی شریعت پر تھے، خود صاحب شریعت نہیں تھے، حضرت ابراہیمؑ کی اولاد شریعت ابراہیمی پر تھی۔

وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝

اور وہ اپنے گھر والوں کو خصوصیت کے ساتھ نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیتے تھے اور اپنے رب کے ہاں وہ برگزیدہ پسندیدہ تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ خصوصیت کے ساتھ اپنے گھر والوں کو صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حکم اس لئے دیتے تھے کہ گھر والوں کی اصلاح سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ آدمی کو چاہئے کہ سب سے پہلے اپنی درستی کی طرف توجہ کرے پھر اقرب ترین لوگوں کی طرف اصلاح کا رخ موڑے پھر دوسرے لوگوں کی اصلاح کی فکر کرے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اہل سے مراد ساری امت ہے انبیاءؑ اپنی اپنی امتوں کے باپ ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نماز و زکوٰۃ سے مراد وہ شریعت ہے جس کی تعمیل اللہ نے اسمٰعیلؑ پر فرض کی تھی اور وہی ملت حنفیہ (دین ابراہیمی) ہم پر فرض ہے، نماز تمام بدنی عبادت میں اور زکوٰۃ تمام مالی عبادات میں افضل ہے، اس لئے خصوصیت کے ساتھ انہی دونوں کا ذکر کیا ورنہ مراد تو پوری شریعت ہے۔

مَرْضِيًّا یعنی اللہ نے ان کو اپنی پیغمبری اور نبوت کے لئے پسند کر لیا تھا اور وہ اللہ کی طاعت پر قائم اور اعمال و افعال کی استقامت کے پابند تھے اس لئے اللہ ان سے راضی تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اور کتاب میں ادریس کا تذکرہ پڑھو، بلاشبہ وہ صدیق نبی تھے، ادریس حضرت نوحؑ کے پردادا اور حضرت شیثؑ کے نواسے تھے، آپ کا نام اخنوخ تھا، درس کتب کی وجہ سے آپ کو ادریس کہا جاتا تھا (بہت پڑھنے والے) بیضاوی نے لکھا ہے ادریس غیر منصرف ہے (اس سے معلوم ہوا کہ یہ عربی نام نہیں) پھر درس سے مشتق ہونے کا کوئی معنی نہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ جس زبان کا یہ لفظ ہو اس میں بھی لفظ ادریس کا معنی (کثیر الدرس یا اس کے قریب کوئی معنی ہو اور اسی بناء پر ادریس کو ادریس کہا جاتا ہو) عربی معنی کے موافق ہو۔ اللہ نے حضرت ادریس پر تیس صحیفے نازل فرمائے تھے۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت ادریس قلم سے لکھنے اور کپڑا سینے اور سیا ہوا کپڑا پہننے کے موجد ہیں، آپ سے پہلے لوگ کھالوں کو بطور لباس استعمال کرتے تھے، آپ ہی نے سب سے پہلے ہتھیار بنائے اور

کافروں سے جنگ کی۔ علم نجوم و حساب کے بھی آپ ہی موجد تھے۔

وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝ اور ہم نے (کمالات میں) ان کو اونچی جگہ تک پہنچایا۔ بعض علماء نے کہا مکاناً علیاً سے مراد ہے نبوت اور قرب خدا کا اونچا درجہ، بعض کے نزدیک جنت، بعض کے نزدیک چھٹا یا چوتھا آسمان مراد ہے۔ حضرت انس بن مالک نے حضرت مالک بن صعصعہ کی روایت سے بیان کیا کہ شب معراج میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ادریس کو چوتھے آسمان پر دیکھا تھا۔ یہ حدیث سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ النجم میں بیان کر دی گئی ہے۔

حضرت ادریس کے آسمان پر اٹھائے جانے کا قصہ

کعب احبار وغیرہ نے بیان کیا کہ حضرت ادریس ایک روز دن بھر چلے اور دھوپ کی تیزی اور تپش سے آپ کو تکلیف ہوئی بارگاہ الٰہی میں عرض کیا میرے رب ایک روز دھوپ کی تپش میں چلنے سے مجھے اتنی تکلیف ہوئی پانسو برس کی مسافت جو ایک دن میں چلنے پر مجبور ہو اس کی کیا حالت ہوگی، اے میرے رب اس سورج کی گرمی ہلکی کر دے اور جو فرشتہ اس کو چلاتا ہے اس کا بار کم کر دے۔ دوسری صبح کو فرشتہ کو محسوس ہوا کہ سورج میں گرمی ہلکی ہو گئی جو روز کے معمول کے خلاف تھی، عرض کیا اے میرے رب تیرے اس حکم (تخفیف) کی کیا وجہ ہے۔ اللہ نے فرمایا میرے بندے ادریس نے درخواست کی تھی کہ میں سورج کی گرمی کم کر کے تیرے اوپر سے اس کا بار ہلکا کر دوں میں نے اس کی دعا قبول کر لی، فرشتہ نے عرض کیا پروردگار میری اس سے دوستی کرا دے، اللہ نے اجازت دیدی۔ آفتابی فرشتہ حضرت ادریس کے پاس آیا ادریس نے اس سے دریافت کیا اور کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو بڑا معزز فرشتہ ہے اور ملک الموت کے پاس تیری بڑی عزت ہے تو ملک الموت سے میری سفارش کر دے کہ وہ میری موت میں کچھ مدت ڈھیل کر دے تاکہ میں اللہ کے شکر و عبادت میں مزید اضافہ کر سکوں، فرشتے نے کہا آئی ہوئی اجل کو تو اللہ کسی کے لئے نہیں ٹالتا بہر حال میں ملک الموت سے کہوں گا۔ اس کے بعد آفتابی فرشتہ ادریس کو آسمان پر اٹھا کر لے گیا اور طلوع آفتاب کے مقام کے قریب ان کو ٹھیرا دیا، پھر ملک الموت سے جا کر کہا میرا آپ سے ایک کام ہے، بنی آدم میں سے میرا ایک دوست ہے جس نے مجھ سے سفارش کرائی ہے کہ آپ اس کی موت کو کچھ پیچھے کر دیں، ملک الموت نے اپنے رجسٹر میں ادریس کا نام دیکھا، دیکھ کر بولا آپ نے مجھ سے ایسے شخص کے متعلق گفتگو کی ہے جو میرے خیال میں آئندہ کبھی نہیں مرے گا کیونکہ اس کا نام زندوں کے اس رجسٹر میں نہیں ہے جو مرنے والے ہیں، آفتابی فرشتے نے کہا یہ کیسے، ملک الموت نے کہا میں نے اپنے رجسٹر میں یہ بات پائی کہ وہ آدمی طلوع آفتاب کے مقام کے قریب مرے گا۔ چنانچہ وہ مر گیا اب زندہ نہیں ہے آفتابی فرشتے نے کہا میں جو آپ کے پاس آیا ہوں تو اس کو چھوڑ کر آیا ہوں ملک الموت نے کہا اب جا کر دیکھو تم اس کو مردہ پاؤ گے اس کی زندگی کا کوئی حصہ باقی نہیں ہے فرشتے نے جا کر دیکھا تو ادریس کو مردہ پایا۔

وہب بن منبہ نے کہا آسمان پر ادریس زندہ ہیں یا مردہ علماء کے اقوال اس کے متعلق مختلف ہیں، ایک گروہ نے کہا وہ آسمان پر زندہ موجود ہیں اور صرف وہ ہی نہیں بلکہ چار انبیاء زندہ ہیں خضر اور الیاس زمین پر اور ادریس و عیسیٰ آسمان پر۔ وہب نے بیان کیا آسمان پر روزانہ ادریس کی اتنی عبادت پہنچتی تھی جتنی ساری زمین کے باشندوں کی، فرشتوں کو اس پر تعجب ہوا اور ملک الموت کو ادریس سے ملنے کا شوق ہوا اور اللہ سے اجازت لے کر وہ ادریس کی ملاقات کو آدمی کی شکل میں آیا۔ ادریس ہمیشہ روزے رکھتے تھے جب افطار کا وقت آیا تو ملک الموت کو بھی انہوں نے کھانے پر بلایا، ملک الموت نے کھانے سے انکار کر دیا تین روز ایسا ہی ہوتا رہا، اب ادریس کو ملک الموت کا انکار ناگوار ہوا اور تیسری شب کو ملک الموت سے پوچھا میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کون ہیں، ملک الموت نے کہا میں موت کا فرشتہ ہوں اپنے رب سے آپ کے ساتھ رہنے کی اجازت لے کر آیا ہوں، ادریس نے کہا میرا آپ سے ایک کام ہے، ملک الموت نے کہا کیا کام ہے، ادریس نے کہا آپ میری روح قبض کر لو۔ فرشتے نے روح قبض کر لی پھر تھوڑی دیر کے بعد اللہ نے روح واپس کر دی، ملک الموت نے پوچھا آپ نے جو روح قبض کرنے کی درخواست کی تھی اس کی غرض کیا تھی، ادریس نے کہا میں موت کی تکلیف اور گھبراہٹ کا مزہ چکھنا چاہتا تھا (بالکل مر جانا میرا مقصد نہیں تھا)

تاکہ موت کے لئے میری قابلیت زیادہ قوی ہو جائے (یعنی آئندہ جب مجھ پر موت آئے تو میرے اندر اس کی تکلیف اٹھانے کی صلاحیت کامل ہو اور کیفیت موت سے میں آشنا ہو چکا ہوں) اس کے بعد حضرت ادریس نے ملک الموت سے کہا میرا آپ سے ایک کام اور ہے ملک الموت نے پوچھا وہ کیا ہے، ادریس نے کہا آپ مجھے آسمان پر لے جائیں تاکہ میں وہاں کے احوال دیکھ لوں اور جنت و دوزخ کی طرف بھی لے جائیں۔ اللہ نے ملک الموت کو ادریس کی درخواست پوری کرنے کی اجازت دے دی، چنانچہ ملک الموت ادریس کو لے گئے دوزخ پر پہنچے تو ادریس نے ملک الموت سے کہا، آپ مالک (مہتمم دوزخ) سے کہہ کر دوزخ کے دروازے کھلوا دیجئے کہ میں (اندر جاکر اور) اتر کر دیکھ لوں، ملک الموت نے ایسا ہی کر دیا، ادریس نے کہا دوزخ تو آپ نے دکھا دی اب جنت بھی دکھا دیجئے۔ ملک الموت جنت کی طرف لے گئے اور جنت کے دروازے کھلوا کر اندر لے گئے اندر پہنچ گئے تو فرشتے نے کہا اب یہاں سے باہر نکلو اور اپنی اصلی قرارگاہ پر واپس جاؤ۔ ادریس ایک درخت کی ٹہنی پکڑ کر چپٹ گئے اور بولے اب میں یہاں سے باہر نہیں جاؤں گا (دونوں میں گفتگو کا ردوبدل ہونے لگا) اللہ نے فیصلہ کرنے کے لئے ایک فرشتہ کو بھیجا، فرشتے نے آکر ادریس سے پوچھا، آپ باہر کیوں نہیں جاتے، ادریس نے جواب دیا وجہ یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے ہر شخص موت کا مزہ چکھنے والا ہے، میں موت کا مزہ چکھ چکا، اور اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر شخص دوزخ میں ضرور اترے گا تو میں دوزخ میں اتر چکا اور اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ جنت سے باہر بھی نہیں نکلیں گے، اس لئے میں اب نہیں نکلوں گا، اللہ نے ملک الموت کے پاس وحی بھیجی میری اجازت سے یہ جنت میں داخل ہوا اور میری اجازت (حکم) سے باہر نکلے گا (تم نکالنے کی کوشش مت کرو) یہی وجہ ہے کہ ادریس وہاں زندہ ہیں۔ وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کی یہی تشریح ہے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْرٰٓءِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا

یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے (خاص) انعام فرمایا، منجملہ دیگر انبیاء کے (نوح سے پہلے) آدم کی نسل سے اور (آدم سے نیچے) ان لوگوں کی نسل سے جن کو نوح کے ساتھ ہم نے (کشتی میں) سوار کیا تھا اور (نوح سے بہت نیچے) ابراہیم و یعقوب کی نسل سے اور یہ سب لوگ ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت کی اور ہم نے ہی ان کو برگزیدہ کیا۔

أُولٰٓئِكَ یعنی زکریا سے ادریس تک جن انبیاء کا ذکر کیا گیا۔

أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ یعنی دنیوی اور دینی نعمتوں سے نوازا۔

مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ یعنی حضرت آدم کی نسل میں سے جیسے ادریس وغیرہ۔

وَمِمَّنْ حَمَلْنَا یعنی منجملہ آدم کی نسل کے ان لوگوں کی اولاد میں سے جو نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کئے گئے تھے خصوصاً خود نوح کی نسل سے جیسے ابراہیم و اسرائیل جو سام بن نوح کی نسل سے تھے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرٰهِيمَ اور نوح سے نیچے ابراہیم کی اولاد یعنی اسمٰعیل و اسحاق وغیرہ۔

وَإِسْرٰٓءِيلَ اور اسرائیل یعنی یعقوب کی نسل سے مثلاً موسیٰ ہارون زکریا، یحییٰ، عیسیٰ آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ بیٹی کی اولاد بھی ذریت میں داخل ہے۔

وَاجْتَبَيْنَا یعنی نبوت، اعزاز اور ہدایت کرنے کے لئے ہم نے انتخاب کر لیا۔

إِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۩ ﴿۵۸﴾ اور جب ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے زمین پر گر جاتے تھے۔ السجدة

سُجَّدًا ساجد کی جمع ہے۔ بُكِيًّا باکی کی جمع ہے یعنی اللہ کی رحمت کی طلب میں سجدہ میں گر پڑتے تھے اور عذاب کے ڈر سے روتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کو شرافت نسب، کمالات ذاتی، علو مرتبہ اور قرب خداوندی حاصل تھا پھر بھی خشیۃ اللہ کی وجہ سے سجدہ میں گر جاتے اور روتے تھے۔

ابن ماجہ، اسحاق بن راہویہ اور بزار نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قرآن پڑھو اور گریہ کرو، رونا نہ آئے تو رونے بن جاؤ۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ پھر ان کے بعد کچھ ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا اور (ناجائز) نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ان کے بعد (ان کے جانشین ہوئے) ان کے پیچھے آئے۔ خَلْفٌ برے جانشین، خَلَفٌ اچھے جانشین۔ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ یعنی انہوں نے نماز ترک کر دی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے ترجمہ کیا، نماز وقت کو ٹال کر پڑھی۔ سعید بن مسیب نے اس کی تشریح میں فرمایا جیسے ظہر کی نماز عصر کا وقت آنے سے پہلے نہ پڑھی جائے اور عصر کی نماز اس وقت پڑھی جائے جب سورج غروب ہونے لگے۔ حضرت مفسر نے فرمایا، میں کہتا ہوں کہ کسی مکروہ طریقے سے نماز پڑھنا اور نماز کے آداب وسنن کو ترک کرنا بھی نماز کو ضائع کرنا ہی ہے۔ اتباع شہوات کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی طاعت کو چھوڑ اور نفس کی خواہشات کو پورا کیا اور اللہ کی نافرمانیاں کیں۔

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ سو یہ لوگ عنقریب (آخرت میں) خرابی پائیں گے (یعنی غی میں پھینک دیئے جائیں گے)۔ بغوی نے لکھا ہے، وہب بن منبہ کا قول ہے کہ غی جہنم کے اندر ایک بہت گہری وادی کا نام ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جہنم کے اندر ایک ایسی وادی ہے کہ جہنم بھی اس کی گرمی سے پناہ مانگتی ہے۔ عادی زناکاروں کے لئے، عادی شراب خوروں کے لئے اور ان سود خوروں کے لئے جو سود خوری سے باز نہیں آتے اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے والوں کے لئے اور جھوٹے گواہوں کے لئے اس کو تیار کیا گیا ہے۔ ابن مردویہ نے یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے مرفوعاً نقل کی ہے۔ بغوی نے عطا کا قول نقل کیا ہے کہ غیؔ جہنم کے اندر ایک وادی ہے، جس کے اندر (بجائے پانی کے) پیپ اور خون بہتا ہے۔ کعب نے کہا غیؔ جہنم کے اندر ایک بہت ہی گہری اور گرم ترین وادی ہے جس کے اندر ایک کنواں ہے کنوئیں کو بہیم کہا جاتا ہے، دوزخ کی آگ جب بھی بجھنے لگتی ہے تو اس کنوئیں کا منہ کھول دیا جاتا ہے جس کی آگ سے دوزخ پھر بھڑکنے لگتی ہے۔ بغوی نے بروایت زکریا بن ابو مریم خزاعی بیان کیا کہ حضرت ابوامامہ باہلی نے فرمایا جہنم کے بالائی کنارہ سے گہرائی تک اتنی دوری ہے کہ کوئی دس ماہہ عظیم الجثہ اونٹنیوں کے برابر اگر کوئی پتھر یا چٹان اوپر سے نیچے کو لڑھکائی جائے تو ستر برس کی مسافت طے کر کے نیچے پہنچے، یہ سن کر عبدالرحیم بن خالد بن ولد کے آزاد کردہ غلام نے دریافت کیا حضرت کیا اس کے نیچے بھی کچھ ہے، حضرت ابوامامہ نے فرمایا ہاں غیؔ اور اثامؔ ہے۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم، سعید بن منصور، ہناد، فریابی حاکم اور بیہقی نے مختلف سندوں سے اس آیت کے ذیل میں حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ غی جہنم کے اندر ایک وادی ہے یا ایک نہر ہے (اختلاف روایت) بہت گہری بہت بدمزہ۔ دوسری روایت میں ہے دوزخ کے اندر گرم پانی کی ایک نہر ہے جو لوگ خواہشات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں انکو اس کے اندر پھینکا جائے گا۔

بیہقی کا بیان ہے کہ حضرت براء بن عازب نے فرمایا غی جہنم کے اندر ایک بہت گہری بدبودار وادی ہے۔

طبرانی اور بیہقی نے حضرت براء بن عازب کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر دس اوقیہ وزن کا کوئی پتھر جہنم کے (بالائی) کنارہ سے اندر پھینکا جائے تو ستر برس تک اس کی تہ تک نہیں پہنچے گا پھر غی اور اثام تک پہنچ جائے گا (یعنی جہنم کی تہ تک پہنچنے کے بعد جب اور نیچے جائے گا تو غی واثام پر پہنچے گا) میں نے عرض کیا غی اور اثام کیا چیز ہے، فرمایا جہنم کے نچلے حصے میں دو نہریں ہیں جن کے اندر دوزخیوں کا کچ لہو رواں ہے۔ اور یہی وہ دونہریں ہیں جن کا ذکر اللہ نے آیت فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا اور آیت مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا میں کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا غی کا معنی اس جگہ وہی لغوی معنی یعنی گمراہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ راہ جنت گم پائیں گے، جنت کے راستے سے بھٹک جائیں گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر بدی کو غی اور ہر اچھائی کو رشاد کہا جاتا ہے، اسی وجہ سے آیت کی تشریح میں ضحاک نے کہا وہ خسران پائیں گے، بعض نے غی کا

ترجمہ ہلاک اور بعض نے عذاب کیا ہے، عذاب ہو یا ہلاکت یا خسران و ناکامی سب ہی شر و بدی کے اقسام ہیں، بعض علماء نے محذوف مانتے ہوئے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے، دنیا میں گمراہ ہونے کا بدلہ اور سزا آخرت میں پائیں گے۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ﴿۶۰﴾

ہاں مگر جس نے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کرنے لگا سو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ یعنی اتباع خواہشات اور ترک صلوٰۃ سے جس نے توبہ کر لی اور کفر چھوڑ کر ایمان لے آیا اور حسب تقاضائے ایمان نیک عمل کیے وہ جنت میں داخل ہو گا اور اس کی بالکل حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ آیت میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ توبہ اور ایمان کے بعد سابق کفر کا کوئی مواخذہ اس سے نہیں ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اسلام پچھلے یعنی ایمان لانے سے پہلے جرائم کو ڈھا دیتا ہے۔ رواہ مسلم من حدیث عمرو بن العاص۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ مذکورہ بالا عذاب کی وعید کافروں کے لئے ہے اور جو کفر کے بعد ایمان لے آئے اس کو جنت کی بشارت دی گئی ہے، (حضرت مفسرؒ نے فرمایا) میں کہتا ہوں کہ عذاب کی وعید سے صرف مَنْ اٰمَنَ ہی مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا کا مجموعہ مستثنیٰ ہے اس لئے وعید سابق صرف کافروں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ مومن فاسق بھی وعید میں داخل ہیں، حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ غی، زانی، شرابی اور دوسرے اہل کبائر کے لئے ہے یعنی صرف کافروں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ فاسق مومن کے لئے بھی ہے۔

جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ

(اور) ہمیشہ رہنے کے باغوں میں جن کا رحمن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ کیا ہے (رہیں گے) عَدْنٍ یا مصدر ہے بمعنی قیام یا ایک جنت یا جنت کی زمین کا نام ہے۔ بِالْغَيْبِ ان لوگوں کیلئے اللہ نے جنت کا وعدہ کیا ہے جو جنت سے غائب اور اس کو نہ دیکھنے کی حالت میں بھی اللہ کی بندگی کرنے والے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ غیب پر ایمان لانے اور تصدیق کرنے کی وجہ سے اللہ نے اپنے بندوں کیلئے جنت کا وعدہ کیا ہے، اول مطلب پر بِالْغَيْبِ کا تعلق مُتَلَبِّسِيْنَ محذوف سے ہو گا اور دوسرے مطلب پر وَعَدَ سے۔

إِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَأْتِيًّا ﴿۶۱﴾ بے شک اللہ کی وعدہ کی ہوئی چیز کو وہ ضرور پہنچیں گے۔ مَاْتِيًّا (اسم ظرف) یعنی اہل جنت جنت میں ضرور داخل ہوں گے یا مَاْتِيًّا اسم مفعول بمعنی اسم فاعل ہے، یعنی اللہ کا وعدہ ضرور آنے والا ہے، دونوں مضمونوں میں کوئی فرق نہیں، عربی محاورہ میں بولا جاتا ہے مجھ پر پچاس سال گزر گئے۔ میں پچاس سال پر گزر گیا، دونوں ہم معنی ہیں۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا اس جنت میں وہ لوگ کوئی فضول بات نہ سننے پائیں گے، بجز سلام کے یعنی جنت کے اندر اہل جنت کوئی بیہودہ لفظ نہیں سنیں گے بلکہ اللہ کی طرف سے اور باہم ایک دوسرے کی طرف سے سلام (کی آواز) سنیں گے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اہل جنت ایسا کلام ہی سنیں گے جو عیب اور نقص سے پاک ہو گا۔

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ اور ان کو ان کا کھانا صبح و شام ملا کرے گا۔ یعنی ہر طرح کا رزق بافراغت اور سکھ حاصل ہو گا۔ حسن بصری نے کہا، عرب کے نزدیک زندگی کا عیش اس سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا کہ صبح و شام کھانے کو غذا (پیٹ بھر کر) مل جائے، اللہ نے عرب ہی کے محاورہ کے مطابق اہل جنت کے لئے صبح و شام رزق ملنے کا ذکر کیا ورنہ حقیقت میں ہر قسم کے عیش کا حصول مقصود ہے۔ سعید بن منصور اور ابن ابی حاتم نے اس آیت کے ذیل میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جتنی مقدار ان کو دنیا میں ملتی تھی اتنی ہی آخرت میں ملے گی۔ ابن مبارک نے اس آیت کی تشریح میں ضحاک کا قول نقل کیا کہ رات و دن کی مقدار کے مطابق ان کو ملے گا۔ ابن المنذر نے بیان کیا کہ ولید بن مسلم نے کہا میں نے اس آیت کی تشریح زہیر بن محمد سے دریافت کی۔ زہیر نے کہا جنت میں رات نہیں ہو گی وہاں تو ہمیشہ نور ہی ہو گا۔ پردہ چھوڑنے سے رات کا اندازہ اور پردہ اٹھا دینے سے دن کا اندازہ معلوم ہو گا۔

حکیم ترمذی نے النوادر میں حضرت ابو قلابہ و حضرت حسن کی روایت سے بیان کیا کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا جنت میں رات ہوگی، فرمایا، وہاں تو محض نور کی چمک ہوگی، صبح کا شام پر اور شام کا صبح پر توارد ہوگا، اللہ کی طرف سے نمازوں کے ان اوقات میں جن میں وہ نمازیں پڑھا کرتے تھے، عجیب تحفے ان کے پاس آئیں گے اور فرشتے ان اوقات میں ان کو سلام کریں گے۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

یہ جنت ایسی ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے اس کا مالک ایسے لوگوں کو بنائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔ نورث یعنی ہم جنت کو ان کے تقویٰ کا ثمرہ بنا کر ان کے لئے باقی رکھیں گی، جیسے مورث کا مال وارث کے لئے باقی رہتا ہے، مطلب یہ کہ وارث کرنے سے مراد ہے باقی رکھنا یہ مطلب نہیں کہ پہلے جنت کا کوئی اور مالک تھا اس کے مرنے کے بعد نیک بندوں کو اس کا وارث بنایا گیا۔ وارث بنانے سے مراد مالک بنانا بھی ہو سکتا ہے۔ محاورات عربیہ اور بعض آیات اس کی شاہد ہیں اس صورت میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ (مترجم)

وراثت کا لفظ (بجائے تملیک کے) اسلئے اختیار کیا کہ ملکیت و استحقاق کا سب سے قوی ذریعہ وراثت ہی ہے، نہ مورث اس کو فسخ کر سکتا ہے، نہ وارث سے واپس لینے کا امکان ہے، نہ اس کو رد کیا جا سکتا ہے، نہ اس کا اسقاط ممکن ہے۔ بعض علماء نے کہا مومنوں کو جنت کے اندر بعض ایسے مکان بھی ملیں گے جو واقع میں ان دوزخیوں کے لئے تھے کہ اگر وہ کفر نہ کرتے تو ان مکانوں کے مالک و قابض ہوتے لیکن ان کے دوزخ میں جانے کے بعد اللہ ان کے مساکن پر مومنوں کو قابض بنا دے گا۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے بسند صحیح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے لئے دو گھر ہوں گے ایک جنت کے اندر ایک دوزخ کے اندر جب کوئی مرنے کے بعد دوزخ میں چلا جائے گا تو اس کے جنت والے گھر کے وارث اہل جنت ہو جائیں گے یہی اللہ کے قول (اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ) کا مفہوم ہے۔

حضرت انسؓ کی روایت سے ابن ماجہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے وارث کو میراث دینے سے بھاگے گا، اللہ جنت کے اندر اس کی (موجود) میراث کو کاٹ دے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بخاری نے بیان کیا کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ سے فرمایا ہماری ملاقات سے رو کنے والی آپ کے لئے کیا چیز ہے (یعنی کیا وجہ کہ آپ ہمارے پاس نہیں آئے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ اور ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے۔ اصل کلام اس طرح تھا۔ جبرئیلؑ محمد ﷺ سے کہہ دو کہ ہم بغیر رب کے حکم کے نہیں اترا کرتے۔ تنزّل (باب تفعل) بمعنی نزول بھی آتا ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اترنا بھی تنزّل کا مفہوم ہے، کیونکہ باب تفعل باب تفعیل کا مطاوع ہوتا ہے اور تنزیل کا معنی ہے تھوڑا تھوڑا اتارنا پس تنزّل کا معنی ہوا وقفہ وقفہ کے بعد اترنا، کبھی تنزیل انزال (اتارنا) کا ہم معنی بھی آتا ہے یعنی اس کے معنی میں آہستہ آہستہ اور قدرے قدرے کا مفہوم نہیں ہوتا۔

ابن ابی حاتم نے عکرمہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک بار جبرئیلؑ کے آنے میں چالیس روز کا وقفہ ہو گیا۔

ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون سا مکان اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور کون سی جگہ ہے جس سے اللہ کو سب سے زیادہ نفرت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے نہیں معلوم، میں جبرئیلؑ سے دریافت کروں گا، اس کے بعد جبرئیل کو آنے میں (ایک لمبی مدت تک) تاخیر ہو گئی، پھر جب جبرئیل آئے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا آپ نے آنے میں بڑی مدت لگا دی مجھے تو یہ خیال ہونے لگا کہ شاید میرا رب مجھ سے کچھ ناراض ہو گیا، اس کے جواب میں حضرت جبرئیل نے کہا وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔

ابو نعیم نے دلائل میں اور ابن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے جب اصحاب کہف اور ذوالقرنین اور روح کے متعلق دریافت کیا اور آپ کو اس کا جواب معلوم نہ تھا (اس لئے آپ نے دوسرے روز جواب دینے کا وعدہ کر لیا) آپ کو امید تھی کہ وحی سے جواب معلوم ہو جائے گا لیکن جبرئیل پندرہ روز تک نہیں آئے اور

کوئی وحی بھی نہیں آئی پندرہ روز کے بعد جب جبرئیل آئے تو آپ نے ان سے تاخیر نزول کا شکوہ کیا۔ الخ

بغوی نے ضحاک، عکرمہ، مقاتل اور کلبی کے حوالہ سے بیان کیا کہ جب قوم والوں نے رسول اللہ سے اصحاب کہف اور ذوالقرنین اور روح کے متعلق سوال کیا تو حضورؐ نے فرمایا میں کل کو بتاؤں گا آپ نے اس وعدے کے ساتھ انشاء اللہ نہیں فرمایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جبرئیلؑ مدت تک نہیں آئے اور حضور ﷺ کو (جبرئیل کے نہ آنے اور جواب معلوم نہ ہونے سے) تکلیف ہونے لگی پھر کچھ دنوں کے بعد جب جبرئیل آئے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا آپ نے بہت دیر کر دی، میرا تو خیال خراب ہونے لگا تھا، میں آپ کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتا رہا، جبرئیلؑ نے کہا میں بھی آپ سے ملنے کا مشتاق تھا لیکن میں حکم کا بندہ ہوں، مجھے جب بھیجا جاتا ہے آ جاتا ہوں روک دیا جاتا ہے رک جاتا ہوں، اس پر یہ آیت اور آیات وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی نازل ہوئیں۔

لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾

اسی کی ملک ہیں ہمارے آگے کی سب چیزیں اور ہمارے پیچھے کی سب چیزیں اور ان کے درمیان کی سب چیزیں اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں۔

لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا سے مراد ہے وقت حاضر سے آئندہ قیامت تک بلکہ ابدالآباد تک ہونے والے واقعات، امور، اشیاء، حوادث، دنیوی ہوں یا اخروی اور مَا خَلْفَنَا سے مراد ہیں ماضی کے احوال، واقعات، حوادث اور امور و اشیاء، اور مَا بَيْنَ ذٰلِكَ سے مراد ہے وقت حاضر اور اس میں موجود تمام اشیاء و احوال۔ بعض علماء کے نزدیک مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا سے مراد ہے زمین جب ہم اس پر اترنا چاہیں اور خَلْفَنَا سے مراد ہے آسمان جب ہم اس سے اترنے کا ارادہ کریں اور اترنے لگیں اور مَا بَيْنَ ذٰلِكَ سے مراد ہے درمیانی خلاء اور فضاء۔

آپ کا رب بھولنے والا نہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کا رب آپ کو بالکل چھوڑ دے، اور آپ کے پاس وحی نہ بھیجے اور ہم بالکل آپ کے پاس نہ آئیں ایسا نہیں ہے بلکہ تاخیر وحی اللہ کی حکمت پر مبنی ہے جس سے وہی واقف ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ

وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان ہیں سو اسی کی عبادت کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ عدم نسیان کی علت ہے۔ فَاعْبُدْهُ اور وَاصْطَبِرْ میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ اللہ کی رحمت و فضل آپ پر کامل طور پر ہے اور اللہ کی شان سے بعید ہے کہ وہ آپ کو بھول جائے لہٰذا بطور شکر نعمت آپ اس کی عبادت کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائیں اور عبادت کی پابندی کریں تاخیر وحی اور استہزاء کفار سے پریشان خاطر نہ ہوں۔

(صَبْر کے بعد عربی میں عَلٰی آتا ہے لیکن) یہاں اِصْطَبِرْ کے بعد لام کا استعمال کیا، اشارہ اس طرف ہے کہ عبادت کی پابندی سے لذت حاصل کرو (ناگوار سمجھ کر نہ ادا کرو) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا نماز میں میری آنکھ کی ٹھنڈک بنادی گئی ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ کفار کی طرف کی ایذا رسانی اور مشکلات و شدائد پر آپ صبر کریں تاکہ اللہ کی عبادت پر آپ کو جماؤ حاصل ہو اور آپ اللہ کے عابد بن سکیں۔ (اس صورت میں لِعِبَادَتِهٖ میں لام اجلیہ ہو گا)

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے سَمِيًّا کا ترجمہ کیا ایسا مثل جو عبادت کئے جانے اور اِلٰہ کہلانے کا مستحق ہو۔ کلبی نے کہا یعنی کیا آپ اللہ کے سوا کسی اور کو ایسا پاتے ہیں جس کا نام اللہ ہو مشرکین بتوں کو اِلٰہ (معبود) کہتے تھے اللہ (ذات جامع صفات کمالیہ) نہیں کہتے تھے، وجہ یہ تھی کہ اللہ کی وحدانیت ظاہر تھی اس کی ذات کے کوئی مشابہ نہ تھا اس لئے لفظ اللہ کے مصداق میں کوئی اشتباہ نہ تھا۔

یہ جملہ حکم عبادت کی علت ہے کیونکہ جب اللہ کی وحدانیت ثابت شدہ ہے اور کوئی اس جیسا نہیں نہ کسی کو معبود ہونے کا استحقاق ہے تو لازمی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کے حکم کو تسلیم کیا جائے اور اسی کی عبادت کی جائے اور عبادت میں جو مشقت ہو اس کو برداشت کیا جائے اور صبر کیا جائے۔

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾ اور انسان (منکر قیامت) یوں کہتا ہے کہ جب میں مرجاؤں گا تو کیا پھر زندہ کر کے (قبر سے) نکالا جاؤں گا۔

اَلْاِنْسَانُ یعنی جنس انسان (الف لام جنسی) یا بعض معین انسان (الف لام عہدی) بغوی نے لکھا ہے الانسان سے مراد ابی بن خلف جمحی ہے، یہ قیامت جسمانی کا منکر تھا۔ روایت میں آیا کہ اس نے ایک بوسیدہ ہڈی ہاتھ میں لے کر اس کا چورا کر دیا اور کہنے لگا محمد کا خیال ہے کہ ہم مرنے کے بعد پھر زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، اس کے قول کو اللہ نے اس آیت میں نقل کیا ہے۔ اُخْرَجُ میں نکالا جاؤں گا۔ زمین سے یا حالت موت سے۔ حیا زندہ ہو کر چونکہ وہ شخص مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا منکر تھا اس لئے حرف انکار سب سے اول ذکر کیا۔ لَسَوْفَ میں لام صرف (تاکید کے لئے ہے زمانہ حال کا مفہوم مراد نہیں ہے۔

أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿۶۷﴾ کیا یہ شخص اس بات کو نہیں سمجھتا کہ ہم اس سے قبل اس کو عدم سے وجود میں لا چکے ہیں اور اس وقت تو یہ کچھ بھی نہ تھا۔ یعنی جو شئے بالکل معدوم ہو کبھی اس کا نام ونشان بھی نہ ہوا ہو اس کو موجود کر دینا زیادہ دشوار اور تعجب انگیز ہے مختلف مواد اور احوال و اعراض کا مجموعہ اگر موجود ہو کر فنا ہو گیا تو اس کو دوبارہ جمع کر کے موجود کر دینا اور جوڑ کر یکجا کر دینا اتنا دشوار نہیں ہے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾
سو قسم ہے آپ کے رب کی ہم ان کو اور شیاطین کو ضرور جمع کریں گے پھر ان کو دوزخ کے گرداگرد اس حالت سے حاضر کریں گے کہ یہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔

وَالشَّيَاطِينَ یہ مفعول معہ ہے یا ہُمْ ضمیر پر معطوف ہے۔ بغوی نے لکھا ہے ہر کافر کو ایک شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں باندھا جائے گا اور ساتھ ساتھ میدان حشر میں لایا جائے گا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جِثِيًّا یعنی گروہ گروہ یہ جثوۃ کی جمع ہے۔ حسن اور ضحاک نے کہا جِثِيًّا جاثٍ کی جمع ہے۔ زانو کے بل بیٹھے ہوئے، سدی نے ترجمہ کیا تنگی مقام کی وجہ سے زانو کے بل کھڑے ہوئے۔

میں کہتا ہوں خوش نصیب ہوں یا بد نصیب مومن یا کافر سب کو جہنم کے گرداگرد اللہ جمع کرے گا۔ نیکوں کو یہ بات دکھا کر خوش کرنے کے لئے کہ اللہ نے ان کو جہنم سے بچالیا اور بدوں کو زیادہ افسوس وحسرت دلانے کے لئے کہ نیک لوگ جہنم سے لوٹ کر جنت کی طرف چلے گئے اور ان کو جہنم کے لئے چھوڑ گئے۔

عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بابہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ منظر گویا میرے سامنے ہے کہ الکرم میں جہنم سے ورے تم لوگ زانو کے بل بیٹھے ہوئے ہو۔ یہ بیان کرنے کے بعد راوی حدیث (یعنی سفیان نے) آیت وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً پڑھی۔ شیخ ابن حجر نے کہا الکرم سے مراد ہے اونچا مقام جہاں امت محمدیہ ہوگی۔ لفظ ثُمَّ دلالت کر رہا ہے اس امر پر کہ حشر سے ایک مدت کے بعد لوگ جہنم کے گرداگرد جمع ہوں گے کیونکہ فیصلے سے پہلے ایک طویل مدت تک ان کو موقف حساب میں رکنا پڑے گا۔

ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ مِن كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾ پھر (ان کفار کے) ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو علیحدہ کریں گے جو ان میں سب سے زیادہ اللہ سے سرکشی کرتا تھا۔ کُلِّ شِيعَةٍ یعنی ہر امت اور ہر مذہب والوں میں سے۔ شِيعَةٍ جدا گروہ، متبعین مددگار، اس لفظ کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور دو پر بھی اور جمع پر بھی، مذکر پر بھی اور مونث پر بھی۔ اصل ماخذ شَاعَ يَشِيعُ (ضرب یضرب) ہے مصدر شَيْعًا شَيَعًا شُيُوعًا مَشَاعًا شَيْعُوعَةً ہے شاع کا

معنی ہے پھیل گیا۔ مشہور ہو گیا۔ (قاموس) میں کہتا ہوں متبعین اور انصار کو شیعہ اس لئے کہتے ہیں کہ شیوع اور پھیلاؤ کا لازمی نتیجہ تقویت ہے اور مددگاروں کے پھیلاؤ سے بھی متبوع اور پیشوا کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ شَاعَ الْقَوْمُ، قوم پھیل گئی۔ اس کی تعداد بہت ہو گئی۔ شَیَّعْتُ النَّارَ بِالْحَطَبِ میں نے آگ کو لکڑیاں ڈال کر تیز کر دیا، کثرت متبعین سے بھی آدمی کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

عِتِیًّا (مصدر ہے) بیجا غرور، معصیت میں حد سے آگے بڑھ جانا (قاموس) یا طاعت سے سرکشی کرنا۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ عِتِیًّا سے اس جگہ جرأت مراد ہے (یعنی اللہ کے مقابلہ میں بیباکی، مترجم) مجاہد نے اس کا ترجمہ فجور کیا۔

عِتِیًّا ضابطۂ نحو کے لحاظ سے تمیز ہے یعنی اَیُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتُوَّةً۔ سیبویہ کے نزدیک لفظ اَیُّهُمْ مفعول ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ لفظ اَیُّ موصولہ ہے اور دوسرے موصولات کی طرح اس کو مبنی ہی ہونا چاہئے لیکن لفظ بعض اور لفظ کل کی طرح یہ ہمیشہ مضاف ہوتا ہے پھر اس جگہ اس کے صلہ کا ابتدائی جز محذوف بھی ہے (یعنی اَیُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ اصل میں اَیُّهُمْ هُوَ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ تھا) اس جگہ لفظ اَیُّ مبنی نہیں ہے معرب ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اَیُّهُمْ مبتدا ہے اور اَشَدُّ خبر ہے۔ مِنْ كُلِّ میں مِنْ بمعنی بعض ہے یا زائد ہے۔

ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا۝ پھر ہم ان لوگوں کو خوب جانتے ہوں گے جو دوزخ میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ مستحق ہوں گے۔

ایک شبہ

لفظ ثُمَّ کا استعمال بتا رہا ہے کہ پہلے جہنم کے گرداگرد دوزخیوں کو حاضر کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہر گروہ میں سے سب سے بڑے نافرمانوں کو چھانٹا جائے گا، پھر آخر میں اللہ کو علم ہو گا کہ آگ میں داخل ہونے کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے، حالانکہ اللہ کو اگر دوزخیوں کا علم پہلے سے نہ ہو گا تو دوزخ کے گرداگرد ان کو جمع کیسے کیا جائے گا اور سب سے بڑے نافرمانوں کو ہر گروہ میں سے چھانٹ کر نکالا کیسے جائے گا۔

ازالہ

(۱) ثم اس جگہ تاخیر زمانی کے لئے مستعمل نہیں ہے بلکہ صرف ترتیب کلام کی تاخیر اور مرتبہ کی تراخی کے لئے مستعمل ہے جیسے آیت ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ میں آیا ہے۔ (۲) یا اس آیت میں جاننے سے مراد ہے عذاب دینا (کیونکہ جاننے کا نتیجہ عذاب کی شکل میں ہی نمودار ہو گا) اور ظاہر ہے کہ دوزخ پر حاضر کرنے کے بعد عذاب دیا جائے گا۔

ایک سوال

اَعْلَمُ اسم تفضیل ہے تو کیا اللہ کے سوا قیامت کے دن کوئی اور مخلوق بھی دوزخیوں کے مستحق دوزخ ہونے سے واقف ہو، کیا کسی اور کو بھی ان کے عقائد و اعمال کا علم ہو گا۔

جواب

(۱) یہاں اَعْلَمُ بمعنی عَلِیْمٌ کے ہے یعنی ہم ہی واقف ہوں گے کہ کون دوزخ میں داخلہ کا زیادہ مستحق ہے۔

(۲) یہ بھی ممکن ہے کہ اعمالنامے لکھنے والے فرشتے دوزخیوں کے اعمال سے واقف ہوں، بدکار اور پرہیزگار، سعید اور شقی ہر ایک کو تفصیل سے جانتے ہوں لیکن ان سب کے علم سے اللہ کا علم زائد ہو پس اللہ سب سے زیادہ ان کے احوال سے واقف ہو گا (کیونکہ اللہ کو دماغی تصورات اور قلبی تصدیقات اور اندرونی نیتوں کا بھی علم ہے اور اعمال لکھنے والوں کو ان میں سے کسی بات کا علم نہیں ان کو تو صرف بدنی اعمال کا علم ہے)

مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ کا لفظ اگر کافروں اور گناہگار مسلمانوں سب کو شامل مانا جائے تو لفظ اَشَدُّ سے تنبیہ ہو گی اس امر پر کہ

اللہ بکثرت گناہ گار مومنوں کو معاف فرمادے گا، لیکن بغوی اور اکثر اہل تفسیر نے کُلِّ شِیْعَۃٍ سے صرف کافروں کے گروہ مراد قرار دیئے ہیں اور رفتار کلام کا بھی یہی تقاضا ہے اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم کافروں کے ہر گروہ میں سے ترتیب وار حسب درجہ کفر چھانٹ لیں گے اور یکے بعد دیگرے ترتیب کے ساتھ دوزخ میں پھینک دیں گے۔ جو سب سے زیادہ باغی ہوگا اس کو سب سے پہلے، پھر اس سے کم سرکش کو، پھر اس سے کم بغاوت والے کو یا یہ مطلب ہوگا کہ ہر کافر کو دوزخ کے اس درجہ اور طبقہ کے لئے چھانٹ لیں گے جو اس کے لئے مقرر اور نامزد ہوگا۔ آیت مذکورہ کی تشریح میں ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اول و آخر سب کا حشر ہو چکے گا اور سب کی گنتی پوری ہو جائے گی تو پھر ترتیب وار بڑے جرائم والوں کو پھر ان سے کم جرائم والوں کو پھر ان سے کم درجہ کے مجرموں کو چھانٹا جائے گا۔ ہناد نے احوص کا قول بھی اس آیت کی تشریح میں اسی کے قریب قریب نقل کیا ہے۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ　اور تم میں سے ہر ایک دوزخ پر اترنے والا ہے (یعنی اللہ نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ ہر شخص کو دوزخ پر ضرور اترنا ہوگا)

كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿۷۱﴾　یہ آپ کے رب پر (اس کے وعدے کے موافق) لازم ہے، جو ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

حَتْمًا مصدر (بمعنی صفت) ہے یعنی لازم ہے اللہ نے اپنے اوپر لازم قرار دے لیا ہے۔ اللہ نے یہ امر طے کر دیا ہے اور قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ایسا ضرور ہوگا اس کے خلاف ہونا ممکن نہیں۔

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾　پھر (جہنم پر اتارنے کے بعد) ان لوگوں کو ہم بچالیں گے جو (شرک سے) بچتے رہے تھے (عذاب دے کر یا بغیر سزا دیئے۔ بہر حال اہل توحید و ایمان کو دوزخ سے نجات دیدی جائے گی) اور کافروں کو دوزخ کے اندر سب کو چھوڑ دیں گے۔

جِثِيًّا یعنی سب کو یعنی دوزانو یا زانو کے بل بیٹھا چھوڑ دیں گے، ورود سے مراد ہے داخل ہونا، پل صراط جہنم کے اوپر ہوگا اور اس پر سے سب کو گزرنا ہی ہوگا۔

بعض اہل ہوئی (یعنی فرقہ مرجئہ والے جو ایمان صحیح کے بعد کسی گناہ کو ضرر رساں نہیں خیال کرتے اور کہتے ہیں اگر ایمان دل میں موجود ہے تو پھر کسی مومن کا داخلہ جہنم میں نہ ہوگا) کہتے ہیں کہ ورود سے مراد داخل ہونا نہیں ہے بلکہ دوزخ پر حاضر ہونا اور اس کو دیکھنا مراد ہے۔ حساب کے مقام پر تو سب کو جانا ہی ہوگا اور مقام حساب جہنم کے قریب ہوگا اس لئے ہر ایک کو دوزخ سامنے نظر آئے گی۔

یہ فرقہ کہتا ہے کہ مومن کبھی دوزخ میں نہیں جائے گا، کیونکہ جو شخص دوزخ میں چلا جائے گا وہ کبھی وہاں سے باہر نہ آسکے گا۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰىٓ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا مقام حساب میں حاضر کرنے کے بعد اللہ مومنوں کو تو وہیں سے نجات دے کر جنت میں لے جائے گا اور کافروں کو دوزخ میں داخل کر دے گا۔ ورود کا معنی قریب یا کنارے پر پہنچ جانا، قرآن مجید میں بھی آیا ہے وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ اور جب موسیٰؑ مدین کے پانی (کنویں) پر اترے، ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کنویں کے اندر نہیں اترے تھے کنارہ پر پہنچے تھے: اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمد اور ابو یعلی اور طبرانی نے قابل قبول سند کے ساتھ حضرت معاذ بن انس کی روایت سے بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی خوشی سے حاکم کے جبر کے بغیر جہاد میں مسلمانوں کی چوکیداری کرے گا وہ دوزخ کو اپنی آنکھ سے بھی نہیں دیکھے گا مگر صرف قسم پوری کرنے کے لئے کیونکہ اللہ نے فرمادیا ہے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا اور یہ (جملہ اہل تفسیر کے نزدیک قسمیہ ہے)

اہل سنت کے مسلک کی تشریح

اور مرجیہ کے شبہات کا ازالہ

ہم کہتے ہیں گردن اٹھا کر جھانکنا، دیکھنا، کنارہ پر پہنچ جانا اور حاضر ہونا بیشک ورود کے مجازی معنی ہیں (حقیقی معنی داخل ہونا ہی ہے) اور مجازی معنی کی طرف رجوع کسی خاص ضرورت ہی کے زیر اثر ہوتا ہے اور یہاں کوئی ضرورت داعی نہیں بلکہ اسی آیت میں مجازی معنی مراد نہ ہونے کی تائید ملتی ہے کیونکہ اس آیت میں لفظ نُنَجِّیْ اور نَذَرُ آیا ہے اور ظاہر ہے کہ نجات دینا یا دوزخ میں چھوڑ دینا اسی وقت ممکن ہے جب پہلے سے دوزخ میں داخلہ ہو گیا ہو۔

حدیث سے استدلال بھی ناکافی ہے، حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قسم پوری کرنے کے لئے دوزخ کو دیکھنا ضروری ہے آگ میں داخلہ نہ ہونا نہ مذکور ہے نہ مستنبط۔

رہی آیت اُولٰٓئِکَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ دوزخ میں داخلہ کے بعد اور پھر نجات کا وقت اور حکم آجانے کے بعد ان کو دور کر دیا جائے گا اس کے بعد وہ دوزخ سے دور رکھے جائیں گے اور دور ہو جانے کے بعد پھر وہ دوزخ کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے، یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ آگ چونکہ ان کے لئے ٹھنڈی کر دی جائے گی اس لئے دوزخ میں داخل ہونے کے وقت ان کو آگ کی آہٹ بھی سنائی نہیں دے گی۔

ہناد اور طبرانی اور بیہقی نے خالد بن معد کا قول نقل کیا کہ جنت میں پہنچ جانے کے بعد جنتی عرض کریں گے اے ہمارے مالک کیا تو نے وعدہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ آگ میں ضرور داخل کئے جائیں گے، اللہ فرمائے گا ضرور یہ وعدہ کیا تھا اور ایسا ہو بھی گیا تم لوگ آگ پر سے گزر گئے اور (چونکہ) آگ ٹھنڈی کر دی گئی (اس لئے تم کو محسوس بھی نہیں ہوئی)

ابن عدی اور طبرانی نے حضرت یعلی بن امیہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن آگ مومن سے کہے گی (میرے اوپر سے) گزر جا، تیرے نور نے تو میری لپٹ کو بجھا دیا۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ ورود بمعنی دخول ہے خواہ بصورت مرور ہی ہو (اندر گھسنا مراد نہ ہو، اوپر سے گزر جانا مراد ہو) اس کا ثبوت ابوسمیہ کے اس بیان سے ملتا ہے جو امام احمد اور حاکم اور بیہقی نے نقل کیا ہے (ابوسمیہ) نے کہا ورود کے معنی کی تعیین میں ہمارا باہم اختلاف ہو گیا کسی نے کہا مومن دوزخ میں داخل ہی نہیں ہو گا کسی نے کہا دوزخ میں سب کو جانا ہو گا پھر شرک سے پرہیز رکھنے والوں کو اللہ نجات دیدے گا۔ میں نے اس اختلاف کا تذکرہ حضرت جابر بن عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کیا حضرت جابر نے اپنی دونوں انگلیاں کانوں تک لے جا کر فرمایا یہ دونوں کان بہرے ہو جائیں اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے ان کانوں سے نہ سنا ہو کہ نیک ہو یا بد کوئی بھی آگ میں داخل ہوئے بغیر نہیں بچے گا مگر مومن کے لئے آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ اور باعث سلامتی ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم کے لئے ہو گئی تھی یہاں تک کہ مومنوں کی ٹھنڈک سے آگ چلا اٹھے گی۔ ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا پھر ہم شرک سے بچنے والوں کو نجات دیدیں گے اور سب کافروں کو اسی کے اندر چھوڑ دیں گے۔

بغوی نے بحوالہ ابن عیینہ، عمرو بن دینار کی روایت سے بیان کیا کہ نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباسؓ سے ورود کے معنی کی تشریح میں کچھ اختلاف کیا اور کہا ورود سے مراد داخل ہونا نہیں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ کیا اس آیت میں ورود سے مراد داخل ہونا نہیں ہے۔ کیا وہ جہنم میں داخل نہیں ہوں گے، پھر فرمایا نافع تم اور میں سب اس میں داخل ہوں گے مجھے تو امید ہے کہ اللہ مجھے نکال لے گا لیکن میرا خیال ہے کہ تجھے نہیں نکالے گا کیونکہ تو داخل ہونے کا ہی منکر ہے۔

سعید بن منصور، عبدالرزاق، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے مجاہد کی روایت سے بیان کیا ہے کہ نافع بن ازرق

حضرت ابن عباسؓ سے ورود کے مرادی معنی کے متعلق جھگڑنے لگا۔ الی آخرہٖ۔ حضرت ابن عباس نے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ تلاوت کرنے کے بعد فرمایا کیا وہ آگ میں داخل ہوں گے یا نہیں۔ اسکے بعد یہ آیت پڑھی يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ اور فرمایا کیا وہ دوزخ میں اپنی قوم کو لے جائے گا یا نہیں۔ اس کے بعد حضرت ابن عباس نے فرمایا میں اور تو سب ہی اس میں داخل ہوں گے۔ اب تو خود ہی غور کر لے کہ تو وہاں سے نکلے گا یا نہیں (ہمیشہ اس کے اندر ہی پڑا رہے گا) بطریق عوفی حضرت ابن عباس کا قول آیت اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کی تفسیر میں آیا ہے کہ نیک اور بد سب ہی اس میں داخل ہوں گے کیا تم کو نہیں معلوم کہ (ورود بمعنی دخول دوسری آیات میں بھی آیا ہے) اللہ نے فرمایا ہے فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ۔ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا۔

حاکم نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ سے آیت اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کا معنی پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا دَاخِلُهَا (یعنی وارد کا معنی ہے داخل)

بیہقی نے بروایت عکرمہ بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ کی تشریح میں فرمایا دوزخ میں داخل ہوئے بغیر کوئی نہیں رہے گا۔

امام احمد، ترمذی، بیہقی اور حاکم نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعود نے آیت وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کے سلسلہ میں بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب لوگ دوزخ پر اتریں گے۔ اس کے بعد اپنے اپنے اعمال کے موافق وہاں سے نکال لئے جائیں گے، اول شخص بجلی چمکنے کی طرح (نکل جائے گا) پھر ہوا کی طرح پھر گھوڑے کی تیز دوڑ کی طرح پھر اونٹ کی رفتار کی طرح جس پر سامان بھی لدا ہو۔ پھر آدمی کے دوڑنے کی طرح پھر آدمی کی معمولی رفتار کی طرح۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ سب لوگ پل صراط پر اتریں گے۔ اور اترنے سے مراد ہے ان کا قیام پھر اپنے اپنے اعمال کے موافق صراط سے باہر نکال لئے جائیں گے۔ کوئی بجلی کی طرح گزر جائے گا۔ کوئی بہترین اونٹ کی طرح، کوئی آدمی کی دوڑ کی طرح (دوڑ کر) گزر جائے گا۔ یہاں تک کہ گزرنے والوں میں آخری وہ شخص ہوگا جو پل صراط پر اپنے قدموں کے انگوٹھے رکھتا ہوا صراط سے گزر جائے گا۔ شیخین (بخاری و مسلم) نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا نہیں ہوگا کہ کسی مسلمان کے تین بچے مر جائیں اور وہ آگ میں داخل ہو ہاں صرف قسم پوری کرنے کے لئے (ضرور داخل ہوگا) اس کے بعد سفیان (راوی) نے آیت وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا پڑھی، طبرانی نے حضرت عبد بن بشیر انصاری کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے تین نابالغ بچے مر جائیں گے وہ (دوزخ میں) نہیں اترے گا۔ مگر رہ گزر کی طرح۔ یعنی وہ پل صراط سے گزر جائے گا (بغیر ٹھہرنے کے)

ابن جریر نے غنیم بن قیس کا بیان نقل کیا کہ لوگوں نے آگ میں وارد ہونے کے سلسلہ میں کچھ تذکرہ کیا۔ حضرت کعب نے فرمایا۔ آگ (سب) لوگوں کو روک لے گی یہاں تک کہ سب لوگوں کے قدم اس پر ٹھیک طرح سے ٹھہر جائیں گے نیکوں کے بھی اور بدوں کے بھی پھر (اللہ کی طرف سے) ایک پکارنے والا پکارے گا اپنے ساتھیوں کو روکے رکھ اور میرے رفقاء کو چھوڑ دے یہ ندا ہوتے ہی جو دوزخ کا ساتھی ہوگا وہ دوزخ میں دھنس جائے گا جس طرح آدمی اپنے بچے کو پہچانتا ہے اس سے زیادہ دوزخ اپنے دوست کو پہچانتی ہوگی اور مومن اس طرح نکل جائیں گے کہ ان کے کپڑے بھی (خشک نہ ہوئے ہوں گے بلکہ) تر ہوں گے۔

سیوطی نے لکھا ہے بعض علماء اہل سنت کے نزدیک ورود سے مراد ہے داخل ہونا قرطبی نے اس معنی کو ترجیح دی ہے اور حضرت جابر وغیرہ کی احادیث سے استشہاد کیا ہے۔ بعض اہل سنت کے نزدیک ورود سے مراد ہے گزر جانا، نووی نے اس معنی کو پسند کیا ہے اور حضرت ابن مسعود کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں صراط سے گزرنے کا ذکر کیا گیا ہے، حضرت ابوہریرہ کی حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔ (حضرت مفسر نے فرمایا) میں کہتا ہوں صراط سے گزرنا ہی موجب دخول ہے۔

دخول سے مراد یہ نہیں ہے کہ آگ کے اندر گھس جائے، جہنم کے اوپر سے مرور بھی دخول ہی ہے لامحالہ ورود سے مراد دخول ہی ہے خواہ بطریق مرور ہی ہو۔ مختلف احادیث میں تطبیق دینے کی یہی صورت ہے۔

اگر شبہ کیا جائے کہ بیہقی نے حسن بصری کا قول نقل کیا ہے کہ ورود سے مراد ہے دوزخ پر سے گزر جانا بغیر داخل ہونے کے اور مرور دخول سے الگ مفہوم رکھتا ہے تو میں کہوں گا کہ حضرت حسن کے قول میں داخل ہونے سے مراد ہے اندر گھس جانا اور آگ کے اندر پہنچ جانا (اور یقیناً گزر جانے کا مفہوم اندر گھس جانے کے مفہوم سے جدا ہے) مطلق دخول مراد نہیں ہے (مطلق دخول تو مرور کو بھی شامل ہے)۔

ہناد نے حضرت حفصہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں یقینی امید رکھتا ہوں کہ جو شخص بدر اور حدیبیہ میں حاضر تھا وہ دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اللہ نے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا نہیں فرمایا ہے۔ فرمایا کیا تم نے اللہ کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا۔

حضور ﷺ کا یہ آخری جواب بھی بتا رہا ہے کہ حدیث مذکور میں داخل نہ ہونے سے مراد ہے اندر نہ گھس جانا اور وہاں استقرار نہ کرنا۔

سیوطی نے لکھا بکثرت سلف صالحین دوزخ میں وارد ہونے سے ڈرتے تھے (کیونکہ دوزخ پر ورود تو یقینی ہوگا) اور نکلنے کا احتمال ہے (یہ امر یقینی نہیں کہ صراط سے گزرتے ہوئے نکل جائیں گے اس لئے ان بزرگوں کو ہر وقت خوف رہتا تھا)۔

امام احمد نے الزہد میں اور ہناد و بیہقی و سعید بن منصور و حاکم نے حضرت حازم بن ابی حازم کی روایت سے بیان کیا کہ ایک بار حضرت عبداللہ بن رواحہ رونے لگے بی بی نے پوچھا آپ کیوں رو رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا مجھے خبر دی گئی ہے کہ میں یقیناً دوزخ پر اتروں گا اور یہ نہیں بتایا گیا کہ میں یقیناً وہاں سے نکلوں گا بھی۔ ہناد اور بیہقی نے ابو اسحاق کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت ابو میسرہ عمرو بن شرحبیل اپنے بستر پر جانے کے لئے اٹھے اور فرمایا کاش میری ماں مجھے نہ جنتی، بی بی نے پوچھا کیا بات ہے، فرمایا اللہ نے یہ تو ہم کو بتا دیا کہ میں (اور تم) ضرور دوزخ پر داخل ہوں گے اور یہ نہیں فرمایا کہ میں (اور تم) وہاں سے نکلیں گے۔

امام احمد نے الزہد میں بیان کیا کہ حسن بصری نے فرمایا کہ ایک شخص نے اپنے بھائی سے کہا کیا تجھے معلوم ہے کہ تو ضرور دوزخ پر اترے گا۔ بھائی نے کہا جی ہاں اس شخص نے کہا کیا یہ بھی تجھے معلوم ہے کہ تو وہاں سے نکل بھی آئے گا بھائی نے کہا نہیں۔ اس شخص نے کہا پھر ہنسی کیسی (روتے رہنے کا مقام ہے چنانچہ مرتے دم تک پھر اس کو ہنستے نہیں دیکھا گیا)۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ اور جب ان کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں جو کھلی ہوئی ہیں۔ یعنی جن کا مطلب واضح ہے خواہ خود ہی ان کا مطلب کھلا ہوا سمجھ میں آجاتا ہے یا رسول اللہ ﷺ کے بیان سے ان کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ یا بَيِّنٰتٍ کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ آیات معجزہ ہیں اس لئے رسول اللہ کی صداقت پر واضح طور پر دلالت کر رہی ہیں اور آپ کی نبوت کو ثابت کر رہی ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا تو کافر اہل ایمان سے کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھی غریب تھے پراگندہ، خشک بال، زندگی بدحال، فرسودہ لباس اور مشرک مالدار تھے بالوں میں تیل ڈالتے کنگھا کرتے اور اعلیٰ و عمدہ لباس پہنتے تھے پس ان خوش حال چکنے بال والے کافروں نے بدحال بوسیدہ لباس والے صحابہ سے کہا۔

اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا (دیکھو ہم) دونوں گروہوں میں کس کا مقام اچھا ہے اور کس کی مجلس اعلیٰ ہے۔ مَقَامًا مصدر بھی ہے بمعنی قیام اور اسم ظرف بھی ہے یعنی قیام کی جگہ۔ نَدِيًّا مجلس، لوگوں کے جمع ہونے کا مقام، مطلب یہ ہے کہ کفار جب آیات واضحات کے مقابلہ سے عاجز ہو گئے اور کوئی جواب ان کو بن نہ پڑا تو بطور تفاخر

غرور کہنے لگے دیکھو ہمارا حال کیسا ہے اور تم کس حالت میں ہو ہم دنیا میں مرفہ الحال ہیں اور تم بدحال پس اللہ کے نزدیک بھی ہمارا درجہ تمہارے درجہ سے اعلیٰ ہے۔ اللہ نے اگلی آیت میں ان کے اس قول کی تہدید آمیز تردید فرمائی اور ان کی دلیل کو توڑتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا ۝ اور ہم نے ان سے پہلے بہت سے قرن والوں کو تباہ کر دیا جو دنیوی سامان اور ظاہری دکھاوٹ میں ان سے اعلیٰ تھے۔

ہر زمانہ والوں کو قرن اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سب زمانہ میں باہم مقارن ہوتے ہیں۔ بغوی نے اَثَاثًا کا ترجمہ کیا ہے سروسامان اور مال۔ مقاتل نے کہا کپڑے اور لباس۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے اَثَاثٌ گھر کا سامان (اس وقت یہ لفظ اسم جنس ہوگا) اس کا واحد نہیں آتا اور اَثَاثٌ کا معنی مال بھی ہے اس وقت اس کا واحد اَثَاثَۃٌ آتا ہے۔

رِئْيًا رُؤْيَتٌ سے ماخوذ ہے۔ منظر، دکھاوٹ، بعض قراء توں میں رِيًّا (سیرابی) آیا ہے یعنی نعمتوں سے سیری۔

قُلْ مَن كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَٰنُ مَدًّا ۚ (اے محمد) آپ کہہ دیجئے کہ جو لوگ گمراہی میں ہیں (یعنی تم) تو رحمن ان کو ڈھیل دیتا چلا جا رہا ہے۔

فَلْيَمْدُدْ اگرچہ امر کا صیغہ ہے لیکن خبر کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ جو شخص گمراہی میں اندھا ہوا ہوتا ہے اللہ اس کو اور ڈھیل دیتا ہے اور گمراہی کے اندر اس کو بڑھاتا اور مہلت دیتا رہتا ہے۔ بجائے خبر کے لفظ امر ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے لئے مناسب بھی یہی ہے کہ اس کو ڈھیل دیتا رہے تاکہ کسی طور پر اس کو معذرت پیش کرنے کا موقع نہ رہے۔ (اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اللہ نے فرمایا ہے أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ

حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضْعَفُ جُندًا ۝ یہاں تک کہ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے خواہ عذاب کو (دنیا میں) یا عذاب قیامت کو (مرنے کے بعد) جب وہ دیکھ لیں گے سو اس وقت جانیں گے کہ برا مقام اور کمزور مددگار کس کے ہیں۔

إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ، مَا يُوعَدُونَ کی تفصیل ہے۔ عذاب سے مراد ہے دنیا میں قتل یا قید ہونا۔ اَلسَّاعَةُ سے مراد آخرت کی رسوائی اور عذاب حتی کے بعد والا کلام ڈھیل دینے کی غایت ہے یعنی اللہ ڈھیل اس وقت تک دیتا ہے کہ عذاب دنیا یا عذاب آخرت (جو مرنے کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ مترجم) سامنے آجاتا ہے جب عذاب کا وقت آجاتا ہے تو ڈھیل ختم ہو جاتی ہے۔

جُندٌ (فوج) یعنی مددگار کافروں کے مددگار شیاطین ہوتے ہیں اور اہل ایمان کے مددگار ملائکہ، یہ کلام کافروں کے کلام کا رد ہے۔ شَرٌّ مَّكَانًا کہہ کر خَيْرٌ مَّقَامًا کی تردید کر دی اور اَضْعَفُ جُندًا کہہ کر اَحْسَنُ نَدِيًّا کی۔ کیونکہ مجلس کی رونق سرداران قوم کے اجتماع سے ہوتی ہے اور مددگار نہ ہوں تو مجلس کا کمزور ہونا یقینی ہوتا ہے۔

وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہو جاتے ہیں اللہ ان کے ایمان میں مزید ترقی دیتا ہے۔ ان کے مراتب قرب میں اضافہ کرتا ہے۔ آیات مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کافروں کی دنیا میں مالداری اور راحت اندوزی اور مومنوں کی ناداری و بدحالی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ کافر اللہ کے محبوب ہیں اور مومن مردود بلکہ مومنوں کے لئے دنیوی عیش و دولت کی کمی کو اللہ ان کی ہدایت و مراتب قرب کی ترقی کا ذریعہ بنا دیتا ہے اور کافروں کی گمراہی کے باوجود خوش حالی اللہ کی طرف سے ایک ڈھیل ہوتی ہے تاکہ ان کی گمراہی میں مزید اضافہ ہو۔

وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَّرَدًّا ۝ اور جو نیک کام ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک ثواب میں بھی بہتر ہیں اور انجام میں بھی۔ اَلْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ سے مراد ہیں وہ نیک اعمال جن کا فائدہ کرنے والوں کو ہمیشہ ہمیشہ پہنچتا رہے گا۔ یعنی کافروں کو جو نعمتیں اللہ نے عطا فرمائی ہیں وہ (ناقص ہونے کے

علاوہ) فانی بھی ہیں جن نعمتوں پر وہ پھولے ہوئے ہیں ان سے اہل ایمان کو نیک اعمال کا ملنے والا ثواب مآل اور انجام میں بہت بہتر ہے۔

خَیْرٌ اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید کافروں کا انجام بھی اللہ کے نزدیک کچھ اچھا ہوگا، مومنوں کے انجام کے برابر نہ سہی ان سے کم ہی سہی بہرحال کچھ تو اچھا ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تفضیل سے تفضیل اضافی مراد نہیں ہے بلکہ فی نفسہ بہتری کی فراوانی مراد ہے جیسے بولتے ہیں، موسم گرما موسم سرما سے زیادہ گرم ہوتا ہے یعنی موسم سرما سردی میں جس طرح زیادہ ہوتا ہے اسی طرح گرمی کا موسم گرمی میں موسم سرما سے زیادہ ہوتا ہے۔

شیخین نے حضرت خباب بن الارت کا بیان نقل کیا ہے حضرت خباب نے بیان کیا میں لوہاری کا کام کرتا تھا میں نے عاص بن وائل کا کچھ کام بنایا اور میری مزدوری اس کے پاس جمع ہوگئی ایک روز مزدوری مانگنے میں اس کے پاس گیا، عاص نے جواب دیا خدا کی قسم جب تک تو محمد کا انکار نہیں کرے گا۔ میں (تیرا قرض) ادا نہیں کروں گا۔ میں نے کہا خوب سن لے خدا کی قسم جب تو مر کر دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے گا اس وقت تک بھی میں کفر نہیں کروں گا، عاص بولا کیا میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا، میں نے کہا ہاں، عاص نے کہا تو پھر میرے پاس وہاں مال بھی ہوگا اور اولاد بھی، میں وہیں تیرا قرض چکا دوں گا اسی پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ كَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَیَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۷۷﴾

کیا آپ نے اس شخص کو (یعنی عاص بن وائل کو) دیکھا جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا مجھے ضرور مال اور اولاد (دوبارہ زندگی میں) دیا جائے گا۔

بغوی نے لکھا ہے وُلْد۔ اور وَلَد دونوں ہم معنی ہیں جیسے عُرْب اور عَرَب اور عُجْم اور عَجَم بعض نے کہا وُلْد جمع ہے اور وَلَد مفرد جیسے اُسْد (جمع ہے) اور اَسَد (مفرد ہے)

اَطَّلَعَ الْغَیْبَ کیا اس کو غیب کا علم ہو گیا ہے۔

یہاں اِلٰی محذوف ہے جیسے اِطَّلَعَ الْجَبَلَ وہ پہاڑ کی چوٹی کی طرف چڑھا۔ اس صورت میں آیت کا ترجمہ اس طرح ہوگا کیا وہ غیب کی طرف چڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے ترجمہ کیا کیا اس نے لوح محفوظ میں دیکھ لیا ہے۔ مجاہد نے کہا کیا اس کو علم غیب حاصل ہو گیا ہے کہ وہ آخرت میں مال و اولاد حاصل ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔

اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ یا اس نے اللہ سے کوئی عہد (اس بات کا) لے لیا ہے یعنی کیا وہ لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو گیا ہے۔ قتادہ نے کہا یعنی کیا اس نے نیک کام کر چھوڑے ہیں۔ کلبی نے کہا کیا اللہ نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کو جنت میں ضرور داخل کرے گا۔

كَلَّا ہرگز نہیں: ایسا ہرگز نہیں ہے۔

سَنَكْتُبُ مَا یَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ ہم اس کا کہا ہوا لکھ لیتے ہیں اور اس کے لئے عذاب بڑھاتے چلے جائیں گے۔

ایک شبہ

ہر بات جو منہ سے نکلتی ہے فوراً لکھ لی جاتی ہے، اللہ نے فرمایا ہے مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ۔ لیکن اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عاص بن وائل نے جو بات حضرت خباب سے کہی تھی اللہ اس کو آئندہ لکھے گا۔

ازالہ

لکھنے سے مراد ہے محفوظ رکھنا، نظر انداز نہ کر دینا یا اس امر کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہم نے اس کا قول لکھ لیا ہے یا اس کی بات کا انتقام لینا مقصود ہے۔ بہرحال محفوظ رکھیں گے یا اس بات کو ظاہر کریں گے کہ ہم نے تیری کہی ہوئی بات لکھ لی تھی یا

انتقام لیں گے یہ تمام امور آئندہ ہوں گے۔

اللہ کے فرشتے اعمال لکھتے ہیں اور اللہ کے حکم سے لکھتے ہیں اس لئے فرشتوں کا لکھنا اللہ کا لکھنا ہوا، یہی وجہ ہے کہ آیت میں لکھنے کی نسبت اپنی طرف کی۔

عذاب میں اضافہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ کفر کا عذاب تو اس کے لئے پہلے ہی سے مقرر ہے۔ اب استہزاء کا عذاب مزید اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔

وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ اور اس کی کہی ہوئی چیزوں کے ہم مالک رہ جائیں گے۔ یعنی جس مال و اولاد کی ملکیت کا یہ مدعی ہے اس کو ہلاک کر کے وہ مال و اولاد ہم اپنے قبضہ میں لے لیں گے۔

وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ۝۸۰ اور (قیامت کے دن) یہ ہمارے پاس تنہا آئے گا جو مال و اولاد دنیا میں اس کے پاس تھا وہ بھی قیامت کے دن اس کے ساتھ نہ ہوگا۔ آخرت میں جدید مال و اولاد ملنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝۸۱ اور ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور معبود تجویز کر رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے (عند اللہ) باعث عزت ہوں۔

اِتَّخَذُوْا کی ضمیر کفار قریش کی طرف راجع ہے۔ اٰلِهَةً سے بت مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ کفار قریش بتوں کی پوجا اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ کی بارگاہ میں ان بتوں کی سفارش یا وسیلہ سے ان کو عزت حاصل ہو جائے اور بت ان کی مدد کریں۔

كَلَّا ایسا ہر گز نہ ہوگا بتوں کے وسیلہ سے ان کو عزت حاصل نہ ہوگی۔

سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وہ ان کی عبادت ہی کا انکار کریں گے یعنی وہ آلہہ اور معبودان کی عبادت کا قیامت کے دن انکار کریں گے اور کہیں گے یہ ہماری پوجا نہیں کرتے تھے (شیطانوں اور اپنے ہوا و ہوس کی پوجا کرتے تھے) ہم ان کے اس فعل سے بری ہیں یا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن کافر غیر اللہ کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور کہیں گے خدا کی قسم ہم مشرک نہیں تھے۔

وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝۸۲ اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔

ضد سے مراد ہے ذلت و حقارت۔ اول فقرہ میں بتوں کا باعث عزت ہونا مذکور ہے۔ جس کی امید کافروں کو تھی اور عزت کی ضد ذلت ہوتی ہے یا ضد سے مراد ہے مخالف ہونا، دشمن ہونا یعنی کافروں کے باطل معبود قیامت کے دن ان کے دشمن اور مخالف ہو جائیں گے، ان کی تکذیب اور ان پر لعنت کریں گے یا یہ مطلب ہے کہ کافروں کو عذاب دینے میں مددگار بن جائیں گے پتھروں کو آگ میں ڈالا جائے گا تو آگ کی تیزی بڑھ جائے گی پتھر ایندھن بن جائیں گے جن کی وجہ سے کافروں کی سوختگی میں اضافہ ہوگا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ قیامت کے دن یہ کافر اپنے آلہہ کے مخالف ہو جائیں گے دنیا میں تو ان کی پوجا کرتے ہیں لیکن آخرت میں منکر ہو جائیں گے۔

لفظ ضِدًّا کی وحدت معنی کی وحدت کی طرف اشارہ کر رہی ہے یعنی سب کافر آلہہ کی ضد ہونے میں ایک شخص کی طرح ہوں گے، سب ضدیت میں متفق ہوں گے۔ ابوداؤد و نسائی نے حضرت علیؓ کی روایت سے اور ابن حبان نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ سب دوسروں کے خلاف ایک ہاتھ ہیں یعنی سب متفق الرائے اور متحد القوت ہوں گے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ لفظ ضد کا اطلاق جمع پر بھی ہوتا ہے اللہ نے فرمایا ہے وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ۝۸۳

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم نے شیطانوں کو کفار پر (ابتلاء) چھوڑ رکھا ہے کہ وہ ان کو خوب ابھارتے ہیں۔ سوال انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے۔ یعنی شیطانوں کو ہم نے کافروں پر مسلط کر رکھا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے اس سے اشارہ اس قول کی طرف ہے جس میں اللہ نے ابلیس سے فرمایا تھا۔ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ یا اَرْسَلْنَا سے مراد ہے آزاد

رکوع ۵

چھوڑ دیا یعنی ہم نے شیطانوں کو اور ان کافروں کو باہم تعلق قائم کرنے میں آزاد چھوڑ دیا ہے اَرْسَلْتُ الْبَعِيرَ میں نے اونٹ کو کھول دیا، آزاد چھوڑ دیا۔

اَزٌّ ابھارنا، برانگیختہ کرنا، جھوٹے فریب دے کر گناہوں پر آمادہ کرنا اور بہکا کر خواہشات کے پیچھے لگا دینا۔

سوال انکاری کے ساتھ جملہ کو شروع کرنے سے مقصود ہے رسول اللہ ﷺ کو تعجب دلانا کافروں کے اقوال پر اور باوجود ظہور حق کے کفر و گمراہی میں اندھے رہنے پر۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾ پس آپ (نزول عذاب میں) ان کے لئے جلدی نہ کریں (یعنی جلد عذاب نازل ہونے کی دعا نہ کریں) ہم ان (کی زندگی کے ایام مقررہ) کی کامل طور پر یقیناً گنتی رکھتے ہیں یعنی ہم نے ان کی عمریں مقرر کر دی ہیں ان کے ایام زندگی اور ساعات حیات محدود اور معدود ہیں (مدت زندگی پوری ہونے سے پہلے ان کو ہلاک نہیں کیا جاسکتا)

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ اور جس روز ہم تقویٰ والوں کو رحمٰن (کے دارالنعیم) کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے۔

إِلَى الرَّحْمَٰنِ (میں رحمٰن کی ذات مراد نہیں بلکہ اس) سے مراد ہے وہ مقام عزت جہاں تجلیات الٰہیہ پر تو انداز ہوں گی۔ وَفْدًا وافد کی جمع ہے بادشاہوں کی طرف وفد جاتے ہیں۔ عزت یابی کی امید اور انعام کی تمنا لئے ہوئے پس بارگاہ الٰہی کی طرف بھی اہل تقویٰ اسی طرح قبروں سے اٹھ کر جائیں گے۔

عبداللہ بن احمد نے زوائد المسند میں اور حاکم و بیہقی و ابن جریر و ابن ابی حاتم نے بیان کیا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا سنو اللہ متقیوں کے وفد کو نہ پیدل اٹھائے گا، نہ ہنکا کر لے جائے گا بلکہ جنت کی ان اونٹنیوں پر سوار کرا کے بلوائے گا جن کی نظیر کسی مخلوق نے نہیں دیکھی اونٹنیوں پر سونے کے کجاوے اور زبرجد کی مہاریں ہوں گی۔ متقی ان پر سوار ہو کر جائیں گے اور جا کر جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا، خدا کی قسم ان کو پیدل نہیں لے جایا جائے گا بلکہ ایسی اونٹنیوں پر جن کے کجاوے سونے کے ہوں گے سوار کیا جائے گا اور ان اصیل گھوڑوں پر سوار کر کے لے جایا جائے گا جن کی زینیں یاقوت کی ہوں گی اگر اہل جنت چاہیں گے تو سواریاں اڑنے لگیں گی۔

بیہقی نے طلحہ بن ابی طلحہ کے طریق سے حضرت ابن عباسؓ کا قول يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا کی تشریح میں بیان کیا آپ نے فرمایا۔ سوار کر کے (لے جایا جائے گا) اور آیت نَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا کی تشریح میں فرمایا پیاسے (یعنی مجرموں کو پیاس کی حالت میں جہنم کی طرف ہنکایا جائے گا) ابن جریر نے ابوطلحہ کی روایت سے حضرت ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا وفدا یعنی اونٹوں پر (سوار)

ابن ابی حاتم نے عمر بن قیس ملائی کا بیان نقل کیا ہے کہ مومن جونہی قبر سے برآمد ہوگا اس کا عمل حسین ترین شکل اور پاکیزہ ترین خوشبو کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا اور کہے گا کیا تو مجھے پہچانتا ہے، مومن جواب دے گا۔ نہیں مگر (اتنا جانتا ہوں کہ) اللہ نے تیری خوشبو کو پاکیزہ اور صورت کو حسین بنایا ہے، عمل کہے گا میں دنیا میں بھی ایسا ہی تھا۔ میں تیرا نیک عمل ہوں دنیا میں مدت دراز تک میں تجھ پر سوار رہا آج تو مجھ پر سوار ہو جا۔ اتنا بیان کرنے کے بعد راوی نے پڑھا يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا۔ پھر کہا کافر کا عمل نہایت بدشکل اور انتہائی گندی بدبو کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا اور پوچھے گا کیا تو نے مجھے پہچانا، کافر جواب دے گا نہیں مگر (اتنا جانتا ہوں کہ) اللہ نے تیری شکل بہت بری اور بو نہایت گندی بنائی ہے، عمل کہے گا میں دنیا میں بھی ایسا ہی تھا میں تیرا برا عمل ہوں دنیا میں مدت دراز تک تو مجھ پر سوار رہا، آج میں تجھ پر سوار ہوں گا۔ اتنا بیان کرنے کے بعد راوی نے پڑھا وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ وہ اپنے بار اپنی پشت پر اٹھائیں گے۔

وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۝ اور مجرموں کو دوزخ کی طرف پیاسا ہانکیں گے۔

مجرمین سے مراد ہیں کافر۔ وردا کا ترجمہ بغوی نے کیا پیدل، بعض نے کہا پیاسے کی شدت پیاس سے گردنیں ٹوٹ رہی ہوں گی۔ ورد کہتے ہیں پانی پر اترنے والی جماعت کو، حضرت ابن عباس نے بھی اس کی تشریح میں پیاسے ہی فرمایا۔

میں کہتا ہوں اللہ نے اس جگہ دوگروہوں کے حشر کا تذکرہ فرمایا (۱) کامل تقویٰ والے انبیاء، عرفاء وغیرہم (۲) مجرمین یعنی کفار عام مسلمانوں کا ذکر نہیں کیا نہ صالحین کا، نہ گناہ گاروں کا۔ حدیث میں آیا ہے، کچھ لوگ پیادہ پا اٹھائے جائیں گے۔ یہ عام مومن ہوں گے (صالحین بھی اور گناہ گار بھی)

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت یُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ کی اور حضرت معاویہ بن حیدہ کی روایت کردہ احادیث ہم نے نقل کر دی ہیں۔ حضرت ابوذرؓ کی حدیث ہے کہ لوگوں کا حشر تین طرح سے ہوگا (یعنی تین فریق ہوں گے) سوار، پیدل اور منہ کے بل، شیخین نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا لوگوں کا حشر تین طریقوں پر ہوگا (کچھ لوگ) راغب ہوں گے (کچھ) خوف زدہ ہوں گے اور ایک ایک اونٹ پر دو دو یا تین تین یا دس دس سوار ہوں گے، آگ بھی ان کے ساتھ ہوگی جہاں وہ دوپہر کو ٹھہریں گے آگ بھی ان کے ساتھ ٹھہرے گی جہاں وہ رات کو رہیں گے آگ بھی ان کے ساتھ رات کو رہے گی۔ شیخ ابن حجر نے کہا رَاغِبِيْنَ رَاهِبِيْنَ وہ لوگ ہوں گے جو پہلے طریقہ پر ہوں گے یعنی عام مومن پھر اس حدیث میں ایک ایک اونٹ پر دو دو اور تین تین اور دس دس کے سوار ہونے کا تو ذکر ہے ایک اونٹ پر ایک کے سوار ہونے کا ذکر نہیں کیا اس سے اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو ان سب سے اونچے درجہ والے ہوں گے یعنی اَبْرَار (اَبْرَار میں سے ہر شخص مستقل طور پر الگ اونٹ پر سوار ہوگا)

بیہقی نے کہا رَاغِبِيْنَ سے اشارہ اَبْرَار کی طرف ہے اور رَاهِبِيْنَ سے ان مخلوط الحال لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو امید وبیم کی درمیانی حالت میں ہیں اور جن کو آگ کھدیڑ کر لے جائے گی وہ کافروں کا گروہ ہوگا۔ حلیمی نے بھی حدیث کی یہی تشریح کی ہے اتنی بات زائد بیان کی ہے کہ اَبْرَار وہی مستحق ہوں گے، جنت سے ان ہی (کی سواری) کے لئے اونٹنیاں لائی جائیں گی باقی وہ اونٹ جن پر مخلوط الحال لوگوں کو سوار کیا جائے گا تو ممکن ہے کہ قیامت کے دن وہ اونٹ پیدا کر دیئے جائیں اور مخلوط الحال لوگوں کو ان پر سوار کیا جائے۔ سیوطی نے کہا یہی قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ مخلوط الحال لوگوں کا جنت سے لائے ہوئے اونٹوں پر سوار کیا جانا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ پھر اونٹوں پر سوار بھی ان مخلوط الحال گناہ گاروں کو کرایا جائے گا جن کے گناہ حساب کے وقت معاف کر دیئے گئے ہوں گے اور ان کو عذاب نہیں ہوگا، رہے عذاب پانے والے لوگ تو ان کو پیدل چلایا جائے گا یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لوگ شروع سے ہی پیدل چلائے جائیں ان کو سوار ہی نہ کیا جائے یا حشر سوار ہونے کی حالت میں ہو اور جب میدان حشر کے قریب پہنچیں تو پیدل ہو جائیں باقی کافروں کا حشر تو منہ کے بل ہوگا ہی۔ (ان کے سوار ہونے کا تو کوئی معنی ہی نہیں)۔

طبرانی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن انبیاء کو سواریوں پر لے جایا جائے گا یہاں تک کہ (اسی حالت میں) وہ میدان حشر تک پہنچ جائیں گے۔ صالح کو ان کی اونٹنی پر سوار (ہونے کی حالت میں قبر سے) اٹھایا جائے گا اور مجھے براق پر (سوار) اٹھایا جائے گا اور میرے دونوں بیٹوں حسن اور حسین کو جنت کے اوپر سے (آئی ہوئی) دو اونٹنیوں پر اٹھایا جائے گا اور بلالؓ کو جنت کے اوپر سے (آئی ہوئی) اونٹنی پر اٹھایا جائے گا وہ اذان دیں گے۔ خالص شہادت توحید کی اور جب اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ کہیں گے تو اگلے پچھلے تمام مومن اس کی شہادت دیں گے پس جس کی شہادت قبول ہوئی ہوگی قبول ہو جائے گی اور جس کی شہادت رد ہوئی ہوگی رد ہو جائے گی۔

حلیمی اور غزالی نے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ جو لوگ سوار کر کے لے جائے جائیں گے وہ قبروں سے سوار ہونے کی حالت میں اٹھائے جائیں گے لیکن اسماعیلی کا قول ہے کہ موقف تک تو پیدل جائیں گے پھر وہاں سے سوار ہو جائیں گے۔

اسماعیلی نے یہ تفریق مختلف احادیث میں توفیق پیدا کرنے کے لئے کی۔ صحیحین اور ترمذی کی حدیث حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے مذکور ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ (خطبہ دینے) کھڑے ہوئے اور فرمایا لوگو! تم کو اللہ کی طرف اس حالت میں لے جایا جائے گا کہ تم ننگے پاؤں، برہنہ بدن، غیر مختون اور پیادہ پا ہو گے۔ پھر حضور ﷺ نے آیت کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ پڑھی اور سب لوگوں سے پہلے حضرت ابراہیم کو لباس پہنایا جائے گا۔

اسی طرح شیخین نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت سودہؓ اور حضرت ام سلمہؓ اور حضرت سہلؓ بن سعد اور حضرت حسنؓ بن علیؓ کی روایت سے اور بزار نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے لیکن ان احادیث میں تلاوت آیت اور حضرت ابراہیم کو سب سے پہلے لباس پہنائے جانے کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اتنا مزید مذکور ہے کہ ام المومنین میں سے حضور ﷺ کی کسی بی بی نے کہا ہائے کیسی بری بات ہو گی کہ ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو دیکھے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا لوگوں کو اس کی طرف توجہ ہی نہیں ہو گی، ہر شخص کو اس روز اپنی پڑی ہو گی۔

لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ وہاں کوئی سفارش کا اختیار نہیں رکھے گا مگر جس نے رحمن کے پاس (سے) اجازت لے لی ہے۔ یعنی جن کے اندر ایسے اوصاف ہوں گے جو شفاعت کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ وہ شفاعت کر سکیں گے مراد یہ ہے کہ ایماندار نیکوکار ہوں تو اہل شفاعت ہوں گے۔ اللہ نے فرمایا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ دوسری جگہ فرمایا ہے یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَیَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ بقول ابن صالح حضرت ابن عباسؓ نے موخر الذکر آیت کی تفسیر میں فرمایا یَسْتَجِیْبُ یعنی ان کے بھائیوں کے لئے ان کی شفاعت قبول فرمائے گا۔ وَیَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ یعنی اپنی مہربانی سے بھائیوں کی بھائیوں کے حق میں شفاعت منظور فرمائے گا۔

یا عَهْدًا سے مراد ہے اجازت اذن یعنی سوائے اس کے جس کو شفاعت کی اجازت مل جائے اور کوئی شفاعت نہیں کر سکتا۔ اسی مضمون کی دوسری آیت ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ عربی محاورے میں بولا جاتا ہے عَهِدَ الْاَمِیْرُ اِلٰی فُلَانٍ بِکَذَا۔ حاکم نے فلاں شخص کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا سے ہر وہ شخص مراد ہے جو لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو اور مَنْ سے پہلے شَفَاعَةً محذوف ہے یعنی اِلَّا شَفَاعَةَ مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا اور چونکہ لا الٰہ الا اللہ کا ہر قائل شفاعت کئے جانے کے قابل ہے۔ اس لئے آیت میں لا الٰہ الا اللہ کا ہر قائل مراد لینا صحیح ہے۔ اللہ نے تمام مومنوں سے مغفرت کا وعدہ کیا ہے، فرمایا ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ۔ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ پر بندوں کا حق ہے کہ وہ غیر مشرک کو عذاب نہ دے (متفق علیہ من حدیث معاذ) اسی طرح کی ایک اور آیت آئی ہے فرمایا ہے لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ لَا یَمْلِکُوْنَ کی ضمیر اَلْمُجْرِمِیْنَ کی طرف لوٹ رہی ہے اور شَفَاعَةً سے مراد ہے سفارش یاب ہونا (مصدر مجہول) یعنی مجرم شفاعت یاب نہیں ہوں گے ہاں مومن شفاعت یاب ہوں گے جن کو اللہ نے وعدہ دے رکھا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمن نے (اپنے لئے) اولاد اختیار کر لی ہے۔
قالوا کا فاعل یہودی، عیسائی اور بعض وہ مشرک ہیں جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے تھے۔ چونکہ یہ قول مشہور تھا اور اس کے قائل بھی نامعلوم مجہول نہیں تھے اس لئے ضمیر جس فاعل کی طرف لوٹ رہی ہے اس کا پہلے مذکور ہونا ضروری نہیں۔ (فاعل متکلم اور مخاطب کو معلوم ہو اور مرجع ضمیر متعین ہو تو بغیر ذکر مرجع کے ضمیر غائب ذکر کی جا سکتی ہے۔)

لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تم نے نہایت سخت حرکت کی ہے حضرت ابن عباسؓ نے اِدًّا کا ترجمہ کیا

منکر یعنی بری۔ مجاہد اور قتادہ نے سخت بری۔ اَدَنِی اَمْر فلاں بات یا واقعہ کا مجھ پر سخت بوجھ پڑا یہ عربی محاورہ ہے۔ بغوی نے لکھا ہے عربی زبان میں اد کا معنی ہے بہت ہی بڑا حادثہ۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝

اس کے سبب کچھ بعید نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین کے ٹکڑے اڑ جائیں اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں اس بات سے کہ یہ لوگ خدا کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں۔ قاموس میں ہے حد توڑنا بالکل ڈھا دینا۔ بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے قریب ہے کہ آسمان ان پر ٹوٹ پڑیں اور زمین پھٹ کر ان کو اپنے اندر دھنسا لے اور پہاڑ ان پر ڈھ پڑیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور کعبؓ نے فرمایا سوائے جن وانس کے آسمان، زمین، پہاڑ اور ساری مخلوق اس قول سے خوف زدہ ہو گئی قریب تھا کہ سب اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔ فرشتے بھی غضب ناک ہو گئے اور جہنم بھی بھڑک اٹھی۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا کہ اتنی پر ہیبت اور ہولناک بات ہے کہ اگر اللہ کا بے پایاں حلم نہ ہوتا تو سارا عالم تباہ ہو جاتا اور اس بات کو منہ سے نکالنے والے پر الٹ جاتا۔

وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۝ حالانکہ خدا تعالیٰ کی شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے۔

یَنْبَغِیْ کا ترجمہ دو طرح سے ہو سکتا ہے (۱) جائز نہیں ہو نہیں سکتا (۲) مناسب اور زیبا نہیں۔ اول صورت میں اِنْبَغٰی یَنْبَغِیْ باب انفعال سے ہو گا جو بَغٰی کا مطاوع۔ بَغٰی کا معنی ہے طلب کرنا۔ طلب شئی کے بعد اس شئی کے ہو جانے کا نمبر آتا ہے۔ حاصل ترجمہ یہ ہو گا کہ بالفرض اگر اللہ اپنے لئے اولاد کا طالب بھی ہو تب بھی اس کے لئے اولاد کا ہونا ممکن نہیں اس کی اولاد ہو ہی نہیں سکتی، دوسری صورت ظاہر ہے اللہ کی اولاد ہونا، اس کی شان کے خلاف ہے، نقص ہے، عیب ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے (بجائے اللہ کے) آیت میں صفت رحمانیت پر حکم کو مرتب کرنے سے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ منعم ہے تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہے اس کے سوا باقی مخلوق میں یا اللہ کی نعمتیں ہیں یا نعمت پانے والے ہیں اور ظاہر ہے کہ نعمتیں ہوں (جو خدا نے پیدا کی اور دی ہیں) یا نعمت پانے والے ہوں (جن کو اللہ نے نعمتیں عطا فرمائی ہیں) منعم کے ہم جنس کیسے ہو سکتے ہیں اور بیٹے کے لئے ضروری ہے کہ وہ باپ کا ہم جنس ہو اس لئے اللہ کی اولاد ہونا ممکن نہیں ہے۔

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝

کیونکہ جتنے بھی کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے روبرو غلام ہو کر حاضر ہونے والے ہیں۔

یعنی آسمان و زمین میں جو کوئی ہے وہ اللہ کی ملک ہے اس کی مخلوق ہے بندگی اور اطاعت و انقیاد کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرنے والا ہے اور قیامت کے دن اس کے سامنے ذلت عبدیت کے ساتھ آئے گا، مجازی غلام ہونا بھی اولاد ہونے کے منافی ہے اسی لئے اگر کوئی کسی سبب سے اپنے بیٹے کا مالک ہو جائے بطور میراث یا خریدنے کے ذریعہ یا کسی کے ہبہ کرنے سے کسی کا بیٹا اس کی ملک میں داخل ہو جائے تو ملک میں آتے ہی آزاد ہو جائے گا۔ پس حقیقی مملوک ہونے کا کیا ٹھکانہ ہے، حقیقی مملوک تو مالک کی مخلوق ہے۔

لَقَدْ أَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ اللہ نے بلاشبہ سب کا احاطہ کر لیا ہے (اس کے دائرہ علم و قدرت سے کوئی بھی خارج نہیں) اور سب کو گن رکھا ہے یعنی تمام افراد کو ان کے افعال احوال اور زندگی و رزق کو اپنے علم و قدرت کے گھیرے میں لے لیا ہے ہر چیز اس کے نزدیک اندازہ کے مطابق ہے۔

وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝ اور قیامت کے دن ہر ایک اس کے پاس تنہا آئے گا۔ یعنی کسی کا کوئی مددگار ساتھی، پیرو اور دنیا کی کوئی چیز ساتھ نہ ہو گی۔

ابن جریر نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بیان نقل کیا ہے آپ نے فرمایا کہ میں جب ہجرت کر کے مدینہ کو چلا گیا تو میرے دل میں مکہ والے دوستوں کا کچھ خیال آیا جیسے شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف (ان لوگوں کی دوستی اور محبت

یاد آتی تھی) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے یقیناً اللہ ان کے لئے (مومنوں کے دلوں میں) محبت (پیدا) کردے گا۔ یا محب (پیدا) کردے گا جو ان سے محبت کریں گے۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے وُدٌّ اور وِدَادٌ محبت اور محبت کرنے والا۔ ود کی تینوں حرکات صحیح ہیں وُدٌّ، وَدٌّ، وِدٌّ (یعنی یہ مصدر بھی ہے اور صیغہ صفت بھی) اور وَدِیْدٌ کی طرح کثیر محبت کرنے والے کو بھی وُدٌّ کہتے ہیں (یعنی صیغہ مبالغہ بھی ہے) اس آیت میں حضرت عبدالرحمٰن کے لئے پیام تسلی ہے اور اس امر کا وعدہ ہے کہ بجائے کافروں کے اللہ مومنوں کے دلوں میں محبت ڈال دے گا اور ان کو تمہارا دوست بنا دے گا۔

طبرانی نے الاوسط میں بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت علی بن ابی طالب کے حق میں ہوا اور ارشاد فرمایا کہ تمہاری محبت سوائے کافروں کے سارے مومنوں اور کل مخلوق کے دلوں میں ڈال دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کا میں مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں۔ (مولیٰ بمعنی آقا، دوست، بھائی) رواہ احمد وابن ماجہ عن البراء بن عازب واحمد عن بریدۃ والترمذی والنسائی عن زید بن ارقم۔

حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا علی کا ذکر (یا علی کی محبت) عبادت ہے، رواہ صاحب مسند الفردوس عن ام المومنین عائشہؓ حضور گرامی نے ارشاد فرمایا اللہ جب (کسی) بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبرئیلؑ سے فرماتا ہے میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ حسب الحکم جبرئیلؑ بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر آسمان کے رہنے والوں میں منادی کرتے ہیں، اللہ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر زمین پر اس شخص کو مقبولیت عطا کردی جاتی ہے (اور اہل زمین اس سے محبت کرتے ہیں) رواہ البخاری ومسلم من حدیث ابی ہریرۃؓ

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ اس حدیث کا یہ مطلب ہو کہ اللہ بندہ کو اپنی ذات گرامی سے محبت کرنے والا بنا دیتا ہے، بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے (جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) پھر اللہ بندہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے فرمایا میرا بندہ پیہم نوافل کے ذریعہ سے میرا متقرب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ سو ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں اس لئے آسان کیا ہے کہ آپ اس سے متقیوں کو خوش خبری سنائیں نیز اس سے جھگڑالو لوگوں کو خوف دلائیں۔

بِلِسَانِکَ یعنی آپ کی زبان پر اس کو آسان کردیا ہے۔ اس صورت میں ب بمعنی عَلیٰ (پر) ہوگا۔ یا آپ کی زبان (یعنی عربی) میں آسان کردیا ہے۔ یعنی سہولت آگیں کیفیت میں نازل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں بِلِسَانِکَ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی امت پر آسان کردیا ہے آپ کی زبان میں اتار کر (دوسری زبانوں میں نہیں اتارا کہ عرب کو سمجھنے میں دشواری ہوتی)

لُدٌّ (اَلَدّ کی جمع ہے) سخت جھگڑالو لوگ جو حق واضح ہونے کے بعد بھی اس کو قبول نہیں کرتے اور محض عناد قومی وذاتی اور جذبۂ خصومت کی وجہ سے دوزخ کو پسند کرتے ہیں، مجاہد نے کہا اَلَدّ اس ظالم کو کہتے ہیں جو کبھی راہ راست پر نہ آئے، ابو عبیدہ نے کہا اَلَدّ وہ شخص ہے جو باطل کا مدعی ہو اور حق کا منکر۔

آیت میں حصر اضافی ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو صرف اس لئے اتارا کہ آپ مومنوں کو اس کے ذریعہ سے بشارت دیں اور کافروں کو ڈرائیں، اسلئے نہیں اتارا کہ آپ دکھ میں پڑ جائیں اور اگر لوگ نہ مانیں تو آپ غمگین اور رنجیدہ ہوں۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُم مِّنْ أَحَدٍ اور ہم نے ان سے

پہلے بہت سے گروہوں کو (عذاب سے) ہلاک کردیا ہے سو کیا آپ ان میں سے کسی کو دیکھتے ہیں۔

اس آیت میں کافروں کو ڈرانا ہے اور رسول اللہ کو پیام رسانی پر جرأت دلانا مقصود ہے۔ ھَلْ تُحِسُّ کا یہ مطلب ہے کہ آپ اب ان میں سے کسی کو بھی محسوس کرتے ہیں یا تُحِسُّ بمعنی تریٰ کے ہے کیا آپ اب ان میں سے کسی کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ یا آپ کسی کو پاتے ہیں یا کسی کا احساس کرتے ہیں۔

اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾ یا ان کی آہٹ سنتے ہیں۔

رِكْزٌ، پست آواز، پوشیدہ آواز۔ لفظ رِكْزٌ کی ساخت پوشیدگی کا مفہوم بتاتی ہے رَكَزَ الرُّمْحَ نیزہ کی نوک زمین میں گاڑ دی (چھپادی) رِكَازٌ دفن کیا ہوا مال۔

الحمد للہ دوشنبہ کے روز بتاریخ ۵ صفر ۱۲۰۳ھ کو سورۂ مریم کی تفسیر بتوفیق الٰہی

ختم ہوئی اس کے بعد سورۂ طٰہٰ کی تفسیر آرہی ہے انشاء اللہ بعونہ تعالیٰ

تفسیر مظہری سے سورۂ مریم کی تفسیر کا ترجمہ ۳ رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ کو صبح پانچ بجے ختم ہوا۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا

سورۂ طٰہٰ

سورۂ طٰہٰ مکہ میں نازل ہوئی اس میں ۱۵۳ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

طٰہٰ دو حروف کے نام ہیں۔ اس کی بحث سورۂ بقرہ کے شروع میں مفصل گزر چکی ہے۔ بعض کے نزدیک اللہ کا نام ہے اور اس جگہ اس کا ذکر بطور قسم ہے (یعنی طٰہٰ کی قسم جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا حٰمٓ لَا یُنْصَرُوْنَ (حٰمٓ کی قسم ان کافروں کی مدد نہیں کی جائے گی، یہ فتح یاب نہیں ہوں گے) ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے حضرت براء بن عازب کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے خندق کی رات کو فرمایا حٰمٓ لَا یُنْصَرُوْنَ

مقاتل بن حبان نے کہا طٰہٰ کا معنی ہے زمین کو اپنے دونوں قدموں سے پامال کرو۔ یعنی تہجد کی نماز میں دونوں پاؤں زمین پر قائم رکھو) ابن مردویہ نے تفسیر میں اور بزار نے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا کہ جب یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نازل ہوئی تو اس کے بعد رسول اللہ ﷺ تمام رات (نماز میں) کھڑے رہنے لگے یہاں تک کہ آپ کے پاؤں سوج گئے (تکلیف کی وجہ سے) آپ ایک پاؤں ٹیکتے تھے تو دوسرا اٹھا لیتے تھے، اس پر جبرئیل اترے اور کہا طٰہٰ یعنی اے محمد اپنے دونوں قدم زمین پر رکھو۔ مجاہد، عطاء اور ضحاک نے کہا طٰہٰ کا معنی ہے اے مرد۔ قتادہ نے کہا سریانی زبان میں اس کا معنی اے مرد ہی ہے۔ کلبی نے کہا عک (قبیلہ عکل) کے محاورے میں طٰہٰ کا ترجمہ ہے اے انسان۔ موخر الذکر دونوں صورتوں میں طٰہٰ کے لفظ سے خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہوگا، اسی لئے بعض لوگوں نے طٰہٰ کو رسول اللہ کے ناموں میں سے شمار کیا ہے کیونکہ آیت میں طٰہٰ سے کنایہ آپ ہی کی ذات سے ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کلبی کا قول ہے کہ جب مکہ میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو آپ عبادت میں زیادہ سرگرم رہنے لگے، نماز میں طویل قیام کی وجہ سے کبھی ایک پاؤں ٹیکتے دوسرا اٹھاتے اور دوسرا ٹیکتے تو پہلا اٹھا لیتے تھے اور رات بھر نماز میں مشغول رہتے تھے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

طٰهٰ ۚ﴿۱﴾ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤی ﴿۲﴾ ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نہیں اتارا ہے کہ آپ (قیام کرتے کرتے) تھک جائیں۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے شقاء کا معنی ہے سختی اور تنگی۔

جوہری نے لکھا ہے شقاوت، سعادت کا عکس ہے اور جس طرح سعادت کی دو قسمیں ہیں، دنیوی اور اخروی، اسی طرح شقاوت بھی دو طرح کی ہوتی ہے دنیوی اور اخروی۔ پھر سعادت دنیوی تین طرح کی ہوتی ہے نفسانی، جسمانی، بیرونی، اسی طرح شقاوت دنیوی کی بھی یہی تین قسمیں ہیں۔ دنیوی، جسمانی شقاوت تھکان ہے اور آیت میں یہی مراد ہے۔ (گویا صاحب قاموس کے نزدیک تشقی کا مصدر شقاء ہے اور جوہری کے نزدیک شقاوہ) بعض علماء کا قول ہے کہ تعب کی بجائے شقاء کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے، تعب کے معنی میں شقاء کا لفظ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ھو اشقی من رابض المھر اور

سید القوم اشقاھم مشہور کہاوت میں مستعمل ہیں۔ شاید تتعب کے بجائے تشقٰی کا لفظ ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہو کہ قرآن کا نزول آپ کے سعادت یاب ہونے کے لئے کیا گیا ہے نہ کہ شقاء کے لئے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ شروع شروع میں جب رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو نماز میں آپ قدموں کے سروں (پنجوں) کے بل کھڑے ہوتے تھے اس پر نازل ہوا طٰہٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى

عبد بن حمید نے رابع بن انس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھتے تو ایک ٹانگ ٹیکے رکھتے اور دوسری اٹھا لیتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بعض علماء نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کافروں نے جب دیکھا کہ رسول اللہ عبادت میں بہت زیادہ مشقت اٹھا رہے ہیں تو کہنے لگے محمد قرآن تم پر صرف اس لئے نازل ہوا کہ تم مشقت اٹھاؤ یا تمہاری شقاوت کے لئے قرآن نازل ہوا ہے) اس قول کی تردید اور تکذیب کے لئے آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ شاید کفار کی مراد یہ ہو کہ تم نے چونکہ باپ دادا کا مذہب چھوڑ دیا ہے اس لئے بدنصیب ہوگئے قرآن اترنے کا یہی نتیجہ نکلا۔ اللہ نے اس خیال کی تکذیب فرما دی۔ اس مضمون پر وہ روایت دلالت کر رہی ہے جو بطریق عوفی آئی ہے جس میں حضرت ابن عباسؓ نے کفار کا یہ مقولہ بیان کیا کہ یہ شخص اپنے رب کی وجہ سے بدنصیب ہو گیا اس کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آیت کا مطلب اس طرح ہو ہم نے قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ تم تھکان میں مبتلا ہو جاؤ اور اس غم میں اپنے آپ کو تباہ کر دو کہ تمہاری قوم مومن کیوں نہیں ہوتی آپ کے ذمے تو صرف تبلیغ ہے ان کے ایمان لانے نہ لانے کا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ بلکہ ایسے شخص کی ہدایت کے لئے اتارا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہو۔ مَنْ يَّخْشٰى سے مراد ہے وہ شخص جس کے دل کے اندر خشیت اور رقت ہو کہ ڈرانے سے اس کو فائدہ پہنچ جائے یا ایسا شخص مراد ہے جس کے متعلق اللہ جانتا ہے کہ ڈرانے اور عذاب کا خوف دلانے سے وہ خوف زدہ ہو جائے گا (اگرچہ بالفعل وہ صاحب خشیہ نہ ہو اور عذاب کا خوف اس کو نہ ہو مگر عذاب کا ذکر سن کر آئندہ خوف زدہ ہو جانے والا ہو) ایسا ہی آدمی انذار و تخویف سے فائدہ اندوز ہو سکتا ہے۔

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝ یہ اس ذات کی طرف سے نازل کردہ ہے جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے پہلے اَنْزَلْنَا بصیغہ جمع متکلم فرمایا تھا اور اس جگہ اپنی ذات کو بصیغہ غائب ذکر کیا اس سے طرز کلام میں نیرنگی پیدا ہوگئی اور اتارنے والے کی عظمت کا اظہار دو طرح سے ہو گیا، اول اتارنے کی نسبت اپنی عظیم الشان ذات کی جانب کی پھر ایسی ذات جامع الصفات کی طرف اسناد تنزیل کی جو عظیم الشان صفات و افعال کا سرچشمہ ہے اور اسی ترتیب سے اس کے افعال کا ذکر کیا جو ترتیب عند العقل مناسب تھی اول تخلیق زمین کا ذکر کیا۔ زمین بالکل ہمارے سامنے اور بہت زیادہ قریب ہے پھر اونچے آسمانوں کا ذکر کیا اس کے بعد استواء علی العرش اور درمیانی کائنات کی ملکیت و تخلیق اور زیر ثری کی پیدائش کا تذکرہ کیا۔

العُلٰی۔ العُلْیا کی جمع ہے اور عُلْیا اَعْلٰی کا مونث ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ وہ بڑی رحمت والا عرش پر قائم ہے۔ اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کی پوری تشریح سورۂ یونس میں گزر گئی۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے یعنی ملائکہ اور ستارے اور پہاڑ اور دریا۔

وَمَا فِي الْاَرْضِ اور جو کچھ زمین میں ہے یعنی پہاڑ اور دریا اور درخت اور کانیں اور جانور اور جن و شیاطین اور انسان و ملائکہ

وَمَا بَيْنَهُمَا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان (خلاء) میں ہے یعنی ہوا اور بادل اور گرج اور بجلی وغیرہ۔

وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝ اور جو کچھ ثری کے نیچے ہے یعنی نمناک مٹی کے نیچے، ایک حدیث میں آیا ہے ایک کتا پیاس کی وجہ سے ثری کھا رہا تھا۔ اگر خشک مٹی پر کوئی پانی چھڑک دے تو بولتے ہیں ثَرِیَ التُّرَابُ۔ حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ زمینیں مچھلی کی پشت پر ہیں اور مچھلی سمندر پر اور مچھلی کی دم اور سر عرش کے نیچے باہم مل گئے ہیں۔ سمندر پتھر کی ایک آسمانی رنگ کی چٹان پر ہے، یہ چٹان وہی ہے جس کا ذکر حضرت لقمان کے قصہ میں اللہ نے کیا ہے اور فرمایا ہے فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ چٹان بیل کے سینگ پر رکھی ہوئی ہے اور بیل ثری پر قائم ہے اور ثری سے نیچے کیا ہے اس سے سوائے اللہ کے کوئی واقف نہیں، بیل منہ کھولے ہوئے ہے جب اللہ سب سمندروں کو ملا کر ایک سمندر کر دے گا تو یہ سب سمندر اس بیل کے منہ کے اندر جا کر پیٹ میں اتر کر خشک ہو جائیں گے (ہذا من رموز الاوائل واللہ اعلم بالصواب مترجم)

وَإِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفٰى ۝ اور اگر تم پکار کر بات کہو تو وہ چپکے سے کہی ہوئی بات کو اور اس سے بھی زیادہ خفی بات کو جانتا ہے۔

بیضاوی نے کہا یہ جملہ اصل میں اس طرح تھا اگر آپ اللہ کا ذکر اور اس سے دعا پکار کر کریں گے تو اللہ کو اس پکارنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ سر کو جانتا ہے اور بہت زیادہ پوشیدہ کو بھی۔ میرے نزدیک اصل کلام اس طرح تھا اگر آپ اللہ کا ذکر چلا کر کریں گے اور اونچی آواز سے پکاریں گے یا پست آواز سے چپکے چپکے ذکر کریں گے اللہ (کے لئے دونوں برابر ہیں بہر حال) اس کو جانتا ہے قبول کرے گا اور ثواب دے گا۔ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ کے بعد اَوْ تُخَافِتْ بِہٖ کے محذوف ہونے پر کلام کی رفتار دلالت کر رہی ہے۔ دوسری آیت میں بھی اسی طرح دوسرا لفظ حذف کر دیا گیا ہے فرمایا ہے سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ اس کے بعد وَالْبَرْدَ محذوف ہے (کیونکہ لباس فقط گرمی سے ہی حفاظت نہیں کرتا بلکہ سردی سے بھی بچاتا ہے)

لفظ سر اور اخفی کی تحقیق: بغوی نے بیان کیا کہ حسن نے کہا سر وہ خفیہ بات جو آدمی چپکے سے دوسرے سے کہہ دیتا ہے اور اخفی وہ پوشیدہ بات جس کو اپنے دل ہی میں چھپائے رکھتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؒ نے فرمایا سر وہ پوشیدہ بات جو آدمی اپنے دل میں رکھتا ہے اور اخفی وہ بات جو آئندہ اللہ دل میں پیدا کر دیتا ہے اور اس وقت کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ آئندہ اللہ کی طرف سے دل میں کیا بات پیدا ہوگی ہم آج جس چیز کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھتے ہیں اس سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن کل کو ہمارے دل میں کیا بات آئے گی اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ہاں اللہ ہمارے آج کے پوشیدہ خیال سے بھی واقف ہے اور آئندہ جو کچھ ہم دل میں پوشیدہ رکھیں گے اس سے بھی واقف ہے۔

علی بن طلحہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول اس طرح آیا ہے سر وہ پوشیدہ بات ہے جو آدمی اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے اور اخفی وہ بات ہے جو آدمی کو خود بھی نہیں معلوم کہ وہ آئندہ کیا کرے گا جب تک کر نہ لے اس کو معلوم نہیں ہوتی۔ مجاہد نے کہا سر وہ پوشیدہ کام ہے جس کو تم لوگوں سے چھپاتے ہو اور اخفی سے مراد وسوسہ ہے۔ بعض علماء نے کہا سر سے مراد ہے عزیمت کسی بات کا پختہ ارادہ اور اخفی وہ خیال ہے جو دل میں گزرتا ہے مگر اس کا پختہ ارادہ نہیں ہوتا (یونہی ایک خیال دل میں آ جاتا ہے) زید بن اسلم نے (اَخْفٰى کو ماضی کا صیغہ مان کر يَعْلَمُ پر اس کا عطف کیا اور) کہا اللہ پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے اور اپنے بندوں سے ان کو پوشیدہ رکھا ہے کسی کو اپنے اسرار پر واقف نہیں کیا۔

اہل تصوف کے نزدیک سر اور اخفی ان پانچ غیر مادی چیزوں میں سے دو چیزوں کے نام ہیں جو مجرد از مادہ ہیں۔ بنظر کشف بالائے عرش ان کو دیکھا جا سکتا ہے البتہ ان کے جلوے انسانی جسم میں نمودار ہوتے ہیں۔ پانچ مجردات کے نام یہ ہیں قلب، روح، سر، خفی، اخفی۔ ولایت آدم کے انوار کی جلوہ گاہ قلب ہے ولایت نوح کی تجلیات کی منزل روح ہے یہی ولایت ابراہیمی کا مہبط انوار ہے۔ سر ولایت موسوی کی تجلیات کی منزل ہے اور خفی ولایت عیسیٰ کے انوار کی فرودگاہ ہے اور اخفی ولایت محمدیہ کے انوار قدسیہ کی جلوہ گاہ ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۝ اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اسی کے (سارے) اچھے اچھے نام (اوصاف) ہیں۔ یہ پورا جملہ تاکیدی اور تقریری ہے۔ جو زمین و آسمان اور ساری کائنات کا مالک ہے، وہ یقیناً الوہیت میں منفرد اور تمام صفات کمال کے ساتھ متصف ہوگا اور اس کی صفات کسی دوسرے میں نہیں پائی جائیں گی پس سارے اسماء حسنی یعنی اعلیٰ اوصاف اسی کے لئے مخصوص ہوں گے۔ حُسْنٰی اَحْسَن کا مونث ہے۔ اللہ کے اسماء حسن میں تمام اسماء سے اعلیٰ وافضل ہیں کیونکہ ان کے معانی تمام اسماء کے معانی سے اشرف اور برتر ہیں۔ اللہ کے اسماء حسنی کی مکمل تفصیل ہم نے سورۂ اعراف کی آیت وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى کی تفسیر کے ذیل میں کردی ہے۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ⑨ اور کیا آپ کو موسیٰ کے قصہ کی خبر بھی پہنچی ہے۔ استفہام تقریری ہے یعنی یقیناً موسیٰؑ کا قصہ تم کو پہنچ گیا۔ حضرت موسیٰؑ کا واقعہ بھی رسول اللہ ﷺ کے واقعہ سے ملتا جلتا تھا، حضرت موسیٰؑ کو تعب و مشقت اٹھانی پڑی تھی اور اسکے بلند مراتب پر آپ فائز ہوئے تھے، اس لئے نزول قرآن اور اس کی اصلی غرض کے تمہیدی ذکر کے بعد حضرت موسیٰؑ کا واقعہ ذکر فرمانا شروع کر دیا، شروع نبوت کے دور میں جن سورتوں کا نزول ہوا، سورۂ طٰہٰ بھی انہی میں سے ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا واقعہ اپنے اندر جن مضامین کو سموئے ہوئے ہے نبوت کے بار کی برداشت، تبلیغ رسالت، تحمل شدائد پر صبر وغیرہ انہی کی طرف سورۃ کی ابتدائی آیات میں اشارہ فرمایا تاکہ آپ بھی حضرت موسیٰؑ کے طریق رسالت کی پیروی کریں۔

اِذْ رَاٰ نَارًا (موسیٰؑ کا واقعہ اس وقت کا) جب کہ انہوں نے آگ دیکھی تھی۔ بغوی نے واقعہ کی تفصیل اس طرح لکھی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیب سے مصر لوٹ کر جانے کی اجازت طلب کی تاکہ اپنی والدہ اور بہن کی زیارت کر سکیں حضرت شعیب نے اجازت دیدی آپ اپنی بی بی کے ساتھ چل پڑے، سردی کا موسم تھا، بادشاہان شام کے خوف سے آپ عام راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہو لئے بیوی دنوں سے تھیں۔ صبح شام کا بھروسہ نہ تھا راستوں سے واقف نہ تھے صحرا میں بغیر جانے ایک راستہ پر چل پڑے وہ راستہ کوہ طور کے دائیں مغربی جانب جاتا تھا۔ رات تاریک اور فضا برفیلی تھی راستہ میں بی بی کو درد زہ ہونے لگا آپ نے چقماق کو رگڑا پر آگ نہیں نکلی۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ آدمی غیرت مند تھے۔ چونکہ بی بی ساتھ تھیں اس لئے رفقاء سفر کے ساتھ رات کو چلتے تھے اور دن کو علیحدہ ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اتفاقاً راستہ بھٹک گئے تاریک رات تھی اور برف زدہ بھی تھی۔ چقماق کو رگڑا لیکن آگ نہیں نکلی نظر اٹھائی تو دور آگ روشن دکھائی دی جو طور کے جانب سے راستہ کے بائیں طرف کو تھی۔

فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا پس بیوی سے کہا تم (یہیں) ٹھہرو۔ جمع کا خطاب بیوی اور ساتھیوں کے لئے ہے یا بی بی کو ہی ہے اور چونکہ وہ حضرت شعیب کی صاحبزادی تھیں اس لئے ان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے تہذیب کے ساتھ بصیغہ جمع خطاب کیا۔

اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ⑩

میں نے آگ دیکھی ہے شاید اس میں سے تمہارے پاس کوئی شعلہ لے آؤں یا آگ کے پاس راستہ کا پتہ مجھے مل جائے۔

اٰنَسْتُ یعنی بلاشک وشبہ میں نے آگ دیکھی ہے مجھے اس کے آگ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ بعض اہل لغت نے کہا کہ ایناس اس طور پر دیکھنے کو کہتے ہیں جس سے کچھ انس خاطر پیدا ہو۔ (اور دل کی وحشت دور ہو)

قَبَسٌ آگ کا شعلہ، آگ کا وہ تھوڑا حصہ جو زیادہ آگ میں سے حاصل کر لیا جائے (کذا فی القاموس)۔

هُدًى بمعنی ہادی، راہنما یعنی مجھے کوئی راستہ دکھانے والا وہاں شاید مل جائے یا هُدًى سے مراد ہے دینی راہنما کیونکہ ابرار اور اہل عرفان کے خیالات ہر وقت امور دین ہی کی طرف مائل رہتے ہیں اور انہی سے ان کو انس خاطر ہوتا ہے لیکن ہادی کا ملنا یا شعلہ کا حصول یقینی نہ تھا۔ اس لئے امید کا لفظ بولا اور آگ کا دیکھنا بلاشک تھا اس لئے دیکھنے کے متعلق یقین کا اظہار کیا۔

عَلَى النَّارِ یعنی آگ کے قریب۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰى ﴿۱۱﴾ اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ سوجب وہ آگ کے پاس پہنچے تو ان کو (اللہ کی طرف سے) آواز دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں۔

بغوی نے لکھا ہے جب موسیٰؑ وہاں پہنچے تو آپ نے ایک درخت دیکھا جو اوپر سے نیچے تک بالکل سبز تھا اور اس کے گرداگرد شفاف، سفید آگ اس کو گھیرے ہوئے تھی جو بہت زیادہ روشن تھا (دھوئیں کا نام بھی نہ تھا) درخت کی سبزی اور آگ کی سفیدی دونوں اپنی اپنی جگہ نمایاں تھیں۔ نہ درخت کی سبزی آگ کی روشنی اور سفیدی میں مخل تھی نہ آگ کی تو انیت درخت کی سبزی نمایاں ہونے سے مانع تھی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا درخت کا رنگ گندمی سبز تھا۔ قتادہ، مقاتل اور کلبی نے کہا وہ عوسج کا درخت تھا، وہب نے کہا علیق کا درخت تھا، بعض کا قول ہے کہ عناب کا درخت تھا، اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسؓ کی طرف کی گئی ہے، اہل تفسیر کہتے ہیں کہ موسیٰؑ نے جس کو آگ سمجھا تھا وہ آگ نہ تھی نور تھا، موسیٰؑ نے اس کو آگ ہی خیال کیا تھا۔ اس لئے اللہ نے بھی اس کو نار ہی فرمایا۔ اکثر مفسر قائل ہیں کہ وہ نور رب تھا۔ حضرت ابن عباس اور عکرمہ وغیرہ کا یہی قول ہے لیکن سعید بن جبیر نے فرمایا وہ حقیقت میں آگ ہی تھی آگ ہی چہرہ خداوندی کے لئے حجاب ہے جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کا حجاب آگ ہے اگر اس حجاب آتشیں کو کھول دے تو اس کی تجلی جمال اس تمام مخلوق کو سوختہ کردے جو اس کی حد نگاہ تک ہو۔ بغوی کی روایت میں یہ حدیث اسی طرح آئی ہے لیکن صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں اس حدیث کے اندر نار کی جگہ نُوْر کا لفظ آیا ہے۔ اس کا حجاب نور ہے۔ میں کہتا ہوں دونوں کا مآل ایک ہی ہے نور بھی لطیف ترین مصفی آگ ہی ہوتا ہے جو جلاتا نہیں ہے۔

اس قصہ میں آیا ہے کہ موسیٰؑ کچھ خشک گھاس لے کر آگ کی طرف بڑھے تو آگ دور ہو گئی جس قدر اس کے قریب جاتے تھے وہ اور دور ہٹ جاتی تھی اور جب موسیٰؑ پیچھے ہٹ آتے تھے تو آگ قریب آجاتی تھی موسیٰ حیران ہو کر کھڑے ہو گئے اور آپ نے وہاں ملائکہ کی تسبیح کی آواز سنی اس وقت آپ کے اوپر سکینہ (ایمان شہودی، سکون خاطر، اطمینان قلبی، دل کی ٹھہراؤ) کا القاء ہوا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ وہب نے بیان کیا حضرت موسیٰؑ کو درخت سے ندا آئی تھی کہ میں تیرا رب ہوں۔ موسیٰؑ کو معلوم نہ ہوا کہ پکارنے والا کون ہے اس لئے آپ نے جواب دیا میں تیری آواز تو سن رہا ہوں لیکن میں نہیں جانتا کہ تیری جگہ کہاں ہے (کہاں سے آواز آرہی ہے تو کہاں ہے آواز آئی میں تیرے اوپر ہوں، تیرے ساتھ ہوں، تیرے سامنے ہوں، تیرے پیچھے ہوں، تجھ سے اتنا قریب ہوں کہ تو بھی اپنے آپ سے اتنا قریب نہیں ہے۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ کو یقین ہو اکہ یہ اللہ ہے یہ شان تو اسی کی ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے موسیٰؑ کو ندا آئی تو آپ نے کہا یہ کلام کرنے والا کون ہے آواز آئی میں ہی اللہ ہوں اس وقت شیطان نے موسیٰؑ کے دل میں وسوسہ پیدا کیا کہ شاید میں شیطان کا کلام سن رہا ہوں، لیکن فوراً کہہ اٹھے یقیناً یہ اللہ کا کلام ہے کیونکہ ہر طرف سے اور ہر عضو سے میں اس کو سن رہا ہوں (شیطان کا کلام نہ ہر جہتی ہو سکتا ہے نہ بند بند سے اس کو سنا جا سکتا ہے) اس تشریح میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روحانی طور پر اول حضرت موسیٰ کے قلب پر کلام اللہ کا القاء ہوا تھا۔ پھر صورت مثالی میں آکر حس مشترک کے سامنے آیا اور ثبت ہو گیا اور تجسم کے سارے اعضاء سے آپ نے سنا لیکن وہ کلام ہر جہتی تھا اور ہر عضو سے آپ نے اس کو سنا۔

فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ پس اپنے جوتے اتار دو۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ برہنہ پا ہو جانا تعظیم کی علامت ہے اس لئے جوتے اتارنے کا حکم دیا گیا۔ بغوی نے لکھا ہے اس حکم کی وہ وجہ تھی جو حضرت ابن مسعود کی روایت میں آئی ہے کہ وہ جوتے مردہ گدھے کی کھال کے بنے ہوئے تھے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ وہ چمڑا جس کے جوتے بنے ہوئے تھے دباغت شدہ نہ تھا۔ عکرمہ اور مجاہد نے کہا ننگے پاؤں ہو جانے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ اس پاک زمین کی خاک سے حضرت موسیٰ کے قدم محروم نہ رہیں پاک سرزمین کی برکت موسیٰ کے قدموں کو حاصل ہو جائے، حضرت موسیٰ نے فوراً جوتے اتار کر وادی کے پرے پھینک

دیجئے۔

اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾ کیونکہ تم بلاشک طوی کی مقدس وادی میں ہو (تقدیس طوی کا تقاضا ہے کہ تو ننگے پاؤں ہو جائے) طوی اس وادی کا نام تھا۔ ضحاک نے کہا وادی طوی گہری تھی اور طور کی طرح مستدیر تھی۔

بعض نے کہا طُوٰی مصدر ہے اور یہ اشارہ ہے اس کیفیت کی طرف جو اللہ نے موسیٰ کو اپنی مہربانی سے بطور انتخاب عطا فرمائی تھی موسیٰ اپنی کوشش سے وہ کیفیت حاصل نہیں کر سکتے اللہ ہی نے وہ ساری وادی طے کرادی جس کی مسافت بہت بعید (مُقَدَّس بمعنی بعید) تھی۔ اہل تصوف کہتے ہیں قلب کا عروج اپنی اصل یعنی بالائی عرش تک اگر بالفرض کوشش سے ممکن بھی ہو تو پچاس ہزار برس کی کوشش کے بعد وہاں تک رسائی ہو گی کیونکہ زمین سے عرش تک پچاس ہزار برس کی مسافت ہے اسی کو بطور کنایہ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ میں بیان کیا گیا ہے لیکن شیخ کی توجہ سے یہ عروج بطریق اجتباء (انتخاب چن لینا) حاصل ہو جاتا ہے۔ عارف رومی نے کیا خوب کہا ہے۔

سیر زاہد ہر شبے یک روزہ راہ　　سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ اور (نبوت و رسالت کے لئے) میں نے تم کو پسند کر لیا ہے۔

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ پس جو کچھ (تمہاری طرف) وحی کیا جارہا ہے اس کو سن لو میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم میری عبادت کرو (کسی اور کی نہ کرو)

اَنَا اللّٰهُ الخ مَا يُوْحٰى سے بدل ہے اس جملہ کے اندر وحی کے دو حصے بیان فرمائے، توحید عبادت جو علم کا کمال ہے اور عبادت خالص جو عمل کا کمال ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴿۱۴﴾ اور میری ہی یاد کی نماز پڑھا کرو۔

عمومی عبادت کا ذکر پہلے کیا پھر نماز کا خصوصیت کے ساتھ حکم دیا، کیونکہ تمام عبادتوں میں نماز کی اہمیت اور عظمت ظاہر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز دین کا ستون ہے۔ رواہ ابو نعیم والبیہقی عن عمرؓ صاحب مسند الفردوس عن علیؓ

ابن عساکر نے انسؓ کی روایت سے حدیث مذکور ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے نماز ایمان کا نور ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا میں نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ کو سب سے زیادہ پیارا کون سا عمل ہے فرمایا نماز، رواہ الشیخان فی الصحیحین

مسلم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ کے اور کفر کے درمیان ترکِ صلوٰۃ (حائل) ہے۔ اسی طرح امام احمد اور اصحاب السنن نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔

احمد، دارمی اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز نماز کا ذکر کیا اور فرمایا جو اس کی پابندی کرے گا تو یہ قیامت کے دن اس کے لئے نور اور برہان اور نجات ہو جائے گی اور جو اس کی پابندی نہیں کرے گا اس کے لئے نماز نہ نور ہو گی نہ نجات (کا ذریعہ) اور قیامت کے دن وہ قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہو گا۔

ترمذی نے عبداللہ بن شقیق کی روایت سے بیان کیا ہے کہ صحابہ کرام سوائے ترکِ صلوٰۃ کے اور کسی عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔ انہی احادیث کی بنا پر امام احمدؒ نے فرمایا کہ جس نے قصداً نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔

نماز کے افضل عبادات ہونے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نماز بجائے خود فی نفسہٖ نیکی ہے (دوسری عبادات کا حسن اضافی ہے) روزہ اس لئے اچھا ہے کہ اس سے نفس امارہ کے غلبہ کو شکست ہوتی ہے، زکوٰۃ اس لئے نیکی ہے کہ اس سے غریبوں، محتاجوں کی حاجت روائی اور امداد ہوتی ہے حج اس لئے نیکی ہے کہ اس سے اللہ کے گھر کی تعظیم کا اظہار ہوتا ہے۔ چونکہ نماز فی نفسہٖ بجائے خود نیکی ہے اسی لئے اللہ نے اقامتِ صلوٰۃ کے حکم کی لِذِكْرِیْ کے لفظ سے علت بھی بیان فرمادی۔

لِذِكْرِی کا مطلب یہ ہے کہ تم نماز کو اس لئے قائم کرو کہ مجھے نماز کے اندر یاد کرو پوری نماز ہی ذکر خدا ہے نماز کے اندر آدمی دل، زبان اور تمام اعضاء کے ساتھ اللہ کی یاد میں مشغول ہوتا ہے۔ لِذِكْرِی کا مطلب بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ چونکہ میں نے نماز کا ذکر اپنی تمام کتابوں میں کیا ہے اور سب ہی کتابوں میں اس کا حکم دیا ہے اس لئے تم بھی نماز قائم کرو (اول مطلب پر ذکری میں مفعول کی طرف نسبت ہوگی اور دوسرے مطلب پر فاعل کی طرف (مترجم) بعض علماء نے ذِكْرِی کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ تم نماز قائم کردتا کہ میں رحمت اور تعریف کے ساتھ تمہارا ذکر کروں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ فرماتا ہے میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوتا ہوں اور میں (ہردم) اس کے ساتھ رہتا ہوں، اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کا ذکر (تنہا) اپنی ذات میں کرتا ہوں اور اگر وہ میرا ذکر جماعت میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر ایسی جماعت میں کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے بہتر ہوتی ہے (یعنی فرشتوں کی جماعت میں) اس جگہ اقامتِ صلوٰۃ کا ذکر اجمالی کیا ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل آئی ہے مثلاً ایک آیت میں فرمایا ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ۔ حضرت جبرئیل کی امامت کی حدیث تو مشہور ہی ہے کہ جبرئیل نے دو روز پانچوں وقت حضور ﷺ کی امامت کی تھی پہلے روز ہر نماز ابتدائی وقت میں اور دوسرے روز ہر نماز انتہائی وقت پر پڑھائی تھی۔ مترجم) بعض علماء نے آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے نماز قائم کرو جب نماز یاد آجائے۔ حضرت انس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص نماز بھول گیا یا سوتا رہ گیا ہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب یاد آجائے (فوت شدہ) نماز پڑھ لے (دوسری روایت میں آیا ہے اس کے سواء اور کوئی کفارہ نہیں) اللہ نے فرمایا ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِی متفق علیہ۔

حضرت ابوقتادہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نیند میں کوئی قصور نہیں قصور تو بیداری میں (نماز ترک کرنے پر) ہے جو شخص کسی نماز کو بھول جائے یا سوتا رہ جائے تو جب (فوت شدہ) نماز یاد آجائے پڑھ لے، اللہ نے فرمایا ہے وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِی مسلم

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا بلاشبہ وہ گھڑی (یعنی قیامت) آنے والی ہے، میں اس (کے مقرر وقت) کو پوشیدہ رکھوں گا۔

یہ جملہ حکم عبادت کی علت ہے یا مستانفہ ہے یا معترضہ ہے جس کو خوف دلانے کے لئے ذکر کیا ہے اور بقول بغوی واو عاطفہ محذوف ہے اصل میں وَاِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ تھا۔

اخفش نے اَكَادُ کا ترجمہ اُرِيْدُ (میں چاہتا ہوں) کیا ہے، بغوی کے نزدیک یہ لفظ زائد ہے۔ معنی یہ ہے کہ میں اس کا مقرر وقت ظاہر نہیں کروں گا۔ بعض اہل علم نے اَكَادُ اُخْفِيْهَا کا یہ مطلب بیان کیا۔ قریب تھا کہ میں قیامت کو چھپالیتا یہ بھی نہ کہتا کہ قیامت آنے والی ہے، بندوں پر مہربانی کرنا اور اتمام حجت کرنا مقصود تھا اس لئے ذکرِ قیامت کردیا اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں اس کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ یہی مطلب تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ کا ہے کہ اگر اللہ کا حکم آسمانوں کو باقی رکھنے کا نہ ہوتا تو ان لوگوں کے اس قول سے کہ اللہ صاحب اولاد ہے آسمان پھٹ جاتے۔ میں کہتا ہوں شاید اس کلام میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان اور اللہ کی عبادت کو وہ فضیلت و شرف اور حسن و خوبی حاصل ہے کہ بغیر جنت کی خواہش اور دوزخ کے خوف اور قیامت کے عذاب کے اندیشہ کے خود ان دونوں کو مقصود اصلی ہونا چاہئے گو ایمان و عبادت اور ترک ایمان و عبادت کا لازمی نتیجہ اور ثمرہ ثواب و عذاب ہوگا لیکن ایمان و عبادت کی غرض و غایت اگر یہ نہ بھی ہو تب بھی ایمان و عبادت کو وہ عزت و شرف اور حسن حاصل ہے کہ ان دونوں کو بندوں پر لازم ہونا چاہئے اور کفر و ترک عبادت، ذلت و ناکامی اور خرابی و قباحت کے اس گڑھے میں گھسے ہوئے ہیں کہ بغیر خوف عذاب کے ان سے پرہیز رکھنا ضروری ہے اگر اللہ نے قیامت آنے کی اطلاع نہ دی ہوتی تب بھی مومن کا ایمان جنت کی طمع اور دوزخ کے خوف سے نہ ہوتا بلکہ خالص لوجہ اللہ ہوتا، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا صہیب بہت اچھا بندہ ہے اگر اسکو اللہ (کے عذاب اور دوزخ) کا خوف نہ بھی ہوتا تب بھی وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرتا۔ رابعہ

بصریہ نے کہا تھا میں چاہتی ہوں کہ جنت کو جلا دوں اور دوزخ کو بجھا دوں تاکہ لوگ بغیر خوف و طمع خالص اللہ کے لئے عبادت کریں۔ اکثر اہل تفسیر نے اَکَادُ اُخْفِیْہَا کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ قریب ہے میں قیامت کو اپنی ذات سے بھی پوشیدہ رکھوں دوسروں کو وقت قیامت بتانے کا توذکر ہی کیا ہے گویا اخفاء قیامت کو اللہ نے زوردار طور پر مبالغہ کے ساتھ بیان کیا (اپنی ذات سے چھپانے کا ارادہ کرنا یا چھپانا مقصود کلام نہیں ہے بلکہ قیامت کے اخفاء کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے) اس مطلب کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ بعض قراءتوں میں اُخْفِیْہَا کے بعد فَکَیْفَ اُظْہِرُہَا لَکُمْ بھی آیا ہے۔ (لیکن یہ قراءت شاذ ہے مترجم) عرب کا قاعدہ ہے کہ جب کسی بات کو چھپانے کا بیان قوت و مبالغہ کے ساتھ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کَتَمْتُ سِرَّکَ مِنْ نَفْسِیْ میں تمہارا راز اپنے آپ سے بھی پوشیدہ رکھوں گا۔ یعنی کسی پر ظاہر نہیں کروں گا قیامت کو مخفی رکھنے کی مصلحت و حکمت خوف اور ہول کو لوگوں کے دماغوں میں قائم رکھنا ہے اگر لوگوں کو قیامت بپا ہونے کا علم تعیین وقت کے ساتھ نہ ہوگا تو ہر وقت ڈرتے رہیں گے کہ خدا جانے کب قیامت بپا ہو جائے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اُخْفِیْ (واحد متکلم مصدر اِخْفَاءٌ باب افعال) میں ہمزہ سلب ماخذ کے لئے ہے، پس اُخْفِیْ کا ترجمہ ہو گیا اُظْہِرُہَا (قریب ہے کہ میں قیامت کو ظاہر کردوں) لغت عربی میں اَخْفَاء کا ترجمہ (جس طرح اس کو چھپایا آتا ہے اسی طرح) اس کو ظاہر کیا (بھی) آتا ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے اس کی تائید اس قراءت سے بھی ہوتی ہے جس میں اُخْفِیْ کی جگہ اَخْفِیْ بفتح ہمزہ آیا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے یہ لفظ بفتح ہمزہ پڑھا گیا ہے اس وقت اسکا معنی ہوگا میں ظاہر کردوں خَفَیْتُ الشَّیْءَ میں نے اس چیز کو ظاہر کر دیا، اَخْفَیْتُہٗ میں نے اس کو چھپا دیا (ثلاثی مجرد سے ظاہر کرنے کا معنی ہے اور ثلاثی مزید سے چھپانے کا کذا فی النہایۃ للجزری۔

ایک شبہ

جب خِفَاء ثلاثی مجرد اظہار کے معنی رکھتا ہے اور اِخْفَاء باب افعال (جب کہ ہمزہ سلب کی قرار دی جائے) سلب اظہار یعنی پوشیدہ کرنے کا معنی رکھتا ہے تو پھر قراءت متواترہ میں اِخْفَاء کا معنی جو اظہار کہا گیا ہے یہ کیسے ممکن ہے (اخفاء کا معنی تو سلب الخفاء یعنی نفی الاظہار ہونا چاہیے)

جواب

میں کہتا ہوں خِفَاء ثلاثی مجرد کبھی بمعنی اظہار کے ہوتا ہے اور کبھی چھپانے کے معنی کے لیے (پس قراءت متواترہ میں جو اِخْفَاء کا معنی اظہار کہا گیا ہے وہ اس خِفَاء (ثلاثی مجرد) سے باضافہ ہمزہ بنایا گیا ہے جس کا معنی ہے چھپانا۔ قاموس میں ہے خَفٰی یَخْفِیْ جیسے رَمٰی یَرْمِیْ (یعنی ضَرَبَ سے) مصدر خَفْیًا اور خُفِیًّا اس کا معنی ہے ظاہر کرنا، اِخْتَفٰی کا بھی یہی معنی ہے اور خَفِیَ یَخْفٰی جیسے رَضِیَ یَرْضٰی (سَمِعَ سے) مصدر خفاء اسم فاعل خَافٍ صفت مشبہ خَفِیٌّ اس کا معنی ہے ظاہر نہ کرنا پس خَفٰی جو ضَرَبَ سے آتا ہے اگر اس میں ہمزہ سلب زیادہ کردی جائے تو اس کا معنی ہو جائے گا چھپانا اور ظاہر نہ کرنا (کیونکہ خَفٰی کا معنی ہے ظاہر کیا) اور اگر خَفِیَ (باب سمع) میں ہمزہ بڑھائی جائے تو اس کا معنی ہو جائے گا ظاہر کر دینا نہ چھپانا۔

لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی ﴿۱۵﴾ تاکہ ہر شخص کو اس کی کوشش کا بدلہ دے دیا جائے۔

فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْہَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِہَا وَاتَّبَعَ ہَوٰىہُ فَتَرْدٰی ﴿۱۶﴾

پس تم کو نہ پھیر دے قیامت سے (یعنی قیامت پر ایمان لانے سے اور اللہ کی ملاقات سے یا نماز قائم کرنے سے) وہ شخص جو قیامت کو نہیں مانتا اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے (ورنہ) تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے۔

آیت میں بظاہر کافر کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ موسیٰ کو اقرار قیامت یا اقامت نماز سے نہ پھیر دے اور حقیقت میں موسیٰ کو ممانعت کی گئی کہ تم کافروں کے کہنے میں نہ آجانا ورنہ ان کی طرح آخرت میں تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ اس فقرہ سے اشارتاً معلوم

ہو رہا ہے کہ فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے اقرار توحید و قیامت اور اقامت الصلوٰۃ لذکرؔیہ، اس کا انکار استقامت فطرت کے خلاف ہے۔ کافر کے اندر کجی اور کج فہمی ہے اس لئے ان باتوں کا انکار کرتا ہے۔

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ یعنی محسوس ظاہری، فناپذیر، ناپائیدار دنیوی لذتوں کے پیچھے پڑا ہے اور جو خرابیاں ان لذت کوشیوں میں پوشیدہ ہیں ان کو سمجھنے سے بھی غافل ہے اور جو عذاب آخرت ان کے نتیجہ میں آنے والا ہے اس سے بھی صرف نظر کئے ہوئے ہے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ اور موسیٰؑ یہ تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے، موسیٰؑ کو مانوس بنانے اور ان کی وحشت خاطر کو دور کرنے کے لئے یہ سوال کیا گیا (ورنہ اللہ تو جانتا ہی تھا کہ موسیٰؑ کے ہاتھ میں کیا ہے اور اس سے موسیٰؑ کے کون سے اغراض و مقاصد وابستہ ہیں) چونکہ وہ لاٹھی مظہر معجزہ ہونے والی تھی اس لئے موسیٰؑ کو ہوشیار کر دیا اور سوال تقریری کر کے اقرار کرالیا ہے کہ واقعی یہ لاٹھی ہی ہے۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ موسیٰؑ نے کہا یہ میری لاٹھی ہے۔ مقاتل نے کہا اس لاٹھی کا نام نبعہ تھا، بغوی نے لکھا ہے اس کا بالائی سرا دو شاخہ تھا اور نچلی جانب برچھی پیوست تھی۔

اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ میں اس سے ٹیک لگاتا ہوں اور بکریوں کے لئے (درختوں سے) پتے جھاڑتا ہوں یعنی تھک جاتا ہوں تو اس سے سہارا لیتا ہوں اگر اوپر اچھلتا ہوں تب اس سے سہارا لیتا ہوں اور جب بکریاں چرتی ہیں تو اس پر ٹیک لگا کر میں کھڑا رہتا ہوں۔ صاحب قاموس نے ہَشَّ کا معنی لکھا ہے اندھا دھند درخت کو پیٹنا (تاکہ اس سے پتے جھڑ کر نیچے گر پڑیں)

وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾ اور میری اس سے اور ضرورتیں بھی وابستہ ہیں یعنی اور حاجتوں کے پورے ہونے کا بھی اس سے تعلق ہے۔ حضرت مفسر نے دوسری ضرورتوں کو مثال کے طور پر اس طرح بیان کیا کہ اس کو کندھے پر رکھ کر زاد راہ اور کھانے پینے کے برتن اس میں لٹکا لینا، اس کے دو شاخ میں کوئی چادر باندھ کر سر پر سایہ کر لینا، رسی چھوٹی ہو تو کنویں سے پانی بھرنے کے لئے رسی کا سرا اس میں باندھ لینا، بکریاں چراتے میں کوئی درندہ آجائے تو اس سے اس کا مقابلہ کرنا۔

بعض اہل محبت نے کہا حضرت موسیٰؑ نے جواب کو قدر کفایت سے زیادہ طول دیا اور سوال سے زائد جواب میں تفصیل کی (جواب اتنا کافی تھا کہ یہ میری لاٹھی ہے، اس کے بعد لاٹھی کے فوائد کا بیان مقدار کفایت سے زائد تھا) اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ محبوب کے ساتھ ہم کلام ہونے میں لذت پا رہے تھے اس لئے زیادہ ہم کلام رہنا چاہتے تھے لیکن پھر اپنی طوالت کلام سے ڈر گئے اور خیال کیا یہ گستاخی اور بے ادبی ہے اس لئے کلام کو آخر میں مجمل کر دیا اور وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى پر کلام کو ختم کر دیا۔

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ اللہ نے فرمایا موسیٰؑ اس کو (ہاتھ سے) پھینک دو۔ یعنی لاٹھی پر تکیہ نہ کرو اس کا سہارا چھوڑ دو، ہمارا سہارا پکڑو، پھینکنے کے بعد تم کو اس لاٹھی کا حقیقی فائدہ نظر آجائے گا۔ وہب نے کہا پھینک دینے کا حکم سن کر حضرت موسیٰؑ سمجھے کہ لاٹھی کو (جوتوں کی طرح) بالکل پھینک دینے کا حکم دیا گیا ہے (حالانکہ حکم تھا لاٹھی کو زمین پر ڈال دینے کا تاکہ لاٹھی کے زمین پر گرنے سے معجزہ کا ظہور ہو جائے، مترجم)

فَاَلْقٰىهَا تو انہوں نے اس کو پھینک دیا پھر جو انہوں نے تعمیل حکم کے بعد نظر موڑ کر دیکھا تو کیا

فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ دیکھتے ہیں کہ وہ لاٹھی ایک سانپ ہے جو (پیٹ کے بل زمین پر) دوڑ رہا ہے۔ دوسری آیت میں آیا ہے کَاَنَّهَا جَآنٌّ، جانّ چھوٹے سانپ کو کہتے ہیں جو بہت خفیف الحرکت ہوتا ہے لیکن ایک اور آیت میں آیا ہے۔ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ۔ ثُعْبَانٌ کا ترجمہ ہے اژدھا، جو سانپوں میں سب سے بڑا ہوتا ہے۔ اور لفظ حَيَّةٌ کا اطلاق سانپ پر ہوتا ہے بڑا ہو یا چھوٹا، نر ہو یا مادہ بظاہر جانّ اور ثُعْبَانٌ میں تعارض معلوم ہوتا ہے اس تضاد کو دور کرنے اور دونوں آیتوں میں

موافقت پیدا کرنے کی توجیہ اس طرح کی گئی ہے کہ شروع میں وہ سانپ چھوٹا ہی تھا جتنی لاٹھی تھی اتنا ہی بڑا سانپ بنا تھا پھر وہ بڑھتا اور پھولتا گیا یہاں تک کہ ثُعْبَانٌ (اژدہا) ہو گیا ابتدائی حال میں جَانٌّ تھا اور انتہائی حال میں ثُعْبَانٌ۔

بعض علماء نے کہا واقع میں تو وہ بڑا اژدھا تھا لیکن تیزی اور سرعت حرکت میں وہ جان (چھوٹی قوم کے سانپ) کی طرح تھا اسی لئے کَاَنَّهَا جَآنٌّ فرمایا) گویا وہ جان تھی) اِذَا هِيَ جَآنٌّ نہیں فرمایا (کہ وہ جان ہو گئی تھی) اور جہاں ثُعْبَانٌ فرمایا ہے وہاں فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ فرمایا (تو اچانک وہ اژدہا ہو گئی)

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب اپنی لاٹھی کو دیکھا تو ان کو بجائے لاٹھی کے ایک بہت بڑا اژدھا نظر آیا، لاٹھی کا دوشاخہ سانپ کی دو باچھیں بن گیا تھا اور لاٹھی کی موٹھ سانپ کی گردن ہو گئی تھی جس کے سر پر بال بھی تھے انگارے کی طرح اس کی دونوں آنکھیں دہک رہی تھیں اور اس کے دانتوں کے رگڑنے کی کر کر کی طرح آواز سنائی دے رہی تھی تیزی کے ساتھ ادھر ادھر دوڑ رہا تھا بڑی چٹان پر منہ مارتا تھا تو اس کو بھی لقمہ بنا لیتا تھا اور بڑے بڑے درختوں کو ٹکڑے کئے دے رہا تھا، موسیٰؑ یہ دیکھ کر ڈر کر پشت پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن پھر ان کے دل میں اپنے رب کا خیال آیا تو شرمندہ ہو کر رک کر کھڑے ہو گئے، اس وقت ندا آئی اور

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۫ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ۝ اللہ نے فرمایا اس

کو پکڑ لو کچھ اندیشہ نہ کرو (میرے پاس آکر پیغمبر کسی سے نہیں ڈرتے) میں دوبارہ لوٹا کر اس کی پہلی حالت اور ہیئت کر دوں گا۔

سِیْرَۃٌ بروزن فِعْلَۃٌ ایک بار چلنا، مجازاً مراد ہے طریقہ ہیئت، حالت۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت موسیٰؑ اس وقت اونی جبہ پہنے ہوئے تھے جب حکم ہوا خُذْهَا اس کو پکڑ لو تو آپ نے جبہ کا دامن ہاتھ کو لپیٹ کر پکڑنا چاہا اللہ نے حکم دیا ہاتھ کھول دو (جبہ کا دامن ہاتھ پر مت لپیٹو) حضرت نے ہاتھ کھول دیا۔ بعض اہل روایت کا بیان ہے جب حضرت موسیٰؑ نے ہاتھ پر جبہ کا دامن لپیٹ لیا تو ایک فرشتہ نے کہا دیکھو آپ کو جس بات کا خوف ہے اگر اسی کے واقع ہو جانے کا اللہ حکم دیدے تو کیا یہ جبہ اس کو دفع کر سکتا ہے، حضرت موسیٰؑ نے فرمایا نہیں لیکن میں کمزور ہوں میرا ضعف خلقی ہے اس کے بعد آپ نے ہاتھ کھول کر سانپ کے منہ میں دیدیا یکدم سانپ لاٹھی بن گیا اور ویسی ہی لاٹھی ہو گئی جیسی پہلے تھی اور لاٹھی کا وہ دوشاخہ سرا ہاتھ میں آ گیا جس پر سہارا دے کر آپ کھڑے ہوتے تھے۔

اہل تفسیر نے لکھا ہے اللہ نے یہ نشان قدرت حضرت موسیٰؑ کو اس لئے دکھایا کہ جب فرعون کے سامنے موسیٰؑ یہ معجزہ دکھائیں تو خود خوف زدہ نہ ہو جائیں۔

بغوی کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت موسیٰؑ سفر میں لاٹھی پر اپنے کھانے پینے کا سامان لاد دیا کرتے تھے وہ سامان اٹھائے ہوئے حضرت کے ساتھ ساتھ باتیں کرتی چلتی تھی آپ اسی لاٹھی کو زمین پر مارتے تو دن بھر کا کھانا برآمد ہو جاتا اور زمین میں گاڑ دیتے تو پانی نکل آتا جب اکھاڑ لیتے تو پانی بند ہو جاتا تھا، اگر کسی پھل کی خواہش ہوتی تو لاٹھی کو زمین پر گاڑ کر کھڑا کر دیتے۔ لاٹھی درخت کی سرسبز شاخ بن جاتی جس میں پتے بھی ہوتے اور پھل بھی۔ کنوئیں سے پانی کھینچنا چاہتے تو لاٹھی کو کنوئیں میں لٹکا دیتے کنواں جتنا گہرا ہوتا لاٹھی اتنی ہی لمبی ہو جاتی اور اس کے سر کا دوشاخہ ڈول کی طرح بن جاتا اس طرح آپ پانی بھر لیتے، رات میں لاٹھی چراغ کی طرح روشن ہو جاتی تھی اگر کوئی دشمن سامنے آ جاتا تو خود اس سے لڑتی اور حضرت موسیٰؑ کی طرف سے دفاع کرتی تھی (وَكُلُّهَا مِنَ الْاَبَاطِيْلِ الْاِسْرَائِيْلِيَّةِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔ مترجم)

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۝

اور تم اپنا (دایاں) ہاتھ اپنی (بائیں) بغل میں دے لو (پھر نکالو) وہ بغیر کسی خرابی (یعنی مرض) کے نہایت روشن ہو کر نکلے گا۔ کہ یہ دوسری نشانی ہو گی۔

یَدٌ سے مراد ہے دائیں ہتھیلی، بغوی نے لکھا ہے کہ جَنَاحٌ سے مراد ہے بائیں بغل، بغوی نے اِلٰی کا ترجمہ نیچے کیا ہے

اور مجاہد کی طرف اس کو منسوب کیا ہے (یعنی بائیں بغل کے اندر دائیں ہتھیلی کو لے جاؤ) آدمی کا بازو بغل کے اندر تک جناح کہلاتا ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے اصل میں جَنَاح پرندہ کا بازو ہوتا ہے، انسان کے لئے جَنَاح کا استعمال بطور استعارہ کیا جاتا ہے۔

قاموس میں ہے سینہ کی طرف کی پسلیاں جوانح کہلاتی ہیں اس کا مفرد جانحۃ ہے جَنَاح بازو، ہاتھ اور بغل۔

تَخْرُجْ یعنی ہاتھ کو بغل کے نیچے لے جاؤ پھر نکالو تو وہ سفید، چمکدار، روشن بغیر کسی بیماری کے برآمد ہوگا سوء بیماری خرابی مراد برص (برص سے بھی جلد سفید ہو جاتی ہے۔ جس کی اس جگہ لفظ سوء فرما کر نفی کر دی) بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے روشن چمکدار نور برآمد ہوتا تھا جو دن میں یا رات میں ہر وقت چاند سورج کی طرح جھلکتا تھا۔ اٰیَۃً اُخْرٰی سے یہ مراد ہے کہ یہ دوسرا معجزہ ہوگا جو تمہارے دعوائے نبوت کی تصدیق کرے گا۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۳﴾ تاکہ ہم تم کو اپنی قدرت کی بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دکھائیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا ید بیضاء حضرت موسیٰؑ کا سب سے بڑا معجزہ تھا۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے۔ یعنی یہ دونوں معجزے لے کر فرعون کے پاس جاؤ اور اس کو اللہ کی عبادت کی دعوت دو وہ نافرمانی اور سرکشی میں حد سے آگے بڑھ چکا ہے، یہاں تک کہ الوہیت کا مدعی بن بیٹھا ہے۔ ع ۱

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ موسیٰؑ نے کہا اے میرے رب میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے کہ اس کے اندر وہ معرفت وجدانیہ سما جائے جس کو کوئی عقل بطور نظر حاصل نہیں کر سکتی۔ تیری ذات کے علاوہ پھر مجھے کسی کے اندر نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت نظر نہ آئے اور فرعون اور اس کی حکومت کا خوف میرے دل سے جاتا رہے، حضرت ابن عباس نے آیت کی تشریح میں بیان کیا موسیٰ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں تیرے سوا پھر کسی سے نہ ڈروں۔ بات یہ تھی کہ فرعون اور اس کے لشکر واقتدار کی وہ شان وشوکت تھی کہ حضرت موسیٰ کو بھی اس سے خوف محسوس ہوتا تھا (اس لئے آپ نے شرح صدر اور بے خوف ہو جانے کی دعا کی)

وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾ اور میرا کام میرے لئے آسان کر دے۔ یعنی ایسی سہولت پیدا کر دے اور ایسی توفیق دیدے کہ میں تبلیغ رسالت کر سکوں اور ادائے واجب کی کوئی دشواری میرے لئے نہ رہے، کوئی بار بھی محسوس نہ ہو بلکہ ادائے فرض کی تکالیف برداشت کرنے میں مجھے لذت محسوس ہونے لگے۔

اِشْرَحْ اور یَسِّرْ کے الفاظ پہلے مبہم بولے پھر صَدْرِيْ اور اَمْرِيْ کے الفاظ بڑھا کر اس کی تشریح کر دی اس سے کلام میں زور اور طرز ادا میں قوت پیدا ہو گئی۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ وہ میری بات سمجھ لیں۔ بغوی نے لکھا ہے، بچپن میں حضرت موسیٰؑ ایک روز فرعون کی گود میں تھے کہ آپ نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا اور داڑھی نوچ لی۔ فرعون نے اپنی بی بی آسیہ سے کہا یہ میرا دشمن ہے میں اس کو قتل کرائے دیتا ہوں، آسیہ نے کہا یہ بچہ ہے بے سمجھ اس کو کچھ تمیز نہیں بھلے برے کو نہیں پہچانتا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کی والدہ نے آپ کا دودھ چھڑایا تو واپس لا کر آسیہ کو دیدیا، چنانچہ آپ نے فرعون اور اس کی بی بی کی گود میں پرورش پائی دونوں نے آپ کو بیٹا بنا لیا ایک روز فرعون کے سامنے کھیل رہے تھے اور ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، یکدم چھڑی فرعون کے سر پر ماردی، فرعون نے غضبناک ہو کر قتل کرا دینے کا ارادہ کر لیا۔ آسیہ نے کہا بادشاہ سلامت یہ بے سمجھ بچہ ہے اگر آپ چاہیں تو تجربہ کر لیں۔ چنانچہ آسیہ نے دو طشت موسیٰؑ کے سامنے رکھ دیئے موسیٰ نے ہاتھ بڑھا کر جواہرات کے طشت میں ڈالنا چاہا لیکن حضرت جبرئیل نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر انگاروں والے طشت میں ڈال دیا۔ آپ نے انگار پکڑ کر منہ میں رکھ لیا جس سے آپ کی زبان جل گئی اور زبان میں گرہ پیدا ہو گئی۔

عبد بن حمید اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے بحوالۂ سعید بن جبیر بیان کیا کہ ایک روز فرعون نے موسیٰؑ کو اٹھا لیا، آپ نے اس کی داڑھی پکڑ کر نوچ لی۔ فرعون نے غضبناک ہو کر قتل کر دینے کا حکم دے دیا۔ آسیہ نے کہا، بچہ ہے انگارے اور یاقوت میں فرق نہیں کر سکتا۔ فرعون نے دونوں چیزیں منگوا کر آپ کے سامنے رکھ دیں آپ نے یاقوت کو پکڑنا چاہا مگر جبرئیل نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر انگارے پر رکھ دیا اور آپ نے انگار اٹھا کر منہ میں رکھ لیا جس سے زبان جل گئی اور گرہ پڑ گئی۔

کیا حضرت موسیٰؑ کی زبان کی گرہ بالکل کھل گئی تھی۔

اس کے متعلق مثبت منفی دو قول آئے ہیں جو لوگ بالکل گرہ کھل جانے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے جواب میں فرمایا قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ (تیری درخواست پوری کر دی گئی) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان کی گرہ بالکل کھول دی گئی تھی۔ جو لوگ نفی کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ (باوجود زبان کی گرہ کھول دینے کے درخواست کی) حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارون کے متعلق فرمایا تھا هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا وہ مجھ سے فصیح اللسان ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ فرعون نے کہا تھا اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ اس ذلیل شخص سے میں بہتر ہوں وَلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ذلیل بھی ہے اور کھول کر کلام بھی نہیں کر سکتا۔ اس فریق نے اول گروہ کے استدلال کا جواب یہ دیا کہ حضرت موسیٰؑ نے بالکل زبان کی گرہ کھولنے کی درخواست نہیں کی تھی بلکہ اتنی گرہ کھولنے کی درخواست کی تھی کہ لوگ آپ کی بات سمجھ جائیں چنانچہ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ اس کے بعد اسی لئے کہا تھا کہ لوگ میری بات سمجھ جائیں یعنی اتنی گرہ کھول دے کہ مطلب سمجھانے میں رکاوٹ نہ رہے۔ کامل طور پر گرہ کھولنے کی دعا ہی نہیں کی تھی۔

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِی ﴿۳۰﴾ اور میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا مددگار بنا دے۔

وَزِیْر، وِزْرٌ سے مشتق ہے وِزْرٌ کا معنی ہے بوجھ، بادشاہ کی طرف سے وزیر پر بھی بار حکومت ہوتا ہے۔ یا وَزَرِ جَبَل سے لفظ وَزِیْر مشتق ہے، وَزَرِ جَبَل پہاڑی پناہ گاہ کو کہتے ہیں، بادشاہ بھی وزیر کی رائے سے مدد لیتا ہے اور اپنی حکومت کے معاملات میں اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مُوَازَرَت (باب مفاعلہ) باہم مدد کرنا۔ بھی اسی سے ماخوذ ہے۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ وَزِیْر اصل میں اَزِیْر تھا اَزِیْر اَزْرٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور اَزْرٌ کا معنی ہے قوت۔ اَزِیْر قوی اور اَزِیْر بمعنی مَاَزِرٌ کے ہے جیسے عَشِیْر بمعنی مُعَاشِر اور جَلِیْس بمعنی مُجَالِس کے آتا ہے۔ ہمزہ کو واؤ سے بدل دیا گیا۔

اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ﴿۳۱﴾ اس سے میری کمر کو مضبوط کر دے یا میری قوت کو مستحکم کر دے یا میری کمزوری کو اس کے ذریعہ سے طاقت ور بنا دے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے اَزْر گھیر لینا۔ پشت، قوت اور قوت کی ضد ضعف (یعنی اضداد میں سے ہے)

وَاَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۳۲﴾ اور میرے (اس) کام میں اس کو میرا شریک کر دے یعنی نبوت اور تبلیغ رسالت میں ہارون کو میرا ساتھی بنا دے۔

كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ﴿۳۴﴾ تاکہ ہم تیری پاکی بکثرت بیان کریں اور تیری یاد بہت کریں۔ کلبی نے کہا تسبیح سے مراد نماز پڑھنا۔ حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارون کو مددگار بنا دینے کی درخواست اس لئے کی کہ باہم تعاون سے امور خیر کی تکمیل میں سہولت پیدا ہو جائے۔

اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ﴿۳۵﴾ بیشک تو ہم سے خوب واقف ہے۔ بَصِیْر سے مراد ہے احوال کو جاننے والا۔ یعنی تو ہمارے احوال کو بخوبی جانتا ہے اور اس بات سے واقف ہے کہ ہارون کا اور میرا تعاون ہمارے کاموں کو درست کر دے گا اور تیرے احکام کی تعمیل میں ہارون میری مدد کرے گا۔

قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ ﴿۳۶﴾ اللہ نے فرمایا موسیٰ! تمہارا سوال پورا کر دیا گیا، یعنی تمہاری سب مانگیں تم کو دیدی گئیں۔ سُؤْلٌ بروزن فُعْلٌ بمعنی مَسْئُوْلٌ جیسے خُبْزٌ بمعنی مَخْبُوْزٌ اور اُكُلٌ بمعنی مَاْكُوْلٌ آتا ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ﴿۳۷﴾ اور ہم ایک بار اور بھی (بغیر درخواست کے) تم پر احسان کر چکے ہیں۔ یعنی اس سے پہلے یا ایک اور وقت، بعض نے کہا یہ عی بار مراد ہے۔

إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ﴿۳۸﴾ جب کہ ہم نے تمہاری ماں کو وہ بات الہام سے بتائی جو الہام سے بتانے کی تھی۔ (حضرت مفسر نے اَوْحَیْنَا کی تشریح میں فرمایا) الہام سے بتایا یا خواب میں یا اس وقت کے کسی نبی کی زبانی یا فرشتے کی معرفت۔ لیکن فرشتہ کی معرفت اگر وحی کی گئی تو بطریق نبوت نہ تھی۔

فائدہ

وحی اور تشریعی نبوت کے لئے انبیاء مخصوص ہیں اور انبیاء سب کے سب مرد ہی ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ پر اس نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ البتہ وحی غیر تشریعی انبیاء کے لئے مخصوص نہیں ہے خواہ بطریق الہام ہو یا بکلام ملائکہ، نہ اس کے لئے مردوں کی خصوصیت ہے جس طرح حضرت مریم سے فرشتے نے کلام کیا تھا، اولیاء کے پاس بھی یہ وحی آتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی اس کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ اسی طرح کمالات نبوت کا حصول بھی اولیاء کو بالتبع یعنی انبیاء کی خوشہ چینی سے ہو جاتا ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے فتوحات کے باب نمبر ۷۰ ۲ میں لکھا ہے کہ تشریعی نبوت کا اگرچہ اس امت کے سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن میراث نبوت کا سلسلہ نہیں منقطع ہوا اس امت میں بعض افراد میراث نبوت کیلئے وارث ہوتے ہیں، بعض میراث رسالت کے، بعض دونوں کے۔ علماء جو کہتے ہیں کہ نبوت محض اختصاص الٰہی (وہبی عنایتی محض انتخاب الٰہی) ہے اس سے مراد نبوت تشریعی ہے یعنی بوحی الٰہی اللہ کی طرف سے احکام کا نزول براہ راست صرف انبیاء کے لئے مخصوص ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی تشریعی نبوت کے متعلق فرمایا ہے کہ نبوت اور رسالت منقطع ہو گئی۔ میرے بعد نبوت نہیں ہے۔ شیخ اکبر نے فتوحات کے باب الصلوٰۃ کے آخر میں بھی ایسی ہی تشریح کی ہے اور فرمایا یہ (ذیلی) انبیاء وہی مقربین بارگاہ ہیں جن کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ۔ میں نے سورۃ النساء اور سورۃ الواقعہ کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ مقربین سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو کمالات نبوت حاصل ہو چکے ہوں لیکن وراثۃً (اور ذیلی طور پر نہ براہ راست تشریعاً) پس وحی غیر تشریعی انبیاء ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کی وحی کو تحدیث فرمایا ہے، امام احمد، بخاری، مسلم، نسائی اور ابو نعیم موصلی نے حضرت ابوہریرہؓ کی اور حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم سے پہلی اقوام میں کچھ مُحَدَّث ہو گزرے ہیں میری امت میں اگر کوئی مُحَدَّث ہو سکتا ہے تو وہ عمر ہو گا۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے حدیث مذکور ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے تم سے پہلے بنی اسرائیل میں کچھ ایسے لوگ گزرے ہیں کہ ان سے (اللہ کی طرف سے) کلام کیا جاتا تھا باوجودیکہ وہ انبیاء نہیں تھے اب اگر اس امت میں کوئی (ایسا) ہوا تو وہ عمر ہو گا۔ اسی بناء پر حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب ہوتا۔ رواہ احمد والترمذی وابن حبان والحاکم عن عقبۃ بن عامر والطبرانی عن عصمۃ بن مالک وابی سعید الخدری، وابن عساکر عن ابن عمر۔

شیخ شعرانی نے الیواقیت والجواہر میں سوال کیا ہے کیا الہام بلاواسطہ ہوتا ہے پھر خود ہی جواب میں کہا ہے ہاں الہام بلاواسطہ اس غیبی لگاؤ کی وجہ سے ہوتا ہے جو ہر ایک انسان کا اپنے رب سے ہے اس سے فرشتہ بھی واقف نہیں ہوتا لیکن اس اندرونی تعلق و ربط کا انکار لوگ بہت جلدی سے کر دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضر کے اسی تعلق کا فوری انکار کیا تھا۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ انبیاء اور پیغمبر تو فرشتہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور غیر انبیاء صرف اثر دیکھتے ہیں فرشتوں کو نہیں دیکھتے مگر غیر مبصر فرشتہ کی معرفت (بھی) الہام ہوتا ہے اور کبھی بغیر کسی واسطہ اس مخفی تعلق و رابطہ کی بناء پر جو ہر انسان

اور اس کے رب کے درمیان قائم ہے، مؤخر الذکر الہام کا اعلیٰ اور افضل درجہ ہے اس میں انبیاء اور اولیاء سب ہی شریک ہوتے ہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعراوی نے شیخ ابوالمواہب شاذلی کا مقولہ نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کہے میرے دل نے میرے رب کی طرف سے مجھ سے کلام کیا تو اس شخص کی تردید یا انکار درست نہیں کیونکہ اس قول کا مقصد یہ ہے کہ بطریق الہام میرے سامنے اللہ کی طرف سے مجھ سے کہا، الہام تو اولیاء کی وحی ہے جو انبیاء کی وحی سے کم درجہ ہے ہاں اگر کوئی کہے کہ میرے رب نے مجھ سے کلام کیا جیسے موسیٰؑ سے کیا تھا تو یہ قول ضرور قابل ردو انکار ہے۔

میں کہتا ہوں کبھی ولی کو بھی آنکھوں سے فرشتہ نظر آتا ہے جیسے حضرت مریم نے جبرئیلؑ کو دیکھا تھا (یا سبز عماموں والے فرشتوں کو بدر میں بعض صحابہ نے دیکھا تھا۔ مترجم)

مَا یُوْحٰی کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے ایک تو وہی ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا، دوسرا یہ کہ جو بات بغیر وحی کے عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی وہ موسیٰؑ کی والدہ کو ہم نے بذریعہ وحی بتائی۔

اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ

کہ موسیٰؑ کو ایک صندوق میں رکھ پھر موسیٰؑ کو (مع صندوق) دریائے نیل میں ڈال دے پھر موسیٰؑ کو دریا کنارے پر لے آئے گا۔ (آخر کار) موسیٰؑ کو ایک ایسا شخص لے لے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے۔

فَلْیُلْقِهِ کو امر کا صیغہ ہے لیکن بمعنی خبر ہے یعنی دریا اس کو لا ڈالے گا۔ بعض نے کہا امر اپنے اصلی معنی پر ہے یعنی اللہ نے دریا کو حکم دیا کہ وہ صندوق کو کنارے پر لے جائے۔ دریا صاحب عقل نہیں اس لئے اپنے ارادے سے تعمیل حکم نہیں کر سکتا لیکن یہاں امر تکوینی ہے جس کے لئے ذی عقل ہونے کی ضرورت نہیں۔ بیضاوی نے لکھا ہے دریا کا صندوق کو کنارہ تک لے جانا لازمی امر تھا کیونکہ اللہ کی مشیت یونہی تھی تو گویا دریا کو ایسا قرار دیا کہ وہ امتیاز و فہم رکھتا ہے اور اللہ کے حکم سے آگاہ ہے۔

محقق اہل تصوف کہتے ہیں کہ جمادات ہمارے لحاظ سے ضرور عقل و خرد سے محروم اور بے سمجھ ہیں ہم ان کو خطاب نہیں کر سکتے نہ وہ ہماری بات سمجھ سکتے ہیں لیکن اللہ کے فرمان کو تو خوب سمجھتے اور اطاعت کرتے ہیں اللہ ان کو حکم دے سکتا ہے قرآن مجید کی متعدد آیات صراحتاً اس پر دلالت کر رہی ہیں۔ ایک جگہ فرمایا ہے وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ اور زمین نے اپنے رب کے حکم کو سنا اور ایسا اس کیلئے لازم تھا۔ دوسری آیت میں ہے قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ پہاڑ (دوسرے) پہاڑ کو پکارتا ہے (اور پوچھتا ہے) کیا تیرے اوپر کوئی ایسا آدمی گزرا جو اللہ کا ذکر کر رہا ہو۔ فاضل رومیؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند　　پیش تو مردہ و بر حق زندہ اند

اللہ نے فرعون کو اپنا دشمن بھی قرار دیا اور حضرت موسیٰؑ کا بھی۔ فرعون چونکہ مشرک تھا اس لئے اللہ کا دشمن تو درحقیقت تھا ہی لیکن حضرت موسیٰؑ کو لیتے اور اپنے پاس رکھنے کے وقت آپ کا دشمن نہ تھا۔ آئندہ زمانہ میں دشمن ہونے والا تھا اس لئے موسیٰؑ کا فرعون کو دشمن کہنا مجازاً ہے اسی لئے عَدُوٌّ کا لفظ الگ الگ دوبار ذکر کیا (اول عَدُوٌّ سے مراد حقیقی دشمن اور دوسرے عدو سے مراد آئندہ ہونے والا دشمن ہے) پھر تکرار ذکر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر صرف ایک بار ہی عَدُوٌّ کا لفظ ذکر کیا جاتا اور حقیقی و مجازی دونوں طرح کا دشمن ہونا مراد ہوتا تو ایک ہی وقت میں حقیقی معنی بھی مراد ہوتا اور مجازی بھی اور حقیقت و مجاز صحیح نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تکرار عَدُوٌّ محض مبالغہ کے لئے ہو (یعنی فرعون کا دشمن ہونا پرزور طور پر ذکر کر دیا جائے) اور دونوں جگہ عَدُوٌّ سے مراد ہو آئندہ ہو جانے والا دشمن، خدا کا بھی اور موسیٰؑ کا بھی۔ یا یوں کہا جائے کہ فرعون بہر حال ایک ہی وقت میں خدا کا بھی دشمن تھا اور موسیٰؑ کا بھی۔ خدا کا دشمن ہونا تو ظاہر ہے وہ مشرک تھا اور موسیٰؑ کا دشمن اس طور پر تھا کہ کاہنوں اور نجومیوں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری حکومت ختم ہو جائے گی۔ اسی لئے فرعون نے ہر سال بنی اسرائیل کے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرانا شروع کر دیا تھا لیکن موسیٰؑ کو (باوجود سخت

دشمن ہونے کے وہ پہچانتا نہ تھا ورنہ فوراً قتل کرا دیتا بہر حال موسیٰؑ کا وہ دشمن ضرور تھا۔ نہ پہچاننے کی وجہ سے قتل نہیں کرایا تھا۔ چاروں جگہ مفعول ضمیریں اور پانچویں جگہ اَنْ کی مجرور ضمیر حضرت موسیٰؑ کی طرف راجع ہیں یہ ممکن ہے کہ دوسری تیسری اور چوتھی ضمیریں تابوت کی طرف راجع ہوں اور پہلی اور پانچویں ضمیر موسیٰؑ کی طرف راجع ہو لیکن اس صورت میں اختلال عبارت اور تنافر ترتیب لازم آئے گا۔ دریا میں اور کنارے پر جس کو براہ راست پھینکا گیا وہ صندوق ہی تھا لیکن حضرت موسیٰ اس کے اندر تھے اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ موسیٰؑ کو (صندوق کے اندر رکھ کر) تو دریا میں پھینک دیا اور دریا موسیٰؑ کو صندوق سمیت کنارے پر لا ڈالے گا۔

بغوی کا بیان ہے حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے ایک صندوق لے کر اس کے اندر دھنی ہوئی روئی بچھائی اور موسیٰؑ کو اس میں رکھ کر سرپوش ڈھانک کر تمام درزیں اور شگاف روغن قیر سے بند کر کے صندوق کو نیل میں ڈال دیا، نیل سے ایک نہر نکل کر فرعون کے مکان کے اندر جاتی تھی صندوق بہتا بہتا اس شاخ میں چلا گیا۔ فرعون اپنی بی بی آسیہ کے ساتھ اس وقت نہر کے دہانے پر بیٹھا تفریح کر رہا تھا کہ بہتا ہوا صندوق اندر آ گیا فرعون نے باندیوں اور غلاموں کو حکم دیا کہ اس کو نکال لائیں۔ خادم صندوق کو پکڑ کر لائے۔ سرپوش کھول کر دیکھا تو اندر سے ایک نہایت شگفتہ رنگ کا خوب صورت بچہ برآمد ہوا۔ فرعون دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا اور ایسا بے قابو ہوا کہ ضبط نہ کر سکا، آیت ذیل سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ اور میں نے تمہارے اوپر اپنی طرف سے ایک اثر محبت ڈال دیا۔ یعنی میں نے اپنی طرف سے لوگوں کے دلوں میں تیری محبت ڈال دی یا یہ مطلب ہے کہ میں نے تجھ پر اپنی محبت ڈال دی۔ تجھ سے محبت کی اور ظاہر ہے کہ جب اللہ نے موسیٰؑ سے محبت کی تو لوگوں کے دلوں میں بھی آپ کی محبت پیدا ہو گئی، حضرت ابن عباسؓ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا، میں نے اس سے محبت کی پس مخلوق کی نظر میں بھی اس کو محبوب بنا دیا۔ عکرمہ نے کہا جو بھی اس بچہ کو دیکھتا تھا پیار کرنے لگتا تھا۔ قتادہ نے کہا موسیٰؑ کی آنکھوں میں عجیب ملاحت تھی کہ جو بھی آپ کو دیکھتا عاشق اور فریفتہ ہو جاتا۔

آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنی طرف سے اپنی محبت تیرے دل میں ڈال دی کہ میری محبت تجھ پر غالب آ گئی تو مجھ سے خالص دل سے محبت کرنے لگا تیرا دل میری محبت میں ایسا ہو گیا کہ پھر کسی دوسرے کی طرف اس کی توجہ ہی نہیں رہی پس تو سرگروہ عشاق ہو گیا۔

شیخ مجدد الف ثانی نے فرمایا کلیم کا مبدء تعین خالص محبیت (اور عشق) ہے اسی لئے آپ اہل محبت (اور عشاق) کے سالار ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کا مبدء تعین خالص محبوبیت ہے اس لئے آپ محبوبوں کے سرگروہ قرار پائے۔

صوفی بنظر کشف دیکھتا ہے کہ محبت کا ایک دائرہ ہے اس دائرہ کا ایک محیط ہے اور ایک مرکز پھر اس مرکز کا بھی ایک محیط (گرداگرد کا کنارہ ہے) اور ایک وسطی نقطہ، پس دائرۂ محبت کے محیط کا نام خلت ہے، حضرت خلیل اللہ کا مبدء تعین ہے اور جس طرح مرکز محیط سے افضل، اعلیٰ اور وسیع تر ہوتا ہے اسی طرح مقام محبت کو مقام خلت پر فضیلت حاصل ہے اور مرکز (محبت) کی نسبت محیط (خلت) سے ایسی ہے جیسے چاند کی نسبت اس کے ہالے سے۔

پھر مرکز کی بھی دو حیثیات ہیں ایک مرکز کا کنارہ اور محیط دوسرا مرکز کا وسطی نقطہ۔ پس مقام محبیت مرکز کا محیط ہے اور یہی کلیم اللہ کا مبدء تعین ہے اور مرکز کا وسطی نقطہ مقام محبوبیت ہے جو حبیب اللہ ﷺ کا مبدء تعین ہے آپ خالص بے آمیزش محبوبیت کے مرکز دائرہ تھے۔ محیط دائرہ محبوبیت یعنی مخلوط محبوبیت آپ نے اپنی امت کے بعض افراد کے لئے چھوڑ دی (حضرت مفسرؒ نے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو مخلوط محبوبیت کا حامل قرار دیا بلکہ حصر کے ساتھ فرمایا کہ) جس فرد امت کے لئے مخلوط محبوبیت چھوڑی گئی وہ حضرت شیخ مجددؒ کی ہی شخصیت گرامی تھی۔

آیت کے الفاظ سے بظاہر معلوم ہو رہا ہے کہ دریا نے صندوق ساحل پر پہنچا دیا پھر فرعون کے آدمیوں نے اس کو نکال لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا دشمن اور وہ شخص جو ان کے لئے آئندہ غم آفریں بن کر آنے والا تھا ان کے پاس پہنچ گیا۔ دریا کے ساحل

سے مراد ہے دریا سے نکلی ہوئی نہر کا کنارہ۔

وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝ اور تاکہ تم میری نگرانی میں پرورش پاؤ۔ صَنَعْتُ فَرَسِيْ میں نے اپنے گھوڑے کو بنالیا یعنی اس کی خوب خدمت اور نگہداشت کی۔ صنع کا معنی ہے حسن سلوک۔

اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۭ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ڛ (یہ قصہ اس وقت کا ہے) جب تمہاری بہن چلتی ہوئی آئی پھر کہنے لگی کیا میں تم کو ایسی عورت کا پتہ بتاؤں جو اس (بچہ) کو (اچھی طرح سے) پالے رکھے اس تدبیر سے ہم نے تم کو تمہاری ماں کے پاس پہنچادیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ رہے۔

یعنی حضرت موسیٰؑ کی بہن مریم موسیٰؑ کی خبر لینے یونہی چلتی چلتی ادھر بھی آپہنچی جہاں موسیٰؑ کو نوکروں چاکروں نے صندوق سے باہر نکالا اور دودھ پلانے والی عورتوں کو بلوالیا تھا مگر بچہ کسی کا دودھ نہیں پی رہا تھا تو اس نے کہا میں تم کو ایسی عورت کا پتہ بتاتی ہوں جو ذمہ داری کے ساتھ اس کی نگہداشت کرے گی (اور دودھ پلائے گی) منظوری کے بعد وہ حضرت موسیٰ کی ماں کو بلا لائی ماں نے دودھ پلایا تو آپ نے پی لیا اور اس طرح اللہ کا وہ وعدہ پورا ہوا کہ ہم اس کو لوٹا کر تیرے پاس لے آئیں گے۔ وَلَا تَحْزَنَ اور وہ تمہاری جدائی سے غمگین نہ رہے یا تم ماں کی محبت نہ پاکر غمگین نہ ہو۔

وَقَتَلْتَ نَفْسًا اور تم نے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا۔ یعنی ایک کافر ظالم قبطی کو قتل کر دیا تھا جو ایک اسرائیلی پر ظلم کر رہا تھا اور اسرائیلی نے موسیٰؑ سے فریاد کی تھی کذا قال ابن عباس۔ اس وقت آپ کی عمر بارہ سال کی تھی کذا قال کعب الاحبار۔

فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ پھر ہم نے تم کو اس غم سے نجات دی حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنے کے بعد اللہ کے عذاب کا خوف تھا لیکن اللہ نے (یہ نادانستہ جرم معاف کر دیا آپ کو فرعون کی طرف سے انتقام کا بھی ڈر تھا۔ اللہ نے یہ غم بھی دور کر دیا کہ مدین کی طرف مصر سے نکال کرلے گیا۔

وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ڛ اور ہم نے تم کو خوب خوب محنتوں میں ڈالا۔ فُتُوْن بروزن قُعُوْد مصدر ہے یا جمع ہے حضرت ابن عباسؓ نے آیت کا ترجمہ کیا ہم نے تمہاری خوب آزمائش کی۔ ضحاک نے کہا ہم نے تمہاری خوب جانچ کرلی یہ دونوں ترجمے اس وقت ہوں گے جب فُتُوْن کو مصدر اور مفعول مطلق مانا جائے۔ یا یوں ترجمہ کیا جائے گا کہ ہم نے طرح طرح سے تمہارا امتحان لیا۔ اس ترجمہ پر فُتُوْن کو فتن کی یا فِتْنَۃٌ کی جمع مانا جائے گا اگر فِتْنَۃٌ کی جمع مانا جائے گا تو فِتْنَۃ کی آخری تاء کو نظر انداز کر دیا جائے گا جیسے حجرہ کی جمع حجور اور بدرہ کی بدور آتی ہے۔

مجاہد نے ترجمہ کیا ہم نے خالص بنالیا (یعنی تکلیف اور مشقت ڈال کر تم کو نکھار دیا اور پھر تم کو چن لیا)

سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا کہ فُتُوْن سے مراد ہے مصیبتوں میں پڑنا جن سے بالآخر اللہ نے آپ کو نجات عطا فرمادی۔ پہلی مصیبت یہ تھی کہ آپ اس سال ماں کے پیٹ میں آئے جو سال فرعون کی طرف سے نوزائیدہ لڑکوں کے قتل کا تھا۔ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ آپ کو صندوق میں رکھ کر دریا میں پھینک دیا گیا۔ تیسرا امتحان کا موقع وہ تھا کہ آپ نے ماں کے سوا کسی اور عورت کی پستان منہ میں بھی نہیں لی۔ چوتھا نزول مصیبت کا وقت وہ تھا کہ آپ نے فرعون کی داڑھی پکڑلی تھی اور فرعون نے آپ کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن آسیہ کی سفارش سے جب آپ کے پاس ایک طشت میں انگارے اور ایک میں یاقوت لائے گئے تو آپ نے انگارا اٹھالیا (اور اس طرح فرعون اپنے ارادہ سے باز آگیا) پانچویں مصیبت قبطی کو قتل کرنے اور مدین کی طرف بھاگ کھڑے ہونے کی تھی۔ حضرت مفسر نے فرمایا وطن کو چھوڑنے دوستوں عزیزوں سے جدا ہوتے پیدل چلنے زاد راہ بھی ساتھ نہ ہونے اور گرفتاری کا ہر وقت اندیشہ ہونے پھر مزدوری کرنے کی تیم ایک کے بعد دوسری مصیبت آنے اور متعدد دکھ اٹھانے نے موسیٰؑ کو نکھار دیا تھا جس طرح آگ میں تپانے سے سونا کندن ہو جاتا ہے اس کا میل کچیل صاف ہو جاتا ہے اسی طرح اللہ نے آپ کو بھی پاک صاف کر دیا۔

فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ڏ پھر مدین والوں میں تم (دس) سال رہے، حضرت شعیب کی صاحبزادی سے نکاح کیا اور حسب قرارداد مہر کے عوض آپ دس سال تک حضرت شعیب کی بکریاں چراتے رہے۔ مدین مصر سے آٹھ منزل پر ہے۔

وہب نے کہا حضرت موسیٰ حضرت شعیبؑ کے پاس اٹھائیس برس رہے دس سال تو مہر زوجہ کے عوض اور اٹھارہ سال اس کے بعد۔ آپ کی اولاد وہیں ہوئی۔

ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى پھر اے موسیٰ تم ایک خاص وقت پر (وادی مقدس کی طرف) آئے۔ یعنی جو وقت میں نے تمہارے آنے کا مقرر کر دیا تھا اس کے موافق تم یہاں آئے۔ محمد بن کعب نے کہا یہ مطلب ہے کہ انبیاء کے پاس وحی بھیجنے کا اندازۂ عمر جو مقرر کر دیا گیا ہے تم اس کو پہنچ گئے۔ انبیاء کے پاس وحی چالیس سال کی عمر میں آتی تھی۔ یعنی اس سے کم عمر بلاسوائے حضرت عیسیٰؑ کے اور کسی کے پاس نہیں آئی۔ مترجم۔ عبدالرحمٰن بن کیسان کا بھی یہی قول ہے اکثر اہل تفسیر نے علی قدر کا ترجمہ کیا ہے مقرر وعدہ جو اللہ نے مقدر کر دیا تھا کہ اس عمر میں موسیٰ کے پاس وحی رسالت بھیجے گا۔ یعنی چالیس سال کی عمر۔ یہ مطلب بھی محمد بن کعب کے بیان کردہ مطلب کی (کسی قدر) تائید کر رہا ہے۔

یٰموسیٰ دوبارہ فرما کر خطاب کرنے سے حضرت موسیٰ کو مانوس بنانا اور موسیٰؑ سے اپنی محبت کو ظاہر کرنا مقصود ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے اس چیز کا ذکر زیادہ کرتا ہے۔ رواہ صاحب مسند الفردوس من حدیث ام المومنین عائشہؓ۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ اور میں نے تم کو اپنے لئے منتخب کر لیا ہے یعنی تمہاری تربیت اپنے لئے کی اور اپنے لئے تم کو چن لیا تا کہ میرے علاوہ تم کسی اور سے دل نہ لگاؤ نہ ظاہر میں نہ باطن میں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے تم کو مکارم اخلاق کے لئے بنایا ہے اور اس طرح تربیت دی ہے کہ تم مجھ سے خطاب کرنے میرے قریب آنے اور میرا پیام پہنچانے کے قابل ہو گئے۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ تم اور تمہارے بھائی میرے (عطا کردہ) نشانات یعنی معجزات کے ساتھ جاؤ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا آیات سے مراد ہیں وہ نو معجزات جو حضرت موسیٰ کو دیئے گئے تھے۔

وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ اور تم دونوں میرے ذکر میں سستی نہ کرنا (سدی) یا کمی نہ کرنا (محمد بن کعب) قاموس میں ہے وَنَیٰ بروزن فَتیٰ تھکان سستی یہ وحی حضرت موسیٰ کو ہوئی تھی حضرت ہارون اس زمانہ میں مصر میں تھے، اللہ نے موسیٰ کو حکم دیا کہ ہارون کے پاس جاؤ ادھر ہارون کو وحی بھیجی کہ تم موسیٰؑ سے ملو۔ حسب الحکم حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ سے ملنے مصر سے نکل کر ایک منزل آئے تھے کہ ملاقات ہو گئی یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی اور آپ استقبال کے لئے مصر سے نکلے تھے۔ جب دونوں جمع ہو گئے تو اللہ نے دونوں کو زائد حکم دیا۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اس کو نصیحت کرو وہ بہت نکل چکا ہے کہ خدا ہونے کا مدعی بن بیٹھا ہے۔ اللہ نے شروع میں حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا، پھر دوبارہ دونوں بھائیوں کو ملا کر حکم دیا۔ اس لئے کلام میں تکرار نہیں ہے بعض علماء نے کہا کہ پہلا حکم مطلق تھا اور دوسرا حکم مقید ہے (آگے قید لگا دی ہے کہ نرمی سے کلام کرنا شاید وہ نصیحت قبول کر لے۔ الخ)

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بات کرنے میں درشتی نہ کرنا عکرمہ اور سدی نے کہا (نام نہ لینا بلکہ) کنیت کہہ کر کلام کرنا، فرعون کی کنیت ابو العباس یا ابو الولید تھی مقاتل نے کہا نرم کلام کرنے سے مراد ہے اس طرح کہنا هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ایسا کلام

دعوت ایمان ہے مگر بطور مشورہ نرم کلامی کے حکم کی وجہ یہ تھی کہ کس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں فرعون پر حمیت جاہلیت سوار نہ ہو جائے اور وہ دونوں پر حملہ نہ کر بیٹھے (اور بات بھی نہ سنے) بعض نے کلام میں نرمی اختیار کرنے کے حکم کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ فرعون کے زیر پرورش موسیٰ رہ چکے تھے اس کو حق تربیت حاصل تھا۔ سدی نے کہا نرم کلام یہ تھا کہ حضرت موسیٰ نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر تم ایمان لے آئے تو تم کو دوبارہ ایسی جوانی مل جائے گی جو کبھی پیری میں تبدیل نہیں ہو گی اور مرتے دم تک تمہاری حکومت قائم رہے گی اور کھانے پینے کی لذت اور جنسی مقاربت کی کیفیت وقت موت تک تم کو حاصل ہوتی رہے گی اور مرنے کے بعد جنت ملے گی۔ فرعون کو موسیٰ کی یہ بات پسند آئی لیکن ہامان کے مشورے کے بغیر وہ کوئی بات طے نہیں کرتا تھا۔ ہامان اس وقت موجود نہ تھا جب آیا اور فرعون نے اس سے موسیٰ کی باتیں نقل کیں اور مشورہ لیا اور قبول کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہامان نے کہا میں آپ کو دانش مند اور صاحب رائے سمجھتا تھا، آپ رب ہو کر کیا مربوب بننا چاہتے ہیں اب تک آپ کی پوجا ہوتی ہے تو کیا اب آپ دوسرے کی عبادت کرنے کے خواستگار ہیں، غرض ہامان نے فرعون کی رائے پلٹ دی۔

لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾ شاید وہ (برغبت) نصیحت پذیر ہو جائے یا (عذاب خداوندی سے) ڈر جائے یعنی اگر تم دونوں کی سچائی اس پر ظاہر ہو گی تو شاید نصیحت مان لے اور سچائی ظاہر نہ ہوئی اور نصیحت پذیر نہ ہوا تب بھی کم سے کم اتنا تو شاید ہو جائے کہ وہ ڈر جائے۔ اللہ کو تو کوئی شک نہ تھا اس کو معلوم ہی تھا کہ فرعون نصیحت پذیر نہ ہو گا یہ شک کا لفظ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون نے اپنے علم کی مناسبت سے استعمال کیا یعنی تم دونوں امید رکھو کہ شاید وہ مان لے۔

قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَاۤ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ موسیٰ اور ہارون نے کہا اے ہمارے رب ہم کو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَاۤ کا یہ مطلب ہے کہ تکمیل دعوت اور اظہار معجزات سے پہلے ہی کہیں وہ ہم کو قتل کرنے اور عذاب دینے کا حکم نہ دے بیٹھے۔

عربی محاورہ میں فَرُطَ عَلَيْهِ کا معنی ہوتا ہے دکھ پہنچانے میں عجلت کی۔ اصل میں فُرُطٌ کا معنی ہے آگے بڑھ گیا فَارِطٌ آگے بڑھنے والا۔

اَوْ اَنْ يَّطْغٰى کا یہ مطلب ہے کہ کہیں وہ اور زیادہ سرکش نہ ہو جائے، تیری شان میں مزید گستاخی کرنے لگے اور تیرے بندوں کو زیادہ دکھ پہنچانا شروع کر دے۔

قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِيْ مَعَكُمَاۤ اللہ نے فرمایا، تم دونوں (کچھ) اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ یقیناً ہوں، یعنی میری حفاظت اور مدد تمہارے ساتھ ہے۔ **اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾** میں (تمہاری پکار کو) سنوں گا اور (جو حرکت تمہارے ساتھ کرنے کا ارادہ کیا جائے گا اس کو) دیکھتا ہوں گا، یعنی میں تم دونوں سے غافل نہیں ہوں تم پروانہ کرو۔ یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے اور فرعون کے درمیان کیا گفتگو ہو گی کیا عمل اور سلوک ہو گا۔ بہر حال میں اس کو سنوں گا اور دیکھوں گا اور تمہاری مناسب مدد کروں گا تم پر دکھ نہ آنے دوں گا۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ سو تم اس کے پاس جا کر کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے فرستادے ہیں لہٰذا ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا۔

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ہم دونوں تیرے رب کے فرستادے ہیں یعنی ہم کو تمہاری طرف بھی بھیجا گیا ہے اور بنی اسرائیل کی طرف بھی۔

فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ یعنی ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو ملک شام کو چلے جانے دے ان کو اپنی عملداری سے آزاد کر دے اور اپنے کاموں کے بارے سبکدوش کر دے اور اپنی عبادت پر مجبور نہ کر اللہ کی عبادت آزادی کے ساتھ کرنے

دے۔

وَلَا تُعَذِّبْهُمْ یعنی ان کو سخت تکلیفیں اور دکھ نہ دے فرعون بنی اسرائیل سے دشوار ترین مشقت کے کام لیا کرتا تھا۔

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے (اپنی نبوت کا) نشان یعنی معجزہ بھی لے کر آئے ہیں اوپر کے کلام کے اندر رسالت کا دعویٰ بھی ضمناً مذکور تھا اس آیت سے دعویٰ رسالت کی تائید ہو رہی ہے معجزے تو دو تھے لیکن دو نشانیاں کہنا چاہئے تھا، لیکن آیت سے مراد اس جگہ فقط ثبوت اور دلیل ہے، دلیل کی وحدت و کثرت کا بیان پیش نظر نہیں۔ اسی طرح آیت قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ اور آیت فَاْتِ بِاٰيَةٍ میں نفس ثبوت مراد ہے، میں واضح دلیل تمہارے پاس لایا ہوں۔ تم کوئی دلیل پیش کرو۔

وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ اور جو سیدھی راہ پر چلے اور اس کے لئے سلامتی ہے (عذاب سے دونوں جہاں میں) یا یہ مطلب ہے کہ جو سیدھی راہ پر چلے اس پر سلام ہوگا میری طرف سے اور ملائکہ کی طرف سے اور جنت کے کارندوں کی طرف سے۔

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَاۤ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾ ہمارے پاس یہ حکم (بذریعہ وحی) پہنچا ہے کہ (اللہ کا) عذاب اس شخص پر ہوگا جو (حق کو) جھٹلائے اور (اس سے) روگردانی کرے۔ اَلْعَذَابَ دنیا اور آخرت میں اللہ کا عذاب۔ مَنْ كَذَّبَ جس نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ تَوَلّٰى اللہ کو ماننے اور اس کی عبادت کرنے سے پشت پھیری (یعنی انکار کیا مترجم) یہ کلام حضرت موسیٰ کے رسول ہونے کی علت ہے یا ذیلی تتمہ ہے حضرت مفسر نے فرمایا یا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ سے بدل ہے رفتار آیت سے یہی معلوم ہو رہا ہے۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾ فرعون نے کہا موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے۔ جس نے تم دونوں کو بھیجا ہے چونکہ اصل مخاطب موسیٰ ہی تھے اسی لئے لفظ ندا نو (یا) صرف موسیٰ پر داخل کیا لیکن پیغامبر ہونے کا دعویٰ دونوں کا تھا اس لئے تثنیہ مخاطب کی ضمیر ذکر کی۔ موسیٰؑ کے وزیر ہارونؑ تھے، پھر تعلق قدیم تربیت کا بھی موسیٰؑ سے ہی تھا یا فرعون گفتگو سے سمجھ گیا کہ موسیٰؑ کا بھائی تو بیان کے لئے ساتھ ہے مرکز گفتگو موسیٰ ہیں۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾ موسیٰ نے کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر اس کو راستہ دکھایا۔ حسن اور قتادہ نے کہا اللہ نے ہر چیز کو اس کی بھلائی اور بہتری کا سامان عطا فرمایا پھر اس کو اس چیز کے حصول کا جس میں اس کی بھلائی ہے راستہ بتا دیا۔

مجاہد نے آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہا اللہ نے ہر چیز کو اس کے مناسب صورت عطا فرمائی آدمی کی شکل جانوروں جیسی اور جانوروں کی شکل انسان جیسی نہیں بنائی پھر کھانے پینے اور قربت صنفی کرنے کی طرف اس کی راہنمائی کی۔

سعید بن جبیر نے کہا خلق سے مراد ہے ہر چیز کو اس کا ہم جنس جوڑا دیا مرد کو عورت اونٹ کو اونٹنی، گدھے کو گدھی اور گھوڑے کو گھوڑی۔ پھر صنفی قربت کا طریقہ اس کو فطرتاً بتا دیا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آیت میں اول مفعول کو دوسرا مفعول اور دوسرے مفعول کو اول مفعول کی جگہ دی ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوق کو ہر وہ چیز عطا فرما دی جس کی اس کو ضرورت تھی اور جو اس کے کام آسکتی تھی پھر اس کو وہ طریقہ بتا دیا جس سے وہ منفعت اندوز ہو سکے اور اپنی ہستی کی بقاء اور تکمیل تک بالارادہ یا اضطراری پہنچ سکے۔ بیضاوی نے لکھا ہے یہ توجیہ بہت ہی بلیغ ہے اس سے ہر مخلوق کی پوری حالت کا اظہار ہے مخلوق کوئی ہو (جاندار یا بے جان جامد یا نامی ذی حس یا بے حس۔ مترجم) اس کی کیفیت و حالت (تخلیقی) کو ظاہر کر دیا اور یہ بات بھی بیان کر دی کہ بے نیاز قادر مطلق اور ہر نعمت دینے والا اللہ ہی ہے اور ہر چیز اپنی ذات، صفات اور افعال میں اسی کی محتاج ہے اسی لئے فرعون متحیر ہو کر لاجواب ہو گیا اور کلام کا رخ اس نے پھیر دیا اور۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾ اس نے کہا پھر اقوام سابقہ کا کیا حال ہوا یعنی قوم

نوح، عاد، ثمود اور دوسری اقوام پارینہ کا کیا ہو گا جو بت پرست اور منکر قیامت تھیں ان کے ساتھ کیا سلوک ہو گا (کیا ان کے عقائد افکار و اعمال ان کے ساتھ تھیں مر گئے اب وہ کہاں اور ان کے عقائد و اعمال کہاں ہیں)

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ موسیٰ نے کہا ان کا علم میرے رب کے پاس دفتر (اعمال) میں (محفوظ) ہے میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے ان کا علم یعنی ان کے اعمال و احوال کا علم۔ کتاب سے مراد ہے لوح محفوظ۔ ضلال کسی چیز کی جگہ کا فراموش ہو جانا کہ اس کی جگہ نہ مل سکے نِسْیَان نفس چیز کو بالکل بھول جانا کہ اس کا تصور بھی دل میں نہ آئے۔ اللہ کے لئے دونوں ناممکن ہیں اللہ کسی چیز یا اس کی جگہ سے غافل نہیں ہے (اس کو معلوم ہے کہ فلاں فلاں چیز فلاں فلاں جگہ ہے)

بعض علماء نے کہا لَا يَضِلُّ کا معنی یہ ہے کہ نہ کوئی چیز رب سے غائب ہے نہ رب کسی چیز سے غیر حاضر ہے اور لَا يَنْسَى کا مطلب یہ ہے کہ ان کے احوال کو اللہ بھولتا نہیں ہے اس کو سب کے احوال معلوم ہیں مراد یہ ہے کہ ہمارا رب ان کو ہر عمل کا بدلہ دے گا اچھے عمل کا اچھا بدلہ۔ برے عمل کا برا بدلہ۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا

وہ رب ایسا ہے جس نے تم لوگوں کے لئے زمین کو (مثل) فرش کے بنایا اور اس زمین میں تمہارے چلنے کے لئے راستے بنائے۔

سُلُوْک راستہ میں چلنا۔ لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی اللہ نے فرمایا ہے لِتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا قاموس میں ہے سَلَکَ الْمَكَان سُلُوْكًا وہ اس جگہ چلا سَلَكَهٗ غَيْرُهٗ کسی دوسرے نے اس کو چلایا، اول مثال لازم کی ہے اور دوسری متعدی کی۔ آیت میں متعدی استعمال کیا گیا ہے سُبُلًا کو ظرف ہے لیکن مفعول بہ کے طور پر مجازاً استعمال کیا گیا ہے جس طرح مجازاً بہنے کی نسبت نہر (شگاف گڑھا، خندق) کی طرف کر دی جاتی ہے مثلاً کہتے ہیں نہر بہنے لگی حالانکہ پانی بہتا ہے نہر تو اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں پانی بہتا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے پہاڑوں وادیوں اور صحراؤں کے اندر زمین پر تمہارے لئے راستے بنا دیئے جن پر تم چلتے ہو راستہ پر چل کر زمین کے ایک حصہ سے دوسرے حصے کی طرف جاتے ہو، حضرت ابن عباس نے آیت کی تفسیر میں فرمایا اللہ نے زمین میں تمہارے لئے راستے آسان کر دیئے اس قول کا بھی وہی مطلب ہے جو ہم نے ابھی بیان کیا۔

بغوی نے کہا سَلَکَ کا معنی ہے ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا (پرونا چلانا) مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے زمین میں راستے داخل کر دیئے تاکہ تم ان پر چلو آیت میں آیا ہے مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ کس چیز نے تم کو دوزخ میں داخل کر دیا۔ چلا دیا۔

وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ فَأَخْرَجْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا مِنْ نَبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ

اور اس نے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے پانی کے ذریعے سے مختلف اقسام کے نباتات پیدا کئے اور تم کو اجازت دی کہ خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ۔

اَزْوَاجًا قسم قسم کی، طرح طرح کی اصناف۔ ماء سے مراد بارش شَتّٰى کا واحد شَتِيْتٌ ہے جیسے مَرْضٰى مَرِيْضٌ کی جمع ہے شَتّٰى یعنی مختلف اور متفرق صورتوں اور خواص و احوال والی جن کے منافع بھی مختلف ہیں کوئی انسان کے لئے مناسب ہے کوئی چوپایوں اور چرندوں کے لئے اِرْعَوْا رَعْيٌ سے بنا ہے رعی لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی (چرو اور چراؤ) عرب بولتے ہیں رَعَيْتُ الْقَوْمَ میں نے قوم کی حفاظت اور نگہداشت کی۔ فراغت پس وہ محفوظ ہو گئی اس جگہ جانوروں کو چرانے کا مفہوم ہے اور امر کا صیغہ اباحت کے لئے ہے یعنی کھانا اور جانوروں کو چرانا تمہارے لئے ممنوع نہیں ہے اس سے نعمت کی یاد دہانی مقصود ہے۔

بعض اہل تفسیر نے کہا ہے کہ مَاءً تک حضرت موسیٰ کا کلام ختم ہو گیا یعنی موسیٰ نے یہ بھی کہا کہ اللہ نے بادل سے پانی برسایا پھر فَاَخْرَجْنَا سے اللہ نے خود اپنی طرف سے فرمایا کہ ہم نے پانی سے طرح طرح کا سبزہ پیدا کیا اور اس میں اہل مکہ کو

مخاطب فرمایا اس سے موسیٰ کے اس کلام کی بھی تکمیل ہو گئی جو اللہ نے نقل کیا تھا۔

زیادہ ظاہر اور صحیح یہ ہے کہ یہ سب حضرت موسیٰ کا ہی کلام ہے جو اللہ نے نقل فرمایا ہے مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے کہا اللہ نے بادل سے پانی نازل فرمایا اور احسان و انعام کے طور پر فرمایا کہ ہم نے اس پانی سے طرح طرح کی سبزیاں تمہارے اور تمہارے جانوروں کے لئے پیدا کی ہیں، سو تم بھی کھاؤ اور جانوروں کو بھی کھلاؤ، یعنی اس کا شکر کرو۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ﴿۵۴﴾ ان سب چیزوں میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں یعنی زمین کو فرش کی طرح بنانے میں بادلوں سے پانی برسانے میں اور پانی سے طرح طرح کا سبزہ پیدا کرنے میں بڑی بڑی بکثرت نشانیاں ہیں جو خالق کی ہستی کو اس کے لم یزل ولا یزال ہونے کو، اس کے علم کی ہمہ گیری اور قدرت کے محیط کل ہونے کو، اس کے جامع کمالات اور منزہ از نقائص ہونے کو بتارہی ہیں لیکن عظمت ربوبیت والوہیت کے یہ نشانات صرف دانشمندوں کے لئے ہیں۔ ع ۳

اَلنُّهٰى نُهْيَةٌ کی جمع ہے نُهْيَةٌ عقل کو کہتے ہیں نَهْيَةٌ (روکنے والی) عقل بھی انسان کو بری اور ضرر رساں اور غلط باتوں سے روکتی ہے اس لئے عقل کو نهیۃ کہتے ہیں۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ ہم نے تم کو اسی زمین سے پیدا کیا۔

وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ اور (مرنے کے بعد) اسی میں ہم تم کو (لوٹا کر) لے جائیں گے۔

وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾ اور (قیامت کے دن) پھر اسی سے دوبارہ تم کو نکالیں گے۔

یعنی تمہارے باپ آدم کو اور تمہارے جسمانی مادہ کو ہم نے زمین کی مٹی سے بنایا نطفہ غذا سے پیدا ہوتا ہے، پس ہر آدمی کے مادہ تخلیق کی پیدائش زمین سے ہی ہوتی ہے۔ بغوی نے عطاء خراسانی کا قول نقل کیا ہے کہ جس جگہ آدمی دفن ہونے والا ہوتا ہے اس جگہ کی مٹی فرشتہ لے کر نطفہ پر چھڑکتا ہے پھر اس نطفہ اور مٹی سے آدمی کا جسم بنتا ہے عطاء کے قول کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی ناف میں وہ مٹی ضرور ہوتی ہے جس سے اس کی پیدائش ہوتی ہے پھر جب وہ اپنی بدترین عمر (بڑھاپے) کو پہنچ جاتا ہے تو جس مٹی سے اس کی تخلیق ہوتی ہے اسی کی جانب لوٹا دیا جاتا ہے اور اسی میں دفن کیا جاتا ہے۔ میں اور ابو بکر اور عمر ایک ہی مٹی سے بنائے گئے ہیں اور اسی میں دفن کئے جائیں گے، یہ حدیث خطیب نے بیان کی ہے اور اس کو غریب کہا ہے اور ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں ذکر کیا ہے۔ شیخ مرزا محمد حارثی بدخشانی نے کہا کہ حضرت ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ سے اس حدیث کے تائیدی اقوال (شواہد) منقول ہیں جن میں سے ایک دوسرے کی تائید کر رہا ہے اس لئے یہ حدیث حسن ہے اس حدیث کی تقویت مندرجہ ذیل اقوال و روایات سے بھی ہوتی ہے۔

عینی نے صحیح بخاری کی شرح میں کتاب الجنائز میں لکھا ہے کہ محمد بن سیرین نے فرمایا اگر میں قسم کھا کر کہوں تو میری قسم جھوٹی نہ ہو گی نہ مجھے اس میں کوئی شک ہے نہ استثناء کرتا ہوں کہ اللہ نے اپنے نبی صلعم کو اور ابو بکر کو اور عمر کو ایک ہی مٹی سے بنایا تھا۔

ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن جعفر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تجھے مبارک اور خوشگوار ہو کہ تو میرے خمیر سے پیدا کیا گیا ہے اور تیرا باپ ملائکہ کے ساتھ آسمان میں اڑتا ہے۔

مسند الفردوس میں دیلمی نے اور ابن النجار نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (باندی غلام کو) آزاد کرنے والے کا خمیر میری مٹی کا ہے شاید حضور ﷺ نے یہ ارشاد کسی آزاد کرنے والے سے فرمایا تھا، مذکورہ بالا احادیث اور عطاء کی تفسیر مذکور سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ بعض آدمیوں کی تخلیق انبیاء کے خمیر سے ہوتی ہے صوفیوں کی اصطلاح میں اس کو اِصَالَةُ الطِّیْنَة کہتے ہیں بلکہ بعض کی تخلیق رسول اللہ ﷺ کی مٹی سے بھی خصوصیت کے ساتھ ہوئی ہے (اور ہوتی

ہے) اصطلاح صوفیہ میں یہ اصالت کبریٰ ہے۔
میں کہتا ہوں اللہ نے جس روز آسمان وزمین کو پیدا کیا اسی روز زمین کے بعض اجزاء کو بعض انسانوں کی اور بعض اجزاء کو دوسرے بعض انسانوں کی تخلیق کے لئے تیار کر دیا۔ (غرض ہر حصۂ زمین میں مختلف اشخاص کو پیدا کرنے کی صلاحیت واستعداد رکھ دی) جس مٹی میں کسی پیغمبر کی تخلیق کی صلاحیت رکھی تو جو انوار و برکات اور تجلیات ذاتیہ اس پیغمبر کے لئے مخصوص کر دی گئی تھیں شاید ان انوار و برکات کا نزول اس حصۂ زمین پر بھی مسلسل ہوتا رہا جس سے اس نبی کی تخلیق ہونی تھی تاکہ نبی کے مبارک جسم کا خمیر اس مٹی سے ہو سکے اس کے بعد جب جسم نبی کی تخمیر ہو چکی تو اس مبارک مٹی کا کچھ حصہ باقی رہنا ممکن نہ تھا یہ ہو سکتا ہے کہ تخمیر نبی سے جو حصہ بچ رہا ہو اس سے کسی دوسرے کی تخلیق کر دی جائے اس طرح ختم نبوت کی برکت غیر نبی میں پیدا ہو جائے۔
کھجور والی حدیث سے اس طرف اشارہ ملتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اپنی پھوپھی یعنی درخت کھجور کی عزت کر، اس کی تخلیق تمہارے باپ آدم کے خمیر سے پس ماندہ مٹی سے ہوئی ہے اللہ کے نزدیک کوئی درخت اس درخت سے زیادہ عزت والا نہیں جس کے نیچے مریم بنت عمران کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا تھا تم اپنی عورتوں اور بچوں کو کھجوریں کھلاؤ اور کھجوریں نہ ملیں تو چھوارے دو۔ یہ حدیث ابو یعلی موصلی نے مسند ابو نعیم نے الطب میں بخاری نے تاریخ میں نیز ابن ابی حاتم اور عقیلی اور ابن عدی اور ابن السنی اور ابن مردویہ نے حضرت علی کی روایت سے بیان کی ہے۔
ابن عساکر نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، درخت کھجور اور انار اور انگور کی تخلیق آدم کے خمیر کے پس ماندہ حصہ سے ہوئی ہے۔
شیخ احمد مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوبات کی تیسری جلد کے نناویں مکتوب میں اپنے کشف سے اصالت کبریٰ کا دعویٰ کیا ہے اس دعوے پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا خواہ ناوانی کی وجہ سے یا جذبہ عناد کی کار فرمائی سے۔ واللہ اعلم۔ تارۃً کا معنی ہے وقتاً یا باری۔
قیامت کے دن دوبارہ زمین سے برآمد کرنے کا معنی یہ ہے کہ جسم کے پراگندہ اجزاء جو مٹی میں مخلوط ہو چکے ہوں گے پھر از سر نو ان کو جمع کر کے جوڑا جائے گا اور سابق صورت پہنائی جائے گی اور پھر ان کے اندر ارواح کو واپس لایا جائے گا۔

وَلَقَدْ أَرَيْنَٰهُ ءَايَٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ﴿٥٦﴾

اور ہم نے اس کو اپنی (وہ ساری نشانیاں دکھائیں لیکن اس نے (سب کو) جھٹلایا اور (ماننے سے) انکار کر دیا۔
أَرَيْنَٰهُ کا ترجمہ ہے ہم نے اس کو چشم دید کرا دیں یا ان کی صحت اس کو بتا دی۔ اٰیٰتِنَا سے مراد ہیں وہ تو معجزات جو موسیٰ کو دیئے گئے تھے آپ نے وہ سارے معجزات دکھائے۔ فَكَذَّبَ۔ پس فرعون نے موسیٰ کو محض عناد کی وجہ سے جھٹلایا اور آپ کو جادوگر کہا۔ وَأَبَىٰ اور ایمان و اطاعت سے انکار کیا۔

قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَٰمُوسَىٰ ﴿٥٧﴾ کہنے لگا موسیٰ کیا تو

اس لئے ہمارے پاس آیا ہے کہ ہم کو ہماری سرزمین (مصر) سے اپنے جادو (کے زور) سے نکال کر باہر کر دے۔ یعنی کیا تو یہ چاہتا ہے کہ ہم کو نکال کر ہمارے ملک پر تو قبضہ کر لے اور یہاں تیری حکومت ہو جائے۔

فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِۦ فَٱجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُۥ نَحْنُ وَلَآ أَنتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾

سو اب ہم بھی تیرے مقابلہ میں ایسا ہی جادو لائیں گے لہٰذا ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ مقرر کر لے جس کے خلاف نہ ہم کریں نہ تو کسی ہموار میدان میں (مقابلہ کریں گے تاکہ سب دیکھ لیں)
لَّا نُخْلِفُهُۥ یعنی ہم اس وعدے کے خلاف نہ کریں موعد بمعنی وعدہ۔ مَوْعِدًا اس جگہ ظرف زمان یا مکان نہیں ہے کیونکہ خلاف ورزی کا تعلق وعدے سے ہوتا ہے زمان و مکان ظرف سے نہیں ہوتا۔ سُوًى کا ترجمہ قتادہ اور مجاہد نے برابر۔ یعنی ہمارے تمہارے درمیان مسافت برابر ہو۔ حضرت ابن عباس کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے کلبی نے کہا سُوًى یعنی اس

جگہ کے علاوہ کوئی دوسرا مقام (جو ترجمہ ہم نے کیا ہے وہ مولانا تھانوی نے لکھا ہے اور صحیح ترین معلوم ہوتا ہے۔)

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝۵۹ موسیٰ نے کہا تمہارے مقابلہ کے وعدے کا وقت وہ دن ہے جس میں (تمہارا) میلہ ہوتا ہے (یعنی تمہارے تہوار کا دن) اور جس میں دن چڑھے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔

مَوْعِدُ (ظرف مکان) وعدے کی جگہ یعنی تمہارے مقابلہ کے وعدہ کی جگہ تہوار والے دن کا مقام ہے۔ میلہ کا دن سب لوگ جانتے تھے جس میں لوگ جمع ہوتے تھے۔ مجاہد قتادہ مقاتل اور سدی نے کہا مصر والوں کا ایک تہوار سالانہ ہوتا تھا جس میں لوگ آراستہ و پیراستہ ہو کر میلہ کی شکل میں جمع ہوتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں مصریوں کے تہوار کا دن نوروز کا ہوتا تھا حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر نے فرمایا محرم کی دس تاریخ کو وہ تہوار مناتے تھے۔ میلہ کا دن حضرت موسیٰ نے اس لئے مقرر کیا کہ تمام لوگوں کے سامنے حق کا ظہور ہو جائے اور باطل کو شکست ہو جائے اور اس طرح اطراف ملک میں یہ خبر پھیل جائے۔

ضُحًى چاشت کے وقت دن چڑھے تاکہ سب لوگ دیکھ لیں اور کسی کو شک نہ رہے۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ۝۶۰ غرض اس گفتگو کے بعد فرعون (دربار سے) لوٹ گیا پھر اپنا مکر (کا سامان) جمع کرنا شروع کیا (یعنی جادو کا سامان) پھر وعدہ پر آ گیا۔

كَيْدَ (مکر تدبیر) سے مراد ہیں جادوگر اور ان کے آلات و سامان۔

اَتٰى یعنی مقررہ وعدہ پر مقام مقررہ پر پہنچ گیا۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ۝۶۱ موسیٰ نے ان (جادوگروں) سے کہا ارے کم بختی مارو اللہ پر جھوٹ نہ تراشو کبھی وہ تم کو کسی قسم کی سزا سے بالکل نیست نابود ہی کر دے اور جو دروغ تراشی کرتا ہے (آخر) کو ناکام رہتا ہے۔

لَهُمْ یعنی فرعون اور اس کے ساتھی جادوگروں سے موسیٰ نے کہا بغوی نے لکھا ہے صرف جادوگروں کی طرف ضمیر راجع ہے جن کو فرعون نے (اطراف ملک سے) جمع کیا تھا یہ بہتر تھے اور ہر ایک کے پاس ایک لاٹھی اور ایک رسی تھی۔ کعب نے ان کی تعداد چار سو بتائی ہے بعض نے بارہ ہزار اس سے زائد بھی کہا ہے۔

وَيْلَكُمْ ویل ہلاکت، یعنی اللہ نے ہلاکت تم پر لازم کر دی ہے یا ویل فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے، یعنی تم ہلاک ہو چکے یا جملہ ندائیہ ہے جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے یا جملہ دعائیہ ہے تمہارا استیصال ہو بری حالت کے اظہار کے لئے ممانعت افتراء سے پہلے بطور تمہید یہ جملہ ذکر کیا۔

جھوٹ تراشنے سے مراد ہے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔

اِسْحَاتٌ اور سَحْتٌ (ثلاثی مزید و مجرد) ہم معنی ہیں اہل نجد و بنی تمیم اِسْحَات بولتے ہیں اور حجاز والے سحت کہتے ہیں۔ مقاتل اور کلبی نے فَيُسْحِتَكُمْ کا ترجمہ کیا وہ تم کو ہلاک کر دے قتادہ نے کہا وہ بیخ و بن سے تم کو اکھاڑ پھینکے۔ بِعَذَابٍ (میں تنوین عظمت کو ظاہر کر رہی ہے) یعنی کسی بڑے عذاب کے ساتھ۔ خَابَ ناکام ہوا، نامراد ہوا۔ مقصد کو نہ پاسکا۔

واقعہ بھی ایسا ہی ہوا جیسا حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا، فرعون نے اللہ پر دروغ تراشی کی اور اپنی حکومت و خدائی کو محفوظ رکھنے کی ہر تدبیر کر گذرا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا ہر تدبیر میں نامراد رہا۔

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ یہ بات سن کر وہ (یعنی جادوگر) باہم اپنی رائے میں اختلاف کرنے لگے یا تَنَازَعُوْا کی ضمیر فرعون اور اس کے مشیروں کی طرف راجع ہے یعنی فرعون اور اس کے ساتھی (یا جادوگر) اس معاملہ میں مختلف الرائے ہو گئے اور موسیٰ کا مقابلہ کرنا چاہئے یا نہیں۔ محمد بن اسحاق نے کہا جب حضرت موسیٰ نے ان کو مذکورہ بالا نصیحت کی تو جادوگروں نے باہم کہا یہ کلام تو جادوگر کا نہیں ہے۔

وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ۝ اور خفیہ گفتگو کرتے رہے۔

نجویٰ اسم ہے یا ناجیتُہ کا مصدر ہے ناجیت کا معنی ہے میں نے اس سے خفیہ بات کی۔ نجویٰ کا اصل ماخذ نجوۃ ہے نجوۃ کا معنی ہے وہ ابھرا ہوا ٹیلہ جو بلندی کی وجہ سے الگ تھلگ معلوم ہو رہا ہو۔ بعض نے اصل ماخذ نجات کو قرار دیا ہے نجات کا معنی ہے رہائی یعنی ایسا باہمی مشورہ جس میں سب کی خلاصی اور بچاؤ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آپس کے نزاع اور اختلاف رائے کو انھوں نے پوشیدہ رکھا۔ کلبی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ انھوں نے اس مشورہ کو چھپائے رکھا کہ اگر موسیٰ (علیہ السلام) ہم پر غالب آگئے تو ہم ان کا اتباع کرلیں گے۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۝ (آخر کار سب متفق ہو کر) کہنے لگے کہ بے شک یہ دونوں جادوگر ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہاری سرزمین سے نکال کر باہر کردیں اور تمہارے اعلیٰ (مذہبی) طریقے کو ختم کردیں۔

قَالُوْٓا یعنی اختلاف رائے کے بعد آخر متفق ہو کر کہنے لگے یہ قول فرعون کا تھا (دوسرے لوگوں کو اس نے اس قول پر متفق بنا لیا تھا اس لئے سب کا قول ہو گیا، مترجم) غرض چار و ناچار طوعاً و کرہاً سب کا اس قول پر اتفاق ہو گیا فرعون اور اس کی قوم کا باہم اختلاف رائے اللہ نے سورۃ المومن میں ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا سے فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ تک۔

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ میں اِن مخففہ ہے اور لَسٰحِرٰنِ میں لام فارقہ ہے (یعنی بیشک یہ دونوں یقیناً جادوگر ہیں) یا اِن نفی کے لئے ہے اور لام بمعنی اِلّا ہے (یعنی نہیں ہے یہ دونوں مگر جادوگر)

ابو عمرو کی قرأت میں اِنَّ (مشدد) هٰذَيْنِ لَسٰحِرٰنِ آیا ہے اور یہ نحو کے عام ضابطہ کے موافق ہے لیکن ابو عمرو کے علاوہ هٰذٰنِ ہی جمہور کی قرأت ہے اور اسی کے ساتھ بعض روایات میں اِنْ کی جگہ اِنَّ آیا ہے جو عام ضابطہ کے خلاف ہے (اِنَّ کا اسم منصوب ہوتا ہے مرفوع نہیں ہوتا) اس کے جواب میں ہشام بن عروہ نے اپنے باپ کے حوالہ سے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے لیکن یہ (یعنی اصل قرآن میں کتابت کی غلطی اجماع علماء کے خلاف ہے علماء کا اتفاق ہے کہ اصل قرآن میں کتابت کی کوئی غلطی نہ تھی) بعض لوگوں نے کہا یہ قبائل ابو الحارث اور خثعم اور کنانہ کے محاورہ کے موافق ہے تثنیہ ہو یا کوئی ایسی ساکن یاء جس سے پہلے فتح ہو ان قبائل میں ان کا الف بہر حال پڑھا جاتا ہے اَتَانِی الرَّجُلَانِ رَاَیْتُ الرَّجُلَانِ مَرَرْتُ بِالرَّجُلَانِ بہر حال تثنیہ کو الف ہی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ کَسَرْتُ یَدَاہُ اور رَکِبْتُ عَلَاہُ کہتے ہیں یدیہ اور علیہ نہیں کہتے۔ مشہور اسماء ستہ (اب اخ وغیرہ) بھی جب ضمیر کی طرف مضاف ہوں ان میں بھی وہ ہر حال میں الف بولتے ہیں ایک شاعر کا قول ہے۔

اِنَّ اَبَاهَا وَ اَبَا اَبَاهَا　　قَدْ بَلَغَا فِی الْمَجْدِ غَایَتَاهَا

بعض لوگ کہتے ہیں اِنَّ کا اسم ضمیر شان محذوف ہے اور هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ خبر ہے اصل کلام اِنَّهٗ هٰذٰنِ لَلسّٰحِرٰنِ تھا بعض نے کہا اِنَّ نَعَمْ کے معنی میں ہے (حرف مشبہ بفعل نہیں ہے۔) ایک اعرابی نے حضرت ابن زبیر سے کچھ مانگا آپ نے نہیں دیا، اعرابی نے کہا لَعَنَ اللّٰهُ نَاقَةً حَمَلَتْنِیْ اِلَیْکَ اللہ کی لعنت ہو اس اونٹنی پر جو مجھے آپ کے پاس سوار کر کے لائی، حضرت ابن زبیر نے جواب دیا اِنَّ وَصَاحِبَهَا بے شک (اونٹنی پر بھی لعنت ہو) اور اس کے مالک پر بھی۔

يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى حضرت ابن عباس نے فرمایا، طریقہ سے مراد سرداران قوم، بڑے لوگ طَرِیْقَةُ الْقَوْمِ، قوم کے سرداروں کو کہتے ہیں شعبی نے اس آیت کی تشریح میں حضرت علی کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی لوگوں کا رخ اپنی

طرف پھیر دیں۔ قتادہ نے کہا اس زمانہ میں بنی اسرائیل تعداد میں بھی ساری قوم سے زیادہ تھے اور مال میں بھی اس لئے طریقہ مثلیٰ سے بنی اسرائیل مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں چاہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جائیں فرعون کے اس قول کی وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔

عام طور پر اہل تفسیر نے کہا کہ طریقہ مثلیٰ سے مراد دین ہے جس پر اہل مصر قائم تھے گویا فرعون نے جو کہا اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَکُمْ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارے مذہب کو بدل دے گا۔ یہی مطلب ہے یَذْهَبَا بِطَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰى یہ دونوں چاہتے ہیں کہ تمہارے اعلیٰ مذہب کو ختم کو دیں۔

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا سو اب تم مل کر اپنی تدبیر کا انتظام کرو پھر صفیں آراستہ کر کے مقابلہ میں آؤ۔

اَجْمِعُوْا (مصدر اجماع باب افعال) کو بعض لوگوں نے ثلاثی مجرد۔ یعنی اِجْمَعُوْا کا ہم معنی قرار دیا ہے یعنی اپنی تدبیریں ساری جمع کر لو۔ عرب کہتے ہیں اَجْمَعْتُ الشَّیْءَ اور جَمَعْتُ الشَّیْءَ دونوں کو ہم معنی کہتے ہیں صحیح یہ ہے کہ اجماع کا معنی ہے متفق الرائے ہو جانا کسی رائے پر اتفاق کر لینا، مطلب یہ ہے کہ اپنی تدبیر پر متفق ہو جاؤ۔ پختہ ارادہ کر لو۔ باہم اختلاف نہ کرو۔ ورنہ کام بگڑ جائے گا۔

صف ایک قطار بنا لینا آدمیوں کی ہو یا درختوں کی یا کسی اور چیز کی یہ مصدر ہے لیکن بمعنی اسم فاعل یعنی سب ایک قطار ہو کر اور جمع ہو کر آؤ تاکہ دیکھنے والوں کے دلوں میں ہیبت پیدا ہو۔ مقاتل اور کلبی نے کہا اسی کی مثل آیت اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا میں صَفًّا کا معنی (ایک قطار) ہے لیکن ابن عبیدہ نے کہا صف کا معنی جمع ہونے کی جگہ جاء نماز کو صف اسی مناسبت سے کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جو جگہ مقرر ہے اس جگہ پہنچ جاؤ۔

وَقَدْ اَفْلَحَ الْیَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾ اور آج جو غالب آئے گا وہی کامیاب ہو گا۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِیَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ انہوں نے کہا اے موسیٰ آپ (اپنا عصا) پہلے ڈالیں گے یا ہم پہلے ڈالنے والے بنیں موسیٰ نے کہا (میں پہلے نہیں ڈالتا) آپ لوگ پہلے ڈالو۔

قَالُوْا یعنی جب جادوگر مقررہ مقام پر جمع ہو گئے تو چونکہ ان کو اپنی تدبیروں کی عظمت پر اعتماد تھا اور غالب آنے کا یقین تھا پھر تہذیب کا تقاضا بھی یہی تھا اس لئے کہا کہ اگر آپ پہلے اپنا داؤ پھینکنا چاہیں گے تو پھینکئے اور اگر آپ کہیں تو داؤ پھینکنے کی ابتداء کرنے والے ہم ہو جائیں (ہم پہلے اپنا داؤ پھینکیں) حضرت موسیٰ کو ان کے جادو کی پروانہ تھی اور کچھ کچھ ان کا میلان بھی اللہ کی طرف محسوس ہو رہا تھا، انہوں نے (نَحْنُ نُلْقِیْ اَوَّلًا نہیں کہا تھا بلکہ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى کہا تھا) اول کا لفظ صراحت اپنے لئے بولا تھا اس لئے ان کی حوصلہ افزائی بھی کرنی تھی پھر یہ مقصد بھی تھا کہ جو جال یہ لوگ بنا کر لائے ہیں اس کو پہلے سامنے آ جانا اور ان کی انتہائی طاقت کو میدان میں لانے کی مہلت دینا چاہئے تاکہ جب میں لاٹھی پھینکوں گا تو حق ظاہر ہو جائے گا اور باطل کو شکست ہو جائے مزید یہ کہ جادوگروں نے ادب کو پیش نظر رکھ کر موسیٰ کو اختیار دیا تھا اس کا بھی تقاضا تھا کہ موسیٰ تہذیب کا مظاہرہ کریں اور ان سے کہہ دیں کہ آپ لوگ ہی شروع کریں اور اس لئے فرمایا میں آغاز نہیں کرتا آپ لوگ ہی (جو پھینکنا چاہتے ہیں) پھینکیں۔

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾

پس یکایک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کی نظر بندی سے موسیٰ کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے (سانپ کی طرح) چلتی دوڑتی ہوں۔ عبارت میں کچھ محذوفات ہیں (جن کو سمجھنے کے لئے رفتار کلام کافی ہے ذکر کرنے میں کوئی فائدہ نہ تھا اس لئے ان کو حذف کر دیا گیا) اصل کلام اس طرح تھا، پس انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں تو اچانک موسیٰ کو ایسا خیال

ہونے لگا کہ وہ رسیاں اور لاٹھیاں (سانپوں کی طرح) دوڑ رہی ہیں۔ قصہ کی تفصیل میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب جادوگروں نے رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں تو لوگوں کی نظر بندی کر دی اور نظر بندی (یا خیال بندی) کی وجہ سے موسیٰ اور دوسرے حاضرین کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ایک میل تک زمین سانپوں سے بھر گئی ہے اور سانپ دوڑ رہے ہیں۔

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰى ۝۶۷ پس موسیٰ نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔

وَجْسٌ، آہٹ، ہلکی آواز۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے وَجْسٌ وہ گھبراہٹ اور خوف جو کسی آواز وغیرہ سے دل میں پیدا ہو جائے یا کانوں میں سنائی دے۔ مطلب یہ ہے کہ باقتضائے بشریت حضرت موسیٰ کے دل میں فوراً کچھ خفیف خوف پیدا ہو گیا۔ مقاتل نے کہا (موسیٰ کو اپنا کوئی خوف نہیں ہوا تھا بلکہ) آپ کو یہ اندیشہ ہوا کہ لوگ دھوکہ کھا جائیں گے اور میرے معجزے میں ان کو شک پڑ جائے گا اور حق واضح نہ ہوگا۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝۶۸ ہم نے (موسیٰ سے) کہا تم کچھ خوف نہ کرو بلاشبہ تم ہی سب پر غالب رہو گے۔

اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی سے خوف نہ کرنے کی وجہ بیان فرمادی اور غالب رہنے کو چند تاکیدی الفاظ سے بیان فرمادیا، جملہ از سر نو شروع کیا (حرف عطف ذکر نہیں کیا) اِنَّ حرف تحقیق ذکر کیا ضمیر فصل بھی ذکر کی اور خبر پر الف لام بھی داخل کیا اور اَلْاَعْلٰی فرمایا تم ہی غالب رہو گے پھر اسم تفضیل کا صیغہ بھی استعمال کیا۔

وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اور جو کچھ تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے اس کو (زمین پر) ڈال دو ان لوگوں نے جو کچھ جھوٹ (فریب دینے کے لئے) بنایا ہے اس کو یہ نگل لے گی۔ مَا فِیْ یَمِیْنِکَ مبہم طور پر (جو کچھ) فرمایا، مراد لاٹھی ہے صراحۃً لاٹھی کا ذکر نہیں کیا اس سے ساحروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کی حقارت دکھانا مقصود ہے کہ یہ لاٹھیاں اور رسیاں تو اتنی حقیر ہیں کہ تمہارے ہاتھ میں جو یہ ایک لکڑی کا ٹکڑا ہے اس کو اگر زمین پر پھینک دو گے تو یہ بھی انکو نگل لے گا۔

اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ان لوگوں نے جو کچھ کارستانی کی ہے یہ تو جادوگر کا فریب ہے۔

وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰى ۝۶۹ اور جادوگر کہیں جائے کامیاب نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جادوگر زمین کے جس حصہ میں ہو اور جہاں جائے کامیاب نہیں ہوتا۔ بعض نے اَتٰی کا ترجمہ اِحْتَالَ کیا ہے یعنی جو تدبیر جہاں کرے کامیاب نہیں ہوتا۔ ابن حاتم اور ترمذی نے حضرت جندب بن عبداللہ بجلی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم جادوگر کو پاؤ تو اس کو قتل کر دو پھر حضور ﷺ نے آیت وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی تلاوت فرمائی۔

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا (یہ دیکھتے ہی) جادوگر فوراً سجدہ میں گر گئے کلام میں کچھ اختصار کر دیا گیا ہے (رفتار کلام محذوفات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے) اصل کلام اس طرح تھا پس موسیٰ نے فوراً اپنے ہاتھ سے لاٹھی زمین پر ڈال دی وہ فوراً اژدہا بن گئی اور جو کچھ جادوگروں نے کارستانی کی تھی سب کو نگلنے لگی اس وقت جادوگر پہچان گئے کہ یہ جادو نہیں ہے بلکہ خدا داد معجزہ ہے اتنا پہچاننے کے بعد فوراً توبہ کی اور سجدے میں گر گئے یا معجزے کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لئے سجدے میں گر گئے اور خود نہ گرے بلکہ عرفان حق (اور تعظیم معجزہ) نے بے اختیار کر کے ان کو سجدہ میں گرا دیا گویا وہ گرا دیئے گئے۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝۷۰ (اور) بول اٹھے کہ ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لے آئے اس جگہ ہارون کا لفظ موسیٰ سے پہلے آیا ہے اور سورۂ شعراء و اعراف میں فرمایا ہے۔ اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ رَبِّ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ اس میں موسیٰ کا لفظ ہارون سے پہلے آیا ہے معلوم یہ ہوا کہ کوئی ترتیب پیش نظر نہیں ہے کہ اس میں موسیٰ کا لفظ ہارون سے پہلے آیا ہے یا ہارون کا بلکہ صرف بتانا یہ ہے کہ دونوں پیغمبروں کے رب پر وہ ایمان لے آئے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ

فرعون نے (جادوگروں سے) کہا کہ میری اجازت کے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے واقعی وہ (سحر میں) تم سے بڑا ہے جس نے تم کو سحر سکھایا ہے۔

لَهٗ (ایمان کے بعد ب آنا چاہئے لیکن) اس جگہ لام آیا ہے کیونکہ اٰمَنْتُمْ کے اندر اتباع کا مفہوم پوشیدہ ہے اور (اتباع کے بعد اگر آتا ہے تو لام آتا ہے ب نہیں آتا یعنی تم نے موسیٰ کی بات کو مان لیا اور اس کے پیرو ہو گئے)

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمْ یعنی جادو میں تمہارا بڑا ہے تم سے زیادہ جادو مکر جانتا ہے اسی لئے تم پر غالب آ گیا اس کا ثبوت کا دعویٰ غلط ہے یا کبیر سے مراد ہے استاد یعنی یہ تمہارا استاد ہے۔

الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ جس نے تم کو جادو سکھایا اسی لئے تم سب نے متفق ہو کر اس کی موافقت اور پیروی کر لی۔

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ

سو اب میں تم سب کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہوں ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پاؤں۔ اور تم سب کو کھجور کے درختوں پر ٹنگواتا ہوں۔

مِّنْ خِلَافٍ یعنی سیدھا ہاتھ اور بایاں پاؤں۔ خلاف یعنی مخالف۔

فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ، درخت کھجور کے تنوں میں درخت کھجور لمبا ہوتا ہے دور سے نظر آتا ہے (اور دوسروں کو دکھا کر عبرت دلانی مقصود تھی) اس لئے درخت کھجور کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا۔ اور عَلٰى جُذُوْعِ کی جگہ فِيْ جُذُوْعِ کہنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ میں تم کو تنوں کے ساتھ پیوست کر دوں گا جس طرح مظروف ظرف کے ساتھ پیوست ہوتا ہے۔

وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝ اور تم کو یقیناً یہ بھی ضرور معلوم ہوا جاتا ہے کہ ہم میں سے کس کا عذاب سخت اور دیرپا ہے یعنی میں تم کو رب موسیٰ پر ایمان لانے کی زیادہ سخت سزا دے سکتا ہوں یا موسیٰ کا رب تم کو زیادہ سخت عذاب دے سکتا تھا، اگر تم اس پر ایمان نہ لاتے۔

وَّاَبْقٰى اور کس کا عذاب دوامی ہے اور لازوال ہے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ

جادوگروں نے کہا ہم تجھ کو ہرگز ترجیح نہیں دیں گے بمقابلہ ان دلائل کے جو ہم کو مل گئے ہیں اور بمقابلہ اس ذات کے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے پس تجھ کو جو کچھ فیصلہ کرنا ہے کر ڈال۔ یا یوں ترجمہ کیا جائے کہ تجھ کو جو کچھ کرنا ہے کر ڈال موخر الذکر ترجمہ پر مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِقْضِ کا مفعول ہوگا اور اگر قضا کا معنی فیصلہ اور حکم کیا جائے تو مَآ اَنْتَ اس کا مفعول نہ ہوگا کیونکہ باب قضا کے مفعول پر ب آنا ضروری ہے اس صورت میں مَآ اَنْتَ قَاضٍ مفعول مطلق ہوگا یعنی جو حکم تجھے دینا ہے دے ڈال۔

اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ تو بجز اس کے کہ اس دنیوی زندگی میں کچھ کر لے اور کر ہی کیا سکتا ہے۔

تَقْضِيْ یعنی اس دنیوی زندگی میں جو چاہے کر لے یا جو حکم دینا چاہے دے لے۔ اَلْحَيٰوةَ الدُّنْيَا مفعول فیہ ظرف زمان ہے، مطلب یہ ہے کہ بس اسی دنیوی زندگی میں تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے یا جو کچھ حکم دینا چاہے دے لے، تیری حکومت اور سلطنت عنقریب ختم ہو جائے گی۔ بعض روایات میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ فرعون نے جو دھمکی جادوگروں کو دی تھی اس کے مطابق اس نے جادوگروں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر صلیب پر لٹکوا بھی دیا۔ ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے یہ روایت نقل کی ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ایسا کر نہیں سکا کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا تم دونوں اور جو تمہارے تبع ہیں سب غالب ہوں گے۔

إِنَّآ ءَامَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَٰيَٰنَا وَمَآ أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ ٱلسِّحْرِ
بلاشبہ ہم اپنے رب پر ایمان لے آئے تاکہ وہ ہماری خطاؤں کو اور اس جادو کو جس پر تو نے ہم کو مجبور کیا تھا معاف فرما دے۔

ایک شبہ

جادوگر اپنے اختیار سے آئے تھے، فرعون نے ان کو مجبور کب کیا تھا، خود ہی انھوں نے عزت فرعون کی قسم کھا کر کہا تھا کہ ہم غالب رہیں گے۔ پھر مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

ازالہ

بغوی نے حسن کا قول نقل کیا ہے کہ کچھ لوگوں کو فرعون جادو سیکھنے پر مجبور کرتا تھا تاکہ جادو کی جڑ قائم رہے مَآ اَكْرَهْتَنَا سے یہی مراد ہے۔ مقاتل نے کہا جادوگر بہتر ۷۲ تھے دو قبطی اور ستر اسرائیلی فرعون نے اسرائیلیوں کو جادو کرنے پر مجبور کیا تھا۔ عبدالعزیز بن ابان نے کہا کہ جادوگروں نے فرعون سے درخواست کی پہلے ہم کو موسیٰ کو سوتے میں دکھا دیجئے۔ (پھر کچھ رائے قائم کریں گے) چنانچہ حضرت موسیٰ جب سو رہے تھے اور لاٹھی آپ کا پہرا دے رہی تھی اس وقت فرعون نے جادوگروں کو بلوا کر حضرت موسیٰ کا معاینہ کرا دیا جادوگر دیکھ کر کہنے لگے یہ تو سحر نہیں ہے جادوگر سو جاتا ہے تو اس کا جادو بھی ختم ہو جاتا ہے (لیکن لاٹھی تو موسیٰ کی سوتے میں نگرانی کر رہی ہے یہ جادو نہیں ہو سکتا) فرعون نے جادوگروں کی بات نہیں مانی اور مقابلہ کرنے پر مجبور کیا مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ کا یہی مطلب ہے۔

وَٱللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰٓ ﴿٧٣﴾ اور اللہ تعالیٰ (تجھ سے بدرجہا) اچھا اور زیادہ بقاوالا ہے یعنی جو شخص ایمان کے ساتھ عمل صالح کرے اس کو ساری مخلوق سے بڑھ کر اللہ ثواب دینے والا ہے اور جو مجرم کفر کی حالت میں اس کے سامنے جائے گا اس کو عذاب بھی ساری مخلوق سے زیادہ پائیدار لازوال دے گا۔

محمد بن اسحاق نے کہا فرعون نے کہا تھا وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ساحروں نے اس کا یہ جواب دیا۔

إِنَّهُۥ مَن يَأْتِ رَبَّهُۥ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُۥ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ﴿٧٤﴾

جو شخص (بغاوت کا) مجرم اپنے رب کے سامنے جائے گا اس کیلئے جہنم مقرر ہے اس میں نہ وہ مرے گا نہ جیئے گا۔

مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا یعنی کفر اور نافرمانی پر مرے گا۔ لَا يَمُوْتُ جہنم کے اندر اس کو موت نہیں آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائے۔ لَا يَحْيٰى نہ خوش گوار زندگی ملے گی کہ آرام پائے۔

وَمَن يَأْتِهِۦ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ ٱلصَّٰلِحَٰتِ فَأُو۟لَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلدَّرَجَٰتُ ٱلْعُلَىٰ ﴿٧٥﴾ جَنَّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا

اور جو شخص اپنے رب کے پاس مومن ہو کر حاضر ہوگا جس نے نیک کام بھی کئے ہوں سو ایسوں کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں یعنی ہمیشہ رہنے کے لئے باغات جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

یعنی جو شخص ایمان کی حالت میں مرے گا اور اس نے دنیا میں اعمال صالحہ کئے ہوں گے اس کو رہنے کے لئے باغ ملیں گے عدن بمعنی قیام و سکونت یہ جنّات بڑے اونچے درجات ہوں گے۔

وَذَٰلِكَ جَزَآءُ مَن تَزَكَّىٰ ﴿٧٦﴾ کفر و معاصی کے میل کچیل سے پاک ہونے کی یہی جزاء ہے کلبی نے کہا تزکّٰی کا یہ معنی ہے کہ جس نے اپنے نفس کی زکوٰۃ دے دی اور لا الہ الا اللہ کا قائل ہو گیا۔ امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے صحیح سند سے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اونچے درجات والوں کو نیچے والے اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم چمکتے ستاروں کو آسمان کے کنارے پر دیکھتے ہو اور ابوبکر ان ہی میں سے ہوں گے اور عمر (بھی) یہ حدیث طبرانی نے حضرت جابر بن سمرہ کی روایت سے اور ابن عساکر نے حضرت ابن عمر و حضرت ابو ہریرہ کی روایت

سے بیان کی ہے۔ شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد نے حضرت ابو سعید کی روایت سے اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے حدیث مذکور مرفوعاً اس طرح نقل کی ہے کہ اہل جنت اوپر والے کمروں والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح (آسمان کے) مشرقی یا مغربی افق میں ڈبڈباتے چمکتے ستارے کو تم لوگ دیکھتے ہو اس کی وجہ ان کے باہم درجات کا تفاوت ہوگا صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ پھر انبیاء کے مراتب کو ان کے علاوہ کوئی اور پہنچے گا نہیں فرمایا کیوں نہیں قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انبیاء کی تصدیق کی (وہ بھی انبیاء کے ساتھ ہوں گے)

موخر الذکر تینوں آیات ساحروں کے کلام کا تتمہ اور اللہ خَيْرٌ وَّ أَبْقٰى کی علت بھی ہو سکتی ہے اور اللہ کی طرف سے ساحروں کے کلام کی تصدیق بھی ان کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلٰى مُوسٰى ۙ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ اور ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ ہمارے ان بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کو (مصر سے) راتوں رات (باہر) لے جاؤ پھر ان کے لئے دریا میں (لاٹھی مار کر) خشک راستہ بناؤ نہ تو تم کو کسی کے تعاقب کا اندیشہ ہوگا اور نہ (کسی اور قسم کا) خوف ہوگا۔

یعنی جب اللہ نے فرعون اور اس کی قوم کا ستیاناس کر دینا چاہا اور بنی اسرائیل کو ان کے ظلم سے نجات دے دینے کا اس نے ارادہ کیا تو حضرت موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ ان لوگوں کو لے کر راتوں رات مصر سے باہر نکل جاؤ۔

فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا۔ یعنی ان کے لئے راستہ مقرر کر دو اس ترجمہ پر یہ جملہ محاورہ ضرب سہم سے ماخوذ ہوگا۔ عرب بولتے ہیں ضَرَبَ لَهٗ مِنْ مَالِهٖ سَهْمًا اس نے اپنے مال میں اس کا ایک حصہ مقرر کر دیا۔ یا فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا کا ترجمہ ہوگا بناؤ ان کے لئے راستہ۔ عرب کہتے ہیں ضَرَبَ اللَّبِنَ اس نے اینٹیں بنائیں۔ میں کہتا ہوں اضرب سے مراد لاٹھی مارنا بھی ہو سکتا ہے اصل کلام اس طرح تھا۔ فَاضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ يَكُنْ طَرِيقًا اپنی لاٹھی دریا میں مار راستہ خشک ہو جائے گا۔ دَرَكًا دشمن کا پہنچ جانا مراد ہے، یعنی دشمن کے تعاقب کرنے اور پہنچ جانے کا تم کو کچھ اندیشہ نہ ہوگا۔ وَلَا تَخْشٰى اور نہ ڈوبنے کا خطرہ۔

موسیٰ نے حکم کی تعمیل کی، بنی اسرائیل کو لے کر چل دیئے، دریا پر پہنچے تو دریا میں لاٹھی ماری پانی پھٹ گیا اور دونوں طرف پہاڑ کی طرح رک گیا خشک زمین نکل آئی بنی اسرائیل خشک زمین پر چل کر پار نکل گئے۔

فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾ پھر فرعون اپنے لشکروں کو لے کر ان کے پیچھے چلا تو دریا ان پر جیسا ملنے کو تھا آملا اور فرعون اپنی قوم کو بری راہ پر لایا اور نیک راہ نہ بتائی۔ بِجُنُودِهٖ میں ب بمعنی مع کے ہے یعنی فرعون کو جب اطلاع ملی کہ موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر رات کو ہی مصر سے نکل گیا تو اس نے خود اپنے لشکر کے ساتھ موسیٰ کا پیچھا کیا۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک اتباع (باب افعال) بمعنی اتباع (باب افتعال) کے ہے (یعنی لازم ہے) ب کے ذریعہ سے اس کو متعدی بنایا گیا ہے، یعنی فرعون اپنے لشکر کو لے کر پیچھے چلا۔ یا فرعون نے اپنے لشکر کو بنی اسرائیل کے پیچھے چلایا، مِنَ الْيَمِّ یعنی دریا کا کچھ پانی۔ یم دریا، مِنْ تبعیضیہ ہے (کچھ پانی) یا بیانیہ ہے مَا غَشِيَهُمْ میں ما کا ابہام موجوں کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے، یعنی ایسی موجیں اوپر سے آئیں کہ جن کی مقدار اور حقیقت سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ اضل یعنی دین کے معاملے میں فرعون نے اپنی قوم کو بے راہ کر دیا۔ وَمَا هَدٰى اور صحیح راستہ نہ دکھایا۔ دین کا مذاق اڑاتا رہا۔ اس نے قوم سے کہا تھا مَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ میں تم کو نہیں بتاتا مگر سیدھا راستہ۔ لیکن اس نے سیدھا راستہ نہیں بتایا اس آیت سے فرعون کے قول مذکور کی تکذیب کر دی گئی یا یہ مطلب ہے کہ دریا کے اندر فرعون نے قوم کو بے راہ کر دیا اور خود بھی نجات نہ پائی۔

يٰبَنِيْٓ إِسْرَآءِيلَ قَدْ أَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنَ

اے بنی اسرائیل (دیکھو) ہم نے تم کو تمہارے (ایسے بڑے) دشمن سے نجات دی اور ہم نے تم سے (یعنی تمہارے پیغمبر سے) طور کے دائیں جانب آنے کا وعدہ کیا۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ سے خطاب ان بنی اسرائیل کو ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے اور جو احسانات ان کے آباؤ اجداد پر کئے گئے تھے وہ موجودہ بنی اسرائیل کو یاد دلائے گئے ہیں لیکن اس مطلب پر ایک لاینحل اشکال یہ وارد کیا جا سکتا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ کی زندگی میں خطاب بنی اسرائیل کو نہیں ہو سکتا۔ پوری مکی زندگی میں مخاطب قریش یا کفار مکہ ہو سکتے ہیں اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ یہ گزشتہ واقعہ کا بیان ہے جن بنی اسرائیل کو اللہ نے فرعون کے پنجے سے رہا کرایا اور فرعون کو مع لشکر کے غرق کیا تھا انہی کو اللہ نے اس وقت یہ خطاب کیا تھا اور اس خطاب کو نقل اس جگہ کیا اس مطلب پر لفظ قلنا محذوف ماننا پڑے گا مطلب اس طرح ہوگا کہ فرعون کو غرق کرنے اور دوسرے واقعات ہو چکنے کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ قَدۡ اَنۡجَیۡنٰکُمۡ

جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَیۡمَنَ جانب مفعول فیہ ظرف مکان ہے اور الایمن جانب کی صفت ہے لیکن پہاڑ کا حقیقت میں کوئی دایاں بایاں رخ نہیں ہوتا اس لئے کہا جائے گا کہ دایاں جانب موسیٰ کا تھا اور موسیٰ پہاڑ پر تھے اس لئے پہاڑ کا دایاں جانب کہہ دیا۔ اللہ نے موسیٰ سے مناجات کا اور توریت دینے کا وعدہ کیا اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کر کے اپنے ساتھ لے آئیں یہ وعدہ حضرت موسیٰ سے تھا لیکن اس وعدہ کا تعلق چونکہ بنی اسرائیل سے تھا اس لئے (مجازاً) فرمادیا کہ ہم نے تم کو وعدہ دیا تھا۔

وَنَزَّلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰی ﴿۸۰﴾ کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰکُمۡ

اور ہم نے تم پر من و سلویٰ نازل کیا اور (اجازت دی کہ) ہم نے جو نفیس چیزیں تم کو دی ہیں ان کو کھاؤ۔

مِنۡ طَیِّبٰتِ میں مِنۡ بیانیہ ہے یا تبعیضیہ۔ یعنی وہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں یا ہماری عطا کردہ پاکیزہ چیزوں میں سے کچھ چیزیں تم کھاؤ۔ طیبات سے مراد ہیں لذیذ یا حلال چیزیں (مَن و سلوٰی لذیذ چیزیں بھی تھیں اور حلال بھی۔) ہر نعمت خدا داد ہی ہے لیکن اس جگہ رَزَقۡنٰکُمۡ میں اپنی طرف دینے کی نسبت صراحۃً کرنے سے مراد ہے نعمتوں کی عظمت کا اظہار۔

وَلَا تَطۡغَوۡا فِیۡهِ اور اس (کھانے) میں حد (شرعی) سے مت گزرو۔ یعنی ہماری دی ہوئی نعمت میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ حد سے تجاوز کرنا کئی صورتوں سے ہوتا ہے شکر نہ کرنا فضول برباد کرنا یا بے ضرورت بیکار خرچ کرنا، مغرور ہو جانا، مستحق کو نہ دینا (اور مالی حقوق ادا نہ کرنا وغیرہ۔ مترجم)

فَیَحِلَّ عَلَیۡکُمۡ غَضَبِیۡ ۚ وَمَنۡ یَّحۡلِلۡ عَلَیۡهِ غَضَبِیۡ فَقَدۡ هَوٰی ﴿۸۱﴾ کہیں میرا غضب تم پر واقع ہو جائے اور جس شخص پر میرا غضب واقع ہوتا ہے وہ بالکل گیا گزرا ہوا۔ یَحۡلِلۡ (باب ضرب سے) کو اجب الاداہونا یعنی جس پر میرا غضب لازم ہو جائے۔ یَحۡلُلۡ (یہ قرأت اعمش و کسائی حلول سے باب نصر) حُلُوۡل کا معنی ہے نازل ہونا اترنا، جس پر میرا غضب نازل ہو جائے۔ هَوٰی، ہلاک ہو گیا آگ میں لڑھک گیا۔

وَاِنِّیۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهۡتَدٰی ﴿۸۲﴾ اور (اس کے ساتھ یہ بھی کہ) میں ایسے لوگوں کو بڑا بخشنے والا ہوں جو توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں پھر اسی راہ پر قائم بھی رہیں۔

تَابَ یعنی شرک سے توبہ کی۔ اٰمَنَ سے مراد ہے اللہ پر اور ان تمام احکام پر ایمان لایا جو اللہ کی طرف سے اس کے پیغمبر لے کر آئے تھے۔ عَمِلَ صَالِحًا یعنی اللہ کے حکم کے مطابق عمل کیا اهۡتَدٰی سے کیا مراد ہے علماء کے اقوال اس میں مختلف ہیں عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے پھر اس نے ہدایت پائی یعنی جان لیا کہ یہ سب کچھ اللہ کی توفیق سے مجھے

ملاہے۔ قتادہ اور سفیان ثوری نے ترجمہ کیا اسلام پر مرتے دم تک قائم رہا، شعبی مقاتل اور کلبی نے کہا یعنی یہ جان لیا کہ اللہ کی طرف سے اس کا ثواب مجھے ملے گا۔ زید بن اسلم نے کہا یعنی اس نے علم حاصل کیا تاکہ اس کے مطابق عمل کرے، ضحاک نے کہا یعنی ہدایت مذکورہ پر قائم رہا سعید بن جبیر نے کہا سنت اور جماعت کے مسلک پر قائم رہا۔ حضرت مفسر نے فرمایا میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ اللہ تک پہنچنے اور مقام قرب تک چڑھنے کی اس کو راہ مل گئی اور یہ رسائی و عروج ہر کیفیت سے بالاتر ہے اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾　اور اے موسیٰ تمہارے لئے اپنی قوم سے جلدی آنے کا کیا سبب ہوا، یعنی کیا وجہ تھی کہ تم قوم کو پیچھے چھوڑ کر ان سے پہلے ہی آگئے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ نے طور پر جانے کے لئے بنی اسرائیل میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا تاکہ طور پر پہنچ کر حسب وعدہ اللہ کی کتاب حاصل کرلیں پھر ان کو پیچھے چھوڑ کر دیدار الٰہی کے شوق میں خود پہلے آگئے اور ان سے کہہ دیا تم لوگ پیچھے آجانا اللہ نے حضرت موسیٰ سے یہی سوال کیا ہے کہ تم قوم سے پہلے کیسے چلے آئے۔ میں کہتا ہوں یہ سوال (طلب علم کے لئے نہیں ہے نہ انکاری ہے بلکہ) تقریری ہے جس طرح محبوب جب اپنے عاشق کے والہانہ شوق اور شیفتگی کو دیکھتے ہوئے چاہتا ہے کہ عاشق اپنے منہ سے اپنی محبت کا اظہار کرے اس لئے کہتا ہے کہ آپ کیسے آئے کیوں آئے۔

لیکن ساتھیوں کو چھوڑ کر آجانا کسی قدر نازیبا بھی تھا اس لئے سوال میں انکاری ہونے کی کچھ آمیزش بھی تھی اس لئے حضرت موسیٰ نے سوال کے دونوں رخوں کا لحاظ رکھتے ہوئے دونوں کا جواب دیا۔

قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾　موسیٰ نے (اپنے گمان کے موافق) عرض کیا وہ لوگ بھی تو میرے پیچھے پیچھے (آرہے) ہیں اور میں آپ کے پاس جلدی اس لئے آیا کہ آپ (زیادہ) خوش ہوں گے۔

اِلَيْكَ تاکہ آپ زیادہ خوش ہوں بعض لوگوں نے کہا تعمیل حکم میں جلدی اور وعدے کی وفا میں سبقت زیادتی خوشی کا موجب تھی، یہی حضرت موسیٰ کے کہنے کا مطلب تھا میں کہتا ہوں لِتَرْضٰى کا مطلب یہ ہے کہ محبت و شوق کی زیادتی، دیدار کی تمنا اور کلام سننے کی بے پایاں خواہش موجب تھی زیادتی مرضی کے حصول کی اسی لئے موسیٰ نے لِتَرْضٰى کہا۔

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ　اللہ نے فرمایا ہم نے تمہاری قوم کو ایک بلا میں مبتلا کر دیا ہے۔ فتن سے مراد ہے آزمائش کرنی جانچنا یا گمراہ کر دینا یعنی (سامری نے گوسالہ بنایا اس میں) ہماری طرف سے جانچ تھی کہ کون اس کی پوجا کرتا ہے اور کون نہیں کرتا یا یہ مطلب ہے کہ بچھڑے کی پوجا کی وجہ سے ہم نے تمہاری قوم کو گمراہ کر دیا۔

ایک شبہ

فَاِنَّا میں ف سببیت کے لئے ہے یعنی اس سے پہلے کا کلام بعد میں آنے والے کلام کا سبب ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تمہاری جلدی چلے آنے سے تمہاری قوم گمراہ ہوگئی تمہاری عجلت آمد قوم کی گمراہی کا سبب بن گئی۔ لیکن بظاہر تو موسیٰ کے پہلے چلے آنے سے قوم گمراہ نہیں ہوئی تھی (کیا موسیٰ اگر جلدی کر کے ستر آدمیوں سے پہلے نہ چلے آتے اور انکو ساتھ لے کر آتے تو کیا باقی قوم گمراہ نہ ہوتی) میں اس کے جواب میں کہتا ہوں پیغمبر کی رسالت کے دو مقصد ہیں (۱) وہ لوگوں کو اسلام اور اللہ کے احکام سکھائیں اور تعمیل کی دعوت دیں۔ (۲) لوگوں کو اپنی باطنی کشش کی قوت سے اللہ کی طرف کھینچیں اور ایمان و معرفت کا نور ان کے دلوں میں ڈالیں تاکہ ان کے سینے روشن ہوجائیں اور وہ حق کو حق اور باطل کو باطل جان لیں۔ لیکن انبیاء کے اس فریضہ کی مکمل ادائیگی اسی وقت ممکن ہے جب وہ مخلوق کی طرف کامل طور پر متوجہ ہوں حضرت موسیٰ پر بارگاہ الٰہی میں حاضری کا شوق اور ہم کلامی کی محبت کا اس وقت غلبہ تھا اور سکر کی حالت تھی اس لئے ان کی باطنی توجہ امت کی طرف باقی نہیں رہی تھی یہی وجہ تھی کہ بنی اسرائیل فتنہ اور گمراہی میں مبتلا ہوگئے۔ یہیں سے بعض اہل تصوف نے کہا ہے کہ ولایت

نبوت سے افضل ہے اس قول کی تشریح بعض اہل باطن نے اس طرح کی ہے کہ انبیاء کی ولایت ان کی نبوت سے افضل ہے کیونکہ ولایت کا تقاضا ہے استغراق اور فنافی اللہ اور ہر طرف سے توجہ کو ہٹا کر اللہ ہی کی طرف اپنا رخ کر کے ڈوب جانا اور نبوت کا تقاضا ہے (تبلیغ وہدایت کے لئے) مخلوق کی طرف رخ کرنا (اور ظاہر ہے کہ خالق کی طرف کامل توجہ مخلوق کی طرف رخ کرنے سے افضل ہے) تحقیق وہ ہے جو حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا کہ نبوت بہرحال ولایت سے افضل ہے۔ ولایت کسی نبی کی ہو یا غیر نبی کی بہر صورت اس کا مرتبہ نبوت سے نچلا ہے کیونکہ ولایت نام ہے تجلیات صفاتی کا اور نبوت عکس ہے تجلیات ذاتیہ کا۔ حضرت مجدد نے فرمایا، نبوت ہو یا ولایت ہر ایک کے دو رخ ہیں عروج و نزول بالائی رخ کی طرف اٹھنا اور زیریں رخ کی طرف اترنا۔ نبی ہو یا ولی مرتبہ عروج میں اس کی توجہ خالص اللہ کی طرف ہوتی ہے تاکہ خود اس کو کمال ذاتی اور ترقی مرتبہ حاصل ہو اور مرتبہ نزول میں دونوں کی توجہ مخلوق کی طرف ہوتی ہے تاکہ دوسروں کو کامل بنا سکیں اور دوسروں کو ان سے نور چینی کا موقع مل سکے نبی اور ولی کے درمیان مرتبہ عروج میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ولی کا عروج صفات کی جانب ہوتا ہے ذات کی جانب نہیں (یعنی سیر صفاتی اس کے پیش نظر ہوتی ہے سیر ذات تک اس کی رسائی نہیں ہوتی) اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نزول کی حالت میں بھی مبدء فیض کی طرف اس کی کسی قدر توجہ رہتی ہے کامل طور پر وہ مخلوق کی طرف متوجہ نہیں ہو جاتا لیکن نبی مرتبہ نزول میں آ کر پورے طور پر مخلوق کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور بظاہر نظر وہ اپنے آپ کو منقطع عن اللہ خیال کرتا ہے اور یہ کیفیت وحالت اس کے لئے بڑی شاق اور دشوار ہوتی ہے مگر حقیقت میں وہ اللہ سے اس حالت میں بھی منقطع نہیں ہوتا بلکہ اس کا رخ ذات کی طرف بھی ہوتا ہے اور اس کے سینے میں دونوں جانب متوجہ ہونے کی سمائی ہوتی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے تب بھی غلط نہ ہوگا کہ حقیقت میں مخلوق کی طرف توجہ کرنے کی حالت میں بھی وہ اللہ ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ کے حکم اذن اور مرضی سے ہی وہ خلق کی طرف متوجہ ہوتا ہے اسی لئے اس سیر نزولی کو سیر من اللہ باللہ (اللہ کی طرف سے اللہ کی مرضی اور حکم کے ساتھ سیر) کہتے ہیں ہم نے اس مسئلے کی تنقیح پورے طور پر سورۂ الم نشرح کی آیت فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کی تفسیر کے ذیل میں کی ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور حضرت موسیٰ کو توریت عطا فرما دی تو اس وقت فرمایا اپنی قوم کے پاس لوٹ کر جاؤ ہم نے ان کی آزمائش کی ہے (جا کر دیکھو ان کی کیا حالت ہو گئی)

مِنۢ بَعۡدِكَ تمہارے بعد یعنی تمہارے پہاڑ کی طرف روانہ ہونے کے بعد۔

وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾ اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا اللہ گمراہی کو پیدا کرنے والا ہے اسی نے بنی اسرائیل کے اندر گمراہی پیدا کی اور سامری کے اندر بھی گمراہی اسی کی پیدا کردہ تھی اس لئے فتنہ میں ڈالنے اور گمراہ کرنے کی نسبت (حقیقی) اپنی طرف کی لیکن عملی گمراہی پیدا کرنے والا اور گمراہ کرنے کا سبب سامری تھا، پس فاعل اضلال کی حیثیت سے سامری کو گمراہ کرنے والا قرار دیا۔

بغوی نے لکھا ہے بنی اسرائیل چھ لاکھ تھے، بارہ ہزار کے علاوہ باقی سب گمراہ اور گوسالہ پرست ہو گئے۔ سب نے بچھڑے کی پوجا کی۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ سامری مقام سامرہ کی طرف منسوب ہے یہ ایک کرمان کا رہنے والا کافر تھا یا بنی اسرائیل کا کوئی سردار تھا بیضاوی نے لکھا ہے سامرہ بنی اسرائیل کا ایک قبیلہ تھا جس کی طرف سامری منسوب تھا سامری کا نام موسیٰ بن ظفر تھا یہ منافق تھا۔

فَرَجَعَ مُوۡسٰۤى اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۚ غرض موسیٰ غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے اپنی قوم کی طرف واپس آئے۔ یعنی چلہ پورا کر کے توریت لینے کے بعد موسیٰ انتہائی غمگینی اور رنج و فکر کی حالت میں قوم کی طرف لوٹے

قَالَ يٰقَوۡمِ اَلَمۡ يَعِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا ۙ اَفَطَالَ عَلَيۡكُمُ الۡعَهۡدُ اَمۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ يَّحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبٌ

مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾

کہنے لگے اے میری قوم کیا تم سے تمہارے رب نے ایک اچھا وعدہ نہیں کیا تھا کیا تم پر (میعاد مقررہ سے زائد) کچھ زمانہ گذر گیا تھا یا تم کو یہ منظور ہوا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب واقع ہو اس لئے تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا۔

قَالَ يٰقَوْمِ واپس آکر موسیٰ نے جب قوم کو بچھڑے کی پوجا میں مبتلا پایا تو کہا وَعْدًا حَسَنًا یعنی توریت دینے کا وعدہ جو سراسر ہدایت اور نور تھی اَفَطَالَ سوال انکاری ہے یعنی تم میرے ساتھ تھے تو اللہ پر ایمان رکھتے تھے اس کو واحد مانتے تھے اسی کی تنہا عبادت کرتے تھے اور مجھ سے تم نے وعدہ کیا تھا کہ میرے بعد بھی اسی پر قائم رہو گے مگر میرے جدا ہونے کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ تمہاری یہ حالت ہو گئی اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ کہ تم پر تمہارے رب کا غضب واجب ہو جائے۔ بچھڑے کی پوجا کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ تم کو اپنے اوپر اللہ کا غضب نازل ہونا مقصود ہے یعنی تم نے ایسا کام کرنا چاہا جو موجب غضب الٰہی ہے۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا کہنے لگے (ایمان پر قائم رہنے کا جو وعدہ ہم نے آپ سے کیا تھا) آپ نے اس وعدے کی خلاف ورزی از خود نہیں کی۔ مَلک مِلک مُلک تینوں ہم معنی ہیں (کذا فی القاموس) یعنی ہم نے اختیار سے ایسا نہیں کیا اگر آدمی خدا کی طرف سے آزمائش اور معصیت میں پڑ جاتا ہے تو (ظاہر ہے کہ) اس کا اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا (اور باوجود با اختیار ہونے کے بے اختیار ہو جاتا ہے)

وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾

لیکن قوم (قبط) کے زیور کا (جو) بار ہم پر لد رہا تھا سو ہم نے اس کو (سامری کے کہنے سے آگ میں) ڈال دیا پھر سامری نے بھی اسی طرح ڈال دیا۔ جب بنی اسرائیل مصر سے نکل کر جانے لگے تو قوم فرعون سے کچھ زیور بطور عاریت شادی میں شرکت کے نام سے لے لیا تھا۔ زِيْنَةِ الْقَوْمِ سے یہی زیور مراد ہے۔ کذا اخرج عبد بن حمید وابن ابی حاتم، عن ابن عباسؓ۔ بغوی نے لکھا ہے بنی اسرائیل نے قوم فرعون کے زیور اپنے اوپر بار اس لئے کہا کہ عاریۃً لیا تھا اور پھر واپس نہ کیا تھا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ فرعون اور اس کے ساتھی جب دریا میں ڈوب گئے تو دریا نے ان کا زیور باہر پھینک دیا بنی اسرائیل نے بطور مال غنیمت اس کو لے لیا لیکن مال غنیمت ان کے لئے جائز نہ تھا اس لئے انہوں نے اس کو بوجھ ہی کہا۔

فَقَذَفْنٰهَا ہم نے اس کو پھینک دیا یعنی ایک گڑھے میں بغوی نے لکھا بعض اہل روایت کا بیان ہے کہ سامری کے کہنے سے انہوں نے ایک گڑھا کھود کر سارا زیور اس میں ڈال دیا تا کہ موسیٰ جب واپس آئیں تو زیور کے متعلق شرعی حکم بتائیں۔

فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ یعنی سامری کے پاس جو زیور تھا اس کو سامری نے بھی اسی طرح گڑھے میں ڈال دیا تھا۔

سعید بن جبیر کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان منقول ہے کہ حضرت ہارون نے آگ جلوا کر بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ تم لوگوں کے پاس جو زیور ہے وہ اس میں ڈال دو حکم کی تعمیل میں بنی اسرائیل نے سارا زیور آگ میں ڈال دیا، پھر حضرت جبرئیل کے گھوڑے کے قدم کے نیچے کی خاک (جو اس کے پاس تھی) آگ میں ڈال دی۔ قتادہ نے کہا وہ خاک سامری نے اپنے عمامے کے گوشہ میں رکھ لی تھی۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾

پھر اس (سامری) نے ان لوگوں کے لئے ایک بچھڑا (بنا کر) ظاہر کیا کہ وہ ایک قالب تھا جس میں ایک بے معنی آواز تھی سو وہ (احمق لوگ) ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ تمہارا اور موسیٰ کا معبود تو یہ ہے موسیٰ تو بھول گئے (اور معبود کی تلاش میں کوہ طور پر چلے گئے) یا نَسِيَ کا یہ مطلب ہے کہ سامری بھول گیا (یعنی) اس نے ایمان کو ترک کر دیا اور اللہ کا منکر ہو گیا (گویا بھولنے سے مراد ہے بالکل ترک کر دینا) خوار سے گائے بیل کی آواز مراد ہے (جو بے معنی ہوتی ہے) فَقَالُوْا یعنی سامری اور اس کے ساتھیوں نے جب سب سے پہلے بچھڑے کو دیکھا تو کہنے لگے۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

کیا وہ لوگ اتنا نہیں دیکھتے تھے کہ وہ نہ تو ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا تھا اور نہ ان کو کسی طرح کا نفع و نقصان پہنچانے پر قدرت رکھتا تھا۔

استفہام انکاری اور دیکھنے سے مراد ہے جاننا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے (بے سمجھے) اس کو معبود بنا لیا اتنا بھی نہ جانا کہ وہ کچھ بھی قدرت نہیں رکھتا اَلَّا یَرْجِعُ میں اَنْ مخففہ ہے یعنی اَنَّ تھا جس کو اَنْ کر لیا اور اس کا اسم ضمیر شان ہے جو محذوف ہے اصل میں لَاَنَّہٗ تھا (یعنی اَنْ ناصبہ مصدریہ نہیں ہے اسی لئے یَرْجِعُ پڑھا گیا یَرْجِعَ نہیں پڑھا گیا) قولا یعنی وہ کوئی بات نہیں کر سکتا تھا نہ کوئی جواب دے سکتا تھا۔ اس کی کمزوری اور عاجزی تو پوجا کرنے والوں سے بھی زائد تھی۔ پھر انہوں نے اس کو کس طرح معبود بنا لیا۔ لَا یَمْلِکُ لَہُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا یعنی نہ فائدہ پہنچانا اس کی قدرت میں تھا نہ نقصان پہنچانا نہ نفع یا نقصان کو روکنا، بغوی نے لکھا ہے مروی ہے کہ سامری بچھڑا بنا رہا تھا کہ حضرت ہارون ادھر سے گزرے اور دریافت فرمایا کیا کر رہا ہے، سامری نے کہا میں ایسی چیز بنا رہا ہوں جو مفید ہوگی، ضرر رساں نہیں ہوگی آپ میرے لئے (کامیابی کی) دعا کر دیجئے حضرت ہارون نے دعا کی اے اللہ یہ جو کچھ تجھ سے مانگ رہا ہے اس کو اس کی دلی مراد کے مطابق عطا فرما دے آپ کی دعا قبول ہوئی اور سامری نے جب بچھڑے کے منہ میں خاک ڈال دی تو بولا چیختا ہوا بچھڑا بن جا، چنانچہ ایسا ہی ہو گیا، حقیقت میں یہ اللہ کی طرف سے آزمائش تھی جس میں اللہ نے بنی اسرائیل کو مبتلا کر دیا تھا۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِن قَبْلُ يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَٰنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ﴿۹۰﴾

اور ہارون ان لوگوں سے (موسیٰؑ کی واپسی سے) پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ میری قوم والو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم اس بچھڑے کی وجہ سے مصیبت میں پھنس گئے اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب رحمٰن ہی ہے پس میری راہ پر چلو اور میرا کہا مانو۔

فُتِنْتُمْ بِہٖ یعنی بچھڑے کے سبب تمہاری جانچ کی گئی ہے کہ تم توحید و ایمان پر قائم رہتے ہو یا بھٹک جاتے ہو وَاِنَّ رَبَّکُمُ الرَّحْمٰنُ یعنی تمہارا رب وہ ہے کہ تمہارا وجود اور لوازم وجود اسی کی رحمت کا نتیجہ ہے یہ بچھڑا تم کو کیا دے سکتا ہے۔ فَاتَّبِعُوْنِیْ یعنی میری راہ پر چلو رحمٰن وحدہ لاشریک لہ کی عبادت پر قائم رہو وَاَطِیْعُوْٓا اَمْرِیْ اور میرا حکم مانو بچھڑے کی پوجا چھوڑ دو۔

قَالُوا لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ﴿۹۱﴾

انہوں نے جواب دیا کہ جب تک موسیٰ ہمارے پاس واپس آئیں ہم تو اس کی پوجا کرنے پر برابر جمے بیٹھے رہیں گے۔ علیہ اس پر یعنی اس کی پوجا پر۔ عاکفین قائم رہیں گے جمے رہیں گے اس جواب کے بعد حضرت ہارون اپنے ساتھ بارہ ہزار اشخاص کو لے کر باقی جماعت سے الگ ہو گئے۔ حضرت موسیٰ واپس آئے تو آپ نے دور سے کچھ شور و غل کی آواز سنی کیونکہ لوگ بچھڑے کے گرد ناچ کود کر رہے تھے اور شور برپا تھا، حضرت کے ساتھ جو ستر آدمی گئے تھے انہوں نے عرض کیا یہ آواز تو کسی فتنہ کی محسوس ہو رہی ہے کوئی فتنہ برپا ہو گیا۔ حضرت موسیٰ نے آکر لوگوں کو بچھڑے کے آس پاس ناچتے دیکھا تو غضب ناک ہو کر دائیں ہاتھ سے حضرت ہارون کے سر کے بال اور بائیں ہاتھ سے داڑھی پکڑ لی۔

قَالَ يَا هَارُونُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ﴿۹۲﴾ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۖ

موسیٰ نے کہا اے ہارون جب تم نے (ان کو) دیکھا تھا کہ یہ بالکل گمراہ ہو گئے (اس وقت) تم کو میرے پاس چلے آنے سے کون سا امر مانع ہوا۔ چونکہ مانع اور داعی میں گہرا تعلق ہے جو کسی چیز سے مانع ہوتا ہے وہ اس چیز کو ترک کرنے کا داعی ہوتا ہے، اس لئے بعض لوگوں کے نزدیک مَنَعَ کا (مجازا) معنی ہے دَعٰی یعنی کس چیز نے تم کو میرے اتباع نہ کرنے پر آمادہ کیا۔

جمہور کے نزدیک لا زائد ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے تم کو وصیت کی تھی کہ ان لوگوں کو برابر توحید پر قائم رکھنے کی

کوشش کرتے رہنا اور شرک سے روکنا خواہ زبان سے ہو یا (آخر میں) اسلحہ کی قوت سے تم نے میرے حکم کی پابندی کیوں نہیں کی، میرے حکم کی تعمیل کرنے سے تم کو کس چیز نے روکا۔

بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ میرے پیچھے آنے اور مجھے اس واقعہ کی اطلاع دینے سے کیا مانع ہوا تم نے ایسا کیوں نہیں کیا (اس مطلب پر اتباع سے مراد ہوگا حضرت موسیٰ کے پیچھے آنا اور اطلاع دینا)

أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي ﴿۹۳﴾ کیا تم نے میرے کہنے کے خلاف کیا پورا کلام اس طرح تھا کیا تم ان کی اس حرکت پر راضی ہو گئے اور میرے نافرمان بن گئے۔ استفہام انکاری ہے۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَآءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ﴿۹۴﴾

ہارون نے کہا اے میرے ماں جائے تم میری داڑھی مت پکڑو اور نہ سر کے بال پکڑو مجھ کو یہ اندیشہ ہوا کہ (کہیں) تم کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفریق ڈال دی اور میری بات کا پاس نہیں کیا۔

یَابْنَ اُمَّ اے میری ماں جائے۔ بجائے بھائی کہنے کے ماں جائے کا لفظ رقت آفریں اور مہربانی طلب ہے اور حضرت موسیٰ کے دل میں اپنے لئے رقت پیدا کرنی مقصود تھی اس لئے اخی نہیں کہا اور یہ لفظ اختیار کیا بعض لوگ کہتے ہیں کہ موسیٰ اور ہارون اخیافی بھائی یعنی دونوں کی ماں ایک تھی، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ بِرَأْسِی یعنی میرے سر کے بال پکڑ کر نہ کھینچئے۔ حضرت موسیٰ نے شدت غضب میں حضرت ہارون کے سر کے بال پکڑ کر کھینچے تھے۔ اِنِّیْ خَشِیْتُ یعنی مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں ان گوسالہ پرستوں سے سختی سے کروں گا اور قتل و قتال سے کام لوں گا تو لا محالہ ان کے دو فرقے ہو جائیں گے ایک میرا حامی اور دوسرا وہ جس سے میں قتال کرتا اور پھر آپ کہتے کہ بنی اسرائیل کے تو نے دو ٹکڑے کر دیئے وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ اور میری بات کا لحاظ نہیں رکھا، میں نے تجھ سے کہا تھا کہ میری جگہ تو ان کی درستی اور اصلاح کرتے رہنا اور ظاہر ہے کہ اصلاح نرمی سے سمجھانے سے ہی ممکن ہو سکتی تھی اس لئے میں نے نرمی سے ان کو سمجھایا خوں ریزی نہیں کی۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ (پھر سامری کی طرف متوجہ ہو کر) موسیٰ نے کہا سامری تیرا کیا معاملہ ہے (تو نے ایسا کس طرح کیا)۔

بیضاوی نے لکھا ہے خَطْبٌ خَطَبَ الشَّیْءَ کا مصدر ہے اس کا معنی ہے طلب یعنی ایسی حرکت کرنے سے تیرا مقصد کیا تھا کس چیز نے تجھے ایسا کام کرنے پر آمادہ کیا۔ صاحب نہایہ نے لکھا ہے کہ خطب کا معنی ہے حال اور شان یعنی تیرا کیا حال ہے خطب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے متعلق خطاب کیا جائے اسی لئے حال اور شان کو بھی خطب کہا جاتا ہے صاحب قاموس نے لکھا ہے خطب کا معنی ہے شان اور امر چھوٹا ہو یا بڑا۔

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي ﴿۹۶﴾

اس نے کہا مجھے ایسی چیز نظر آئی تھی جو اوروں کو نظر نہیں آئی تھی پھر میں نے اس فرستادہ خداوندی کی سواری کے نقش قدم سے ایک مٹھی بھر (خاک) اٹھالی تھی پس میں نے وہ مٹھی خاک (اس قالب کے اندر) ڈال دی اور میرے جی کو یہی بات پسند آئی۔

قَبْضَةً ایک بار قبضہ کرنا اس سے مراد وہ شے بھی ہوتی ہے جو مٹھی میں لے لی جائے یہاں ایک مٹھی خاک مراد ہے اَثَرِ الرَّسُوْلِ (مضاف محذوف ہے) یعنی فرستادہ (خداوندی) کے گھوڑے کے نقش قدم سے فَنَبَذْتُهَا میں نے وہ خاک (بچھڑے کے قالب میں) ڈال دی۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سامری نے وہ خاک حضرت جبرئیل کے گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے سے اٹھائی تھی کیونکہ اس کی پیدائش اس سال ہوئی تھی جس سال بنی اسرائیل کے نوزائیدہ قتل کئے جا رہے تھے سامری کی ماں نے اس کو لے جا کر ایک غار

میں رکھ دیا تھا اللہ نے اس کی پرورش کے لئے حضرت جبرئیل کو مامور فرمادیا کیونکہ اس کے ہاتھوں سے ایک فتنہ بنی اسرائیل میں بپا کرانا تھا۔ جبرئیل اس کی غذائی پرورش کرتے رہے یہاں تک کہ یہ خود اپنے پیروں کا ہو گیا اس وقت یہ جبرئیل کو پہچانتا تھا (اور گھوڑے کے قدموں کے نیچے کی خاک کی حیات بخشی سے بھی واقف تھا) وہی خاک اس کے پاس تھی جو اس نے بچھڑے کے کالبد کے منہ میں ڈال دی اور بچھڑا ڈکرانے لگا)

وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ اور میرے دل نے یہی بات پسند کی اور میری نظر میں اس فعل کو پسندیدہ بنادیا۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهُ

موسیٰ نے کہا تو بس تیرے لئے (اس دنیا کی) زندگی میں یہ سزا ہے کہ تو کہتا پھرے گا چھونا نہیں (مجھے کوئی ہاتھ نہ لگانا) اور تیرے لئے (آخرت میں) ایک اور مقررہ وعدہ ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں۔ مساس علم مصدر ہے (نفی بمعنی نہی ہے) یعنی مجھے چھونا نہیں میرے قریب نہ آنا میں کہتا ہوں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اللہ نے اس کے دل میں انسانوں سے وحشت پیدا کر دی ہو اسی لئے وہ جنگلوں اور ویرانوں میں مارا مارا پھرتا تھا اسی حالت میں مر گیا۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دے دیا تھا کہ اس سے میل جول نہ رکھنا اس کے پاس بھی نہ جانا۔ حضرت ابن عباس نے لامساس کی تفسیر میں فرمایا نہ تجھے چھونا ہے نہ تیری اولاد کو (یعنی نہ تجھے کوئی چھوئے گا نہ تیری اولاد کو) مَوْعِدًا یعنی آخرت میں عذاب کا اللہ کی طرف سے مقررہ وعدہ ہے۔

وَانْظُرْ إِلٰى إِلٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَّنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا

اور تو اپنے اس معبود کو دیکھ جس (کی عبادت) پر تو جما بیٹھا تھا ہم اس کو جلا دیں گے (جلا کر خاک کر دیں گے) پھر اس کی (راکھ) کو دریا میں بکھیر کر بہادیں گے۔

اِلٰهِكَ یعنی تیرے باطل خیال میں جو تیرا معبود تھا اس کو دیکھ لَنُحَرِّقَنَّهُ ہم اس کو آگ میں جلا ڈالیں گے یا ریتی سے بالکل گھس ڈالیں گے۔ حَرَقَ ریتی سے گھس ڈالا۔ باب افعال میں حَرَّقَ کو لے گئے تو گھسنے میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا بالکل گھس ڈالنا لَنَنْسِفَنَّهُ خاک اور راکھ کو یا گھسے ہوئے چورے کو بکھیر دیں گے اڑا دیں گے، دریا میں بکھیر کر بہادیں گے پھر اس کی خاک کا کوئی ذرہ بھی ہاتھ نہیں لگے گا ان بیوقوفوں کی حماقت کو ظاہر کرنے کے لئے حضرت موسیٰ نے ایسا کیا بھی۔

إِنَّمَا إِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا

حقیقت میں تمہارا معبود یعنی تمہاری عبادت کا مستحق صرف اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں (کیونکہ علم کی ہمہ گیری اور کمال قدرت میں کوئی اس جیسا نہیں بلکہ اس کی برابری کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتا) اس کا علم ہر چیز کو (اپنے اندر) سمائے ہوئے ہے یہ بچھڑا معبود کیسے ہو سکتا ہے جس کو اول سونے چاندی کو پگھلا کر ڈھالا گیا بنایا گیا پھر اس کو خاک بنایا جائے گا اگر یہ زندہ بھی ہوتا تو اتنا بے وقوف ہوتا کہ لوگ بیوقوفی میں اس کو ضرب المثل بناتے (اور کہتے یہ بیل ہے)

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ آتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا

اسی طرح ہم تم سے واقعات گزشتہ کی کچھ خبریں بیان کرتے رہتے ہیں اور ہم نے تم کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ دیا ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ یعنی جس طرح ہم نے تم کو موسیٰ کا قصہ سنایا اسی طرح ہم گزشتہ اقوام کے سابقہ احوال وواقعات بیان کرتے ہیں تاکہ تم کو بصیرت حاصل ہو تمہارے علم میں افزونی ہو معجزات میں اضافہ ہو اور تمہاری امت کے بصیرت اندوز لوگوں کے لئے سرمایہ نصیحت و بیداری حاصل ہو۔

وَقَدْ آتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ذکر سے مراد ہے قرآن مجید، یعنی ہم نے تم کو ایسا قرآن عطا کیا ہے جس میں اقوام ماضیہ کے واقعات درج ہیں یہ قابل غور و فکر یادداشت اور نصیحت نامہ ہے بعض علماء کے نزدیک ذکر سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کا بہترین ذکر اور آپ کی عظیم الشان شہرت اور قیامت تک قائم رہنے والا تذکرہ، یعنی ہم نے اپنی جانب سے تم کو شہرت اور اعلیٰ نام

آوری عطا کی۔ بعض اہل تفسیر نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا کہ میں نے تمہارے ذکر کو اپنے ذکر کے ساتھ ملا دیا۔ اذان میں اقامت میں تشہد میں اور (کلمہ وغیرہ جیسی) دوسری چیزوں میں ملا دیا۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ یَحْمِلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهِ ؕ وَ سَآءَ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾

جو لوگ اس سے منہ موڑیں گے وہ قیامت کے دن بھاری بوجھ (عذاب کا) اپنے اوپر لادے ہوں گے اور وہ اس (عذاب) میں ہمیشہ رہیں گے اور قیامت کے دن یہ بوجھ ان کے لئے (بہت) برا بوجھ ہوگا۔ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ یعنی جو شخص قرآن سے منہ موڑے گا اس کو نہیں مانے گا اور اس پر عمل نہیں کرے گا یا عنہ کی ضمیر ذکر کی طرف یا اللہ کی طرف راجع ہے یعنی جو تمہارے ذکر سے یا اللہ سے منہ موڑے گا۔

وِزْرًا یعنی گناہوں کا بھاری بوجھ۔ سورۂ مریم کی آیت یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا کی تشریح میں عمرو بن قیس ملائی کی روایت کردہ حدیث ہم نے ذکر کر دی ہے اس حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ کافر کے سامنے اس کا برا عمل بہت ہی مکروہ شکل اور سڑاند کے ساتھ آئے گا اور کافر سے کہے گا کیا تو مجھے نہیں پہچانتا کافر جواب دے گا نہیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اللہ نے تیری شکل بڑی مکروہ اور تیری بو بہت سڑی ہوئی بنائی ہے۔ عمل کہے گا میں دنیا میں بھی ایسا ہی تھا میں تیرا عمل ہوں دنیا میں طویل مدت تک تو مجھ پر سوار رہا آج میں تجھ پر سوار ہوں گا، پھر حضور اقدس نے پڑھا وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ گناہ کو ایک بھاری بوجھ قرار دیا کیونکہ جس طرح بھاری بوجھ اگر پشت پر لدا ہو تو کمر ٹوٹنے لگتی ہے اسی طرح گناہوں کا عذاب بھی ناقابل برداشت ہوگا جس پر پڑے گا اس کو اٹھانے میں انتہائی دشواری ہوگی۔ فِیْهِ یعنی بارِ گناہ کی سزا میں۔

آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو قرآن سے روگردانی کرے گا وہ قیامت کے دن اپنے کندھے پر اس مال کا بوجھ اٹھائے گا جو دنیا میں اس نے ناجائز طور پر بغیر استحقاق کے لیا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص کوئی چیز دنیا کی اپنے حق کے بغیر نہ لے ورنہ جب اللہ کے سامنے وہ جائے گا تو وہ چیز قیامت کے دن اس کے اوپر سوار ہوگی میں تم میں سے کسی شخص کو اللہ کے سامنے اپنے اوپر بلبلاتے اونٹ ڈوکتی گائے اور ممناتی بکری کو لادے ہوئے نہ پاؤں۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین عن ابی حمید الساعدی۔

حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے بالشت بھر زمین ناحق لی قیامت کے دن اس کو سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔

طبرانی نے حضرت حکم بن حارث سلمی کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مسلمانوں کے راستہ کی بالشت بھر زمین لی وہ سات زمینوں سے اس کو اپنے اوپر لادے ہوئے (قیامت کے دن) آئے گا۔

امام احمد اور طبرانی نے حضرت یعلی بن مرہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جس نے بالشت بھر زمین ناحق لی اللہ اس کو مکلف کرے گا کہ بالشت بھر کا گڑھا زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا اور لوگوں کا فیصلہ ہونے تک یہ طوق گلے میں پڑا رہے گا۔

طبرانی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے بالشت بھر زمین ناحق لی، وہ قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنے ہوئے آئے گا۔ امام احمد اور طبرانی نے حضرت ابو مالک اشعری کی روایت سے بھی یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔

امام احمد اور شیخین نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ (ایک روز خطاب کرنے کے لئے) کھڑے ہوئے اور مال غنیمت میں خیانت کرنے کی بڑی برائی کی پھر فرمایا ایسا نہ ہو کہ میں قیامت کے دن تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں پاؤں کہ بلبلاتے اونٹ کو اپنے گردن پر سوار کئے آرہا ہو اور مجھ سے کہہ رہا ہو یا رسول اللہ میری مدد کیجئے۔ میں کہہ دوں گا کہ اللہ کے مقابلہ میں، میں تیرے لئے (اب) کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے تجھے پیام پہنچا دیا حضورؐ نے اس حدیث میں اسی

گردن پر ہنہناتے گھوڑے اور منمناتی بکری کے سوار ہونے کا تذکرہ فرمایا تھا، ابو یعلی اور بزار نے حضرت عمر بن خطاب کی روایت سے بھی اسی طرح یہ حدیث بیان کی ہے مال زکوٰۃ وصول کرنے والے اگر اس میں خیانت کریں تو اسی مضمون کی حدیث سعد بن عبادہ کی روایت سے امام احمد نے اور حضرت ابن عمرؓ و حضرت عائشہ کی روایت سے بزار نے اور حضرت ابن عباسؓ و حضرت عبادہ بن صامت و حضرت ابن مسعود کی روایت سے طبرانی نے بیان کی ہے۔

ابو نعیم نے حلیہ میں اور طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنی ضرورت سے زیادہ کوئی مکان بنایا اس کو مجبور کیا جائے گا کہ اس کو کندھے پر اٹھائے۔ ابو داؤد ابن ماجہ اور طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کسی انصاری کے (تعمیر کردہ) ایک قبہ (گول کمرہ) کی طرف سے گزرے اور دست مبارک سے اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جو عمارت اس سے زائد ہو گی وہ قیامت کے دن اس عمارت کے مالک کے لئے مصیبت ہو گی اس مکان کے مالک کو یہ اطلاع پہنچی (حضور ﷺ نے ایسا فرمایا ہے) تو انہوں نے اس عمارت کو ڈھادیا۔ طبرانی نے حضرت واثلہ بن اسقع کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔

منذری نے کہا اس حدیث کے دوسرے شواہد بھی ہیں۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک کنوئیں کی طرف سے جس سے پانی سینچا جا رہا تھا۔ گزرے فرمایا اس کنوئیں کا مالک اگر اس کا حق ادا نہیں کرے گا تو قیامت کے دن اس کو یہ کنواں اپنے اوپر لادنا ہو گا۔

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿١٠٢﴾

جس روز صور میں پھونک ماری جائے گی اور ہم اس روز مجرموں کو اس حالت سے جمع کریں گے کہ وہ کرنجے ہوں گے۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں آیا ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے صور کے متعلق دریافت کیا حضور ﷺ نے فرمایا ایک سینگ ہو گا جس کے اندر پھونکا جائے گا، رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن حبان والحاکم والبیہقی وابن المبارک۔ نسائی نے اس حدیث کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے مسدد نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔ زرقا سے مراد ہے نیلی آنکھوں والے، آنکھ کی سیاہی میں سبزی کی آمیزش کو زرقت کہتے ہیں عرب کے نزدیک ایسے رنگ کی آنکھ بہت بدنما اور بری مانی جاتی ہے رومیوں کی آنکھیں اسی رنگ کی ہوتی تھیں اور رومی عربوں کے دشمن تھے، قیامت کے دن کافروں کے چہرے کالے اور آنکھیں نیلی ہوں گی۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک زرقا سے مراد ہیں نابینا آنکھوں والے نابینا کی آنکھ ازرق ہو جاتی ہے، دوسری آیت سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے دوسری جگہ فرمایا ہے وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى بعض نے کہا زرقا سے مراد ہے پیاسے۔

يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿١٠٣﴾ چپکے چپکے آپس میں باتیں کرتے ہوں گے کہ تم لوگ صرف دس روز قبروں میں رہے ہو گے۔ چونکہ ان کے دل مرعوب اور ہول زدہ ہوں گے اس لئے چپکے چپکے باہم کہیں گے کہ تم لوگ دنیا میں صرف دس رات رہے یعنی بہت جلد دنیوی زندگی ختم ہو گئی۔ دس رات سے قلیل مدت مراد ہے، جو مدت گذر گئی وہ ان کو قلیل ہی معلوم ہو گی اور آخرت کے مقابلہ میں تو ان کو دنیا کا قیام خصوصیت کے ساتھ قلیل محسوس ہی ہو گا، یا یوں کہا جائے کہ شدائد آخرت سامنے آنے کے بعد ان کو افسوس ہو گا کہ ہم نے دنیوی زندگی، نفسانی خواہشات پوری کرنے میں کھو دی اور چند روزہ زندگی کو بیکار ضائع کر دیا۔ بعض اہل تفسیر نے کہا کہ قبروں کے اندر ٹھہرنے کو وہ دس روزہ قیام سے تعبیر کریں گے۔ بعض نے کہا کہ صور فنا اور صور بعث کے درمیان مدت چالیس سال کی ہو گی، اللہ دونوں صوروں کے درمیان ان پر کوئی عذاب نہ ہو گا۔ (اور آرام کی مدت قلیل ہی معلوم ہوتی ہے اس لئے وہ چالیس سال کو دس روز کہیں گے)

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿١٠٤﴾

طہ ۲۰

جس مدت کے متعلق وہ (اپنے اندازے سے) کہیں گے ہم خوب جانتے ہیں (کہ وہ کتنی ہوگی) جب کہ ان کا سب سے صائب الرائے یوں کہتا ہوگا کہ نہیں ہم تو ایک ہی روز (قبر میں) رہے اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً یعنی زیادہ سمجھدار اور بھرپور عقل والا اور سب سے بڑھ کر معتدل العقل یا معتدل العمل۔ اس قول کے قائل کو اللہ نے زیادہ صائب الرائے قرار دیا، کیونکہ آخرت کے طول کے مقابلہ میں دنیوی مدت انتہائی کم ہے اور اس قول میں کمترین مدت کا ہی اظہار کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ کسی ثقفی شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا قیامت کے دن ان پہاڑوں کا کیا ہوگا۔ اس کے جواب میں آیت ذیل نازل ہوئی (رواہ البغوی) بعض نے کہا سوال کسی نے نہیں کیا تھا آیت میں جو جواب ہے وہ بر تقدیر سوال ہے یعنی اگر وہ سوال کریں تو آپ یہ جواب دیں۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾

اور وہ آپ سے پہاڑوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں (کہ قیامت کے دن ان کا کیا ہوگا) سو آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کو بالکل اڑا دے گا پھر ان کو ایک چٹیل ہموار میدان (میں تبدیل) کردے گا کہ جس میں آپ کو نہ ناہمواری دکھائی دے گی نہ (کہیں) بلندی۔ ابن المنذر نے ابن جریج کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قریش نے سوال کیا تھا قیامت کے دن آپ کا رب ان پہاڑوں کا کیا کرے گا اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

صحیح بات یہ ہے کہ کوئی خاص سائل نہ تھا اور بر تقدیر سوال جواب کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ فَقُلْ میں ف کا لانا بتا رہا ہے کہ یہ ف جزائیہ ہے اور شرط محذوف ہے یعنی اگر لوگ سوال کریں تو یہ جواب دیجئے دوسری آیات میں بھی سوالات کے جوابوں کی تعلیم دی گئی ہے لیکن وہاں چونکہ کوئی شرط محذوف ہے نہ مذکور اس لئے قل سے پہلے ف نہیں ذکر کی گئی مثلاً فرمایا ہے وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وغیرہ۔

يَنْسِفُهَا یعنی ان کو جڑ سے اکھاڑ دے گا اور ریت کی طرح ریزہ ریزہ کردے گا نَسْفٌ جڑ سے اکھاڑ دینا۔ ہا ضمیر زمین کی طرف راجع ہے اگرچہ زمین کا ذکر پہلے نہیں آیا کیونکہ جبال کا لفظ اپنی قرارگاہ یعنی زمین پر دلالت کر رہا ہے قاع نرم نشیبی زمین جس کے ادھر ادھر پہاڑیاں اور ٹیلے ہٹ گئے ہوں ہموار زمین نکل آئی ہو (قاموس) صَفْصَفٌ ہموار میدان قاموس عِوَجٌ کجی موڑ۔ اَمْتٌ ابھار۔ یعنی پہاڑوں کے تین احوال ہوں گے دیکھنے میں وہ ہموار چٹیل میدان محسوس ہوں گے اور نشیب فراز جانچنے کے آلے سے دیکھو تو ان میں کوئی کجی نظر آئے گی نہ ابھار۔

يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾

اس روز (سب کے سب خدا کی طرف سے) بلانے والے کے کہنے پر ہو لیں گے اس کے سامنے کسی کا ٹیڑھا پن نہیں رہے گا اور ساری آوازیں رحمٰن کے سامنے (اس کی ہیبت کی وجہ سے) دب جائیں گی پس اے مخاطب تجھے پاؤں کی آہٹ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے گی۔

داعی یعنی اسرافیل میدان حشر کی طرف سب کو بلائیں گے اور صخرۂ بیت المقدس پر کھڑے پکار کر کہہ رہے ہوں گے اے بوسیدہ ہڈیو! اے پارہ پارہ کھالو! اے ٹوٹے بالو! تم کو اللہ فیصلے کے لئے جمع ہونے کا حکم دیتا ہے (سب آجاؤ) ابن عساکر نے زید بن جابر شافعی کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے عِوَجَ لَهٗ یعنی پکارے جانے پر بلانے والے سے دائیں بائیں طرف کو نہیں مڑیں گے بلکہ سیدھے تیزی کے ساتھ داعی کی دعوت پر آئیں گے۔ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ اور رحمٰن کی ہیبت سے آوازیں پست ہو جائیں گی دب جائیں گی۔

فَلَا تَسْمَعُ ف سببیہ ہے اور خطاب ہر شخص کو ہے یعنی اسی سبب سے اے مخاطب تو کسی کی آواز نہ سن پائے گا ہمْسٌ

خفیف آواز جیسے چلنے میں اونٹوں کے پاؤں کی۔ بغوی نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ ہمس کا معنی ہے چپکے چپکے بات کرنا اور پست آواز۔ سعید بن جبیر نے اس کی تشریح میں حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا کہ بغیر بات کیے لب ہلانا (کہ کوئی بات اوا نہ ہو) ابن ابی جارود نے بحوالہ ابو طلحہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا کہ بغیر بات کے لب ہلانا (کہ کوئی بات اوا نہ ہو) ابن ابی جارود نے بحوالہ ابو طلحہ حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا کہ قاعاً یعنی ہموار، صفصفاً یعنی اس میں کوئی سبزہ نہ ہوگا، چٹیل میدان ہوگا عوج وادی (گڑھا) امت ٹیلہ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ آوازیں ساکن ہو جائیں گی۔ ہمسا خفی آواز۔ دوسرے طریق روایت سے حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے چٹیل چکنی زمین نہ اس میں کوئی مکان بلند ہوگا نہ نشیب۔ ایک اور سند سے حضرت ابن عباس کا قول مروی ہے کہ ہمس سے مراد ہے پاؤں کی چاپ، یعنی آدمیوں کے قدموں کی آواز جب ان کو میدان حشر کی طرف لایا جائے گا۔

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ اس روز (کسی کو کسی کی) سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسے شخص کے واسطے جس کے لیے رحمٰن نے اجازت دے دی ہو اور اس شخص کے واسطے بولنا پسند کر لیا ہو۔

مَنْ یا محل رفع میں ہے اور لفظ شفاعت مضاف محذوف ہے یعنی کسی کو کسی کی شفاعت فائدہ نہیں دے گی ہاں اس شخص کی شفاعت فائدہ دے گی جس کو شفاعت کرنے کی اللہ نے اجازت دے دی ہو گی۔ یا مَنْ محل نصب میں ہے یعنی کسی کو کسی کی شفاعت مفید نہ ہوگی ہاں اس شخص کو سفارش فائدہ دے گی جس کے لیے سفارش کرنے کی اللہ نے اجازت دے دی ہو گی۔

وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا یعنی اس شفیع کی شفاعت کو اللہ نے پسند کیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ شفیع عند اللہ معزز ہوگا اللہ اس کو شفاعت کرنے کی اجازت دے گا اور اس کی سفارشی گزارش کو پسند فرمائے گا یا یہ مطلب ہے کہ اس گناہ گار کے حق میں اللہ نے سفارشی کے قول کو پسند کیا ہو۔ (اول مطلب اس وقت ہوگا جب مَنْ کو محل رفع میں مانا جائے اور دوسرا مطلب اس وقت ہوگا جب مَنْ کو محل نصب میں قرار دیا جائے)

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وہ اُن سب کے اگلے پچھلے احوال کو جانتا ہے اور اس کو ان کا علم احاطہ نہیں کر سکتا۔

مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ یعنی سفارش کرنیوالوں اور جن کی سفارش ہو گی ان کے آگے آنے والے احوال کو اللہ جانتا ہے وَمَا خَلْفَهُمْ یعنی دنیا میں اور قبروں میں جو احوال ان کے تھے ان کو بھی اللہ جانتا ہے۔ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا یعنی ان کا علم اللہ کی معلومات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ ؕ اور (اس روز) تمام چہرے اس حَیّ و قَیُّوْم کے سامنے جھکے ہوں گے۔ عَنَتْ ذلیل ہوں گے عاجز ہوں گے جیسے قیدی بادشاہ کے سامنے ذلیل و عاجز ہوتے ہیں عنا یعنو عناءً (نصر) تھک گیا تَعَنّٰی تکلیف جھیلی۔ بغوی نے لکھا ہے عانی بمعنی قیدی اسی (باب نصر عَنَا یَعْنُوْ) سے ہے۔ اَلْحَیُّ وہ ذات جو کبھی نہیں مرے گی اور اس پر موت ہی نہ آنی چاہیے۔ کیونکہ جس پر موت کا طاری ہونا ممکن ہو وہ حقیقت میں مَیِّت (یعنی معدوم الاصل) ہی ہوتا ہے اور اللہ معدوم الاصل نہیں اس لیے اس پر موت آنا ناممکن ہے۔ اَلْقَیُّوْمُ تھامے ہوئے ہر شخص جو کچھ کرتا ہے اس کے تمام اعمال کو تھامے ہوئے اور ساری مخلوق کے انتظام کو تھامے ہوئے۔ چہروں سے مراد ہیں چہروں والے۔ لفظ الوجوہ بظاہر تمام چہروں کو شامل ہے یعنی ہر شخص اللہ کے سامنے جھکا ہوگا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف مجرموں کے چہرے مراد ہوں اور الوجوہ میں الف لام مضاف الیہ کے عوض لایا گیا ہو۔ یعنی وجوہ المجرمین۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ اور ایسا شخص تو (ہر طرح) ناکام رہے گا جو ظلم (یعنی شرک) لے کر آیا ہوگا۔ ظلم سے مراد ہے شرک حضرت ابن عباس نے آیت کی تشریح میں فرمایا گھاٹے میں رہے گا جس نے اللہ کا کسی کو

شریک قرار دیا۔

طلق بن حبیب کے نزدیک عنا سے مراد ہے سجدہ کرنا اس تفسیر پر آیت کا مطلب اس طرح ہوگا تمام چہرے حی و قیوم کو سجدہ کرتے ہیں اور جو شخص شرک کرے اور اللہ کو سجدہ نہ کرے وہ ناکام رہے گا۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

اور جس نے نیک کام ایماندار ہونے کی حالت میں کئے ہوں گے سو اس کو نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کمی کا۔ مِنَ الصّٰلِحٰتِ میں مِنْ بمعنی بعض نیک کام، مراد فرائض کی ادائیگی۔ یا مِنْ ابتدائیہ ہے اور صالحات سے مراد ہیں صحیح درست نیتیں، یعنی جس نے نیک نیت سے کوئی کام کیا ہوگا۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ جملہ حالیہ ہے یعنی نیک کام بحالت ایمان کئے ہوں تمام عبادات، طاعات اور نیک کاموں کے قبول ہونے کی لازمی شرط ایمان ہے۔

فَلَا يَخٰفُ جزا محذوف ہے ف سببیت کے لئے ہے۔ یعنی محذوف جزا کی علت بے خوفی ہے مطلب یہ ہے کہ جو مومن نیک کام کرے گا وہ کامیاب ہوگا کیونکہ وہ حق تلفی سے بے خوف ہوگا۔ یا لَا يَخٰفُ خبر ہے هُوَ ضمیر مبتدا محذوف ہے پس وہ نہیں ڈرے گا۔ ظُلْمًا یعنی گناہوں میں اضافہ کر دیئے جانے کا اس کو اندیشہ نہ ہوگا۔ وَّلَا هَضْمًا اور نہ نیکیوں کے ثواب کم ہونے کا اس کو خوف ہوگا۔ کذا قال ابن عباسؓ۔ حسنؒ نے تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا ہے نہ اس کو نیکیوں کے ثواب میں کمی ہونے کا اندیشہ ہوگا۔ اور نہ اس امر کا خوف ہوگا کہ دوسرے گناہ گار کے گناہ اس پر لاد دیئے جائیں۔ ضحاک نے کہا اس کو نہ گناہ میں پکڑے جانے کا اندیشہ نہ ہوگا اور نہ کسی عمل کی اچھائی تلف ہونے کا خطرہ۔ هَضْم کا لغوی معنی ہے کم کرنا اور توڑنا هَضْمُ الطَّعَامِ اسی سے بنا ہے (معدہ کے اندر کھانے کا ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جانا)

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

اور ہم نے اسی طرح اس کو عربی قرآن کر کے نازل کیا ہے اور اس میں ہم نے طرح طرح سے وعید بیان کی ہے تاکہ وہ (سننے والے) ڈر جائیں یا یہ قرآن ان کے لئے (کسی قدر تو) سمجھ پیدا کر دے۔

یعنی جس طرح ہم نے گزشتہ احوال اور سابق امتوں کے واقعات آپ پر نازل کئے اسی طرح یہ قرآن بھی عربی میں نازل کیا جو ہماری طرف سے نازل کردہ ہے اور اس میں نیک ایمانداروں کے لئے اچھے ثواب کا وعدہ اور کافروں بدکاروں کے لئے برے عذاب کی وعید ہے۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا یعنی جو قرآن ہم نے نازل کیا وہ عربی زبان میں پڑھا جاتا ہے سب کا اسلوب اور طرز ایک ہے سارا قرآن معجز ہے۔ وَصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ اور طرح طرح سے گھما پھرا کر بار بار وعید کی آیات بیان کیں تاکہ لوگ شرک اور معاصی سے پرہیز رکھیں اور تقویٰ کی پائیدار قوت ان کے اندر پیدا ہو جائے یا (اگر کامل تقویٰ کی راسخ قوت ان کے اندر پیدا نہ بھی ہو تب بھی) یہ قرآن سننے والوں کے لئے کسی قدر نصیحت ہی پیدا کر دے گا اور گناہوں سے وہ کچھ تو بچ جائیں۔

ایک شبہ: يَتَّقُوْنَ میں نسبت سننے والوں کی طرف کی گئی، کیونکہ تقویٰ ان ہی کے اندر ایک راسخ لازوال قوت ہو سکتا ہے اگر وہ ہی شرک و معاصی سے پرہیز کریں گے تو تقویٰ ان کے لئے مستحکم صفت اور راسخ قوت بن جائے گا اگر یہ نہ ہو سکا تو کم سے کم اتنا تو ہو ہی جائے گا کہ قرآن کے ذریعہ سے اللہ ان کو کچھ نصیحت و موعظت ہی عطا فرما دے (خواہ تقویٰ کے درجہ تک وہ نہ پہنچیں) احداث ذکر کی نسبت قرآن کی طرف مجازی ہے۔ قرآن سبب نصیحت پذیری ہے، فاعل حقیقی اور نصیحت پیدا کرنے والا تو خدا ہے۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک اَوْ يُحْدِثُ اَوْ بمعنی واو ہے (اس صورت میں مطلب زیادہ واضح ہو جائے گا کہ قرآن اس لئے نازل کیا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ اور قرآن ان کے لئے نصیحت پیدا کر دے) فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ

سو اللہ تعالیٰ جو بادشاہ حقیقی ہے بڑا عالی شان ہے فَتَعٰلَى اللّٰهُ یعنی جس طرح اللہ اپنی ذات و صفات میں مشابہت مخلوق سے پاک ہے اسی طرح اس کا کلام بھی مخلوق کے کلام کی مماثلت سے اعلیٰ اور بالا ہے پس وہ برتر اور منزہ ہے مشرکوں کے شرکیہ

اقوال سے۔ میں کہتا ہوں، بلکہ وہ ان لوگوں کے بیان سے بھی برتر و بالا ہے جو اس کے اوصاف کامل طور پر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کوئی اس کی ذات وصفات کو پورا پورا بیان نہیں کر سکتا۔ اَللّٰھُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ عَلٰی مَا اَرَدْتَ

اَلْمَلِکُ یعنی وہ ایسا بادشاہ ہے جس کا حکم نافذ ہے جس کی حکومت ہمیشہ سے ہے جس کا غلبہ ہمہ گیر اور عظیم الشان ہے اَلْحَقُّ یعنی اس کا وجود اور تمام صفات اور اقتدار ذاتی ہے (کسی کا عطا کردہ نہیں ہے) فنا و بگاڑ اور زوال کا اس کے اقتدار، حکومت اور صفات وذات میں کوئی احتمال ہی نہیں ہے۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤی اِلَیْکَ وَحْیُهٗ ۚ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

اور قرآن پڑھنے میں قبل اس کے کہ آپ پر اس کی وحی پوری نازل ہو عجلت نہ کیجئے اور کہئے کہ اے میرے رب میرا علم بڑھادے۔

یعنی جب تک جبرئیل پوری وحی پہنچانہ چکیں آپ قرآن پڑھنے میں عجلت نہ کیجئے مطلب یہ ہے کہ جب تک جبرئیل وحی پہنچانہ چکیں آپ قرآن پڑھنا شروع نہ کیجئے۔ آیت لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔

مجاہد اور قتادہ نے آیت کا تفسیری مطلب یہ بیان کیا ہے کہ صحابہ کو قرآن پڑھانا اور لکھوانا اس وقت تک شروع نہ کیجئے جب تک آپ کے لئے اس کا مطلب اور معنی واضح نہ ہو جائے گویا مکمل بیان آنے سے پہلے مجمل آیات کی تبلیغ (اور توضیح) کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ جلدی کرنے کی جگہ آپ زیادتی علم کی درخواست کیجئے اور دعا کیجئے کہ پروردگار جو علم تو نے مجھے عنایت کیا ہے اس میں اور ترقی عطا کر اس کی وجہ یہ ہے کہ جو وحی آگئی وہ تو بہر حال پوری آکر رہے گی (اور یاد بھی ہو جائے گی اس میں عجلت بے سود ہے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

اور اس سے (بہت زمانہ) پہلے ہم آدم کو ایک حکم دے چکے تھے سو اس سے بھول اور (بے احتیاطی) ہو گئی اور ہم نے اس کے اندر پختگی نہیں پائی۔ عَہِدْنَا ہم نے آدم کو حکم دیا اور نصیحت کر دی کہ درخت کے قریب نہ جائے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے عَهِدَ اِلَیْهِ اس کو حکم دے دیا نصیحت کر دی فَنَسِیَ یعنی وہ حکم کو بھول گیا اور درخت سے بچے رہنے کا جو اس کو حکم دیا گیا تھا اس کو چھوڑ بیٹھا۔ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا اور حکم کو یاد رکھنے کی کوشش ہم نے اس کے اندر نہیں پائی یا جس چیز سے روکا گیا اس سے باز رہنے پر صبر اس کے اندر نہیں پایا۔ لغت میں عزم کا معنی ہے کسی کام کو کرنے کا پختہ ارادہ کر لینا۔ اِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّکَاحِ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ تینوں آیات میں، عزم کا معنی پختہ ارادہ ہی ہے۔ قاموس میں ہے عزم علیہ اس کام کو کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ بالکل طے کر لیا کہ ایسا ہی کرنا ہے۔ یا اس کام کی کوشش کی (دونوں معنی آتے ہیں) نہایہ میں ہے، عزم کوشش اور صبر۔ میں کہتا ہوں اگر کسی کام کا پختہ ارادہ کر لیا تو اس کا تقاضا ہے کہ اس کو کرنے کی کوشش کی جائے اور جو دشواریاں اور مشکلات راستہ میں آئیں ان پر صبر کیا جائے۔

بعض اہل تفسیر نے لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا کا مطلب یہ لکھا ہے کہ ہم نے آدم کے دل میں نافرمانی کرنے کا ارادہ نہیں پایا وہ بھول گیا اس سے چوک ہو گئی[1]۔ صاحب کشاف (زمخشری) اور بیضاوی نے کہا ہے کہ لَقَدْ عَهِدْنَا کا عطف صرفنا پر ہے مطلب یہ ہے کہ بار بار نصیحت وعید کے بعد بھی جو یہ لوگ عہد شکنی کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ آدم کی تخلیق کی

---

[1] ابن زید نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا کہ اللہ نے جو آدم کو بتادیا تھا کہ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَلِزَوْجِکَ یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے آدم ابلیس کی عداوت کو اور اللہ کی اس نصیحت کو بھول گئے۔ قاضی عیاض نے شفا میں لکھا ہے کہ اللہ نے فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا فرما کر خود ہی آدم کا عذر پیش کر دیا۔

بنیاد ہی عصیان پر ہے اور نسیان آدم کی سرشت میں ہے ہم نے اس سے بہت پہلے آدم کو بھی ایک حکم دیا تھا لیکن وہ بھول گیا اور اس سے چوک ہو گئی، حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ نے آدم کو پیدا کر دیا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا جس کی وجہ سے ہر وہ نفس جس کو آدم کی نسل سے قیامت تک اللہ پیدا کرنے والا ہے آدم کی پشت سے نکل پڑا اور ہر شخص کی دونوں آنکھوں کے درمیان اللہ نے نور کی ایک چمک پیدا کر دی۔ پھر سب کو آدم کے سامنے لایا آدم نے پوچھا اے میرے رب یہ کون ہیں اللہ نے فرمایا یہ تیری نسل ہے آدم نے ان میں ایک شخص کو دیکھا جس کے دونوں آنکھوں کی درمیانی چمک آپ کو بہت اچھی لگی پوچھا اے میرے رب یہ کون ہے اللہ نے فرمایا داؤد۔ آدمؑ نے عرض کیا اے میرے رب تو نے اس کی عمر کتنی مقرر کی ہے اللہ نے فرمایا ساٹھ برس۔ آدمؑ نے عرض کیا اے میرے رب میری عمر میں سے چالیس برس لے کر اس کی عمر بڑھا دے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدم کی عمر ختم ہو گئی اور (وہی) چالیس برس رہ گئے (جو آپ نے داؤد کو دے دیئے تھے) تو موت کا فرشتہ آ گیا آدم نے کہا کیا ابھی میری عمر کے چالیس برس باقی نہیں ہیں۔ فرشتے نے کہا کیا آپ نے چالیس برس اپنے بیٹے داؤد کو دے نہیں دیئے تھے۔ آدمؑ نے انکار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے اور آدم بھول گئے اور انہوں نے درخت (ممنوعہ) میں سے کھا لیا یہی وجہ ہے کہ ان کی اولاد بھی بھولتی ہے اور آدمؑ نے خطا (چوک) کی یہی وجہ ہے کہ ان کی اولاد سے بھی خطا ہو جاتی ہے۔

بعض اہل تحقیق نے کہا زمخشری اور بیضاوی کا مذکورہ بالا قول غلط ہے اگر اس آیت کا عطف صَرَّفْنَا پر ہو گا اور ظاہر ہے کہ کَذٰلِکَ کا تعلق صَرَّفْنَا سے ہے اور کَذٰلِکَ صَرَّفْنَا کا عطف کَذٰلِکَ نَقُصُّ عَلَیْکَ پر ہے اور کَذٰلِکَ نَقُصُّ سے حضرت موسیٰؑ کے قصہ کی طرف اشارہ ہے پس حضرت آدم کا قصہ حضرت موسیٰ کے قصے سے مشابہ ہونا چاہئے کیونکہ آدم کے واقعہ میں نسیان اور ترک امر کا ذکر ہے اور موسیٰ کے واقعہ میں نسیان یا ترک امر کی طرف اشارہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ آیت زیر تفسیر کا عطف وھل اتاک حدیث موسیٰ پر ہے حضرت آدم کا قصہ بھی گزشتہ قصوں میں داخل ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کے سامنے سجدہ کرو۔ فوراً سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار کر دیا۔ ہم نے کہا آدم یقیناً یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے (نکال دینے کا سبب بن جائے) پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

وَاِذْ قُلْنَا اور یاد کرو اس وقت کا واقعہ جب ہم نے کہا تھا تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ آدم سے بھول ہو گئی تھی اَبٰی اس نے سجدہ کرنے یا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ابلیس کے استثناء کی علت بھی اس کو قرار دیا جا سکتا ہے فَقُلْنَا الخ کا عطف ایک محذوف جملہ پر ہے یعنی ہم نے آدم اور ان کی بی بی کو جنت میں داخل کر دیا پھر ہم نے کہا ھٰذَا یعنی ابلیس لَا يُخْرِجَنَّكُمَا بظاہر یہ ابلیس کے لئے ممانعت ہے مگر حقیقت میں ممانعت کا رخ آدم اور ان کی بی بی کی طرف ہے کہ دونوں (ہوشیار رہیں) ابلیس کا کہنا مانیں ورنہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے گا یعنی تم دونوں کو جنت سے خارج کر دیئے جانے کا سبب بن جائے گا۔ اس کے بہکاوے کی وجہ سے اللہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے گا۔ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا میں ف سببی ہے عداوت ابلیس چاہتی ہے کہ اس کا کہنا نہ مانا جائے۔ فَتَشْقٰى پھر تھک جاؤ گے، تعب میں پڑ جاؤ گے خود اپنے ہاتھ سے کما کر چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہا کر زمین کھود کر اس میں بیج بکھیر کر پھر کھیتی کاٹ کر دانہ پیس کر گوندھ کر پکا کر کھانا ہو گا۔ بغوی نے بحوالہ سعید بن جبیر لکھا ہے کہ آدمؑ کے لئے ایک سرخ بیل بھی پیدا کیا گیا جس کے ذریعہ سے وہ زمین کھودتے تھے اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے جاتے تھے یہی تَشْقٰى کا مفہوم ہے چونکہ آدم کا مصیبت میں پڑ جانا بی بی کے دکھ اور تکلیف کو بھی مستلزم ہے۔ آدم کے دکھ کے بعد بی بی کو سکھ کہاں مل سکتا تھا اس لئے تَشْقٰى سے (براہ راست) خطاب صرف آدم کو کیا گیا (بی بی سے خطاب ضمنی ہو گیا) یا یوں کہا جائے کہ شقاء سے مراد ہے

روزی کی تلاش میں تھکنا اور یہ کام صرف آدم کا تھا بی بی کا نہ تھا اس لئے صرف آدم کو خطاب کیا۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

جنت میں تو تمہارے لئے یہ بات ہے کہ اس میں نہ تم بھوکے رہو گے نہ ننگے اور یقیناً یہاں نہ پیاسے ہو گے نہ دھوپ میں تپو گے۔ عکرمہ نے کہا لَا تَضْحٰی کا یہ مطلب ہے کہ دھوپ میں تپنا نہ پڑے گا کیونکہ جنت کے اندر دھوپ ہی نہیں ہر وقت سایہ پھیلا رہتا ہے مطلب یہ ہے کہ جنت کے اندر تمام ضروریات زندگی فراہم ہیں بھوک دور کرنے کے لئے کھانا پیاس کے لئے پانی برہنگی کے لئے لباس اور سایہ دار مکان نہ کمانے کی تکلیف۔ نہ سامان زندگی فراہم کرنے کے لئے کوشش۔ ہر چیز خداداد موجود ہے۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾

پھر ان کو شیطان نے بہکایا۔ کہنے لگا اے آدم کیا میں تم کو ہمیشگی (کی عطا کرنے) والا درخت بتاؤں اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی زوال اور ضعف نہیں آئے گا۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ یعنی شیطان نے وسوسہ ڈالا جو آدم (کے دل) تک پہنچ گیا قَالَ يٰٓاٰدَمُ یہ وسوسہ کا بیان ہے۔ شَجَرَةِ الْخُلْدِ خُلد بمعنی خلود۔ یعنی ایسا درخت جس کا پھل کھانے والا ہمیشہ زندہ رہے گا۔ گویا ابلیس نے اپنے خیال کے مطابق درخت کو حیات دوام کا سبب قرار دیا۔ لَا يَبْلٰى جس کو کبھی زوال نہ ہو گا نہ اس میں ضعف آئے گا۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

سو (اس کے بہکانے سے) دونوں نے اس درخت سے کھا لیا، فوراً دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور (اپنا بدن ڈھانکنے کو) دونوں اپنے اوپر جنت کے (درختوں کے) پتے چپکانے لگے اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو وہ غلطی میں پڑ گئے۔

دونوں نے کھا لیا یعنی آدم و حوا نے ورق الجنۃ سے مراد ہیں انجیر کے درخت کے پتے۔

عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى یعنی آدم منزل مقصود سے بھٹک گئے صحیح راستہ کھو دیا اور ناکام ہو گئے درخت کا پھل کھانے سے دوامی زندگی کے طلب گار ہوئے، حالانکہ وہ درخت سبب زوال تھا یا یہ مطلب ہے کہ جس بات کا ان کو حکم دیا گیا ہے اس سے کٹ گئے کج راہ ہو گئے یا ابلیس سے فریب کھا گئے اس لئے سیدھے راستے سے ہٹ گئے

ابن اعرابی نے غوی کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ان کی آرام کی زندگی بگڑ گئی، عزت سے ذلت کی طرف اور سکھ سے دکھ کی طرف چلے گئے۔ ابن قتیبہ نے کہا اگرچہ عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ کہنا درست ہے (آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی) لیکن آدم کو عاصی کہنا غلط ہے کیونکہ عاصی اسی شخص کو کہتے ہیں جو عصیان کا عادی اور خوگر ہو (ایک مرتبہ اگر کسی سے صدور عصیان ہو جائے تو اس کو عاصی نہیں کہا جا سکتا) اگر کسی نے ایک بار کوئی کپڑا سی لیا ہو تو یہ کہنا صحیح ہے کہ اس نے کپڑا سی لیا۔ لیکن جب تک سینے کا اعادہ بار بار نہ کرے اور سینے کا عادی نہ ہو جائے۔ اس کو خیاط (درزی) نہیں کہا جا سکتا۔ (اس فقیر مترجم کی نظر میں ابن قتیبہ کا قول نامناسب ہے اسم فاعل کو صفت مشبہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اسم فاعل تو وہ ہوتا ہے جس سے کسی فعل کا صدور ہو جائے یا اس کے لئے اس فعل کا ثبوت ہو خواہ ایک ہی مرتبہ ہو ہر فعل کا کرنے والا فاعل ہوتا ہے۔ لیکن صفت مشبہ کا صیغہ اس وقت صادق آئے گا جب کوئی وصف کسی ذات کے اندر موجود ہو اور قوت صدور اس میں موجود ہو خواہ ساری عمر اس سے اس فعل کا صدور نہ ہوا ہو پس خیاط وہ شخص ہے جس میں سینے کی صفت پائی جائے خواہ کبھی سیا ہو خواہ ایک ہی مرتبہ سیا ہو۔ اسم فاعل اور صفت مشبہ کا یہی فرق ہے پھر خیاط صرف صفت مشبہ کا مفہوم ہی اپنے اندر نہیں رکھتا، بلکہ بار بار خیاطت کرے گا تو خیاط کہلائے گا یہ مبالغہ کا صیغہ ہے، مبالغہ تعداد میں ہو یا کیفیت میں بہر حال صفت خیاطت کا مبالغہ کے ساتھ موجود ہونا خیاط کہلانے کے لئے لازم ہے عاصی اسم فاعل ہے اس کے اطلاق کے لئے تو ایک بار صدور عصیان کافی ہے واللہ اعلم۔

مسلم نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب کے سامنے آدمؑ اور موسیٰؑ کا باہم

کچھ مباحثہ ہوا، اور آدم موسیٰ پر غالب آگئے موسیٰ نے آدم سے کہا آپ آدم ہیں آپ کو اللہ نے اپنے (خاص) دست قدرت سے بنایا آپ کے اندر اپنی روح پھونکی فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور آپ کو اپنی جنت میں رکھا، پھر آپ نے اپنے قصور کی وجہ سے لوگوں کو جنت سے زمین پر اتروا دیا۔ آدم نے کہا آپ موسیٰ ہیں آپ کو اللہ نے اپنی رسالت اور اپنے کلام کے لئے منتخب فرمایا اور آپ کو (توریت کی) تختیاں عطا فرمائیں جن کے اندر ہر چیز کا واضح بیان تھا اور آپ کو ہم کلام بنانے کے لئے اپنا قرب عنایت کیا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میری پیدائش سے کتنی مدت پہلے اللہ نے توریت لکھ دی تھی موسیٰ نے کہا چالیس برس پہلے آدم نے کہا کیا اس میں یہ بھی تھا کہ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بھٹک گیا موسیٰ نے کہا ہاں۔ آدم نے کہا پھر آپ مجھے ایسا کام کرنے پر ملامت کر رہے ہیں جس کا مجھ سے صادر ہونا اللہ نے میری پیدائش سے چالیس برس پہلے لکھ دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، پس آدم موسیٰ پر غالب آگئے۔

بغوی کی روایت میں حدیث کے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں موسیٰ نے کہا آدم آپ ہمارے صاحب آپ ہی نے ہم کو جنت سے نکلوایا آدم نے کہا، اللہ نے آپ کو اپنے کلام کے لئے منتخب فرمایا اور اپنے ہاتھ سے توریت لکھ کر عطا فرمائی کیا آپ مجھے ایسے عمل پر ملامت کر رہے ہیں جو میری پیدائش سے چالیس سال پہلے اللہ نے میرے لئے مقرر کر دیا تھا۔ پس آدم موسیٰ پر غالب آگئے۔

ایک شبہ

جب حضرت آدم حکم کو بھول گئے اور جو کچھ کیا بھول چوک سے کیا تو پھر یہ کیسے کہا گیا کہ آدم نے گناہ کیا۔ معصیت کی نسبت آدم کی طرف کیوں کی گئی۔ انسان کا نسیان تو ناقابل مواخذہ ہے۔

جواب

اس امت کے لئے نسیان ناقابل مواخذہ قرار دیا ہے۔ ہر امت اور ہر شخص کے لئے نسیان کا یہ حکم نہیں ہے طبرانی نے حضرت ثوبان و حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میری امت سے بھول چوک اور وہ فعل جو کسی کو مجبور کر کے زبردستی کرایا گیا اٹھا لیا گیا ہے (یعنی معاف کر دیا گیا ہے) اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ ہر شخص اور ہر امت کے لئے بھول چوک معاف کر دی گئی ہے (بلکہ صراحۃً صرف اس امت کا ذکر کیا گیا ہے) ہاں مجنون وغیرہ کے متعلق (اس امت ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ عموماً بلا کسی کا نام لئے) فرمایا ہے قلم اٹھا لیا گیا دیوانے مغلوب العقل سے جب تک وہ تندرست ہو اور سوئے ہوئے آدمی سے جب تک وہ بیدار ہو اور بچہ سے جب تک وہ بالغ ہو۔ ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا کی تفسیر کے ذیل میں لکھ دیا ہے کہ بھول چوک پر گرفت عقلاً ممنوع نہیں ہے گناہ ایک زہر ہے زہر قصداً کھایا جائے یا بھول چوک سے اپنا ہلاکت آفریں اثر ضرور کرے گا۔ اسی طرح گناہ بھی قصداً ہو یا بھول کر اپنا نتیجہ ضرور پیدا کرے گا اور گناہ گار بہر حال عذاب اور سزا میں مبتلا ہو گا۔ بشرطیکہ اللہ اس کو معاف نہ کر دے۔ (توبہ یا مغفرت گناہ کے زہر کا علاج ہے مترجم) کلبی نے کہا کہ بنی اسرائیل سے اگر کسی حکم کے خلاف کوئی حرکت بھولے سے یا غلطی سے ہو جاتی تھی تو فوراً ان کو سزا دے دی جاتی تھی اور کوئی کھانے پینے کی چیز بطور سزا بقدر گناہ حرام کر دی جاتی تھی۔

میں کہتا ہوں اسی لئے حضرت آدم کی بھول پر ان کی پکڑ ہوئی اور جنت کی کھانے پینے کی چیزوں سے محروم کر دیا گیا۔

دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اہل تقویٰ کی نیکیاں بھی اہل قرب کے لئے گناہ ہیں۔ عام لوگوں کی بھول چوک پر آخرت میں پکڑ نہ ہو گی اور دوزخ کا عذاب نہ ہو گا لیکن خواص کا حکم اور ہے وہ بھول چوک پر آخرت میں دوزخ کے عذاب سے تو محفوظ ہیں ان کا درجہ بلند ہے وہ اہل قرب ہیں اس لئے بھول چوک کی پاداش میں ان کے دلوں پر زنگ آجاتا ہے اور اللہ کے ساتھ ان کے معاملات قرب کے نہیں رہتے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا میرے دل پر بھی میل آجاتا ہے اور میں ہر روز اللہ سے سو مرتبہ معافی کا طلب گار ہوتا ہوں۔ رواہ مسلم واحمد و ابوداؤد والنسائی۔

صاحب مدارک نے کہا انبیاء ایسے نسیان پر ماخوذ ہیں کہ اگر وہ تکلیف کر کے بچنا چاہتے تو بچ سکتے تھے۔

فائدہ: اسی بنیاد پر بعض علماء قائل ہیں کہ نبوت سے پہلے انبیاء سے صغیرہ گناہ کا صدور ہو سکتا ہے۔
ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ پھر ان کے رب نے ان کو (زیادہ) مقبول بنالیا سو ان پر توجہ فرمائی اور راہ راست پر (ہمیشہ) قائم رکھا۔

اِجْتَبٰهُ، جَبٰی کا لغوی معنی ہے جمع کرنا جَبَی الْخِرَاجَ اس نے خراج جمع کیا اِجْتِبَاءٌ (افتعال) اپنے پاس جمع کر لینا اپنے قرب میں لے آنا مراد چن لینا برگزیدہ بنا دینا مقرب بنالینا یعنی آدم کو توبہ پر آمادہ کیا جب انہوں نے توبہ کر لی تو اللہ نے ان کو چن لیا مقرب بنالیا۔

تَابَ عَلَيْهِ اللہ رحمت اور مغفرت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ہدیٰ ان کو توبہ کا راستہ بتادیا۔ اللہ ہی کی ہدایت و توفیق سے انہوں نے دعا کی رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا اور اللہ نے ان کو درجات قرب تک پہنچنے کا راستہ بتادیا۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًاۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ اللہ نے فرمایا۔ تم دونوں (آدم وحوا) ساتھ ساتھ جنت سے اس حالت میں زمین پر اترو اور دنیا میں ایسی حالت میں جاؤ کہ تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوگا۔

حضرت آدم اور حضرت حوا کے نزول کے ساتھ ان کی آئندہ نسل کا نزول لازم تھا اس لئے حضرت حوا اور حضرت آدم کو خطاب مع ذریات کے ہوا اور جَمِيْعًا کے لفظ سے اس مضمون کو پختہ کردیا۔ ایک دوسرے کا دشمن ہوگا۔ یعنی تم دونوں کی نسل میں باہم دنیوی عداوت بھی ہوگی اور دینی و مذہبی بھی (کوئی موحد ہوگا کوئی مشرک، کوئی منکر)

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾
پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو (تم میں سے) جو کوئی میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا نہ (آخرت میں) نامراد۔

بغوی نے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص قرآن پڑھے گا اور جو تعلیم اس میں ہے اس پر چلے گا اللہ اس کو دنیا میں بھی گمراہی سے بچا کر سیدھے راستے پر چلائے گا اور قیامت کے دن بھی حساب کی خرابی سے محفوظ رکھے گا کیونکہ اللہ نے خود فرمادیا ہے فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى شعبی کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا، قرآن کی پیروی کرنے والے کو اللہ دنیا میں گمراہ اور آخرت میں بدنصیب ہونے سے محفوظ رکھے گا، پھر حضرت ابن عباس نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا۔ عَنْ ذِكْرِيْ، یعنی اس ہدایت سے جو میری یاد دلاتی ہے یا اس بلانے والے سے جو میری یاد کی طرف بلاتا ہے اعراض کرے گا ضَنْكًا بہت تنگ۔ بطور مبالغہ مَعِيْشَةً کی صفت قرار دیا ہے۔ ورنہ ضَنْكًا مصدر ہے (زندگی تنگی والی یعنی تنگ ہوتی ہے خود تنگی نہیں ہوتی) چونکہ یہ لفظ مصدر ہے اس لئے مونث کی بھی صفت بن سکتا ہے۔

بغوی نے حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری کا قول نقل کیا ہے کہ مَعِيْشَةً ضَنْكًا سے مراد ہے عذاب قبر۔ بزار نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَعِيْشَةً ضَنْكًا عذاب قبر ہے۔ حضرت ابو سعید نے فرمایا زمین اس کو دبائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر نکل جائیں گی۔ بعض مسند احادیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ اس پر قبر اس طرح سمٹے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر نکل جائیں گی اور قبر سے اٹھائے جانے کے وقت تک برابر یہ عذاب اس پر ہوتا رہے گا۔ یہ حدیث سنن ترمذی میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے آئی ہے۔

میں کہتا ہوں، حرام رزق، ناپاک کمائی اور بدبختی قبر کی تنگی یا دوزخ کی طرف لے جانے والی چیزیں ہیں اللہ نے فرمایا ہے اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ

ایک روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ بندہ کو جو مال بھی دیا جائے تھوڑا ہو یا بہت اور وہ اس میں تقویٰ نہ

اختیار کرے تو ایسے مال میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی یہی مَعِیْشَۃً ضَنْکًا ہے ایسے لوگوں کو اللہ پر بدگمانی ہوتی ہے وہ خیال کرتے ہیں کہ (اگر یہ مال خرچ یا تلف ہو گیا تو) اللہ اسکی جگہ ان کو دوسری معاش (مال) عطا نہیں فرمائے گا۔ سعید بن جبیر نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ ہم اس سے قناعت چھین لیتے ہیں کہ کسی طرح وہ مال سے سیر ہی نہیں ہوتا۔ ان دونوں قولوں کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے ذکر سے اعراض کرتا ہے اس کا اصلی مقصد، منتہائے خواہش اور مطمع نظر صرف دنیا کا مال و متاع ہوتا ہے ہر وقت مال کی ترقی کی فکر میں ڈوبا رہتا ہے اور گھاٹے سے اپنی جگہ ڈرتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف مومن کی حالت ہوتی ہے جو آخرت کا طلب گار ہوتا ہے۔ اللہ جو کچھ عطا فرماتا ہے وہ اس پر قانع اور شکر گزار ہوتا ہے۔ اس کا بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے اسی لئے اسکی زندگی خوشگوار اور پاکیزہ ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں اس مطلب پر ذکر خدا سے اعراض کرنے والے کافر ہی نہیں ہوں گے اور آیت میں صرف کافر ہی مراد نہ ہوں گے بلکہ جو شخص بھی اللہ کے ذکر کی کثرت سے گریز کرتا ہے وہ مراد ہو گا کافر ہو یا مسلمان بہت سے مسلمان بھی دنیا کی طلب میں ڈوبے رہتے ہیں ان کو بھی مال کی کمی کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے کثرت ذکر خدا سے اعراض کرنے والا صرف دنیوی مال و متاع کو اپنا مقصد اول بنا لیتا ہے ایسے شخص کی زندگی تاریک ہو جاتی ہے اور احوال زندگی پراگندہ رہتے ہیں اگر یہ شبہ کیا جائے۔ کہ معیشۃ ضنکا سے مراد اگر دنیوی تنگی اور شدت مصائب ہے تو اس میں کافروں فاسقوں کی ہی کیا خصوصیت ہے انبیاء اور صلحاء تو بہت زیادہ تنگ حال اور مبتلائے مصائب ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے سب سے زیادہ سخت مبتلاء (مصائب) انبیاء ہوتے ہیں، ان کے بعد وہ لوگ جو دوسروں سے افضل ہوں پھر ان کے بعد وہ لوگ جو ماتحتی سے افضل ہوں۔ دین کے مطابق آدمی مبتلاء معیبت ہوتا ہے اگر وہ دین میں ٹھوس (یعنی پختہ اور کامل) ہوتا ہے تو اس کی جانچ بھی سخت ہوتی ہے اور اگر اس کے دین میں کچھ نرمی (کمزوری) ہوتی ہے تو دین کے مطابق اس کی جانچ ہوتی ہے (یعنی مبتلا معیبت ہوتا ہے) رواہ احمد والبخاری فی الصحیح والترمذی وابن ماجہ عن سعد طبرانی نے حضرت حذیفہ کی بہن کی روایت سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

بخاری نے تاریخ میں حضرت امہات المومنین کی روایت سے اچھی سند کے ساتھ حدیث کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں معیبت کے لحاظ سے دنیا میں سب سے زیادہ سخت نبی ہوتا ہے یا کوئی (اور) منتخب نیک بندہ۔

میں کہتا ہوں اس شبہ کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے۔

(۱) آیت میں جس تنگ معیشت کا ذکر کیا ہے وہ کافروں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ تنگی سے مراد ہے دنیوی سامان کی قلت جیسے دوسری آیت میں آیا ہے اُمَتِّعُہٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّہٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ، مطلب یہ ہے کہ جو میرے ذکر سے اعراض کرتا ہے میں اس کو دنیا میں کچھ تھوڑی سی معاش دے دیتا ہوں۔ (اگر کروڑوں کی دولت ہو تب بھی وہ قلیل ہی ہے) متاع دنیا کتنی ہو پھر بھی قلیل ہے، چند روزہ ہے، تھوڑی مدت کیلئے ملتی ہے، پھر قیامت کے دن ہم اس کو نابینا اٹھائیں گے۔

(۲) مومن ہو یا کافر ہر ایک کے لئے دنیا کی معیشت تکلیف اور دکھ سے خالی نہیں (خالص سکھ ہر شخص کے لئے مفقود ہے) اللہ نے فرمایا ہے یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ۔ مومن پر جو دکھ آتا ہے اس سے اس کے گناہ مٹتے اور درجات کی ترقی ہوتی ہے جیسا کہ حدیث مذکور سے واضح ہے یہ دکھ بظاہر تنگی معیشت کی شکل میں رونما ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس سے سینہ کی کشائش اور انشراح باطن حاصل ہوتا ہے البتہ کافر کا دکھ اس دنیا میں اس کے لئے موجب ضیق بھی ہے اور آخرت کا نمونہ بھی ہے۔ اللہ کی محبت موجود ہونے کی صورت میں جو دکھ بھی اللہ کی طرف سے آتا ہے مومن کو اس میں لذت آتی ہے۔ دل کو فرحت ہوتی ہے محبوب کی ضرب میں بھی مٹھاس ہوتی ہے۔

ابن ماجہ، عبدالرزاق اور حاکم نے ابو سعید خدریؓ کی روایت سے جو حدیث مذکور نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں سب سے زیادہ شدید البلاء انبیاء ہوتے ہیں ان کے بعد دوسرے نیک لوگ۔ ان میں سے بعض لوگ اس قدر فقر میں مبتلا رہے کہ سوائے تن پر پہنے ہوئے عباء کے ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور ان میں بھی اتنی جوئیں تھیں کہ قتل کئے ڈالتی تھیں لیکن اس

معیشت سے وہ اتنے زیادہ خوش ہوتے تھے کہ تم میں سے بعض لوگ عطیات (ملنے) سے اتنے خوش نہیں ہوتے۔

وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ اور قیامت کے روز ہم اس کو (قبر سے) اندھا اٹھائیں گے۔ حضرت ابن عباس کے نزدیک اعمی سے مراد ہے آنکھوں کا اندھا، مجاہد کے نزدیک کور بصیرت مراد ہے (جس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی) کوئی دلیل اس کو نہ سوجھے گی۔ آئندہ آیت حضرت ابن عباس کے قول کی موید ہے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ وہ (تعجب سے) کہے گا، اے میرے رب تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، میں تو (دنیا میں) آنکھوں والا تھا۔ اگر کور بصیرت مراد لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں دنیا میں صاحب بصیرت تھا، یعنی میرے پاس شرک کی دلیل تھی، حالانکہ شرک کی کوئی دلیل دنیا میں بھی اس کے پاس نہ تھی۔ اللہ نے فرمایا، وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ۔ دوسری آیت میں آیا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى جس کے پاس شرک کی کوئی دلیل اس زندگی میں نہیں ہے نابینا ہے اس کے پاس آخرت میں بھی کوئی دلیل نہ ہوگی وہاں بھی نابینا ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابن عباس کا تفسیری قول صحیح ہے اور آیت زیر تفسیر میں اَعْمٰى سے مراد ہے کور بصر۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کی سند سے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے دریافت کیا حضرت اللہ نے فرمایا ہے: وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا اور فرمایا وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا اس کا کیا مطلب ہے، حضرت ابن عباس نے فرمایا قیامت کے دن وہ ایک حالت میں کرنجے ہوں گے اور دوسری حالت میں نابینا۔

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾

ارشاد ہوگا ایسے ہی ہمارے احکام تیرے پاس پہنچے تھے (پھر تو اندھا بن گیا تھا) تو نے ان کا خیال نہیں کیا اور ایسا آج تیرا کچھ خیال نہیں کیا جائے گا۔ كَذٰلِكَ کا تعلق فعل محذوف سے ہے یعنی تو نے ایسا ہی کیا تھا کہ ہماری کتابی نشانیاں تیرے سامنے آئی تھیں یا ہماری وہ آیات جو انبیاء پر اتاری گئیں تھیں، تیرے پاس پہنچی تھیں، پس تو نے ان کو بھولا بسرا کر دیا، یعنی ان کو چھوڑ دیا۔ ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، نظر اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا جیسے اندھا چھوڑ دیتا ہے (اور نہیں دیکھتا) پس آج تجھے بھی (دوزخ کے اندر ڈال کر) اسی طرح بھلا دیا جائے گا۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک كَذٰلِكَ خبر ہے، مبتدا محذوف ہے۔ یعنی اَلْاَمْرُ كَذٰلِكَ (بات یونہی ہے) اس کے بعد اَتَتْكَ سے جملہ سابقہ کی علت بیان کی ہے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

اور اسی طرح ہم ہر اس شخص کو جو حد (اطاعت) سے گزر جائے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے (اس کے عمل کے مناسب) سزا دیں گے اور واقعی آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بڑا دیرپا ہے۔ اسرف حد سے گذر گیا یعنی ناجائز خواہشات میں ڈوب گیا اور آیات الٰہیہ سے منہ پھیر لیا۔ لَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ یعنی رب کی آیات کی تکذیب کی، ان کو جھوٹا جانا، ان کی مخالفت کی۔ اَشَدُّ وَاَبْقٰى یعنی تنگی معیشت اور نابینا ہونے سے آخرت میں دوزخ کا عذاب بہت سخت اور بہت زیادہ دیرپا ہے۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾

کیا ان لوگوں کو (اب تک) اس سے بھی ہدایت نہیں ہوئی کہ ہم ان سے پہلے بہت سے گروہوں کو ہلاک کر چکے ہیں کہ ان (میں سے) بعض کے رہنے کے مقامات میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں یقیناً اہل فہم کے لئے اس میں کھلی ہوئی دلیلیں موجود ہیں۔

كَمْ اَهْلَكْنَا میں كَمْ خبریہ ہے یعنی بہت گروہوں کو۔ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ اس آیت کا مطلب دو طرح سے

بیان کیا گیا ہے اول یہ کہ یہ جملہ حالیہ ہے اور ہم ضمیر سے حال ہے یعنی مکہ کے کافروں کو اس بات سے بھی ہدایت نہیں ملی کہ بہت سے گزشتہ گروہوں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ (ایسی حالت میں کہ) ان کے رہنے کے مقامات میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ گروہ اپنے اپنے مقامات سکونت میں چلتے پھرتے تھے کہ اسی حالت میں ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ (ہم نے ترجمہ اول ترکیب کے موافق کیا ہے) نُھٰی عقلیں (یہ نُھْیَۃٌ کی جمع ہے مترجم)، جو غفلت میں پڑے رہنے اور نابینا بننے سے روکتی ہیں۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ اور اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات پہلے (طے شدہ) نہ ہوتی اور (عذاب کے لئے) ایک میعاد معین نہ ہوتی تو عذاب (اسی زندگی میں) لازمی ہوتا۔

كَلِمَةٌ سَبَقَتْ ایک بات جو پہلے طے کر دی گئی ہے، یعنی یہ پہلے سے اللہ نے طے کر دیا ہے کہ اس امت کے کافروں پر عذاب قیامت کے دن ہوگا اور رسول اللہ ﷺ کے رحمۃ للعٰلمین ہونے کی وجہ سے کافروں پر بھی اس دنیا میں ایسا عذاب نہیں آئے گا جو ان کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دے۔

لَكَانَ لِزَامًا تو ان کافروں کو گزشتہ انبیاء کی کافر امتوں کی طرح بالکل ہلاک کر دینا بھی لازم ہو جاتا۔

وَاَجَلٌ مُّسَمًّى اس کا عطف کلمۃ پر ہے یعنی اگر دنیا میں ان کے باقی رہنے کی یا قیامت برپا ہونے کی یا ان کے عذاب کی میعاد مقرر و معین نہ ہوتی تو عذاب لازم ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کان کے اندر جو ضمیر پوشیدہ ہے اَجَلٌ مُّسَمًّى کا اس پر عطف ہو، اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا اگر تاخیر عذاب کا پہلے سے فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو دنیا میں فوری عذاب اور وہ عذاب جس کا وقت مقرر کر دیا گیا ہے دونوں لازمی ہو جاتے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ

سو آپ ان کی باتوں پر صبر کیجئے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجئے۔ (اس میں نماز بھی آ گئی) آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے۔

اور اوقات شب میں بھی پاکی بیان کیجئے۔ (مثلاً نماز مغرب و عشاء) اور دن کے دونوں طرفوں میں بھی (یعنی اول اور آخر) تاکہ (جو ثواب آپ کو ملے) آپ اس سے خوش ہوں۔

وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

فَاصْبِرْ سے خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے یعنی کفار کے عذاب کی ایک میعاد مقرر ہے جب وہ دن آئے گا تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے، اب جو آپ کے متعلق (دکھ پہنچانے والی) باتیں وہ کرتے ہیں ان پر صبر کیجئے۔ وَسَبِّحْ اور پاکی بیان کیجئے یعنی نماز پڑھیے، بِحَمْدِ رَبِّكَ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہ اس نے آپ کو نماز اور تسبیح کی توفیق دی۔ اس فقرے میں گویا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اگر اللہ کی عبادت کرتا ہے تو مغرور نہ ہو جائے بلکہ اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے عبادت کی توفیق دی اور مدد کی۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے بعد اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سَبِّحْ کے ساتھ جو اس آیت میں بِحَمْدِ رَبِّكَ آیا ہے اس سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے (کیونکہ سَبِّحْ سے مراد ہے نماز پڑھو اور بِحَمْدِ رَبِّكَ کا مطلب ہے اپنے رب کی حمد کے ساتھ۔ اور سورۂ فاتحہ سورۃ الحمد ہی ہے پس دونوں کو ملا کر یہ مطلب ہوا کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ نماز پڑھو۔ مترجم)

شیخین نے صحیحین میں نیز امام احمد نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نماز نہیں مگر فاتحۃ الکتاب (سورۃ الحمد) کے ساتھ۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں جس نے فاتحۃ الکتاب نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں۔ آیت میں تسبیح کا حمد کے ساتھ اقتران مجمل تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ کے ارشاد مبارک نے آیت کے اجمال کی وضاحت کر دی اور آیت کے ساتھ

حدیث کو ملانے سے واضح ہو گیا کہ حمد سے (آیت میں) مراد سورۂ فاتحہ کی قرات ہے۔ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ یعنی فجر کی نماز۔ قَبْلَ غُرُوْبِهَا یعنی عصر کی نماز۔ بعض نے کہا قبل الغروب سے پچھلا دن مراد ہے جس کے اندر ظہر اور عصر دونوں نمازیں آ گئیں۔

وَمِنْ آنَاءِ الَّيْلِ یعنی مغرب و عشاء کی نمازیں۔ آناءٌ بمعنی ساعات یہ إِنْیٌ کی جمع ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس فقرہ میں الَّيْلِ سے مراد ہے رات کا اول حصہ۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے اس سے تہجد بھی مراد ہو کیونکہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اور تہجد کی نماز رسول اللہ ﷺ پر واجب تھی۔ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ کا قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ پر عطف ہے یہ فجر و عصر کی نمازوں کا مکرر تاکیدی حکم ہے (کیونکہ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا میں نماز فجر و عصر مراد ہے) مزید تاکید اور اظہار خصوصیت کے لئے ان دونوں نمازوں کا مکرر حکم دیا۔ فجر کا وقت میٹھی نیند کا وقت ہوتا ہے اور عصر میں دنیوی کاروبار میں مشغولیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے دونوں نمازوں کا حکم تاکید کے ساتھ دیا۔ اسی طرح حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى میں صلوٰۃ وسطیٰ (عصر) اگرچہ صلوٰۃ کے لفظ میں داخل تھی لیکن تاکید کے لئے اس کا ذکر صراحۃً کر دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ أَطْرَافَ النَّهَارِ سے صرف ظہر مراد ہو کیونکہ ظہر کا وقت دن کے نصف اول کا اختتام اور نصف دوم کا آغاز ہوتا ہے پس یہ وقت نصف اول کا بھی کنارہ ہے اور نصف دوم کا بھی۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ آنَاءِ الَّيْلِ سے صلوٰۃ عشاء اور أَطْرَافَ النَّهَارِ ظہر و مغرب کی نمازیں مراد ہیں کیونکہ دن کے نصف اول کا آخری کنارہ اور نصف دوم کا ابتدائی کنارہ ظہر ہے پس ظہر طرفین کا مجموعہ ہے دن کا تیسرا کنارہ غروب آفتاب ہے اس وقت مغرب کی نماز پڑھی جاتی ہے یا أَطْرَافَ النَّهَارِ دن کے مختلف حصے ہیں اور تسبیح سے مراد نفل نماز ہے۔

لَعَلَّكَ تَرْضٰى، یعنی اوقات مذکورہ میں نماز پڑھو تاکہ اللہ کی طرف سے تم کو وہ ثواب مل جائے جس سے تم خوش ہو جاؤ (تمہاری پسند کے مطابق ہو) بعض نے لَعَلَّكَ تَرْضٰى کا مطلب یہ بیان کیا ہے تاکہ تم کو اللہ پسند کر لے جس طرح دوسری آیت میں آیا ہے كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا۔ بعض نے خوش ہونے سے مراد لیا ہے شفاعت کرنے سے خوش ہونا، تم شفاعت (کا حق حاصل ہونے) سے خوش ہو جاؤ (اس وقت لَعَلَّ کو لِكَيْ کے معنی میں لینے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ لَعَلَّ اپنے اصلی معنی پر ہی رہے گا۔ ترجمہ اس طرح ہوگا امید ہے کہ تم شفاعت کرنے کی اجازت پا کر خوش ہو جاؤ گے) یہی مضمون آیت وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى کا ہے۔ شیخین نے صحیحین میں اور چاروں اصحاب السنن نے اور امام احمد نے حضرت جریر بن عبد اللہ کا بیان نقل کیا ہے، حضرت جریرؓ نے فرمایا، ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے آپ نے چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر فرمایا یقیناً تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو جس کو دیکھنے میں تمہیں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی پس جہاں تک تم سے ہو سکے کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے کی نمازیں تمہاری ضائع نہ ہوں (تم مغلوب نہ ہو

ؔ حضرت مفسر قدس سرہ نے دور از کار تقریر کر کے قراۃ فاتحہ کا ہر نماز میں وجوب ثابت کر دیا، اول تو بات نا قابل تسلیم ہے کہ تسبیح سے مراد صرف نماز ہے تسبیح کا لفظ عام ہے اس میں نماز شامل ضرور ہے۔ صرف نماز ہی مراد ہے یہ نا قابل تسلیم ہے تو گیا جس طرح نماز میں سورۂ فاتحہ کی قرأت کو واجب قرار دیا گیا ہے اسی طرح کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہر تسبیح بیان کرنے اور سبحان اللہ پڑھنے کے وقت سورۂ فاتحہ کی قرأت کا واجب ہونا اس آیت سے مستنبط ہے۔

پھر حدیث میں جو لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ آیا ہے۔ اہل علم کہتے ہیں کہ اس سے مراد کمال صلوٰۃ کی نفی ہے کمال شئی کی نفی کو کبھی نفس شئی کی نفی سے تعبیر کر لیتے ہیں اور یہ بات اختلاف کو بھی تسلیم ہے کہ فضیلت اور کمال صلوٰۃ بغیر قرأت فاتحہ کے حاصل نہیں ہوتا۔ کمال کی نفی حدیث میں مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ آیت قرآنی میں صراحۃً آیا ہے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ اس آیت میں مَا کا لفظ عام ہے پس قرآن کا جو حصہ پڑھا جائے گا نماز ہو جائے گی اگر لَا صَلٰوةَ سے مراد نفی صلوٰۃ ہو تو حکم قرآن اور حدیث میں تعارض و تضاد پیدا ہو جائے گا۔ والتفصیل فی الفقہ۔ مترجم۔

یعنی کسی اور مشغلہ کا غلبہ نہ ہو کہ تمہاری ان اوقات کی نمازیں مغلوب ہو کر جاتی رہیں) تو ایسا کرو پھر حضور ﷺ نے آیت فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا تلاوت فرمائی۔

ابن ابی شیبہ، ابن مردویہ، بزار اور ابو یعلی نے حضرت ابو رافع کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مہمان آکر اترا آپ نے مجھے یہودی کے پاس آٹا قرض خریدنے کے لئے بھیجا، دوسری روایت میں آیا ہے کہ اتنا اتنا آٹا لیا یہ فرمایا کہ مجھے رجب کا چاند دیکھنے (یعنی پہلی تاریخ) تک کے لئے آٹا دے دو۔ یہودی نے کہا بغیر کسی چیز کو رہن رکھے میں نہیں دوں گا، میں نے حاضر خدمت ہو کر یہودی کا جواب عرض کر دیا، ارشاد فرمایا اگر وہ میرے ہاتھ بیچ ڈالتا یا فرمایا قرض بیچ ڈالتا تو میں (قیمت) ضرور ادا کرتا اور میں بلاشبہ آسمان میں بھی امین ہوں اور زمین میں بھی امین ہوں، جاؤ میری لوہے کی زرہ اس کے پاس لے جاؤ، میں حضور ﷺ کے پاس باہر نکلنے نہ پایا تھا کہ آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿۱۳۱﴾

اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ اپنی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھئے جن سے ہم نے کافروں کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ محض دنیوی زندگی کی رونق ہے اور آپ کے رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملے گا) بدرجہا بہتر اور دیرپا ہے۔

آیت وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ سے دو باتیں معلوم ہوئی تھیں ایک یہ کہ کافروں پر (دنیا میں جڑ سے اکھاڑ دینے والا) فوری عذاب نہیں آئے گا، دوسری یہ کہ (آخرت میں) ان کو مقرر لازوال عذاب ہوگا۔ ان دونوں باتوں پر دو حکموں کو مرتب کیا اول بات یعنی عذاب عاجل کی نفی پر حکم صبر کو متفرع کیا، دوسری بات یعنی عذاب آخرت کے ثبوت پر ممانعت نظر کو مرتب کیا۔ (یعنی جب کافروں پر عذاب اجل نہ آنا پہلے سے طے شدہ ہے تو پھر آپکو صبر کرنا اور ان کی طرف سے پہنچنے والی سخت کلامی اور اذیتوں کو سہنا لازم ہے اور جب مرنے کے بعد ان کا مبتلاء عذاب ہونا یقینی ہے تو آپ پر لازم ہے کہ انکی دولت و ثروت کو نگاہ اٹھا کر نہ دیکھیں یہ دولت ان کے لئے ایک آزمائشی چیز ہے اور چند روزہ ہے اس کا فنا ہونا اور سبب عذاب بن جانا یقینی ہے۔ مترجم) آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی دولت و ثروت کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھیں اور یہ خواہش نہ کریں کہ آپ کو بھی یہ مل جائے۔

أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ یعنی کافروں کے مختلف گروہوں کو۔ أَزْوَاجٌ بمعنی أَصْنَافٌ اصناف اور مِنْهُمْ میں مِنْ بمعنی بعض ہے اور یہ مَتَّعْنَا کا مفعول ہے یعنی مختلف اقسام کی نعمتیں جو ہم نے ان کافروں سے بعض کو دے رکھی ہیں۔

زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فعل محذوف کا مفعول ہے۔ زَهْرَةٌ رونق، زینت، تری، تازگی یا مَتَّعْنَا کا ہی مفعول ہے کیونکہ مَتَّعْنَا کے اندر عطا کرنے کا معنی ہے زَهْرَةٌ سے ہی أَزْهَا رُبَنا ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو محفوظ رکھنا اور اس سے خوش ہونا۔

لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ تاکہ ہم ان کی آزمائش کریں یا ہم انکو کفر و گمراہی میں چھوڑے رکھیں تاکہ وہ مزید سرکشی کریں یا یہ مطلب ہے کہ ہم نے ان کو یہ دنیا کی رونق اس لئے دی ہے کہ آخرت میں اس کے سبب سے ہم ان کو عذاب میں مبتلا کریں (فتن کے بعد جب فی آیا ہے تو تینوں معنی ہو سکتے ہیں، آزمائش کرنا، چھوڑ رکھنا اور اس کے سبب سے دکھ یعنی عذاب دینا۔ مترجم)

وَرِزْقُ رَبِّكَ اور آپ کے رب کی آپ کو عطاء یعنی ہدایت، نبوت، بقدر کفاف حلال روزی، یا جنت اور مراتب قرب۔ خَيْرٌ یعنی ان کو جو کچھ دیا گیا ہے اس سے کہیں بہتر ہے۔ وَأَبْقَىٰ اور دیرپا، یعنی لازوال ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے فرمایا اللہ کی تسکین دہی اور اطمینان بخشی سے اگر کسی کو تسکین قلبی اور اطمینان خاطر حاصل نہ ہو تو اس کا سانس حسرت دنیا میں ہی نکلتا ہے، اور جو لوگوں کے مال کی طرف چشم تمنا سے دیکھتا ہے اس پر غم چھایا رہتا ہے اور جو شخص خیال کرتا ہے کہ کھانا پینا اور لباس ہی اللہ کی نعمت ہے (ہدایت ایمان اور جنت نعمت خداوندی نہیں ہے) تو اس کے اعمال (حسنہ) کم ہو جاتے ہے اور عذاب سامنے آموجود ہوتا ہے۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ﴿۱۳۲﴾

اور اپنے متعلقین کو نماز کا حکم دیتے رہیے اور خود بھی اس کے پابند رہیے

ہم آپ سے معاش (کمونا) نہیں چاہتے معاش تو آپ کو ہم دیں گے اور بہتر انجام تو پرہیزگاری ہی کا ہے۔

اَهْلَكَ اہل سے مراد ہیں قوم، قبیلہ والے اور ہم مذہب (یعنی مسلمان) بِالصَّلٰوةِ متعلقین کو بھی نماز پڑھنے کا حکم دیتے کی ہدایت کی تاکہ سب باہم تعاون کریں اور ناداری کے خلاف سب متفق و متحد ہو جائیں اور پھر امر معاش کو اہمیت نہ دیں اور کوئی مسلمان دولت مندوں کی دولت کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔

وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا یعنی خود بھی نماز کے پابند رہو۔

لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا یعنی ہم آپ کو اس بات کا مکلف نہیں کرتے کہ آپ ہماری مخلوق میں سے کسی کو رزق کہیں سے دیں یا اپنا رزق خود پیدا کریں ہم نے تو آپ کو عمل صالح کا مکلف کیا ہے۔ نَحْنُ نَرْزُقُكَ یعنی ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور آپ کو بھی، پس امر آخرت کے لئے آپ کو فارغ البال اور مطمئن ہو کر کام کرنا چاہئے۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى یعنی اچھا انجام تو اہل تقویٰ کا ہے، عمل صالح کے بعد کو اچھا نتیجہ اور ثواب حاصل ہوگا اس کو عاقبت کہا جاتا ہے۔ جس طرح عقاب اس عذاب کو کہتے ہیں جو برے عمل کے بعد آنے والا ہے۔ اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباس نے فرمایا جن لوگوں نے آپ کو سچا جانا اور مانا اور آپ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے اور مجھ سے ڈرتے رہے ان کا انجام اچھا ہے۔ سعید بن منصور نے سنن میں اور طبرانی نے الاوسط میں اور ابو نعیم نے الحلیہ میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں کو جب کوئی دکھ پہنچتا تھا تو آپ ان کو نماز کا حکم دیتے تھے اور یہ تلاوت فرماتے تھے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا يَأْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ اَوَلَمْ تَأْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾

اور وہ (مشرک عناداً) کہتے ہیں کہ یہ رسول کوئی نشانی (اپنی نبوت کی) اپنے رب کے پاس سے کیوں نہیں لائے کیا ان کے پاس پہلی کتابوں کے مضامین کا ظہور نہیں ہوا۔

بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ یعنی محمد کوئی ایسی کھلی نشانی کیوں نہیں پیش کرتے جو ان کے دعوئ نبوت کی سچائی کو ثابت کر سکے۔ نشانیاں تو بکثرت موجود تھیں اور آچکی تھیں انہوں نے محض عناد کی وجہ سے موجودہ آیات کا انکار کیا اور خود تراشیدہ نشانیوں کے طلب گار ہوئے، اللہ نے قرآن نازل کرنے کو سب سے بڑا اور ابدی معجزہ قرار دے کر ان کو الزامی جواب دے دیا (کہ یہ قرآن سب سے بڑا معجزہ تمہارے سامنے موجود ہے جو لازوال ہے) کیونکہ معجزہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ مدعی نبوت اپنے دعوے کے ثبوت میں اپنی کوئی ایسی علمی یا عملی خصوصیت ظاہر کرتا ہے جس سے دوسرے انسان (اس زمانہ میں) محروم ہوتے ہیں اور پیغمبر کی یہ صفت خارق عادت انسانی ہوتی ہے۔ (تمام پیغمبروں سے عملی معجزات کا ظہور ہوا جو وقتی اور ہنگامی تھے اور مخصوص وقت تک قائم رہے) اور ظاہر ہے کہ علم عمل کی بنیاد ہے عمل سے علم افضل و اعلیٰ ہے، علم کا مرتبہ عمل سے بہت اونچا ہے جو معجزہ علمی ہوگا اس کا مرتبہ بھی عملی معجزات سے اونچا ہونا لازم ہے اور جس پیغمبر سے علمی معجزہ کا ظہور ہو وہ خود ان پیغمبروں سے افضل ہوگا جن سے عملی معجزات کا صدور ہوتا ہے۔ اَوَلَمْ تَأْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى استفہام انکاری ہے (اور جب ہمزہ انکاری کو منفی جملہ پر داخل کیا گیا تو تقریر اور اثبات مضمون ہو گیا کیونکہ نفی کی نفی اثبات ہوتی ہے، مترجم) یعنی کیا ابھی تک ان مشرکوں نے آپ کے دعوائے نبوت کی سچائی کو نہیں پہچانا اور کیا توریت، انجیل اور دوسری آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے مضامین کا بیان قرآن کی صورت میں نہیں آگیا، قرآن کے اندر تو ان تمام عقائد و احکام عامہ کا خلاصہ اور نچوڑ موجود ہے جو پچھلی آسمانی کتابوں میں آئے ہیں اور یہ پیش کرنے والا ایک ناخواندہ شخص ہے جس نے نہ آسمانی کتابوں کو خود پڑھا، نہ کسی سے سیکھا، کیا یہ صداقت نبوت کی روشن نشانی نہیں ہے، آیت میں ایک مخفی تنبیہ ہے اس بات پر کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی دلیل وہ قرآن ہے جس کے صحیح ہونے کی شہادت گزشتہ کتابوں کے مضامین دے رہے ہیں جن کو قرآن نے بطور معجزہ (بغیر کسی انسان کی تعلیم کے) بیان کیا ہے لیکن دوسری آسمانی کتابیں ایسی نہیں ہیں ان کی صحت کا ثبوت شہادت پر موقوف ہے۔

آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ گزشتہ آسمانی کتابوں میں جو مختلف اقوام وامم کے حالات بیان کیے گئے ہیں کہ انہوں نے اپنے اپنے پیغمبروں سے اپنے فرمائشی معجزات طلب کیے اور جب وہ مطلوبہ معجزات ظاہر ہو گئے تو وہ ایمان نہ لائے۔ آخر اللہ نے دنیا ہی میں ان کو عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اور ان کو تاخت وتاراج کر دیا۔ پس اگر ان مشرکوں کے مطلوبہ معجزات بھی ظاہر کر دیے گئے اور یہ ایمان نہ لائے (اور حسب تاریخ اقوام یہ ظہور معجزات کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے) تو پھر ان کو تباہی سے کون بچائے گا کیا ان کا حال بھی پچھلی امتوں کی طرح نہیں ہو جائے گا کیا ان لوگوں نے کتب سابقہ کے بیانات نہیں پڑھے ہیں۔

وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾

اور اگر ہم ان کو اس سے (یعنی قرآن آنے سے) پہلے کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ لوگ (بطور عذر) یوں کہتے کہ اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس (دنیا میں) کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا تھا کہ ہم تیرے احکام پر چلتے قبل اس کے کہ ہم (یہاں خود) ذلیل ہوں اور (دوسروں کی نظر میں) رسوا ہوں۔

وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنٰهُمْ اور اگر ہم بالفرض ان قریش کے کافروں کو شرک کرنے کی وجہ سے کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے۔

مِنْ قَبْلِهٖ محمد ﷺ کو بھیجنے سے پہلے یا نصیحت کرنے اور بینہ بھیجنے سے پہلے۔

لَقَالُوْا تو قیامت کے دن یہ کہتے۔

لَوْلَآ أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُوْلًا تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم کو توحید کی طرف بلاتا۔ فَنَتَّبِعَ اور ہم تیرے ان احکام پر چلتے جو تو رسول پر نازل کرتا۔ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَّذِلَّ قبل اس کے کہ ہم دنیا میں ذلیل ہوتے قید اور قتل ہونے کی ذلت اٹھاتے۔ وَنَخْزٰى اور قیامت کے دن دوزخ میں پڑ کر رسوا ہوتے۔ یا ذلت سے مراد ہے قیامت کے دن ذلیل ہونا اور رسوا ہونے سے مراد جہنم میں پڑ کر رسوا ہونا۔

مسئلہ: آیات مذکورہ بتا رہی ہیں کہ پیغمبروں کی بعثت کے بغیر بھی اللہ پر ایمان لانا اور اس کو واحد جاننا واجب ہے اور ہر باہوش (بالغ) کو کفر عذاب کا مستحق بنا دیتا ہے پیغمبروں کو بھیجنا اللہ پر لازم نہ تھا اس نے محض اپنی مہربانی سے انبیاء کو مبعوث کیا تاکہ اتمام حجت ہو جائے اور کسی کو (ناقابل پذیرائی) معذرت کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک ہے لیکن امام شافعیؒ کا قول اس کے خلاف ہے (امام شافعیؒ کے نزدیک بغیر بعثت نبی کی اطلاع کے کفر بھی ناقابل مواخذہ ہے بغیر نبی کے محض عقل ایمان کا مکلف بنانے کے لیے کافی نہیں ہے۔ مترجم)

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ أَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾ ۸ ع

آپ کہہ دیجئے ہم سب انتظار کر رہے ہیں سو تم (چندے اور) انتظار کرو، عنقریب تم کو (خود) معلوم ہو جائے گا کہ راہ راست والے کون ہیں اور وہ کون ہے جو منزل مقصود تک پہنچا۔

قُلْ، رسول اللہ کو خطاب ہے اور نیا کلام شروع کیا گیا ہے۔

كُلٌّ ہم اور تم سب

مُتَرَبِّصٌ نتیجہ کے منتظر ہیں اور انتظار کر رہے ہیں کہ تمہارا حال کیا ہوتا ہے اور ہمارا کیا۔

فَتَرَبَّصُوْا (کچھ اور) انتظار کرتے رہو۔ مشرکین کہا کرتے تھے ہم منتظر ہیں کہ محمد ﷺ پر زمانہ کی گردشیں آئیں اور وہ حوادث دہر میں مبتلا ہو جائیں گے جب وہ مر جائیں گے۔ اسی وقت ہمارا پیچھا چھوٹے گا۔

فَسَتَعْلَمُوْنَ عنقریب یعنی قیامت کے دن تم کو معلوم ہو جائے گا۔

الصِّرَاطِ السَّوِيِّ سیدھا راستہ جنت تک پہنچانے والا۔
وَمَنِ اهْتَدٰى اور وہ کون ہے جس نے گمراہی سے ہدایت پائی یا وہ کون ہے جس نے لازوال راحت و چین کی راہ پائی۔
حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت معقل بن یسار کی روایت سے اور بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مجھے سورۂ بقرہ ذکر اول سے اور طٰہٰ اور طسم والی سورتیں اور حم والی سورتیں موسیٰ کی الواح (توریت) سے اور فاتحۃ الکتاب (سورۃ الحمد) اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات زیر عرش سے عطا کی گئی ہیں اور مفصلات (مجھے) زائد عطا کی گئی ہیں۔ حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی اور ابن ماجہ نے حضرت امامہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کا وہ اسم اعظم کہ اگر اس کو لے کر دعا کی جائے تو اللہ قبول فرمالیتا ہے۔ تین سورتوں میں ہے سورۃ البقرہ اور آل عمران اور طٰہٰ۔

بحمداللہ وفضلہ سورۂ طٰہٰ کی تفسیر ۸ ربیع الثانی ۱۲۰۳ھ کو ختم ہوئی۔ المنۃ للہ والشکر لہ کہ سورۂ طٰہٰ کی تفسیر مظہری کا اردو ترجمہ ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ کو صبح ۴ بجے پورا ہوا۔ فالحمد قبل لہ والحمد بعدلہ

ہم تیری حمد کرتے ہیں اے خدا کہ تیرے سوا کوئی قابل پرستش نہیں، ہم تیرے پاک ہونے کا اقرار کرتے ہیں، تجھ سے مدد کے خواستگار ہیں اور مغفرت کے طلب گار۔ ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو سارے ملک کا مالک ہے جس کو چاہتا ہے حکومت واقتدار دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت نکال لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے عزت عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت نصیب کرتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے اور ہر چیز پر تیرا قابو ہے، تو ہی ہمارا مالک ہے اور آسمان وزمین اور ان کی کائنات کا بھی مالک ہے۔

ہم دعاء رحمت وسلامتی کرتے ہیں تیرے رسول ﷺ اور حبیب کے لئے جو ہمارے آقا اور مولی ہیں، جن کا نام نامی محمد ﷺ ہے اور تمام انبیاء ومرسلین کے لئے اور تیرے نیک بندوں کے لئے۔

سترھواں پارہ

سورۃ الانبیاء

اس سورۃ میں ایک سو بارہ ۱۱۲ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ لوگوں کے قریب آگیا ان کا حساب یعنی گزشتہ زمانے کے مقابلے میں اب حساب (آخرت) کا زمانہ قریب آگیا۔ لِلنَّاسِ میں لام بمعنی مِنْ ہے یعنی لوگوں سے قریب آگیا۔ اَلنَّاسُ میں الف لام جنسی ہے عام لوگ یا عہدی ہے یعنی کافر لوگ، آئندہ آیت سے یہی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ اَلنَّاس سے مراد کافر ہیں۔

وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں یعنی دنیا اور نفسانی خواہشات میں غرق ہونے کی وجہ سے وہ محاسبۂ آخرت سے بھی غافل ہیں اور اسی سزا سے بھی جو ان کو دی جائے گی۔

مُّعْرِضُونَ ۝۱ منہ موڑے ہوئے یعنی حساب فہمی پر غور کرنے اور اس کی تیاری کرنے سے روگرداں ہیں۔

فِي غَفْلَةٍ کے بعد مُعْرِضُونَ کا اضافہ اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ حساب کی طرف سے ان کا غافل ہونا دنیا میں ڈوبنے کی وجہ سے ہے یہ بات نہیں ہے کہ وہ اللہ کی یاد میں غرق ہیں اس لئے ان کو آخرت کا خیال نہیں آتا۔

اگر اَلنَّاس میں الف لام استغراقی قرار دیا جائے اور تمام لوگ مراد ہوں تو هُمْ ضمیر بعض لوگوں یعنی کافروں کی طرف راجع ہوگی اور یہ جائز ہے جیسے آیت وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ۔ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ میں اَلْمُطَلَّقٰتُ کا لفظ عام ہے، لیکن بُعُوْلَتُهُنَّ کی ضمیر ان مطلقات کی طرف راجع ہے جن کی طلاق رجعی ہو۔

مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۲

ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو نصیحت تازہ (ان کے حسب حال) آتی ہے یہ اس کو ایسے طور سے سنتے ہیں کہ (اس کے

ساتھ) ہنسی کرتے ہیں۔
مِنْ ذِكْرٍ میں مِنْ زائد ہے جار مجرور محل فاعل میں ہے۔ ذکر یعنی ایسی نصیحت جو خواب غفلت سے بیدار کردے۔
مُّحْدَثٍ تازہ جدید ہو، کانوں میں باربار آئے تاکہ نصیحت پذیری پر تنبیہ ہو۔ مُحْدَثٍ سے یہ لازم نہیں آتا کہ ذکر قدیم نہ ہو (کیونکہ حدوث سے مراد نزول کا حدوث ہے، اس سے معتزلہ کے اعتراض کی بیخ کنی ہو گئی جو کلام اللہ کو حادث کہتے ہیں اور محدث کے لفظ سے حدوث پر استدلال کرتے ہیں۔ مترجم) وَهُمْ يَلْعَبُونَ یعنی قرآن سے استہزاء کرتے ہیں۔ انتہائی غافل ہیں انجام کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہیں اس لئے قرآن کا مذاق اڑاتے ہیں۔

لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ (قرآن میں غور کرنے اور انجام کو سوچنے سے) ان کے دل بے فکر ہیں۔ ابوبکر وراق نے لَاهِيَةً کا مطلب بیان کیا کہ ان کے دل دنیوی سجاوٹ دبناوٹ میں مشغول ہیں آخرت اور اس کی ہولناکیوں سے غافل ہیں۔

وَأَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِينَ ظَلَمُوا اور چھپا کر سرگوشیاں کیں ظالموں نے۔ (سرگوشی تو خود پوشیدہ ہی ہوتی ہے کانوں کانوں میں بات کرنے کو نجوی کہتے ہیں، پھر اسروا کیوں فرمایا تو اس اضافہ سے پوشیدہ رکھنے میں مبالغہ کو ظاہر کرنا مقصود ہے یا یہ مطلب ہے کہ ایسی جگہ سرگوشی کرتے ہیں کہ وہ مقام بھی پوشیدہ رہے کسی کو معلوم نہ ہو۔
اَسَرُّوا میں واؤ زائد ہے یا ضمیر جمع کا ہے اور اَلَّذِينَ اس سے بدل ہے یا اَسَرُّوا سے پہلے هُمْ لا کر مبتدا محذوف ہے اور اَلَّذِينَ ظَلَمُوا سے پہلے هُمْ مبتدا محذوف ہے۔

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ نہیں ہے یہ مگر تم ہی جیسا انسان۔ کافروں کا خیال تھا کہ پیغمبر کا فرشتہ ہونا ضروری ہے اور یہ ہم جیسا انسان ہے اس لئے پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ پیغمبر کو پیغامبر بنا کر بھیجنے والے کا ہم جنس ہونا چاہئے اور ان کے گمان کے موافق ملائکہ اللہ کے ہم جنس تھے اسی لئے فرشتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے پس پیغمبر کا فرشتہ ہونا لازم ہے، حق بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کا ہم جنس ہونا چاہئے جن کے پاس رسول کو بھیجا گیا ہو تاکہ اس کی ہدایت سے کچھ فائدہ حاصل ہو سکے اللہ تو کسی کا ہم جنس نہیں اس کی مثل تو کوئی نہیں (اور فرشتے انسان کے ہم جنس نہیں اس سے لوگوں کو کیسے فائدہ پہنچنا ممکن ہے اگر بالفرض فرشتہ کو بھی پیغمبر بنا کر بھیجا جاتا تو اس کی اصل شکل کو کوئی پہچان نہ سکتا تھا نہ اس سے فائدہ حاصل کر سکتا لامحالہ فرشتہ بشکل بشری بھیجا جاتا لیکن کسی کو کیا معلوم ہوتا کہ یہ فرشتہ ہے یا آدمی۔ مترجم)
اللہ کے پیغمبر نے جب دعویٰ رسالت کے ثبوت کے لئے معجزات پیش کئے اور کافروں سے اس کا جواب نہ بن پڑا تو کہنے لگے۔

اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③ کیا تم پھر بھی دیدہ و دانستہ جادو کی بات سننے جاؤ گے۔ یعنی یہ شخص رسول نہیں ہے آدمی ہے اور یہ جو کچھ غیر معمولی عاجز کن چیزیں قرآن جیسی پیش کر رہا ہے تو یہ جادو ہے پس آنکھوں سے جادو دیکھتے ہوئے کیا تم جادو کی پیروی کرنے لگو گے، رسول اللہ ﷺ کے معجزات کو جادو قرار دینے کی ان کے پاس کوئی دلیل تھی نہ کوئی ثبوت پیش کر سکتے تھے اس لئے مجبوراً وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ کہا۔ یعنی ہدایت کا دعویٰ کیا اور ایسا جادو قرار دیا جس کو ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ باہم مشورہ کو پوشیدہ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ ہم باہم متفق طور پر ایک ایسے فیصلہ پر پہنچنے کے خواستگار تھے اور ایسے قول پر اتفاق کرنا چاہتے تھے جس سے نبوت کا مقابلہ کر سکیں اور قصر نبوت کو ڈھادیں جس کو سن کر سننے والے نبوت کی تکذیب کرنے پر آمادہ ہو جائیں وہ چاہتے تھے کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں مگر اللہ تو اپنا نور پورا اور اچھیلانے والا تھا خواہ کافروں کو ناگوار ہو۔

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ④
پیغمبر نے کہا میرا رب ہر بات کو خواہ وہ آسمان میں ہو یا زمین میں جانتا ہے اور وہ ہی خوب سننے والا اور بخوبی جاننے والا ہے۔ یعنی ہر قائل کی ہر بات کو آسمانوں میں ہو یا زمین میں ظاہر ہو یا پوشیدہ، چلا کر ہو یا چپکے چپکے بہر حال اللہ اس کو جانتا ہے وہ سب کی باتیں خوب سنتا اور سب کے احوال و اعمال کو خوب جانتا ہے اس سے کوئی پوشیدہ بات چھپی نہیں۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بلکہ یوں بھی کہا کہ یہ قرآن پریشان خیالات ہیں بلکہ اس شخص نے اس کو خود تراش لیا ہے۔

کافروں نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت سے اس لئے انکار کیا تھا کہ یہ آدمی ہیں اور آدمی پیغمبر نہیں ہو سکتا اللہ نے ان کے اس قول کو گزشتہ آیت میں نقل فرمادیا پھر کافروں نے قرآن کی شان میں کہا تھا کہ یہ بے ہودہ گڑبڑ خوابوں کا مجموعہ ہے۔ اللہ نے پہلے قول کو نقل کرنے کے بعد کلام کا رخ موڑ اور کافروں کے دوسرے قول کو نقل فرمایا۔

مخلوط اور گڑبڑ خوابوں کا مجموعہ قرار دینے کا یہ مطلب تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے وحی نہیں ہے۔ بلکہ کچھ بے ہودہ خواب ہیں جوان کو سوتے میں نظر آجاتے ہیں۔ پھر اس سے بھی اعراض کیا (کیونکہ بے ہودہ خواب غیر مربوط اور بے بنیاد ہوتے ہیں اور افادیت سے بھی خالی ہوتے ہیں اور قرآن مربوط مفید پیام کا حامل ہے اس لئے) کہنے لگے (یہ اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ نہیں ہے، بلکہ اس شخص نے خود اپنی طرف سے یہ کلام بنالیا ہے اور اللہ کی طرف اس کی نسبت کردی ہے۔

بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (پھر کہنے لگے یہ خالی دروغ بندی اور کذب تراشی ہی نہیں) بلکہ یہ شخص شاعر ہے (یہ اس کی شاعری کی بلند پروازی اور کمال شعری ہے) پہلے قرآن کو دروغ بندی قرار دیا تھا پھر اس سے گریز کیا اور اللہ کے کلام کو شعر کہنے لگے۔

بغوی نے لکھا ہے مراد یہ ہے کہ کچھ مشرکوں نے کتاب اللہ کو پراگندہ خواب کہا کچھ لوگوں نے من گھڑت دروغ بندی قرار دیا اور بعض نے قرآن کو شعر کہا اور رسول اللہ ﷺ کو شاعر۔ مفتری اور شاعر میں فرق یہ ہے کہ افترا کرنے والے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ جھوٹی بات کہہ کر سننے والے کو اس کے سچے ہونے کا یقین دلادے۔ اور شعر ان مقدمات کے مجموعہ کا نام ہے جن سے سننے والے اور پڑھنے والے کے دل میں خوف یا رغبت یا شوق یا خوشی یا غم یا تعظیم یا تحقیر یا کوئی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ شعر کی غرض صرف جذبات کو برانگیختہ کرنا ہوتا ہے۔ تصدیق کرانی مقصود نہیں ہوتی (گویا شعر کلام خبری نہیں ہوتا انشائی ہوتا ہے اور افترا کلام خبری کا نام ہے) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر مقدمات شعریہ کے ساتھ کچھ واقعات بھی بیان کرتا ہے (خواہ کلام سچا ہو یا جھوٹا مگر واقعات کی تصویر کشی ضرور ہوتی ہے محض انشاء (یعنی ترہیب و ترغیب، تعظیم و تحقیر وغیرہ) غزل میں ہوتی ہے اور مثنوی میں انشاء کے ساتھ اخبار بھی ہوتا ہے، کافروں کے یہ پراگندہ اقوال دلالت کر رہے ہیں کہ ان کو کسی بات کا یقین نہ تھا کبھی قرآن کے متعلق کچھ کہتے تھے کبھی کچھ۔

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ (یعنی محمد اگر اپنے دعوئی میں سچے ہیں) تو ہمارے سامنے کھلی ہوئی نشانی لائیں ایسی (محسوس) جیسی پہلے انبیاء کو دے کر بھیجا گیا تھا مثلاً حضرت صالح کی اونٹنی، حضرت موسیٰ کا عصا اور ید بیضاء، حضرت عیسیٰ کا مردوں کو زندہ کرنا اور مادر زاد نابینا اور کوڑھی کو تندرست کردینا وغیرہ۔

ابن جریر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ مکہ والوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا آپ اگر اپنے دعوئی میں سچے ہیں تو کوہ صفا کو سونے کا کر دیجئے اس سوال کے بعد فوراً اللہ کی طرف سے حضرت جبرئیل آئے انہوں نے کہا اگر آپ ﷺ چاہتے ہوں تو آپ ﷺ کی قوم کا سوال پورا کردیا جائے اور (کوہ صفا کو سونے کا کردیا جائے) لیکن اس کے بعد بھی اگر یہ ایمان نہ لائے تو پھر (سب کو ہلاک کردیا جائے گا) مہلت نہیں دی جائے گی اور آپ چاہیں تو میں آپکی قوم کو ڈھیل دوں اور (مزید سوچنے سمجھنے اور ایمان لانے کی) مہلت دے دوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اپنی قوم کے لئے درخواست مہلت کرتا ہوں، اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ ان سے پہلے جن بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں وہ (مطلوبہ معجزات دیکھنے کے بعد بھی) ایمان نہیں لائے تھے تو کیا یہ لوگ (اپنے مطلوبہ فرمائشی معجزات کو دیکھ کر) ایمان لے آئیں گے۔

قَبْلَھُمْ، یعنی مشرکین مکہ سے پہلے۔ مِنْ قَرْيَةٍ جار مجرور فاعل کے قائم مقام ہے اور مضاف محذوف ہے، یعنی اہل قریہ مِنْ قَرْيَةٍ میں مِنْ زائد ہے۔

اَفَھُمْ یُؤْمِنُوْنَ، استفہام انکاری ہے یعنی مکہ کے مشرک تو گزشتہ کافروں سے کفر میں سخت ہیں جب گزشتہ کافر ایمان نہیں لائے تو یہ لوگ یقیناً (مطلوبہ معجزات کے ظہور کے بعد بھی) ایمان نہیں لائیں گے۔ آیت میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ مطلوبہ معجزات کو ظاہر اور نمودار نہ کرنے کی وجہ اور مصلحت صرف یہ ہے کہ لوگ (کفار مکہ) اگر ظہور معجزات کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے اور یقیناً ایمان نہیں لائیں گے تو ان کو بھی گزشتہ کافروں کی طرح ہلاک کر دیا جائے گا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷

(اے محمد ﷺ) ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف مردوں کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا جن کے پاس وحی بھیجتے تھے پس (اے مکہ والو) تم اہل ذکر یعنی اہل کتاب سے پوچھ لو اگر تم کو اس کا علم نہیں ہے۔ یعنی اہل کتاب سے پوچھ لو کہ سابق پیغمبر آدمی ہوئے یا فرشتے، تاکہ تمہارا شبہ جاتا رہے۔ اہل کتاب سے پوچھنے کا حکم دینے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ مشرکین مکہ کو رسول اللہ ﷺ (اور دوسرے دینی امور) کے سلسلہ میں اہل کتاب پر اعتماد تھا ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ یا یہ وجہ ہے کہ متواتر خبر موجب یقین ہوتی ہے خواہ اہل تواتر کافر ہی ہوں اور چونکہ آدمیوں کا ہی پیغمبر ہونا ہر زمانہ میں بطور تواتر مسلسل بیان کیا جاتا رہا ہے اس لئے یہودیوں کا قول بھی اس کے متعلق قابل اعتبار ہے۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ اور ہم نے ان پیغمبروں کے لیے جسم نہیں بنائے جو کھانا نہ کھاتے ہوں۔ (یعنی فرشتے نہیں بنایا) جَسَدٌ اسم جنس ہے ایک ہو یا زیادہ سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے یا مضاف محذوف ہے یعنی جسموں والے۔ جَسَدٌ رنگ دار جسم کو کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے جَسَد کا معنی ہے کسی چیز کا باہم اکٹھا ہوتا اور جڑنا۔

لَا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ، جَسَدًا کی صفت ہے یا علیحدہ ہے اور کافروں کے قول کا جواب ہے۔ کفار کہتے تھے کیا وجہ ہے کہ یہ رسول کھانا کھاتا ہے۔

وَمَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ ۝۸ اور وہ ہمیشہ رہنے والے بھی نہیں ہوتے۔ آیت سابقہ کے مضمون کی تاکید اس آیت سے ہو رہی ہے کہ جس کی زندگی کی بقاء کھانے پر موقوف ہو لا محالہ اس کے جسم میں تحلیل ہوگی اور تحلیل کا نتیجہ فنا ہے۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ پھر ہم نے ان سے جو وعدہ کیا اس کو سچ کر دکھایا، یعنی ہم نے پیغمبروں کی مدد کا جو وعدہ کیا تھا اس کو سچ کر دکھایا۔

فَاَنْجَیْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ اور ان کو اور جن کو ہم چاہتے تھے (یعنی پیغمبروں پر ایمان لانے والوں کو) ہم نے (اپنے عذاب سے اور کفار کی ایذا رسانی سے) بچالیا۔ مَنْ نَّشَآءُ سے وہ لوگ مراد ہیں جو پیغمبروں پر ایمان لے آئے تھے یا آئندہ ایمان لانے والے تھے یا آئندہ ان کی اولاد پیدا ہونے والی اور ایمان لانے والی تھی، یہی وجہ ہے کہ عرب عام تباہ کن عذاب سے محفوظ رکھے گئے (کیونکہ آئندہ ان کا یا آئندہ پیدا ہونے والی اولاد کا ایمان لانا اللہ کے علم میں تھا)

وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِیْنَ ۝۹ اور (کفر و معصیت میں) حد سے بڑھنے والوں کو ہم نے تباہ کر دیا۔

ع ۱

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰ (اے گروہ قریش) ہم نے تمہاری طرف قرآن نازل کیا ہے جس کے اندر تمہارا ذکر ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

ذکر یعنی تمہاری فضیلت اور بزرگی قرآن کے اندر ہے بشرطیکہ تم اس کو سمجھو (اور مانو) یا یہ مطلب ہے کہ قرآن میں تمہارے لئے شرف ہے کہ تمہاری زبان میں اتار آگیا۔ یا ذکر سے مراد ہے اللہ کا ذکر اور ضروری دینی امور کا تذکرہ۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ ذکر سے مراد ہے اچھا ذکر اور شہرت و ناموری۔ یا نصیحت یا وہ اعلیٰ اخلاق جن سے تم کو اچھا ذکر حاصل ہو۔ مجاہد کے

نزدیک ذکر سے اس جگہ مراد ہیں باتیں۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے ذکر اور تذکار کسی چیز کو یاد رکھنا، ذکر کرنا زبان پر جاری کرنا، شہرت، تعریف، شرف، نماز، دعا، وہ کتاب جس میں قرض کی تفصیل ہوتی ہے مالی حساب ہوتا ہے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، میں ہمزہ انکاری ہے یعنی کیا تم اس کے اندر وہ باتیں نہیں سمجھتے جن سے تمہاری بہبودی اور شرف وابستہ ہے۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ⑪

اور ہم نے بہت سی بستیاں جہاں کے رہنے والے ظالم (یعنی کافر) تھے، غارت کردیں اور ان کے بعد دوسری قوم پیدا کردی۔

قَصَمْنَا توڑنا مراد بکثرت ہلاک کرنا۔ قَرْيَةٍ یعنی اہل قریہ بہت بستیوں والے۔ كَانَتْ ظَالِمَةً یعنی کفر اور گناہ کرکے انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔ اَنْشَاْنَا ہم نے وارث بنایا۔ بَعْدَهَا اس بستی کو تباہ کرنے کے بعد۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ⑫ پھر جب اس بستی والوں نے ہمارے عذاب کی شدت دیکھ لی تو یکدم تیزی کے ساتھ وہاں سے بھاگنے لگے۔

اَحَسُّوْا یعنی جب انہوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ بَاْسَنَا ہمارے عذاب کی شدت کو، يَرْكُضُوْنَ گھوڑوں کی ایڑ لگا کر تیزی سے بھاگنے لگے، یا یوں کہا جائے کہ سوار گھوڑے کو ایڑ مار کر تیزی سے بھگاتا ہے اور بستی والے بھی تیزی سے بھاگنے لگے اس لئے ان کو ایڑ مارنے والے سواروں سے تشبیہ دی۔

لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ (ان سے کہا گیا) بھاگو مت اور اپنے سامان عیش کی طرف اور اپنے مکانوں کی طرف واپس چلو۔ یعنی ان سے بزبان حال یا کسی فرشتے یا کسی مومن کی زبانی کہا گیا کہ (اب کیوں بھاگتے ہو) مت بھاگو، اُتْرِفْتُمْ جس عیش میں پڑے تھے اس کی طرف پلٹو۔ اِتْرَافٌ نعمت پر اترا جانا۔ خلیل نے کہا مُتْرَفٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو خوش حال فارغ البال ہو کوئی پریشانی اور فکر اس کو نہ ہو۔

لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ⑬ شاید تم سے کوئی پوچھے پاچھے۔

تاکہ کل کو تم سے پوچھا جائے کہ تم پر اور تمہارے مال و متاع پر کیا گذری اور تم اس کا جواب معاینہ کے بعد دے سکو۔ یا یہ مراد ہے کہ تم لوٹ کر جاؤ اپنے جلسوں میں بیٹھو۔ پھر تمہارے نوکر چاکر اور کارندے تم سے دریافت کریں کہ اب ہم کو آپ کیا حکم دیتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ شاید لوگ تمہاری مجلسوں میں آکر تم سے اپنی اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کے متعلق دریافت کریں۔ یا یہ مطلب ہے کہ شاید کل کو تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہوگی یا تم کو عذاب دیا جائے گا، باز پرس بھی عذاب کی ابتدائی تمہید ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تم سے قتل نبی کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔ بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول حضورا کے باشندوں کے حق میں ہوا، حضور ایمن کی ایک بستی تھی جس کے باشندے عرب تھے، اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے ایک نبی کو مبعوث فرمایا، پیغمبر نے ان کو توحید کی دعوت دی، اہل حضورا نے نبی کی تکذیب کی اور اس کو قتل کردیا، اللہ نے (بطور سزا) شاہ بخت نصر کو ان پر مسلط کردیا، بخت نصر نے ان کو قتل اور قید کیا جب عام طور پر لوگ قتل ہونے لگے تو پشیمان ہوئے اور (بستی چھوڑ کر) بھاگ کھڑے ہوئے، فرشتوں نے ان کو آواز دی بھاگو مت، اپنے گھروں اور مالوں کی طرف لوٹو شاید تم سے (کچھ) مانگا جائے، اور پھر جس کو چاہو تم دو اور جسکو چاہو نہ دو، تم بڑے مالدار اور اہل ثروت ہو، غرض بخت نصر نے ان کا تعاقب کیا اور بے دریغ قتل کیا اور کسی ہاتف نے اوپر سے آواز دی انبیاء کا انتقام۔ یہ حالت دیکھ کر ان کو اپنے کئے پر پشیمانی ہوئی۔ لیکن اقرار قصور نے ان کو فائدہ نہ دیا۔ یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں نے کہا بھاگو نہیں لوٹ کر گھروں کو چلو شاید تم سے بطور تاوان مال طلب کیا جائے اور تم مال دے کر قتل ہونے سے بچ جاؤ اس وقت آسمان سے ندا آئی انبیاء کا انتقام۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ⑭ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ⑮

کہنے لگے ہائے ہماری تباہی (آگئی) ہم بلاشبہ ظالم تھے۔ وہ برابر یہی پکار مچاتے رہے آخر ہم نے ان کو کٹی ہوئی کھیتی (کی طرح تباہ اور) مردہ کر دیا۔ یعنی وہ برابر یٰوَیْلَنَا اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ کی رٹ لگاتے رہے گویا وہ اپنی موت کو بلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے اے موت تو کہاں ہے آجا اس وقت تیری ضرورت ہے حصید۔ کٹی ہوئی کھیتی۔ خامدین مردے، بجھے ہوئے، خمود نار آگ کا بجھنا۔ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ، دونوں کا مجموعہ ہے، ایک اسم کی طرح ہو کر جَعَلْنَا کا مفعول دوم ہے۔ یعنی ان کو کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہم نے کر دیا اور بجھی ہوئی آگ کی طرح بھی۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ﴿۱۶﴾ اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ کہ ان کے درمیان ہے اس کو اس طور پر نہیں پیدا کیا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں۔ لٰعِبِیْنَ بیکار کام کرنے والے۔ یعنی آسمان و زمین اور ان کی درمیانی کائنات کی تخلیق ہم نے بیکار نہیں کی۔ بلکہ ان کے اندر حکمت کے عجائب کا اظہار کیا ہے۔ عبرت اندوز نظر رکھنے والوں کے لئے ان کے اندر ذخیرہ عبرت پوشیدہ ہے اور معاش و معاد کو درست کرنے کا سامان موجود ہے، ضروری ہے کہ موجودات کی ظاہری نظر فریبیوں کا شکار نہ ہو جائیں، اصل حکمت پر غور کریں اور اس ساری کائنات کو تحصیل کمال کا ذریعہ بنائیں۔

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ کُنَّا فٰعِلِیْنَ ﴿۱۷﴾

اگر ہم کو مشغلہ ہی بنانا ہوتا تو ہم خالص اپنے ہی پاس کی چیز کو مشغلہ بناتے اگر ہم کو یہ کرنا ہوتا۔

عطاء کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لہو سے مراد عورت ہے۔ حسن اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ جماع کو لغت میں لہو کہتے ہیں اور عورت محل جماع ہے۔ کلبی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ لہو سے مراد اولاد ہے۔ سدی کا بھی یہی قول ہے، آدمی اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتا اور دل بہلاتا ہے۔

لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ کا یہ مطلب ہے کہ اگر ہم لہو کرنے والے ہی ہوتے تو اپنی شان کے مناسب ان چیزوں کو ذریعہ لہو بناتے جو ہماری ذات کے مناسب ہوتیں۔ مثلاً وہ مخلوق جو مادہ سے خالی ہے (مجردات، ملائکہ) ہر چیز کا جوڑا اور ہر شخص کی اولاد اسی کی ہم جنس ہوتی ہے اور اللہ کا ہم جنس کوئی نہیں ہے اس لئے اس کا جوڑا یا اولاد ہونا محال ہے اور ناممکن چیز سے اللہ کے ارادے کا تعلق ہو جائے یہ بھی محال ہے (موقوف علی المحال محال ہوتا ہے) اس آیت میں نصاری کے عقیدے کی تردید ہے جو مسیح کو اللہ کا بیٹا اور مسیح کی اماں کو اللہ کی بیوی قرار دیتے ہیں۔

اِنْ کُنَّا فٰعِلِیْنَ میں اِنْ شرطیہ ہے کلام سابق جزا پر دلالت کر رہا ہے اس لئے جزا کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ قتادہ اور ابن جریج اور مقاتل کے نزدیک اِنْ نافیہ ہے یعنی ہم ایسا کرنے والے نہیں۔ گویا یہ جملہ کلام سابق کا نتیجہ ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ

بلکہ ہم حق بات کو باطل پر پھینک مارتے ہیں۔ سو وہ (حق) اس (باطل) کا بھیجا نکال دیتا ہے سو وہ مغلوب ہو کر دفعتاً جاتا رہتا ہے۔ اس کا عطف سابق کلام پر ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم کھیل کرنے والے نہیں۔ بلکہ باطل کو حق پر دے مارتے ہیں۔ حق سے مراد ہیں وہ آیات جو اللہ کی تنزیہ اور پاکی کو ثابت کر رہی ہیں اور اللہ کا بیوی بچوں سے پاک ہونا جن سے ظاہر ہو رہا ہے۔ قَذْفٌ کا معنی ہے پٹکنا، پھینک مارنا۔ اَلْبَاطِلُ سے مراد ہے کفر اور جھوٹ اور یہ قول کہ اللہ کے بیوی بچے ہیں۔ یَدْمَغُ یعنی اس کو فنا کر دیتا ہے۔ دَمْغٌ سر توڑ دینا، بھیجا کچل دینا جس سے ہلاکت واقع ہو جائے۔ مجاز اً مراد ہے فنا کر دینا، حق کو قائم کرنا اور باطل کو تباہ کر دینا۔ قَذْفٌ کا لفظ بتا رہا ہے کہ جس چیز کو پھینک کر مارا گیا وہ بھاری اور ٹھوس ہے۔ ابطال باطل کو دمغ کہنا بطور مبالغہ ہے۔ زَاهِقٌ ہلاک ہونے والا جس کا نشان بھی باقی نہ رہے۔ قاموس میں ہے زَهَقَ الْبَاطِلُ باطل نابود ہو گیا زَهَقَ الشَّیْءُ وہ چیز تباہ اور ہلاک ہو گئی بعض نے کہا زُهُوْقٌ کا معنی ہے جان نکل جانا۔

وَلَکُمُ الْوَیْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ اور تمہارے لئے اس بات سے بڑی خرابی ہو گی جو تم گھڑتے ہو۔ خطاب

کافروں کو ہے۔ وَیْلٌ ہلاکت۔ مِمَّا تَصِفُوْنَ، یعنی جو نامناسب اوصاف تم بیان کرتے ہو اور جو اللہ کی شان کو زیبا نہیں ہیں ان کی وجہ سے تمہارے لئے ہلاکت ہوگی۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ اور جتنے کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اسی کے ہیں (وہ بھی اور جو اسکے پاس (یعنی اس کے مقرب) ہیں یعنی جو کوئی آسمانوں میں اور زمین میں ہے وہ اللہ ہی کی مخلوق اور مملوک ہے نہ کوئی اس کی مثل بننے کے لائق ہے نہ بیوی اور اولاد بننے کا سزاوار۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ اور جو اس کے مقرب ہیں وہ بھی اسی کے پیدا کردہ اور اسی کی ملک ہیں، یعنی ملائکہ، انبیاء اور دوسرے اہل قربت بھی اسی کے ہیں۔ اللہ کا قرب (جسمانی) نہیں بے کیف ہے (اس کی کوئی کیفیت نہیں بیان کی جاسکتی۔ مَنْ عِنْدَهٗ کو مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے الگ مستقل طور پر بصورت عطف اس لئے بیان کیا کہ بعض ملائکہ مثلاً حاملین عرش اور انبیاء و ملائکہ کی حقائق اور دائرۂ ظلال (یعنی حقائق امکانیہ اور اعیان ثابتہ) کا کوئی مکان نہیں نہ آسمان میں نہ زمین میں۔

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿١٩﴾ (اور ان میں سے) اللہ کے نزدیک جو (بڑے مقبول و مقرب) ہیں وہ اسکی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں۔

اِسْتِحْسَارٌ تھکنا، ماندہ ہو جانا، اِسْتِحْسَار کے معنی میں حُسُوْر کے معنی سے زیادہ زور ہے۔ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی عبادت گو ثقیل ہے، دوام عبادت دشوار ہے، مقرب ملائکہ کو تھک جانا چاہئے لیکن وہ سست نہیں پڑتے کیونکہ ان کو عبادت میں لذت حاصل ہوتی ہے اس لئے ہر وقت عبادت میں ڈوبے رہتے ہیں، ترک عبادت کو اپنی ہلاکت جانتے ہیں۔

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿٢٠﴾ رات دن اللہ کی پاکی بیان کرتے (اور تعظیم الٰہی کا اظہار کرتے) ہیں سست نہیں پڑتے۔ کعب احبار نے کہا ملائکہ کے لئے تسبیح خداوندی ایسی ہے جیسے آدمی کے لئے سانس (سانس لینا باعث حیات ہے اور سانس لینے سے آدمی کسی وقت نہیں تھکتا فرشتوں کے لئے تسبیح باعث حیات ہے وہ پاکی بیان کرنے سے نہیں تھکتے۔

لَا يَفْتُرُوْنَ کمزور نہیں پڑتے، نہیں اکتاتے۔ وہ عبادت جس میں اہل قربت ہر وقت غرق رہتے ہیں اس سے مراد ذکر خفی اور ہر وقت اللہ کی طرف توجہ ہے۔ جس طرح بری حیوان کے لئے ہوا میں سانس لینا اور بحری جانور کے لئے پانی میں سانس لینا ہر وقت ضروری ہے اور یہی بقاءِ حیات کا سبب ہے اسی طرح اہل قربت کے لئے خواہ ملائکہ ہوں یا انسان ہر دم اللہ کی طرف توجہ رکھنا لازم ہے (یہی ان کی زندگی ہے)۔

ذکر خداوندی کے استغراق کی حالت میں بندہ جو کچھ کرتا ہے حقیقت میں وہ اللہ کا فعل ہوتا ہے۔ ایسا شخص اللہ کی طاعت و عبادت کی قوت حاصل کرنے کے لئے کھاتا پیتا اور سوتا ہے۔ نکاح کرتا ہے تو اس کا مقصد ہوتا ہے سنت رسول اللہ ﷺ کا اتباع۔ امت اسلامیہ کی تعداد میں اضافہ اور حضور ﷺ کے اس فرمان کی تکمیل کہ نکاح کرو، تمہاری کثرت کے سبب میں دوسری امتوں پر قیامت کے دن فخر کروں گا۔ چونکہ ہر دم استغراق رکھنے والا شخص کسی وقت یاد سے غافل نہیں ہوتا اس لئے اکثر اس سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا اگر بتقدیر الٰہی کوئی گناہ ہو بھی جاتا ہے تو اس کو فوراً پشیمانی ہو جاتی ہے اور وہ توبہ کر لیتا ہے اس طرح اللہ اس کی خطاؤں کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے۔ یہی بنیاد ہے اس قول کی کہ عالم کی نیند بھی عبادت ہے ایسے ہی لوگوں کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تھکتے نہیں رات دن اللہ کی یاد میں سرگرم رہتے ہیں سست نہیں پڑتے۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ کیا (باوجود ان دلائل توحید کے) ان لوگوں نے خدا کے سوا اور معبود بنا رکھے (بالخصوص) زمین کی چیزوں میں سے)

اَمْ منقطعہ ہے جو بَلْ (بلکہ) مع ہمزہ استفہام کے معنی میں ہوتا ہے اور بَلْ کلام سابق سے اعراض کے لئے آتا ہے

(مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام سابق کا مضمون نہیں ہے بلکہ یہ بات ہے جو آئندہ بیان کی گئی ہے) اور ہمزۂ انکار توبیخ کے لئے ہے۔
آیات سابقہ کی ترتیب اس طرح ہے اَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ پھر فرمایا بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ۔ اول مشورہ کر کے کہنے لگے یہ تو بس تم جیسا آدمی ہے (اور اسی کہنے پر اکتفا نہیں کیا) بلکہ کہنے لگے یہ پراگندہ خواب ہیں بلکہ (اس سے بھی آگے بڑھ کر کہنے لگے) اس نے از خود بنا کر اور اپنے دماغ سے تراش کر خدا کی طرف نسبت کر دی ہے (پھر کہنے لگے نہیں یہ بھی نہیں ہے) بلکہ یہ شاعر ہے۔ اس تمام کلام کا حاصل یہ ہے کہ نبوت کے متعلق (تاویلیں کرنے میں) حد سے آگے بڑھ گئے اور فقط نبوت و قرآن کے معاملہ میں انہوں نے حق سے تجاوز نہیں کیا بلکہ (اللہ کے ساتھ) انہوں نے دوسروں کو معبود بھی بنالیا ہے اور معبود بھی وہ جو زمین کی پیداوار ہیں، زمین کی چیزوں سے بنائے گئے ہیں۔ پتھر، سونا، چاندی (پیتل) وغیرہ، ان معبودوں کا مادہ صنعت ہے۔ مِّنَ الْاَرْضِ کہنے سے تخصیص مقصود نہیں (کیونکہ ان کے معبود ستارے اور جن وغیرہ بھی تھے) بلکہ معبودوں کی تحقیر مقصود ہے (کہ ان کے معبود ایسے حقیر و ذلیل ہیں جو موجودات ارضی سے بنائے گئے ہیں۔

هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وہ معبود مردوں کو زندہ کر کے اٹھائیں گے۔ اس فقرے میں مشرکوں کی انتہائی جہالت کا اظہار، استہزائیہ طرز کے ساتھ ہے۔ مستحق عبادت صرف وہی ہو سکتا ہے جو زندہ کرنے، مارنے اور کامل نعمتیں عطا کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور جب مشرک بتوں کو بھی معبود قرار دیتے ہیں تو گویا اس بات کے مدعی ہیں کہ بت بھی زندہ کرنے۔ مردہ کرنے اور نعمتیں عطا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور یہ دعویٰ واقعیت کے خلاف ہے۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ اگر ان دونوں (زمین یا آسمان) میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے۔
جس طرح لفظ غَیْر استثنائیہ بھی آجاتا ہے اسی طرح اِلَّا کبھی بصورت صفت بمعنی غَیْر کے بھی مستعمل ہے۔ آیت مذکورہ میں استثنائی معنی درست نہیں، استثناء کے لئے ضروری ہے کہ اِلَّا کا مابعد (مستثنیٰ) اِلَّا کے ماقبل (مستثنیٰ منہ) میں استثناء سے قبل داخل ہو اور پھر کلمۂ استثناء کے ذریعہ سے الگ کر لیا جائے اور یہاں اَللّٰہ (مستثنیٰ) اٰلِهَةٌ (مستثنیٰ منہ) میں داخل ہی نہ تھا، پھر استثناء متصل و منفصل کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔
لَفَسَدَتَا سے مراد یہ ہے کہ شروع سے ہی بگاڑ ہو جاتا اور دونوں پیدا ہی نہ ہوتے کیونکہ چند الٰہوں کا اگر مقصد میں اتفاق ہوتا تو سب کی باہمی قدرت میں ٹکراؤ ہونا یقینی ہوتا اور اگر ان کے مقصد و مراد میں اختلاف ہوتا تب تو وجود کائنات میں رکاوٹ پڑ جانا لازم ہی تھی۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾ سو (اس تقریر سے ثابت ہوا کہ) مالک عرش خدا ان امور سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کر رہے ہیں۔
سُبْحٰنَ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے یعنی میں اللہ کی کامل پاکی بیان کرتا ہوں جو عرش کا رب (حاکم و مالک) ہے۔ عرش تمام اجسام کو محیط ہے۔ انتظامات عالم کا مرکز اور تمام مقادیر کا سرچشمہ ہے۔ اس عالم میں عرش کی حالت ایسی ہے جیسے انسانی جسم میں دماغ کی، عَمَّا يَصِفُوْنَ یعنی مشرک جو اللہ کی بیوی بچے اور شرکاء ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، میں ان کے اس بیان سے اللہ کے کامل طور پر پاک ہونے کا اقرار کرتا ہوں۔

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اس سے اس کے فعل کی باز پرس نہیں کی جائے گی اور ان سے (یعنی آسمانوں و زمین والوں سے ان کے اعمال کی) باز پرس کی جائے گی، یعنی اللہ کی عظمت، اقتدار کی قوت، الوہیت میں یکتائی اور ذاتی حکومت کی وجہ سے اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ باز پرس نہ کی جاسکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا ہر فعل اپنی ملکیت میں تصرف ہے وہ ہر چیز کا مالک ہے اور مالک اپنی ملکیت میں جیسا چاہے تصرف کر سکتا ہے اس پر کوئی

اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور مخلوق کا تصرف اپنی ملک میں تصرف نہیں، مخلوق کسی چیز کی حقیقی مالک ہی نہیں ہے بلکہ اللہ کی ملک میں تصرف ہے اور اللہ کی ملک میں تصرف اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، لہٰذا اللہ کی ملک میں تصرف کرنے والوں سے باز پرس کی جائے گی۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ یہ پورا کلام سابق مضمون کی علت ہے کیونکہ جو مسئول ہو گا وہ اس ذات کا شریک کیسے ہو سکتا ہے جو غیر مسئول ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةًؕ کیا خدا کو چھوڑ کر انہوں نے اور معبود بنا رکھے ہیں۔ اس جملہ کو دوسری مرتبہ ذکر کرنے سے مقصود ہے کفر کی برائی کی عظمت کا بیان اور کافروں کی جہالت کا مزید اظہار۔ تکرار کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ پہلی مرتبہ ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ کافروں کے پاس باطل معبودوں کو الٰہ قرار دینے کی کوئی عقلی دلیل نہیں، کیا وہ مردوں کو زندہ کر دیں گے اور دوبارہ زندہ کر کے قبروں سے اٹھا دیں گے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان کی الوہیت کا عقلاً کوئی استحقاق نہیں۔ پھر دوبارہ اسی جملہ کو ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ گزشتہ آسمانی کتابوں میں بھی اس کو اللہ کا شریک قرار دینے کی اجازت نہیں، اس لئے شرک کی کوئی نقلی دلیل بھی ہے۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْۚ آپ ان سے کہئے کہ (اس دعویٰ پر) تم اپنی دلیل پیش کرو۔ یعنی شرک کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرو، بے دلیل بات صحیح نہیں، تمام عقلی و نقلی دلیلیں شرک کے خلاف موجود ہیں۔

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْؕ یہ میرے ساتھ والوں کی کتاب اور مجھ سے پہلے لوگوں کی کتابیں موجود ہیں۔ یعنی یہ قرآن اور توریت و انجیل جو تمہارے سامنے موجود ہے یہ قیامت تک میری امت کے لئے بھی نصیحت نامہ ہے اور گزشتہ امتوں کے لئے بھی، یہی یادداشت اور درس نصیحت تھا (مراد یہ ہے کہ تینوں کتابیں درس توحید پر متفق ہیں کسی میں بھی شرک کی اجازت نہیں۔ پس یہی پیام توحید میری امت کے لئے بھی ہے اور سابق امتوں کے لئے بھی یہی درس نصیحت تھا)

عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ سے قرآن مراد ہے اور ذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ سے توریت و انجیل، مطلب یہ ہے کہ قرآن ہو یا توریت یا انجیل یا کوئی اور آسمانی صحیفہ سب کو پڑھو اور بتاؤ کہ کسی کتاب میں بھی کسی جگہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے کسی کو اپنا شریک یا بیٹا بنایا ہے یا اپنے سوا کسی اور کی عبادت کا حکم دیا ہے۔

ایک شبہ

مکہ کے مشرک تو نہ قرآن کو مانتے تھے نہ توریت و انجیل کو اگر ان کتابوں میں شرک کی اجازت نہ تھی تو مشرکین مکہ پر اس فیصلہ کا ماننا ان کی نظر میں کب ضروری تھا پھر کتب سماویہ میں شرک کی اجازت نہ ہونے کو ابطال شرک کی دلیل کیسے قرار دیا جا سکتا تھا۔

ازالہ

مشرکین مکہ عناداً ان کتابوں کو نہیں مانتے تھے ورنہ ان کی صداقت و حقانیت تو واضح تھی خصوصاً قرآن کا اعجاز اور بلاغت اعلیٰ تو اس کی صداقت اور منزل من اللہ ہونے کی کھلی دلیل تھی ایسی حالت میں کافروں کا انکار قابل التفات ہی نہیں تھا گویا اہل انصاف کی نظر میں ان کتابوں کی سچائی مسلمہ تھی (اور مسلمات یقینیہ پر جس قیاس کی بناء ہوتی ہے وہ قیاس برہانی یقینی ہوتا ہے پس کتب سماویہ میں شرک کی اجازت نہ ہونے سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک باطل ہے اور توحید ہی حق ہے)

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۴) بلکہ ان میں زیادہ وہی ہیں جو امر حق کا یقین نہیں رکھتے سو (اس وجہ سے) اعراض کر رہے ہیں۔ یعنی صداقت کے واضح ہونے کے باوجود یہ لوگ حق کو نہیں جانتے اور حق و باطل میں امتیاز نہیں کرتے، اس لئے توحید خداوندی اور اتباع رسول سے گریز کرتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں۔ پس میری ہی عبادت کرو۔ اس کلام میں تخصیص کے بعد تعمیم ہے یعنی توحید کا حکم صرف اس قرآن، توریت اور انجیل میں ہی نہیں ہے بلکہ جو پیغمبر بھی ہم نے بھیجا اس کو یہی پیغام دیا کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم سب میری ہی خالص عبادت کرو۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ اور یہ (مشرک) یوں کہتے ہیں کہ اللہ نے فرشتوں کو اولاد بنا رکھا ہے اللہ اس سے پاک ہے بلکہ وہ فرشتے اس کے بندے ہیں معزز۔

اس کلام کا عطف اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ کے مضمون پر ہے یعنی کیا انہوں نے اللہ کے شریک بنا رکھے ہیں اور کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اپنے لئے اولاد اختیار کی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول بنی خزاعہ کے حق میں ہوا، جو کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، بَلْ عِبَادٌ بلکہ بندے ہیں یعنی فرشتے اللہ کی بیٹیاں نہیں ہیں، خدا ان کا باپ نہیں، خالق ہے۔

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے اور اسی کے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کی اجازت و اذن کے بغیر کوئی بات نہیں کہتے اور اللہ جو حکم ان کو دیتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ خلاف حکم کچھ نہیں کرتے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ اللہ ان کے اگلے پچھلے احوال کو جانتا ہے یہ گویا کلام سابق کی علت ہے، مطلب یہ کہ اللہ سے فرشتوں کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں، نہ گزشتہ عمل، نہ موجودہ عمل، نہ ہونے والا۔ اور چونکہ اللہ ان کے تمام احوال سے واقف ہے اس لئے وہ بھی اپنے احوال کی نگہداشت کرتے اور اعمال کا انضباط رکھتے ہیں۔

وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ اور بجز اس کے جس کے لئے شفاعت کرنے کی خدا تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے اور وہ سب اللہ کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں۔

یعنی ہیبت الٰہیہ کی وجہ سے ان کا یہ حال ہے کہ فقط انہی لوگوں کی شفاعت کرتے ہیں جن کے حق میں شفاعت کو اللہ پسند فرماتا ہے اور (یہ شفاعت بھی) ڈرتے ڈرتے کرتے ہیں، عظمت الٰہیہ کا خوف ان پر چھایا رہتا ہے۔ تعظیم آمیز خوف کو خشیت کہا جاتا ہے اس لئے خشیت کو علماء کے لئے مخصوص فرمادیا ہے۔ اِشْفَاقٌ کا معنی ہے ڈرنا، خوف کھانا، اگر اس کے بعد لفظ مِنْ آتا ہے تو کسی سے خوف کرنا اور ڈرنا مراد ہوتا ہے اور اگر اس کے بعد عَلٰی آتا ہے تو کسی کو نقصان پہنچنے اور دکھ پانے سے ڈرنا اور اس پر رحم کھانا مراد ہوتا ہے۔

ع ۲ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور (بالفرض اگر) ان میں سے کوئی کہے کہ میں اللہ کے سوا معبود ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے۔ ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ یعنی کوئی فرشتہ یا کوئی مخلوق الٰہ ہونے کا مدعی بالفرض ہو جائے تو اس کی سزا جہنم ہے اس آیت کا مقصد غیر اللہ کی ربوبیت کی نفی اور اس بات کی تکذیب ہے کہ فرشتے مدعی الوہیت ہیں۔ اور مدعی الوہیت کی سزا کا اظہار کر کے مشرکوں کو عذاب کی تہدید ہے۔ اس آیت کا مضمون (تقریبا) ویسا ہی ہے جیسا آیت لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا کا ہے۔ قتادہ نے کہا مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ سے مراد ابلیس ہے، جو حقیقتاً یا حکماً ملائکہ میں سے تھا فرشتوں کے ساتھ اس کو شامل کر دیا گیا، ابلیس نے غرور کیا اور اپنی عبادت کی لوگوں کو دعوت دی۔ دوسرا فرشتہ اس کا قائل نہیں ہو سکتا۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے (گویا قتادہ کے نزدیک آیت میں ایک واقعہ کا اور اس کی سزا کا اظہار کیا گیا ہے محض فرض پر کلام کی بناء نہیں ہے)

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ

کیا ان کافروں کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ آسمان وزمین (پہلے) بند تھے، پھر ہم نے دونوں کو اپنی قدرت سے کھول دیا۔

اَلسَّمٰوٰتِ یعنی آسمانوں کا مجموعہ، اَلْاَرْضَ زمینوں کا مجموعہ، رَتْقًا، حضرت ابن عباس ضحاک، عطاء اور قتادہ نے کہا آسمان وزمین سب باہم چسپاں اور ایک ہی تھے۔ فَفَتَقْنٰهُمَا پھر ہوا داخل کر کے ہم نے دونوں کو الگ الگ کر دیا۔ رَتْقٌ کا لغوی معنی ہے بند کرنا، ملا دینا اور فَتْقٌ کا معنی ہے پھاڑ دینا، کھول دینا۔ کعب نے کہا اللہ نے آسمان وزمین کو اوپر نیچے (تہ بر تہ) بنایا تھا پھر ہوا پیدا کر کے اس کو دونوں کے بیچ میں داخل کر کے دونوں کو کھول دیا۔ (یعنی الگ الگ کر دیا) مجاہد اور سدی نے کہا آسمان وزمین چسپاں ایک طبقہ ہی تھے پھر اللہ نے ایک آسمان کے سات کر دیئے اور اسی طرح ایک زمین تھی اس کے سات (طبقے) بنا دیئے۔

عکرمہ اور عطیہ نے کہا آسمان بند (بلا سوراخ) تھا اس سے بارش نہیں ہوتی تھی اور زمین بھی بند (بلا سوراخ) تھی اس سے کوئی سبزہ نہیں اُگتا تھا، پھر اللہ نے بارش کے ذریعہ سے آسمان میں شگاف (یعنی سوراخ) اور سبزہ اُگا کر زمین میں سوراخ بنا دیئے اس مطلب پر اَلسَّمٰوٰتِ (بصیغۂ جمع) سے مراد ہوگا آسمان دنیا اور چونکہ اس کے اجزاء بہت ہیں اس لئے سَمٰوٰت کے لفظ کا اس پر اطلاق کیا (گویا سماء کے مختلف بلند اجزاء کو سَمٰوٰت کہا گیا) یا سَمٰوٰات سے متعدد آسمان ہی مراد ہیں اور سب آسمانوں کو بارش برسانے میں دخل ہے (اس لئے تمام آسمانوں کو رَتْقٌ فرمایا پھر ان سب کے اندر اللہ نے سوراخ کر دیئے) حضرت مفسرؒ نے فرمایا یہی قول زیادہ ظاہر ہے کیونکہ تمام اہل عقل مؤمن ہوں یا کافر جانتے ہیں کہ پہلے بارش نہیں تھی پھر ہو گئی اور پہلے سبزہ نہ تھا پھر زمین سے اُگنے لگا۔ بارش ہونا اور سبزہ پیدا ہونا ایک امر حادث ہے (جو پہلے نہ تھا پھر ہو گیا) اور ہر حادث کے لئے پیدا کرنے والے کی ضرورت ہے، کوئی حادث بغیر واجب الوجود محدث کے نہیں ہو سکتا۔

رہا پہلا مطلب کہ آسمان وزمین باہم چسپاں تھے پھر اللہ نے ان کو ہوا کے ذریعہ سے الگ الگ کر دیا تو عام کافروں کے لئے یہ (علمی مسئلہ) ظاہر نہیں لیکن وہ علماء سے دریافت کر سکتے ہیں، آسمانی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں، اس طرح ان کو بھی علم ہو سکتا ہے۔ آئندہ آیت عکرمہ اور عطیہ کے قول کی تائید کر رہی ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ــــــــــــ اور ہم نے (بارش کے) پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے۔ اس کا عطف فَفَتَقْنٰهُمَا پر ہے یعنی ہم نے آسمان میں سوراخ کر دیئے اور اس سے بارش نازل کی اور زمین میں سوراخ کر دیئے اور اس سے سبزہ اگا دیا اور ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ اس مطلب پر رابطہ محذوف ہے۔ مطلب اس طرح ہوگا ہم نے ہر زندہ چیز کو جو آسمان و زمین کے درمیان ہے پانی سے پیدا کیا۔

جَعَلْنَا ہم نے پیدا کیا (جَعْل بسیط جو صرف ایک مفعول چاہتا ہے) اس وقت مِنَ الْمَآءِ کا تعلق جَعَلْنَا سے ہوگا اور كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ مفعول ہوگا۔ جَعَلْنَا کا دوسرا ترجمہ ہم نے کر دیا پانی سے مخلوق ہر چیز کو (جعل مرکب جو دو مفعول چاہتا ہے) اس صورت میں كُلَّ شَيْءٍ مفعول اول ہوگا اور مِنَ الْمَآءِ کا تعلق كَائِنًا یا مَخْلُوْقًا محذوف سے ہوگا یعنی ہم نے پانی سے مخلوق کر دیا ہر چیز کو۔

ایک شبہ

گھاس کی پیدائش تو فی الجملہ پانی سے ہے۔ گھاس بھی کچھ نہ کچھ زندگی رکھتی ہے اس لئے گھاس کا پانی سے پیدا ہونا تو ٹھیک ہے۔ بعض حشرات الارض کا مادۂ تخلیق بھی رطوبت ہی ہے اس لئے ان کی تخلیق کو پانی سے قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن انسان اور اکثر حیوانات کا مادۂ تخلیق تو نطفہ ہے ان کو پانی کی پیداوار کہنا کس طرح درست ہے۔

جواب

کلام مجازی ہے ہر حیوان کو اپنی بقاء کے لئے پانی کی ضرورت اتنی زیادہ ہے کہ گویا ہر حیوان پانی ہی سے پیدا کیا گیا ہے، جیسے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ آدمی طبعاً اتنا عجلت پسند واقع ہوا ہے اور ہر چیز کے نتیجے کو اتنی جلد طلب کرتا ہے کہ گویا اس کی

تخلیق ہی عجلت کے مادے سے ہوئی ہے یا لفظ بقا محذوف ہے۔ یعنی ہم نے ہر زندہ چیز کی بقاء پانی سے کی ہے یا یوں کہا جائے کہ پانی سے رطوبت مراد ہے۔ نطفہ سے اکثر حیوانات کی تخلیق ہوتی ہے اور نطفہ مرطوب ہوتا ہے۔ اَلْمَآء کے اندر نطفہ داخل ہے۔ ابو العالیہ نے کہا اکثر مفسرین نے آیت کا تفسیری مطلب یہ بیان کیا کہ ہر زندہ چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز کو پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں پانی سے مراد نطفہ، جیسے دوسری آیت میں اللہ نے فرمایا ہے، وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ اور اللہ نے ہر چوپایہ کو پانی سے پیدا کیا ہے، اس مطلب پر حدیث میں جو لفظ شَیْءٍ آیا ہے اس سے مراد حیوان ہے اور (چونکہ بعض حیوانات کی تخلیق پانی سے نہیں ہوئی جیسے آگ کے اندر پیدا ہونے والا کیڑا جس کو سمندر کہا جاتا ہے۔ مترجم) لفظ کُلّ سے اکثر مراد ہے جیسے حدیث مبارک میں كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ یعنی تم سے اکثر لوگ نگرانی کے ذمہ دار ہیں۔

اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ کیا (ان باتوں کو سن کر) پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔ استفہام انکاری ہے اور ف تعقیب کے لئے یعنی صانع قدیم کی توحید ذاتی و صفاتی کی اتنی واضح اور عظیم الشان دلائل دیکھنے کے بعد بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۖ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ اور ہم نے زمین میں اس لئے پہاڑ بنائے کہ زمین ان لوگوں کو لے کر ہلنے نہ لگے اور ہم نے اس زمین میں کشادہ کشادہ راستے بنائے تاکہ وہ لوگ (ان کے ذریعہ سے) منزل مقصود کو پہنچ جائیں۔

رَوَاسِيَ۔ جِبَالًا محذوف کی صفت ہے، جمے ہوئے پہاڑ، گڑے ہوئے پہاڑ۔ یہ لفظ رَسَا سے ماخوذ ہے رَسَا کا معنی ہے ثبت۔

اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ لفظ کَرَاهَةَ یا حرف نفی (لا) اس سے پہلے محذوف ہے۔ تاکہ زمین اپنے باشندوں کو لے کر نہ لرزے۔

وَجَعَلْنَا فِيْهَا، یعنی زمین میں یا پہاڑوں میں فِجَاجًا دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ راستے (قاموس) سُبُلًا کھلے ہوئے راستے۔ یہ سَبِيْل کی جمع ہے (قاموس) فِجَاج میں وسعت کا مفہوم ہے، سُبُلًا سے پہلے اس کو ذکر کرنا جتا رہا ہے کہ آغاز تخلیق میں پہاڑی راستے کشادہ تھے، لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ تاکہ وہ اپنے مقاصد و مصالح کا راستہ پالیں، راہ چل کر اپنے مقصد کو حاصل کر لیں۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ اور ہم نے آسمان کو مثل ایک چھت (کے) بنایا جو محفوظ ہے اور وہ لوگ اس کے اندر کی نشانیوں سے اعراض کئے ہوئے ہیں۔ (غور نہیں کرتے) یعنی ہم نے آسمان کو گرنے سے محفوظ بنایا محض اپنی قدرت سے بغیر ستونوں کے سہارے کے۔ یا قیامت تک ٹوٹنے، پھوٹنے، تباہ و برباد ہونے اور بگڑنے سے محفوظ کر دیا یا اس بات سے محفوظ کر دیا کہ کوئی شیطان اوپر چڑھ کر چوری چھپے کوئی خبر سن نہ پائے۔ عَنْ اٰيٰتِهَا یعنی چاند، سورج ستارے اور ان کے مختلف احوال جو صانع کے وجود، وحدت، کمال قدرت اور وسعت حکمت پر دلالت کر رہے ہیں ان کی طرف سے وہ لوگ رو گرداں ہیں غور نہیں کرتے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ اور وہ ایسا ہے کہ اس نے رات و دن اور سورج اور چاند بنائے ہر ایک، ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔

یہ بعض آیات ربوبیت والوہیت کا بیان ہے، كُلٌّ یعنی ہر ایک فِيْ فَلَكٍ، یعنی مدار نجوم۔ جو سب ستاروں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے (قاموس) فَلَكٌ کی جمع اَفْلَاك آتی ہے۔ عربی زبان میں ہر گول گھیرے کو فَلَک کہتے ہیں۔ تکلے کے دمرکہ کو بھی اسی مناسبت سے فَلَک کہا جاتا ہے۔ حسن نے کہا فَلَک تکلے کے دمرکہ کی شکل کی ایک چکی ہے، مراد یہ ہے کہ چکی کے گول چکر کی طرح ستارے دائرہ میں چلتے ہیں یعنی ستاروں کی رفتار متدیر ہے۔ قتادہ نے کہا فَلَک سے مراد آسمان ہے جس کے اندر ستارے موجود ہیں اور ہر ستارہ اسی آسمان میں چلتا ہے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ کلبی نے کہا فَلَک آسمان کی گولائی

کو کہتے ہیں کچھ لوگوں نے کہا آسمان کے نیچے موج بستہ کا نام فَلَکٌ ہے جس میں چاند، سورج اور ستارے چلتے ہیں۔

(حضرت مفسر نے کہا)، میں کہتا ہوں فَلَک آسمان ہی ہے۔ آسمان دنیا ہی پر سب ستارے چلتے ہیں اور فَلَک کی تنوین بتا رہی ہے کہ ہر ستارہ ایک دائرہ میں چل رہا ہے تمام ستاروں کے مدار مختلف متعدد گھیروں پر ہیں باوجود مدار کے تعدد فَلَک کو بصیغۂ واحد ذکر کرنا عربی محاورے کے مطابق ہے۔ عرب بولتے ہیں امیر نے ان سب کو خلعت پہنایا (یعنی ہر ایک کو ایک ایک خلعت پہنایا)

یَسْبَحُوْنَ تیرتے ہیں یعنی تیز چلتے ہیں جیسے پانی میں تیرنے والے کی (ہموار) رفتار ہوتی ہے یَسْبَحُوْنَ کی ضمیر جمع شمس وقمر کی طرف راجع ہے۔ شمس وقمر کے مطالع متعدد اور کثیر ہوتے ہیں اس لئے جمع کی ضمیر راجع کرنا درست ہے۔

ابن المنذر نے ابوجریج کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو اللہ کی طرف سے آپ کی وفات کی اطلاع دی گئی تو حضور ﷺ نے عرض کیا اے میرے رب (میرے بعد) میری امت کا کون نگران ہوگا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿٣٤﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۗ

اور ہم نے آپ ﷺ سے پہلے بھی کسی بشر کے لئے ہمیشہ زندہ رہنا تجویز نہیں کیا پھر اگر آپ کا انتقال ہو جائے تو کیا یہ لوگ (دنیا میں) ہمیشہ رہیں گے ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا۔

خلد دنیا میں ہمیشہ رہنا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول اس وقت ہوا جب کافروں نے کہا تھا ہم تو اس وقت کے منتظر ہیں جب محمد پر موت کا چکر پڑے (اور وہ مر جائیں) مطلب یہ ہے کہ آپ ہمیشہ رہنے والے نہیں یہ بات طے شدہ ہے پھر آپ کے بعد کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ (ایسا ہرگز نہ ہوگا) ہر شخص موت کا مزہ چکھنے والا ہے، بدن سے روح کے جدا ہونے کی تلخی سب کو چکھنی ہے۔

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٣٥﴾ اور ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں پھر اس زندگی کے بعد تم سب ہمارے پاس چلے آؤ گے۔

نَبْلُوْكُمْ یعنی ہم تمہارے ساتھ ویسا عمل کریں گے جیسا امتحان لینے والا کرتا ہے (اللہ کو سب کچھ معلوم ہے اس لئے اصل کیفیت دریافت کرنے اور واقف ہونے کے لئے وہ ہماری جانچ نہیں کرتا، پس بَلا، یعنی امتحان کی نسبت اس کی طرف حقیقی بلکہ محض مجازی اور ظاہری ہے، وہ بندوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے جیسا ممتحن ان لوگوں کے ساتھ کرتا ہے۔ جن کا وہ امتحان لیتا ہے)

بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ یعنی برائی، بھلائی، سختی، نرمی، صحت، بیماری، دولت، افلاس اور ہر ناگوار و گوارا چیز سے ہم تمہاری جانچ کرتے ہیں تاکہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ تم مرغوب ومحبوب مقصد کو حاصل کر کے شکر کرتے ہو یا ناشکری۔ اور دکھ پر صبر کرتے ہو یا شکوہ و شکایت اور بے صبری۔

وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ اور ہماری ہی طرف تم کو لوٹا کر لایا جائے گا پس ہم ہی تم کو صبر و بے صبری اور شکر و ناشکری کی جزاو سزا دیں گے۔ اس آیت میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ پیدا کرنے کی اصل غرض جانچ کرنا اور عذاب وثواب دینا ہے۔ اس جملہ میں آیت نَبْلُوْكُمْ کے مضمون کی تائید ہے۔ ابن حاتم نے بروایت سدی بیان کیا کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ، ابوجہل اور ابوسفیان کی طرف سے گزرے حضور کو دیکھ کر ابوجہل ہنسنے لگا اور ابوسفیان سے بولا یہ ہے بنی عبد مناف کا نبی۔ ابوسفیان کو اس بات سے غصہ آگیا اور کہنے لگا بنی عبد مناف میں پیغمبر ہونا تم کو کیوں ناگوار ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ گفتگو سن لی اور پلٹ کر ابوجہل کو ڈرایا اور فرمایا میرا خیال ہے کہ تو اس وقت تک باز نہیں آئے گا جب تجھ پر وہ مصیبت نہ آپڑے جو تیرے چچا پر پڑی تھی اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ

اور کافر لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ کی ہنسی اڑاتے ہیں اور (آپس میں کہتے ہیں) کیا یہی ہے جو تمہارے معبودوں کا برائی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

هُزُوًا مسخرہ یعنی کیا یہ ہی وہ شخص ہے جو تمہارے معبودوں کو برا کہتا اور ان کا ذکر برائی کے ساتھ کرتا ہے (برائی کے ساتھ) لفظ گو مذکور نہیں ہے مگر مراد ہے دشمن کا ذکر کرنا، برائی کے ہی ساتھ ہوتا ہے اور دوست کا ذکر اچھائی کے ساتھ۔ فُلَانٌ يَذْكُرُ فُلَانًا فلاں شخص اس آدمی کی برائی کر رہا تھا فُلَانٌ يَذْكُرُ اللّٰهَ فلاں شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے یعنی اللہ کی اچھی صفات بیان کرتا ہے یہ دونوں محاورے ہیں۔

وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ اور خود یہ لوگ رحمٰن کے ذکر کا انکار کیا کرتے ہیں۔ رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں، یعنی اللہ کی توحید و تعظیم کے منکر ہیں یا اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ نے مخلوق کی ہدایت کے لئے پیغمبروں کو بھیجا اور اپنی کتابیں نازل فرمائیں یا قرآن کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رحمٰن یمامہ یعنی مسیلمہ کے علاوہ ہم اور کسی رحمٰن کو نہیں جانتے، پس ایسے لوگ اس امر کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان سے استہزاء کی جائے اور ان کو مسخرہ بنایا جائے۔

هُمْ کا تکرار تاکید اور تخصیص کے لئے ہے یا اس لئے ہے کہ اول هُمْ (مبتدا) اور كٰفِرُوْنَ (خبر) کے درمیان بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ کے لفظ سے فصل ہو گیا ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ انسان جلدی ہی کے خمیر کا بنا ہوا ہے۔ یعنی عجلت پسندی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ انسان اتنا عجلت پسند اور بے صبرا واقع ہوا ہے کہ گویا اس کے خمیر میں عجلت (داخل) ہے اگر کسی شخص سے کسی بات کا صدور کثرت سے ہوتا ہے تو محاورے میں کہا جاتا ہے اس کی تو سرشت میں یہ بات داخل ہے۔

فُلَانٌ خُلِقَ مِنْ غَضَبٍ۔ خُلِقَ فُلَانٌ مِنَ الْكَرَمِ فلاں شخص کا خمیر ہی غصہ کا ہے۔ فلاں شخص کی سرشت ہی سخاوت سے ہوئی ہے، ایسا کلام بطور مبالغہ کے کہا جاتا ہے اور مجازی معنی پر محمول ہوتا ہے۔ سعید بن جبیر اور سدی نے بیان کیا کہ جب حضرت آدم کے سر اور آنکھوں میں روح داخل ہو گئی تو جنت کے پھلوں پر فوراً نظر پڑی اس کے بعد روح پیٹ کے اندر پہنچی تو آپ کو کھانے کی اشتہا پیدا ہو گئی اور فوراً ٹانگوں تک روح پہنچنے سے پہلے ہی جنت کے پھل لینے کے لئے اٹھنے لگے، لیکن اٹھ نہ سکے اور گر پڑے، اسی لئے کہا گیا ہے، خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ اس آیت میں اَلْاِنْسَانُ سے مراد حضرت آدم ہیں آپ ہی کی عجلت پسندی آپ کی اولاد میں بطور توارث منتقل ہو کر آئی ہے۔ آدمی کی یہ عجلت پسندی ہی ہے کہ کفر کی طرف پیش قدمی کرتا ہے اور عذاب کی اس کو وعید سنائی جاتی ہے تو فوراً نزول عذاب کا طلب گار ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں صوفیہ صافیہ کے قول کے مطابق تمام عالم اللہ کے اسماء و صفات کا پرتو اور سایہ ہے اور یہ صفات الٰہیہ تعینات خلائق کے مبادی ہیں اور اللہ کی صفات متضاد ہیں (وہ رَحِيْمٌ بھی ہے اور قَهَّارٌ بھی) پس جس طرح صَبُوْرٌ اس کا وصفی نام ہے اسی طرح وہ سَرِيْعُ الْحِسَابِ بھی ہے عجلت پسندی بھی اس کی ایک صفت ہے اور انسان کے اندر صفت عجلت پسندی کا کی مبداء ہے اسی بناپر کہا گیا ہے کہ انسان کی سرشت اور تخلیق میں عجلت داخل ہے۔

ایک شبہ

جب عجلت پسندی اللہ کی صفت ہے تو یقیناً یہ صفت اچھی ہی ہو گی لیکن رفتار آیت بتا رہی ہے کہ عجلت پسندی مذموم صفت ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جب استعجال انسان کی فطرت میں داخل ہے تو اس کی ممانعت کیوں کی گئی، سرشتی چیز ناقابل تبدیل ہوتی ہے اس کو ترک کرنا انسان کے بس میں ہی نہیں ہے۔

ازالہ

نفس استعجال بری چیز نہیں ہے ہاں اس میں حد سے تجاوز کرنا یا بے موقع اس کا استعمال برا ہے، دیکھو اللہ نے انبیاء کی تعریف میں فرمایا ہے وہ نیکیوں کی طرف تیزی سے بڑھتے ہیں، پس استعجال کا افراط یا بے محل استعمال مذموم ہے اور اس کو ترک

کرنا ناممکن نہیں ہے۔
بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ حضرت آدم کو اللہ نے تھوڑے وقت میں پیدا کیا تھا۔ آدم کی تخلیق میں عجلت سے کام لیا تھا، آپ کو جمعہ کے روز دن کے آخری حصے میں پیدا کیا گیا اور غروب آفتاب سے پہلے پہلے آپ کی تخلیق مکمل ہو گئی۔ دوسری مخلوق آپ سے پہلے دن کے آخری حصہ تک پیدا کی جا چکی تھی۔ حضرت آدمؑ کے سر میں جب روح داخل ہو گئی تو آپ نے عرض کیا الٰہی غروب آفتاب سے پہلے میری تخلیق پوری کر دے، یہ قول مجاہد کا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا اللہ نے حضرت آدم کو جلد یعنی یکدم پیدا کر دیا، دوسرے آدمیوں کی تخلیق تدریجی ہے پہلے نطفہ ہوتا ہے، پھر بستہ خون، پھر بوٹی وغیرہ، حضرت آدم کی تخلیق اس طرح نہیں کی گئی۔ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ عَجَل کا معنی ہے گیلی مٹی، کیچڑ۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ عجل بفتح عین وجیم کیچڑ یا سد اور دلدل۔ ایک شاعر کا قول ہے۔

وَالنَّبْعُ فِي الصَّخْرَةِ الصَّمَّاءِ مَنْبَتُهُ وَالنَّخْلُ تَنْبُتُ بَيْنَ مَاءٍ وَبَيْنَ عَجَلِ

درخت نبع کی پیدائش کا مقام ٹھوس پتھروں میں ہوتا ہے اور کھجور کا درخت پانی اور کیچڑ سے پیدا ہوتا ہے۔

سَأُورِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ ﴿۳۷﴾ میں عنقریب (وقت آنے پر) تم کو اپنی آیات (قہر) دکھاؤں گا پس تم مجھ سے جلدی مت مچاؤ۔

نشانیوں سے مراد ہے (عذاب دنیا و آخرت یعنی) بدر کا واقعہ اور عذاب دوزخ۔ فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ کا مطلب یہ ہے کہ آیات کے ظہور کا ایک وقت مقرر ہے، وقت مقرر سے پہلے تم ان کی طلب نہ کرو۔ مقرر وقت پر ان کا وقوع ضرور ہو جائے گا۔ حقیقت میں یہ تردید کافروں کے اس خیال کی ہے کہ عذاب کا وقوع بعید از فہم ہے اور اگر واقعی عذاب آنے والا ہے تو فوراً آجانا چاہئے وہ استہزاءً کہتے تھے کہ اے اللہ محمد جو کچھ کہہ رہے ہیں اگر یہ حق ہے، تیری طرف سے ہے (اور ہم اس کے منکر ہیں) تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول نضر بن حارث کے حق میں ہو لہٰذ کورہ بالا قول اسی کا تھا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۸﴾ اور وہ (کافر) کہتے ہیں کہ یہ (عذاب اور قیامت کی) وعید کب آئے گی اگر تم (اس وعید میں) سچے ہو (تو بیان کرو کہ کب اس کا وقوع ہوگا)

کُنْتُمْ کے مخاطب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ ہیں۔ اور کلام سابق چونکہ مفہوم جزا پر دلالت کر رہا ہے اس لئے اِنْ کُنْتُمْ کی جزا کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَن وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَن ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۳۹﴾

اگر کافر جان لیتے تو اس وقت (کے سماں) کو جب کہ وہ آگ کو نہ اپنے چہروں کی طرف سے روک سکیں گے نہ پشت کی جانب سے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ شرط کا جواب محذوف ہے یعنی اگر کافر جان لیں اس وقت کو جب کہ ہر طرف سے ان کو آگ اپنے گھیرے میں لے لے گی اور اس کو وہ نہ خود دفع کر سکیں گے نہ کوئی اور ایسا مددگار ملے گا جو عذاب کو دفع کر سکے تو اپنے کفر پر قائم نہیں رہیں گے یا عذاب آنے کی جلدی نہیں مچائیں گے یا ایسی بات نہیں کہیں گے۔

بَلْ تَأْتِيهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۴۰﴾ بلکہ وہ ساعت ان پر اچانک آپڑے گی اور ان کو حیران بنا دے گی پھر نہ وہ اس کو لوٹا سکیں گے اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

تَأْتِيهِمْ کی فاعلی ضمیر نار کی طرف راجع ہے یا وَعْد کی طرف یا حِيْنَ کی طرف۔ معنوی اعتبار سے وَعْدہ بمعنی مدت مقررہ اور حِيْن بمعنی ساعت ہے، اس لئے مونث کی ضمیر ان کی طرف لوٹ سکتی ہے۔

بَغْتَةً اچانک ناگہاں، وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ یعنی جس طرح دنیا میں مہلت دی گئی ہے اس وقت مہلت نہیں دی جائے گی۔

لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اور لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ میں هُمْ کو فعل سے پہلے ذکر کرنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ صرف کافروں کا

کوئی مددگار نہ ہوگا اور صرف انہیں کو مہلت نہیں دی جائے گی۔ گناہ گار مومنوں کی یہ حالت نہیں ہوگی انبیاء، اولیاء، صلحاء اور ملائکہ کی سفارشی مدد ان کو حاصل ہو سکے گی اور ان کو مہلت بھی دی جائے گی اور مغفرت کر دی جائے گی۔

۳ ع ۲

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

اور آپ سے پہلے جو پیغمبر گزرے ان سے بھی استہزاء (تمسخراپن) کیا جا چکا ہے آخروہی (عذاب) ان پر نازل ہو گیا جس کا وہ مذاق بناتے تھے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے پیام تسکین ہے اور استہزاء کرنے والوں کے لئے عذاب کی وعید۔

فَحَاقَ، یعنی جس چیز کا وہ استہزاء کرتے تھے اسی کی سزا اور عذاب ان پر نازل ہوا۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۭ (اے محمد ﷺ) آپ ان استہزاء کرنے والوں سے کہیے کہ رات اور دن میں رحمٰن (کے عذاب) سے تمہاری کون حفاظت کرے گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر میں فرمایا یعنی اگر رحمٰن تم کو عذاب دینا چاہے گا تو تمہارا بچاؤ کون کرے گا، یا یہ مطلب ہے کہ اگر رحمٰن کا عذاب تم پر نازل ہوگا تو کون تم کو بچائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ عذاب سے دنیا میں بچانے والا سوائے اللہ کی رحمت عامہ کے اور کوئی نہیں۔ اور عذاب کا دفاع اسی وقت ہوگا جب اللہ ہی مہلت دے گا۔

بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ بلکہ وہ لوگ اپنے رب کے ذکر سے روگرداں ہی ہیں۔ یہ حکم سوال سے اعراض ہے، مطلب یہ ہے کہ رحمٰن سے انکو خوف دلاؤ اور اس کے عذاب سے ڈراؤ۔ اس کے بعد فرمایا، بلکہ یہ ڈرانا بیکار ہے۔ قرآن اور اللہ کے مواعظ سے تو یہ روگرداں ہیں یا یہ مطلب ہے کہ ان کے دل میں تو رحمٰن کا خیال ہی نہیں آتا اس کے عذاب سے کیسے ڈریں گے۔

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ۝

کیا ان کے پاس ہمارے سوا ایسے معبود ہیں کہ (عذاب مذکور سے) ان کی حفاظت کر لیتے ہوں، وہ تو اپنی حفاظت کی بھی قدرت نہیں رکھتے اور نہ ہمارے مقابلے میں کوئی اور ان کا ساتھ دے سکتا ہے۔

تَمْنَعُهُمْ، یعنی ایسے معبود جو ہمارے عذاب سے ان کو بچا سکیں۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ یعنی ان کے معبود تو اپنی مدد بھی خود نہیں کر سکتے۔ اگر ان پر مکھی بیٹھ جائے تو اڑا نہیں سکتے۔

وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ اور نہ ان کے ساتھ ہماری مدد ہو سکتی ہے جس طرح ان لوگوں کے ساتھ ہوگی جو گناہ گار اہل ایمان کی شفاعت کریں گے یعنی انبیاء، اولیاء، ملائکہ، جو گناہ گار مومنوں کی شفاعت کریں گے ان کے ساتھ تو ہماری مدد ہوگی اور ان بتوں کے ساتھ (جن کو کافر اپنا شفیع سمجھتے ہیں) نہیں ہوگی۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس جملہ کا ترجمہ اس طرح کیا کہ وہ (بت) بھی اپنے عذاب سے محفوظ نہ ہوں گے یعنی ان معبودوں پر بھی عذاب ہوگا۔ اسی طرح کا مضمون آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ میں ادا کیا گیا ہے۔ تم اور جن بتوں کی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ مجاہد نے يُصْحَبُوْنَ کا ترجمہ يُنْصَرُوْنَ کیا یعنی ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ قتادہ نے کہا ان کے ساتھ اللہ کی طرف سے اذن، شفاعت اور مدد نہ ہوگی۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو (دنیا کا) خوب سامان دیا یہاں تک کہ ان پر اسی حالت میں عرصہ دراز گزر گیا۔

مَتَّعْنَا یعنی ہم نے نعمت دی اور مہلت بھی دی، هٰٓؤُلَاۗءِ ان کافروں کو حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ یعنی ان کی مدت زندگی لمبی ہوگئی۔

کافروں کو وہم ہو سکتا تھا یا وہم تھا کہ یہ تمام امور ہمارے معبودوں کی وجہ سے ہوئے، اللہ نے اس خیال سے اعراض کیا اور فرمایا ایسا نہیں ہے کہ تم کو نعمت و مدت زندگی معبودوں کی وجہ سے ملی ہو بلکہ یہ سب کچھ ہم نے دیا۔ یا یوں کہا جائے کہ اللہ نے جو ان کو نعمت سے نواز اور طویل زندگی عطا کی تو یہ خیال ہوا کہ ہم کو یہ سب کچھ ہمارے ذاتی استحقاق کی وجہ سے حاصل ہوا ہے اور ہماری یہ حالت ہمیشہ رہے گی، اس خیال کو دور کرنے کے لئے فرمایا، ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ہماری طرف سے ڈھیل ہے آئندہ آیت اس تاویل کی تائید کر رہی ہے۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿۴۴﴾

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم (کافروں کی) زمین کناروں کی طرف سے گھٹا رہے ہیں پس کیا یہ پھر بھی غالب آجائیں گے۔

الْاَرْض سے مراد ہے کافروں کی سرزمین۔ کافروں کے مقبوضات گھٹانے سے مراد یہ ہے کہ کافروں کے قبضے سے نکال کر مسلمانوں کے تسلط میں ہم دے رہے ہیں تو ایسی حالت میں کیا کافر رسول اللہ ﷺ پر اور مسلمانوں پر غلبہ پا سکیں گے۔

قُلْ إِنَّمَا أُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۚ آپ کہہ دیجئے میں تم کو وحی کے ذریعہ سے (عذاب سے) ڈرا رہا ہوں۔

یعنی عذاب کا ڈراوا اپنی طرف سے تمہیں دے رہا ہوں بلکہ جو قرآن میرے اوپر اترا ہے اس میں اللہ نے عذاب کی اطلاع دی ہے اور اللہ کی اطلاع میں غلطی کا احتمال بھی نہیں ہے اس لئے اس خبر کو تم بعید از فہم نہ سمجھو اور نہ تعجب کرو۔

وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ إِذَا مَا يُنْذَرُونَ ﴿۴۵﴾ اور بہرے پکار کو نہیں سنتے، جب ان کو ڈرایا جاتا ہے (کیونکہ وہ بہرے ہیں، پکارنے سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا) مطلب یہ کہ کافر بہرے ہیں ان کو پکارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

وَلَئِنْ مَسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۴۶﴾

اور اگر آپ کے رب کے (اس) عذاب کی (جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اور جس کے جلد آجانے کے یہ خواستگار ہیں) ایک ذرا سی لپٹ بھی چھو جائے تو کہنے لگیں گے ہائے ہماری خرابی ہم ہی ظالم تھے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک قرار دے کر اور اللہ سے نہ ڈر کر ہم نے اپنے اوپر خود ظلم کیا۔

حضرت ابن عباسؓ نے نَفْحَةٌ کا ترجمہ کیا کنارہ، بعض نے کہا تھوڑا سا۔ ابن جریج نے کہا نَفْحٌ یعنی ایک حصہ نَفَحَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ فلاں نے فلاں کو اپنے مال میں سے ایک حصہ دے دیا۔ بعض نے نَفْحَةٌ کا ترجمہ کیا مارنا۔ نفحت الدابة برجلها گھوڑے نے اپنی ٹانگ ماری۔ لغوی اعتبار سے نفحة خوشبو کی لپٹ کو کہتے ہیں۔

مَسَّتْ چھو جانا نَفْحَةٌ ایک ادنیٰ جھونکا، ذرا سی لپٹ۔ اس میں تا وحدت کی ہے، ان دونوں لفظوں سے مبالغہ کا اظہار کیا ہے کہ بڑا عذاب آنا اور پورے عذاب میں مبتلا ہونا تو درکنار ایک ذرا سی لپٹ ان کو چھو بھی جائے تو موت کو پکارنے لگیں گے اور اپنے ظالم ہونے کا اقرار کرنے لگیں گے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ اور قیامت کے روز ہم میزان عدل قائم کریں گے (اور سب کے اعمال کا وزن کریں گے) اَلْقِسْطَ سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ یعنی انصاف والی ترازو میں یا بطور مبالغہ موازین کو بعینہٖ انصاف قرار دیا۔ قسط مصدر ہے۔

لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ میں لام بمعنی فی ہے، قیامت کے دن میں یا جزاً کا لفظ یَوْمٌ سے پہلے محذوف ہے قیامت کے دن کے بدلے کے لئے یا اہل قیامت کے لئے مراد ہے۔ یعنی یَوْمٌ سے پہلے لفظ اَہْل محذوف ہے۔ کچھ علماء نے کہا (میزان سے حقیقی ترازو مراد نہیں ہے بلکہ) ٹھیک ٹھیک حساب فہمی اور اعمال کے مطابق بدلہ دینے کا موازنہ مراد ہے، یعنی بطور تمثیل و تشبیہ مجازاً صحیح طور پر ٹھیک ٹھیک حساب فہمی اور معاوضہ اعمال کو میزان عدل قرار دیا۔ اہل سنت کے نزدیک یہ تاویل درست نہیں بلکہ

صحیح یہ ہے کہ میزان عدل بصورت ترازو حقیقتاً قائم ہو گی۔ ابن مبارکؒ نے الزہد میں اور آجریؒ نے الشریعۃ میں حضرت سلمان کی موقوف روایت بیان کی ہے۔ اور ابن حبان نے اپنی تفسیر میں بروایت کلبی از ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے ہوں گے۔ ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے اللہ نے آسمان و زمین کی شکل میزان کے دو پلڑے پیدا کئے ہیں۔ الحدیث۔

بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے حضرت عمرؓ کا بیان حدیث جبرئیل کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ جبرئیلؑ نے کہا محمد ﷺ! ایمان کیا چیز ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا (ایمان یہ ہے) تم اللہ کو، اس کے ملائکہ کو، اس کے پیغمبروں کو، جنت اور دوزخ کو اور میزان کو مانو اور مرنے کے بعد اٹھنے پر بھی یقین رکھو اور اچھی بری تقدیر کو بھی عقیدے کے ساتھ تسلیم کرو۔ جبرئیلؑ نے کہا اگر میں ایسا کر لوں گا (یعنی ان تمام چیزوں کو مان لوں گا) تو کیا میں مومن ہو جاؤں گا، فرمایا، ہاں جبرئیلؑ نے کہا آپ نے سچ کہا۔

حاکم نے مستدرک میں بر شرط مسلم بیان کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے کہ حضرت سلمان کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میزان قائم کی جائے گی۔ اگر اس میں آسمان کو اور زمین کو تولا جائے گا تو ان کی بھی اس کے اندر سمائی ہو گی۔

ترمذی اور بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے۔ حضرت انسؓ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ حضور قیامت کے دن میرے لئے شفاعت فرمائیں۔ ارشاد فرمایا، میں ایسا کروں گا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں حضور ﷺ کو کہاں تلاش کروں۔ فرمایا، سب سے پہلے مجھے صراط پر تلاش کرنا۔ میں نے عرض کیا اگر میں وہاں آپ کو نہ پاؤں۔ فرمایا تو میزان کے پاس مجھے تلاش کرنا، میں نے عرض کیا اگر میزان کے پاس بھی حضور ﷺ کو نہ پاؤں۔ فرمایا تو حوض کے پاس تلاش کرنا، ایسا نہ ہو گا کہ ان تینوں مقامات میں سے کسی ایک جگہ نہ ملوں۔

حاکم بیہقی اور آجری کا بیان ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میں نے عرض کیا آپ لوگ (یعنی مرد) اپنی بیویوں کو قیامت کے دن یاد کریں گے، فرمایا تین مقامات ہیں کہ کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔

(۱) اس جگہ جہاں میزان قائم کی جائے گی تاوقتیکہ اس کو اپنی میزان کا بھاری یا ہلکا ہونا معلوم نہ ہو جائے۔

(۲) اس جگہ جہاں صراط قائم کی جائے گی تاوقتیکہ... معلوم نہ ہو جائے کہ وہ صراط سے نجات پاتا ہے یا نہیں۔

(۳) اس جگہ جہاں اعمالنامے اڑتے ہوں گے تاوقتیکہ اس کو معلوم نہ ہو جائے کہ اس کا اعمالنامہ کہاں آکر پڑتا ہے دائیں ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں یا پشت کے پیچھے سے۔ ایسی احادیث بکثرت ہیں جن میں میزان کا ذکر آیا ہے سورۃ القارعۃ کی آیت فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ کی تفسیر میں کچھ نقل کی ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اپنے رب سے درخواست کی کہ مجھے میزان دکھا دی جائے، اللہ نے ان کو میزان اس حالت میں دکھا دی کہ اس کا ہر پلڑا اتنا تھا کہ مشرق سے مغرب اس کی وسعت تھی، حضرت داؤد بیہوش ہو گئے، جب ہوش آیا تو عرض کیا الٰہی ایسا کون ہے جو اپنے نیکیوں کے پلڑے کو بھر سکے۔ اللہ نے فرمایا داؤد جب میں اپنے بندے سے راضی ہوں گا تو ایک چھوارے کو خیرات کرنے سے اس کی نیکیوں کے پلڑے کو بھر دوں گا۔ اَلْمَوَازِيْنَ جمع کا صیغہ ہے نسفی نے بحر الکلام میں اس کی چند وجوہ لکھی ہیں (۱) ہر شخص کی میزان الگ الگ ہو گی۔ (۲) یا یوں کہا جائے کہ جمع کا صیغہ بول کر واحد مراد لے لیا جاتا ہے جیسے آیت فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ میں ملائکہ سے جبرئیل مراد ہیں اور يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ میں اَلرُّسُلُ سے مراد صرف رسول اللہ کی ذات ہے۔ (۳) یا یوں کہا جائے کہ میزان کے ہر جز کو میزان مان کر اس کی جمع موازین ذکر کی جیسے سراویل (پاجامہ شلوار) جمع کا صیغہ ہے جس کا واحد سِرْوَالَۃ اور پاجامہ کے ہر جز کو سِرْوَالَۃ قرار دے کر مجموعہ اجزاء کو سَرَاوِیْل کہا جاتا ہے۔

فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ط پھر کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، نہ ادنیٰ حق تلفی کی جائے گی، نہ برائیوں

میں کوئی اضافہ کیا جائے گا۔

وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ اور اگر اس کا عمل رائی کے دانے کے برابر ہوگا تو ہم اس کو بھی میزان میں لے آئیں گے۔ رائی کے دانے سے مراد ہے حقیر ترین (رائی کے دانہ کے برابر ہو یا اس سے کم و بیش)۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے قیامت کے دن لوگوں کا محاسبہ کیا جائے گا، جس کی نیکیوں کی تعداد برائیوں سے ایک بھی زائد ہوگی وہ جنت میں جائے گا اور جس کے گناہوں کی تعداد نیکیوں سے ایک بھی زائد ہوگی وہ دوزخ میں جائے گا۔ یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ ایک دانہ کے وزن سے میزان ہلکی یا بھاری ہو جائے گی اور جس کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی وہ اصحاب اعراف میں سے ہوگا اور اس کو صراط پر روک لیا جائے گا۔

وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝ اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔

سدی نے حاسبین کا ترجمہ کیا مُحْصِیْنَ گنتی میں احاطہ کرنے والے، حَسَبَ کا معنی ہے اندازہ کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے ترجمہ کیا جاننے والے، یاد رکھنے والے جو شخص کسی چیز کی گنتی کرتا ہے یقیناً اس چیز کا اس کو علم ہو جاتا ہے اور وہ چیز اس کو حفظ ہو جاتی ہے۔ کَفٰی بِنَا کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے علم و عدل سے کسی کا علم و عدل بڑھ کر نہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو بھی ایک فیصلہ کی اور روشنی کی اور ان متقیوں کے لئے نصیحت کی چیز یعنی توریت عطا کی تھی۔

اَلْفُرْقَانَ یعنی توریت جو حق کو باطل سے الگ کرنے والی اور دونوں میں امتیاز پیدا کر دینے والی تھی۔

ضِیَآءً عظیم الشان روشنی۔ جو لوگ حیرت و جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے تھے ان کو روشنی عطا کرنے والی۔ ذِكْرًا متقیوں کے لئے ہدایت نامہ، یادداشت جس سے اہل تقوی نصیحت حاصل کرتے تھے یاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس میں ضوابط شریعہ بیان کئے گئے تھے۔ غرض یہ کہ توریت میں تینوں اوصاف تھے۔

ابن زید نے کہا فرقان سے مراد ہے دشمنوں پر فتح۔ اللہ نے یَوْمَ الْفُرْقَانِ یوم بدر کو فرمایا ہے جس میں مسلمانوں کو کافروں پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ بعض نے کہا فرقان (جدا کرنے) سے مراد ہے سمندر کو پھاڑنا (پایاب بنا دینا) اس قول پر ضیاء اور ذکر سے مراد توریت ہوگی جو حضرت موسیٰؑ کے پاس آئی تھی۔ اور اس کی روشنی میں حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو نصیحت کرتے تھے۔

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ۝ جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت سے بھی خوف کھاتے ہیں۔ یہ متقین کی صفت ہے۔ یا فعل مدح محذوف ہے اور اَلَّذِیْنَ اس کا مفعول۔ مُشْفِقُوْنَ ڈرنے والے۔ ھُمْ کو شروع میں لانے سے یا تو مبالغہ مقصود ہے یا غیر متقین پر تعریض کہ جو متقی ہیں وہی ڈرتے ہیں اور جو متقی نہیں ہیں وہ نہیں ڈرتے۔

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝ اور یہ قرآن بھی ایک کثیر الفائدہ نصیحت کی کتاب ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے تو کیا پھر بھی تم اس سے منکر ہو۔

ھٰذَا یعنی قرآن، ذِکْرٌ مُّبٰرَکٌ یعنی ایسا ذکر عظیم ہے جس کی افادیت اور خیر کثیر ہے۔

اَنْزَلْنٰهُ یعنی اس کو ہم نے محمد پر اتارا ہے۔ اَنْتُمْ سے خطاب اہل مکہ کو ہے اور استفہام انکاری ہے۔

یعنی جب یہ قرآن کثیر خیر والا ہے اور اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے تو پھر تم کو اس کا انکار نہ کرنا چاہئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝ اور ہم نے موسیٰ سے بہت پہلے ابراہیم کو (ان کی شان کے مناسب) راستی فہم عطا کی تھی اور ان سے (ان کے احوال سے) خوب واقف تھے۔

رُشْد یعنی توحید اور بت پرستی سے پرہیز۔ رُشْدَهٗ میں اضافت بتا رہی ہے کہ رُشْد میں ابراہیم کا بہت بڑا درجہ تھا۔ مِنْ

قَبْلُ یعنی موسیٰ اور ہارون سے پہلے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو محمد کے پاس وحی بھیجی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہمیشہ سے اللہ کا یہی دستور رہا ہے، مخلوق کی اصلاح کے لئے اللہ پیغمبروں کے پاس وحی بھیجتا رہا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے مِنْ قَبْلُ کی تشریح کی ہے بالغ ہونے سے پہلے جب کہ حضرت ابراہیم بچے ہی تھے اور غار سے باہر آئے تھے اور سورج و چاند سے روگرداں ہو کر اللہ ہی کی طرف رخ کیا تھا اور اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ بلیغ کہا تھا، اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے بچپن میں ہی ابراہیم کو نبوت عطا کر دی تھی۔ اسی طرح حضرت یحییٰ کے متعلق فرمایا اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا۔

یا یہ مطلب ہے کہ نبی بنانے سے پہلے ہم نے ابراہیم کو رشد عطا کر دی تھی۔ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ یعنی ہم ابراہیم کو جانتے تھے کہ وہ ہدایت و نبوت کے اہل ہیں۔ کیونکہ ان کا مبدء تعین اللہ کا اسم ہادی اور عالم تھا (پس ان پر اللہ کی صفت ہدایت و علم کا پر تو پڑا تھا۔ مترجم)

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی عبادت پر تم جمے ہوئے ہو۔

حضرت ابراہیم نے اہانت آمیز لہجے میں دریافت کیا اور قوم والے جو مورتیوں کی تعظیم کرتے تھے اس پر ان کو تنبیہ کی، یہ مورتیاں ہیں، بے جان ہیں، نہ فائدہ پہنچا سکتی ہیں، نہ نقصان چونکہ عُكُوْف کے بعد عَلٰی آتا ہے اس لئے لَهَا میں لام تعدیہ کا نہیں بلکہ اختصاص کے لئے ہے۔ یعنی خصوصیت کے ساتھ تم ان کی لئے جمے ہوئے ہو یا لام بمعنی عَلٰی ہے یعنی تم ان کی عبادت پر جمے ہوئے ہو یا عُكُوْف کے اندر عبادت کا معنی داخل ہے، یعنی تم ان کی عبادت کرتے ہو۔

قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ ﴿۵۳﴾ انہوں نے کہا ہم نے اپنے آباء واجداد کو ان کی پوجا کرتے پایا (یعنی ہمارے اسلاف ان کی پوجا کرتے تھے، قدیم سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے کیا ہمارے باپ دادا بے وقوف تھے (مترجم) قوم والوں نے اپنی بت پرستی کا سبب بیان کیا کہ ہم اپنے اسلاف کی تقلید کرتے ہیں (کوئی عقلی وجہ نہ بیان کر سکے تو قومی رواج کا سہارا لیا)

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۵۴﴾ ابراہیم نے کہا تم بھی یقیناً گمراہی میں پڑے ہوئے ہو اور تمہارے باپ دادا بھی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

یعنی تم سب کھلی ہوئی غلطی پر ہو، پتھروں کی پوجا کرتے ہو جو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر۔ تمہارے باپ دادا بھی کھلی ہوئی غلط راہ پر تھے اور تم ان کے پیرو ہو تو تم بھی غلط راستہ پر ہو۔

قَالُوْۤا انہوں نے کہا حضرت ابراہیم کا قول ان کو عجیب معلوم ہوا۔ باپ دادا کو گمراہ بتانا ان کی نظر میں عجیب تھا، اس لئے خیال کیا کہ شاید ابراہیم کوئی دل لگی کی بات کہہ رہا ہے۔

اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِیْنَ ﴿۵۵﴾ کیا واقعی کوئی صحیح بات ہم سے کہہ رہے ہو یا دل لگی کر رہے ہو یعنی کیا کوئی ایسی حق بات کہہ رہے ہو جس کی کوئی عقلی سند اور واقعی ثبوت ہو یا یہ محض تفریح طبع کے طور پر یوں ہی کہہ رہے ہو۔ استفہام انکاری ہے، مطلب یہ ہے کہ تمہاری بات مبنی بر حق تو نہیں ہے (اسلاف کو گمراہ بتانا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے) معلوم ہوتا ہے تم دل لگی کر رہے ہو۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۵۶﴾

ابراہیم نے کہا (میں دل لگی کے طور پر یہ بات نہیں کہتا) بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا رب (مالک و حاکم) ہے، جس نے ان کو نیست سے ہست کیا ہے اور میں بھی اسی کی شہادت دینے والوں میں سے ہوں۔

فَطَرَهُنَّ یعنی بغیر سابقہ نظیر کے اللہ نے ان کو نیست سے ہست کیا ہے۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے بعد فَطَرَهُنَّ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جاہل لوگ رب کا اطلاق بادشاہ اور ہر سرپرست پر بھی کرتے ہیں اور نمرود نے تو کہا ہی تھا اَنَا

اَلْحَيُّ ذُو الْوُسْعِ اس خیال کو دفع کرنے کے لئے فرمایا، اللہ تمام آسمانوں اور زمینوں کا ایسا رب ہے کہ اسی نے ان کو پیدا کیا اور وہی عدم محض سے وجود میں لایا ہے۔ بَلْ کے لفظ سے گریز ہے یعنی میں تفریح کے لئے ایسی بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ زمین و آسمان شہادت دے رہے ہیں کہ اللہ ہی ان کا خالق ہے، یہ سب ممکن اور محل حوادث ہیں یہ اپنی ہستی میں ایسے واجب الوجود کے محتاج ہیں جو وحدہ، لاشریک اور تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے پس وہی معبود ہونے کا مستحق ہے۔ میں بھی ان خاموش شہادت دینے والوں میں سے ہوں، اور زبان اور دل سے اس کی توحید ذاتی و صفاتی کی شہادت دے رہا ہوں۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ اور خدا کی قسم میں تمہارے ان بتوں کی گت بناؤں گا جب تم ان کے پاس سے منہ پھیر کر چلے جاؤ گے۔

كَيْدٌ کا معنی ہے مکر، تدبیر یہاں مراد یہ ہے کہ کسی تدبیر سے میں ان کو توڑنے کی کوشش کروں گا۔ بیضاوی نے لکھا ہے ت قسمیہ واؤ قسمیہ سے بدل کر آئی ہے اس میں تعجب کا معنی ہے (واؤ قسمیہ میں تعجب کا معنی نہیں ہوتا) چونکہ بتوں کو توڑنا یا نقصان پہنچانا ایک مشکل کام تھا بت پرستوں کو نمرود کی اور ساری قوم کی حمایت حاصل تھی نمرود کی حکومت تھی، ان سب کے مقابلہ میں بت شکنی عجیب بات تھی اس لئے بجائے واؤ کے ت قسمیہ اور لفظ كَيْدٌ کا استعمال کیا۔

مُدْبِرِيْنَ یعنی جب ان کو پیچھے چھوڑ کر میلہ میں چلے جاؤ گے تو میں ان کو نقصان پہنچانے اور توڑنے کی کوئی تدبیر کروں گا۔

بغوی نے مجاہد اور قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے یہ بات چپکے سے کہی تھی۔ سوائے ایک شخص کے اور کوئی نہیں سن سکا تھا۔ اسی نے یہ بات پھیلا دی اور اسی نے کہا تھا کہ ایک نوجوان جس کا نام ابراہیم ہے بتوں کا ذکر کر رہا تھا ہم نے خود سنا تھا۔

سدی نے کہا قوم نمرود کا سالانہ تہوار پر ایک میلہ ہوتا تھا جب وہ میلہ سے واپس آتے تھے تو سیدھے بتوں کے پاس آتے تھے، ان کو سجدے کرتے تھے، پھر گھروں کو جاتے تھے حسب معمول جب میلہ کا وقت آیا تو حضرت ابراہیم سے ان کے باپ نے کہا تم بھی اگر ہمارے ساتھ میلے کو چلو تو بہتر ہے ہمارا دین (رواج، مذہبی دستور) تم کو پسند آئے گا۔ باپ کے کہنے سے حضرت ابراہیم ان کی ساتھ ہو لئے کچھ ہی راستہ طے کیا تھا کہ آپ نے خود اپنے کو زمین پر گرا لیا اور کہنے لگے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ کا مطلب یہ تھا کہ میرے پاؤں میں چوٹ آگئی ہے جب سب لوگ چلے گئے اور صرف کمزور لوگ پیچھے رہ گئے تو حضرت نے پکار کر وہ الفاظ کہے جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے لوگوں نے آپ کے الفاظ سن لئے پھر حضرت ابراہیم لوٹ آئے اور بت خانہ کی طرف پہنچے، تمام بت ایک بڑے کمرے میں قطار بند رکھے ہوئے تھے، بت خانہ کے دروازہ کے سامنے سب سے بڑا بت تھا اس کی برابر اس سے چھوٹا، پھر اس کی برابر اس سے بھی چھوٹا، اسی طرح سب کی قطار تھی اور سب کے سامنے تیار کھانا بھی رکھا ہوا تھا، کھانا اس لئے سب کے سامنے چنا گیا تھا کہ بتوں کی وجہ سے کھانے میں برکت آجائے اور میلہ سے واپس آکر سب لوگ اس کو کھائیں۔ حضرت ابراہیم نے بطور استہزاء بتوں سے فرمایا تم کھاتے کیوں نہیں جب کوئی جواب نہیں ملا تو فرمایا تمہیں کیا ہو گیا تم بولتے کیوں نہیں اس کے بعد بتوں کی طرف بڑھے اور داہنے ہاتھ سے اس قسم کی وجہ سے جو بتوں کو توڑنے کے سلسلے میں آپ نے کھائی تھی اور فرمایا تھا تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بتوں پر ضرب لگائی (آیت میں آیا ہے فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ اور یمین داہنے ہاتھ کو بھی کہتے ہیں اور قسم کو بھی، مترجم)

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ پس ان بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا مگر بڑے بت کو بغیر توڑے ان کے لئے چھوڑ دیا۔ جُذَاذٌ بروزن فُعَالٌ بمعنی مفعول ہے جیسے حُطَام۔ یہ جَذٌّ سے ماخوذ ہے جذ کا معنی ہے کاٹنا، بعض اہل لغت کہتے ہیں جُذَاذٌ جمع کا صیغہ ہے لیکن اس کا کوئی مفرد نہیں ہے، كَبِيْر سے مراد ہے بڑا بت جس کو حضرت ابراہیم نے نہیں توڑا اور اس کے کاندھے پر تبر رکھ دیا۔ فَجَعَلَهُمْ میں جمع مذکر کی ضمیر اس لئے ذکر کی کہ بت پرستوں کے خیال میں ان

کے بت ذی علم تھے۔

لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ کہ شاید وہ لوگ ابراہیم کی طرف دریافت کرنے کے لئے لوٹیں۔ الیہ کی ضمیر ابراہیمؑ کی طرف راجع ہے۔ حضرت ابراہیم بتوں سے دشمنی رکھنے اور بت پرستی کی مخالفت کرنے میں مشہور تھے اس لئے حضرت نے بتوں کو توڑ دیا اور بڑے بت کو چھوڑ دیا، یہ خیال کر کے کہ جب یہ لوگ واپس آئیں گے تو میرے پاس آئیں گے اس وقت میں ان کو جتلا دوں گا کہ تمہارے معبود ایک آدمی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یا اِلَیْہِ کی ضمیر بڑے بت کی طرف راجع ہے مطلب یہ ہے کہ بت پرست لوگ جب میلہ سے واپس بڑے بت کے پاس آئیں گے تو اس سے دریافت کریں گے کہ چھوٹے بتوں کی یہ حالت کس نے کی معبود کو علم ہونا اور جواب دینا چاہیے۔ وہ معبود ہی کیا جو نہ کچھ جانے، نہ جواب دے، آخر جواب نہ پا کر خود ہی ذلیل ہوں گے۔

یا اِلَیْہِ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے، مطلب یہ کہ جب بتوں کی بے بسی ان پر ظاہر ہو گی تو شاید وہ اللہ کی طرف لوٹ آئیں۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ انہوں نے کہا ہمارے ان معبودوں کے ساتھ کس نے یہ حرکت کی بلاشبہ وہ ظالموں میں سے ہے (کہ ان بے چاروں کو بے قصور اس نے توڑا اور ہمارے جذبہ مذہبی کا بھی لحاظ نہیں کیا اور ہم کو دکھ پہنچایا، مترجم)

مَنْ فَعَلَ میں مَنْ سوالیہ ہے اور موصولہ بھی ہو سکتی ہے یعنی جس نے بھی یہ حرکت کی وہ ظالم ہے، اس نے معبودوں سے یہ گستاخی کی یا ان کو ایسا توڑ کہ ریزہ ریزہ کر دیا یا یہ کہ اس نے اپنے اوپر خود ظلم کیا کہ اپنے کو ہلاکت کے لئے تیار کیا۔

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ کہنے لگے ہم نے ایک نوجوان کو ان بتوں کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرتے سنا تھا اس نوجوان کو ابراہیم کہا جاتا ہے۔ یہ خبر نمرود اور اس کے اراکین سلطنت کو جب پہنچی تو۔

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ انہوں نے کہا (اگر اس نے ایسا کیا ہے تو) اس کو لوگوں کی نظروں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ (اس کے قول و فعل کی) شہادت دیں اور بلا ثبوت ہم سزا دینے کے مرتکب نہ ہوں قتادہ، حسن اور سدی نے یہی مطلب بیان کیا ہے، بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اَعْیُن سے مراد ہیں سردار یعنی سرداران قوم اور حکام کے سامنے اس کو لاؤ۔ محمد ابن اسحاق نے کہا یَشْہَدُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ لوگ آئیں اور دیکھیں کہ اس کو ہم کیسی سخت سزا دیتے ہیں۔ غرض جب لوگ ابراہیم کے پاس آئے تو۔

قَالُوْۤا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ انہوں نے کہا اے ابراہیم کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے۔

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ابراہیم نے کہا بلکہ یہ کام ان کے اس بڑے نے کیا ہے تم ان بتوں سے پوچھ دیکھو اگر یہ بول سکیں گے (تو بتا دیں گے)۔

حضرت ابراہیم کو بڑے بت پر بڑا غصہ تھا اور اس سے آپ کو نفرت زیادہ تھی کیونکہ وہ لوگ اس کی تعظیم زیادہ کرتے تھے اسی لئے بت شکنی کی نسبت آپ نے بڑے بت کی طرف مجازاً کر دی۔ یا یوں کہا جائے کہ آپ نے بت شکنی پر تعریضی اقرار نما کی استہزاء کے طرز میں خود بت توڑنے کا اقرار کر لیا۔ جیسے اگر آپ کسی ایسے آدمی کی جو خوشخط نہ ہو کوئی خوشخطی کی تحریر دیکھ کر کہیں کیا یہ تم نے لکھا ہے اور وہ جواب دے میں نے نہیں بلکہ آپ نے لکھا ہے یہ تعریضی اقرار ہے۔ گویا حضرت ابراہیم نے یوں جواب دیا میں نے نہیں کی بلکہ اس بڑے بت نے کی۔ یا یوں کہا جائے کہ بت پرستوں کا یہ اعتقاد تھا کہ بڑے بت کی موجودگی میں چھوٹے بتوں کی پوجا سے بڑا بت ناراض ہوتا ہے آپ نے ان کے عقیدہ کی نقل کر دی۔ قتیبی نے کہا معنوی حیثیت سے كَبِيْرُهُمْ هٰذَا کا تعلق فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ سے ہے مطلب یہ کہ اگر یہ بول سکتے ہیں تو ایسا کر بھی سکتے ہیں اور

بول نہیں سکتے تو ایسا کر بھی نہیں سکتے گویا اس ضمن میں آپ نے بت شکنی کا اقرار کر لیا اور بتوں کا عجز ظاہر کر دیا۔ قسیبی کی یہ توجیہ غلط ہے کیونکہ کسائی نے کہا ہے جب ابراہیم نے اعتراض کیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بعد اگر ضمنی اقرار مانا جائے گا تو ایسا ہوگا جیسے کوئی کہے میں نے یہ کام نہیں کیا بلکہ میں نے کیا اور ظاہر ہے کہ یہ منفی مثبت کا اجتماع غلط ہے، پھر حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ فعلہ پر وقف نہیں ہے (بلکہ فَعَلَهٗ کا تعلق كَبِيْرُهُمْ سے ہے)

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابراہیم نے تین بار کے علاوہ (صورۃً بھی) جھوٹ نہیں بولا۔ دو بار ذات خداوندی کے متعلق (۱) اِنِّیْ سَقِیْمٌ کہا تھا (۲) اور بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ کہا تھا اور (تیسری بار کا واقعہ یہ ہوا کہ) کسی روز ابراہیم اور سارہ کا گزر کسی ظالم بادشاہ کی طرف سے ہوا، بادشاہ سے کہا گیا کہ یہاں ایک شخص تو وارد ہے جس کے ساتھ بہت ہی حسین عورت ہے۔ بادشاہ نے حضرت ابراہیم کو بلوایا اور دریافت کیا کہ یہ کون عورت ہے، ابراہیم نے کہا میری بہن ہے، پھر واپس آکر سارہ سے کہا اگر اس ظالم کو معلوم ہو جاتا کہ تم میری بیوی ہو تو وہ تم کو مجھ سے چھین لیتا اب اگر تم سے وہ دریافت کرے تو تم یہی کہنا کہ میں ابراہیم کی بہن ہوں، واقعہ یہ ہے کہ تم میری اسلامی بہن ہو۔ روئے زمین پر میرے اور تمہارے سوا اور کوئی مؤمن نہیں ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے سارہ کو بلوایا اور ابراہیم نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے سارہ کو اس ظالم کے پاس پہنچایا تو اس نے سارہ پر دست درازی کرنی چاہی لیکن فوراً پکڑ لیا گیا (یعنی غیبی پکڑ ہو گئی) یہاں تک کہ پاؤں زمین پر پٹخنے لگا اور سارہ سے درخواست کی، میرے لئے اللہ سے دعا کر دے، میں تجھے اچھا ہو کر کوئی دکھ نہیں دوں گا۔ سارہ نے اللہ سے دعا کی، اللہ نے بندش کھول دی دوبارہ پھر اس نے ہاتھ بڑھایا اور پہلے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ پکڑا گیا۔ اس نے پھر دعا کی درخواست کی اور ضرر نہ پہنچانے کا وعدہ کیا، سارہ نے پھر دعا کی اور اللہ نے رہائی دے دی، رہائی کے بعد بادشاہ نے کسی دربان کو بلایا اور کہا تو میرے پاس انسان کو نہیں بلکہ جن کو لے کر آیا ہے اس کے بعد اس نے ہاجرہ کو خادمہ کے طور پر سارہ کو دے کر رخصت کر دیا۔ سارہ ابراہیم کے پاس پہنچیں تو آپ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے آپ نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کیا خبر ہے۔ سارہ نے کہا اللہ نے کافر کے فریب کو اسی کے سینہ پر پلٹ دیا اور اس نے خدمت کے لئے ہاجرہ مجھے دی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد کہا اے ماء السماء کی اولاد (آسمانی پانی سے مراد خالص نسب کا دعویٰ کرنے والا) یہ (ہاجرہ) ہی تمہاری ماں ہے۔ متفق علیہ۔

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں تعریضات اور ایہام، کو کذب مجازاً فرمایا کیونکہ بظاہر تعریض کذب کے مشابہ تھی۔ اللہ نے مشابہت صوری کی وجہ سے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ کو سَيِّئَةٌ فرمایا ہے۔ حضرت ابراہیم نے خود صراحۃً فرما دیا کہ تم میری دینی بہن ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نے تعریضی الفاظ بولے تھے (جو بظاہر جھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور حقیقت میں سچ ہیں ہر لفظ کے دو معنی ہیں ایک قریب الفہم دوسرے گہرے اور بعید از فہم۔ حضرت ابراہیم کی مراد گہرے معنی تھا جو ان کا مخاطب نہ سمجھ سکا وہ قریب الفہم معنی سمجھ کر دھوکہ میں پڑ گیا)

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ اس پر وہ لوگ اپنے جی میں سوچ پھر (آپس میں) کہنے لگے، حقیقت میں تم ہی لوگ ناحق پر ہو۔ یعنی اس وقت انہوں نے اپنی عقلوں کی طرف رجوع کیا اور غور و فکر کیا اور سمجھے کہ ابراہیم کی بات حق ہے اور ہم غلطی پر ہیں۔ اس لئے آخر دل میں یا باہم کہنے لگے کہ تم ہی بڑا ظلم کر رہے ہو کہ جو بت بول نہیں سکتے نفع خود اپنے کو نہیں پہنچا سکتے۔ اپنے دکھ کو دفع نہیں کر سکتے ان کی پوجا کرتے ہو۔

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ پھر (شرمندگی کے مارے) اپنے سروں کو جھکا لیا اور (بولے) ابراہیم تم کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ یہ (بت) کچھ بولتے نہیں ہیں۔ یعنی کچھ دیر کے لئے تو عقلوں کی طرف انہوں نے رجوع کر لیا تھا اور سمجھے تھے کہ ابراہیم کی بات درست ہے اور ہم غلطی پر ہیں لیکن پھر کفر کی طرف

پلٹ گئے اور جھگڑا کرنے کی طرف لوٹ آئے اور کہنے لگے تم یہ بات تو یقیناً جانتے ہو کہ یہ بولتے نہیں ہیں، بات نہیں کرتے۔ کفر کی طرف پلٹنے کو کسی چیز کو سرنگوں کرنے سے تشبیہ دی، سر نیچے ٹانگیں اوپر اعلیٰ کو اسفل اور نچلے کو الٹ کر اونچا کر دینا حق کو نچلا اور کفر کو سر بلند کر دینا ہے۔ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ یعنی یہ بت بات نہیں کر سکتے بولتے نہیں تو ہم ان سے دریافت کیا کریں۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ ابراہیمؑ نے کہا تو کیا خدا کو چھوڑ کر تم ایسی چیز کی پوجا کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچاتی ہے نہ نقصان۔ تف ہے تم پر (کہ باوجود وضوح حق کے تم باطل پر جمے ہوئے ہو) اور ان پر جن کو خدا کے سوا پوجتے ہو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

یعنی ابراہیمؑ نے کہا کیا یہ بات جاننے کے بعد بھی کہ یہ بت نہ بولتے ہیں نہ نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں تم ان کو پوجتے ہو۔ نہ بول سکنا اور اپنے پرستاروں کو فائدہ نہ پہنچا سکنا اور پرستش نہ کرنے والوں کو ضرر پہنچانے کی طاقت نہ رکھنا ایسی کمزوری ہے جو الوہیت کے منافی ہے، تمہاری حالت پر افسوس ہے کہ باطل پر جمے ہوئے ہو باوجودیکہ تمہاری نظر میں بھی اس کا باطل ہونا واضح ہو گیا اور ان معبودوں کی حالت بھی قابل نفرت و افسوس ہے کہ باوجود استحقاق نہ ہونے کے ان کو معبود بنایا جا رہا ہے۔ کیا تم یہ باتیں دیکھتے ہو پھر بھی نہیں سمجھتے کہ یہ بت قابل پرستش نہیں واجب العبادت اور مستحق معبودیت صرف اللہ ہے۔

اف اس آواز کو کہتے ہیں جو کسی چیز سے کراہیت کرنے والا اور اکتا جانے والا اپنے منہ سے نکالتا ہے۔ بعض اہل علم نے کہا کسی چیز کی تحقیر کے لئے یا بدبو محسوس کر کے جو آواز نکلتی ہے اس کو اف کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی ناک میں ایک مرتبہ کسی طرح کی بدبو آئی اور آپ نے بدبو محسوس کر لی تو فرمایا اف اف اور کپڑا ناک کو لگا لیا۔ بیضاوی نے لکھا ہے اف کا معنی ہے رنج اور بدبو جب وہ لوگ عاجز ہو گئے (اور کوئی جواب بن نہ پڑا) تو آزار اور دکھ دینے کے درپے ہو گئے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾ اور کہنے لگے اس کو (آگ سے) جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تم ایسا کرنے والے ہو (تو کرو)۔

اِنْ كُنْتُمْ شرط ہے، کلام سابق جزا پر دلالت کر رہا ہے، اس لئے آگے جزا کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ یہ بات ایک شخص نے کہی جس کا نام ہنون کہا گیا ہے اللہ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت تک دھنستا چلا جائے گا۔ بعض نے کہا یہ بات نمرود نے کہی تھی، جب نمرود اور اس کی قوم کا باتفاق آراء فیصلہ ہو گیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دیا جائے تو آپ کو گرفتار کر کے ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا اور باڑہ کی طرح کا ایک احاطہ بنایا یا قریہ کوثی میں ایک بہت بڑا گڑھا کھودا گیا اور ٹھوس قسم کی لکڑیاں آپ کو جلانے کے لئے وہاں اکٹھی کیں اور عام جوش اس حد تک پہنچ گیا کہ بیمار منت مانتا تھا کہ اگر میں اچھا ہو گیا تو ابراہیمؑ کو جلانے کے لئے لکڑیاں دوں گا۔ عورتیں اگر مراد مانتی تھیں تو کہتی تھیں اگر ہماری مراد پوری ہو گئی تو ہم ابراہیمؑ کو جلانے والی آگ میں لکڑیاں ڈالیں گے۔ لوگ وصیت کرتے تھے کہ ہمارے بعد لکڑیاں خرید کر ڈھیر میں شامل کر دینا عورتیں چرخہ کات کر اس کی مزدوری سے لکڑیاں خرید کر بامید ثواب ڈھیر میں شامل کرتی تھیں۔

ابن اسحاق کا بیان ہے اس طرح ایک ماہ تک لوگ لکڑیاں جمع کرتے رہے جب حسب منشاء لکڑیاں جمع کر چکے تو ڈھیر میں ہر طرف سے آگ لگا دی آگ بھڑک اٹھی، جب خوب تیز ہو گئی اور اس حد تک پہنچ گئی کہ پرندہ بھی جلنے کے ڈر سے اوپر سے نہ اڑ سکتا تھا تو انہوں نے مزید سات روز تک بھڑکنے دیا اور ابراہیم کو اس میں ڈالنا چاہا لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آگ میں کیسے پھینکیں ابلیس نے آکر منجنیق کو بنانے یا چرخی قائم کرنے کی تدبیر بتائی لوگوں نے چرخی بنائی اور سب سے اونچی عمارت کی چوٹی پر اس کو قائم کیا اور ابراہیم کو باندھ کر اس میں بٹھا لیا یہ دیکھ کر آسمان و زمین ملائکہ اور سوائے جن و انس کے ساری مخلوق چیخ پڑی اور عرض کیا اے ہمارے رب ابراہیم تیرا خلیل ہے اور آگ میں اس کو ڈالا جا رہا ہے اس کے سوا روئے زمین پر اور کوئی تیری عبادت کرنے والا

نہیں ہے ہم کو اجازت مل جائے تو ہم اس کی مدد کریں۔ اللہ نے فرمایا ابراہیم میرا خلیل ہے اس کے سوا اور کوئی میرا خلیل نہیں اور میں ہی اس کا معبود ہوں میرے سوا اس کا اور کوئی معبود نہیں۔ اگر وہ تم میں سے کسی کی مدد کا خواستگار ہو یا دعا کرے تو جس سے وہ مدد طلب کرے وہ اس کی مدد کر سکتا ہے میری طرف سے اس کو اجازت ہے اور اگر میرے سوا وہ کسی اور سے مدد کا طلبگار نہ ہو تو میں اس کی حالت کو خوب جانتا ہوں، میں ہی اس کا کارساز ہوں میرے اور اس کے درمیان تم حائل نہ ہو جوں ہی لوگوں نے حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکنا چاہا تو وہ فرشتہ جو پانی کا خازن (کارندہ) تھا آیا اور اس نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا اگر آپ چاہیں تو میں آگ کو بجھا دوں اور ہوا کا مؤکل بھی آیا، اس نے کہا اگر آپ کا منشاء ہو تو میں آگ کو ہوا میں اڑا دوں۔ حضرت ابراہیم نے کہا مجھے تمہارے مدد کی ضرورت نہیں میرے لئے اللہ کافی ہے وہی میرا کارساز ہے۔

حضرت ابی بن کعب کی روایت میں آیا ہے کہ جب لوگوں نے ابراہیم کو آگ میں ڈالنے کے لئے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا تو آپ نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَکَ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الْمُلْکُ لَا شَرِیْکَ لَکَ اس کے بعد منجنیق میں رکھ کر آپ کو آگ کی طرف پھینک دیا گیا، اسی دوران میں جبرئیلؑ نے سامنے سے آکر کہا ابراہیم اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت ہو تو میں موجود ہوں۔ حضرت ابراہیم نے کہا مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں، جبرئیلؑ نے کہا تو پھر اپنے رب سے درخواست کیجئے، حضرت ابراہیمؑ نے کہا مجھے سوال کی کیا ضرورت ہے۔ میری حالت کا اس کو علم ہے، میرے لئے یہی کافی ہے۔

کعب احبار کا بیان ہے ہر چیز نے ابراہیم کی آگ بجھانے میں حصہ لیا سوائے گرگٹ کے یہ آگ کو پھونکیں مار رہا تھا (تاکہ مزید اشتعال پیدا ہو)

بغوی نے بوساطت سعید بن مسیب حضرت ام شریک کی روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کر دینے کا حکم دیا اور فرمایا یہ ابراہیم پر بھڑکتی آگ میں پھونکیں مار رہا تھا اور آگ کو بھڑکا رہا تھا۔

شیخین نے صحیحین میں اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے گرگٹ کو قتل کر دو خواہ کعبہ کے اندر ہی ہو۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کرنے کا حکم دیا اور اس کو فُوَیْسِق (فاسق بچہ) فرمایا۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے گرگٹ کو پرچھے کی پہلی ضرب سے قتل کیا اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور جس نے دوسری ضرب سے قتل کیا اس کے لئے اس سے کم نیکیاں لکھی جائیں گی اور جس نے تیسری ضرب سے قتل کیا اس کے لئے اس سے بھی کم نیکیاں لکھی جائیں گی رواہ مسلم۔

قُلْنَا یٰنَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ ﴿۶۹﴾ ہم نے حکم دیا اے آگ تو ٹھنڈی اور سلامتی بخش ہو جا ابراہیم کے لئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر اللہ سلاماً نہ فرماتا تو آگ کی انتہائی سردی کی وجہ سے ابراہیم مر جاتے۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ سَلٰمًا (کُوْنِیْ کی خبر نہیں ہے) بلکہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے یعنی ہم نے ابراہیم کو کامل طور پر سالم رکھا۔

بغوی نے لکھا ہے بعض آثار میں آیا ہے کہ اس روز تمام روئے زمین کی آگ بجھ گئی تھی دنیا بھر میں کوئی اس روز آگ سے فائدہ نہ اٹھا سکا اگر اللہ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ نہ فرماتا تو ہمیشہ کے لئے آگ ٹھنڈی ہو جاتی۔

میں کہتا ہوں بظاہر آگ کی خاصیت سلب نہیں ہوئی تھی جلانے کی خاصیت حسب معمول موجود تھی۔ لیکن حضرت ابراہیم کے لئے وہ ضرر رساں نہیں رہی تھی۔ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ کا لفظ اسی پر دلالت کر رہا ہے۔

سدی نے کہا ملائکہ نے حضرت ابراہیم کے بازو پکڑ کر زمین پر بٹھا دیا، آپ نے وہاں اچانک شیریں پانی کا چشمہ اور خوب صورت سرخ گلاب کے پھول (اپنی نظر کے سامنے) دیکھے۔ کعب کا بیان ہے آگ سے حضرت کے جسم کا کوئی حصہ متاثر نہیں

ہوا صرف بند ھن کی رسی جل گئی۔ اہل روایت نے کہا ہے ابراہیم وہاں سات روز رہے۔ منہال بن عمرو کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا جس آرام اور راحت کے ساتھ میں چند روز آگ میں رہا اتنے آرام سے کبھی نہیں رہا۔ ابن یسار نے کہا اللہ نے سایہ کے مؤکل کو ابراہیم کی صورت عطا فرما کر بھیجا جو آکر ابراہیم کے پہلو میں آپ کی وحشت دور کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اور بحکم خدا حضرت جبرئیل جنت کا ایک قمیص اور مسند لے کر آئے۔ قمیص حضرت ابراہیم کو پہنایا اور کہا آپ کا رب فرماتا ہے کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے دوستوں کو آگ ضرر نہیں پہنچایا کرتی ہے۔ کچھ مدت کے بعد نمرود نے ایک اونچی عمارت کے اوپر سے حضرت ابراہیم کو جھانک کر دیکھا اور آپ کو باغ میں بیٹھا پایا اور ایک فرشتہ کو (بصورت انسان) آپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھا اور آپ کے چاروں طرف آگ ہی آگ تھی جو لکڑیوں کو جلا رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر پکار کر کہا ابراہیم تیرا معبود بہت بڑا ہے جس کی قدرت اس حد تک ہے کہ وہ تیرے اور اس آگ کے درمیان حائل ہوا جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ابراہیم کیا تو اس سے نکل بھی سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا، ہاں، نمرود نے کہا کیا تجھے اس بات کا ڈر ہے کہ اگر وہاں رہے گا تو آگ تجھے دکھ پہنچائے گی۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا نہیں۔ نمرود نے کہا تو پھر اٹھ کر وہاں سے نکل آ۔ حضرت ابراہیم اٹھ کھڑے ہوئے اور آگ میں قدموں سے چل کر باہر آگئے۔ نمرود نے کہا ابراہیمؑ وہ کون آدمی تھا جو تمہارے پہلو میں میں نے بیٹھا دیکھا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا وہ سایہ کا مؤکل تھا، میرے رب نے آگ کے اندر میری وحشت دور کرنے کے لئے اس کو میرے پاس بھیج دیا تھا، نمرود نے کہا میں تیرے معبود کے لئے کچھ قربانی پیش کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے اس کی قدرت اور طاقت کا ظہور تیرے معاملے میں دیکھ لیا ہے کہ جب تو نے اس کے سوا دوسروں کی عبادت سے انکار کر دیا اور اس کی توحید پر قائم رہا تو اس نے تیرے ساتھ کیسا سلوک کیا، میں اس کے نام پر چار ہزار گائیں قربان کروں گا، حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا جب تک تو اپنا مذہب چھوڑ کر میرے مذہب کو نہ اختیار کرلے گا میرا رب تیری قربانی قبول نہیں کرے گا۔ نمرود نے کہا میں اپنی سلطنت تو نہیں چھوڑ سکتا (مذہب تبدیل کروں گا تو سلطنت چھوڑنا پڑے گی) ہاں قربانی ضرور پیش کروں گا۔ چنانچہ نمرود نے چار ہزار گایوں کی قربانی کر دی اور پھر ابراہیمؑ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اللہ نے ابراہیمؑ کو محفوظ کر دیا۔

شعیب جبائی کا بیان ہے کہ جس وقت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا اس وقت آپ سولہ سال کے تھے۔

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ ۝ اور ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ برائی کرنی چاہی تھی سو ہم نے انہی لوگوں کو ناکام کر دیا۔

فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ کی تشریح میں بعض لوگوں نے کہا کہ قوم نمرود کی مراد حاصل نہیں ہوئی، چیزوں کے نرخ گراں ہوگئے اور مہنگائی بڑھ گئی، بعض نے کہا اللہ نے مچھروں کی فوج بھیج دی جس نے نمرود کا گوشت کھا لیا اور ایک مچھر اس کے دماغ میں گھس گیا جس کی وجہ سے نمرود ہلاک ہو گیا۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے اللہ نے جب ابراہیم کے لئے آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی بخش کر دیا تو یہ منظر دیکھ کر آپ کی قوم کے کچھ لوگ ایمان لے آئے لیکن نمرود اور اس کے حکام کا خوف تھا (اس لئے انہوں نے ایمان کا اعلان نہیں کیا) منجملہ ان کے آپ کے بھتیجے لوط بن ہاران بن تارخ بھی ایمان لے آئے۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارخ تھا جو حضرت لوط کا دادا تھا تارخ بن ثالث تھا، ثالث کو ناخور بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے چچا کی بیٹی سارہ بنت ہاران بھی ایمان لے آئی تھیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے قریۂ کوثی (علاقہ عراق) کو چھوڑ دیا اور لوط و سارہ کو ساتھ لے کر ترک وطن کر دیا، آپ کا یہ ترک وطن اللہ کے واسطے تھا، اپنے دین کو محفوظ رکھنے کی غرض سے تھا اور اطمینان سے اپنے رب کی عبادت کرنے کیلئے تھا، آپ نے فرمایا تھا اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ لوط کے مؤمن ہونے کا ذکر اللہ نے آیۃ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ میں فرمایا ہے۔ کوثی سے چل کر آپ حران پہنچے کچھ مدت وہاں قیام کیا پھر وہاں سے چل کر مصر پہنچے پھر مصر سے شام کی طرف چل دیئے اور علاقہ فلسطین میں سبع کے مقام پر اترے، یہاں سے مؤتفکات کی بستیاں (سدوم وغیرہ جو بحیرۂ میت کے ساحل کی پانچ بستیاں تھیں۔ مترجم) چوبیس گھنٹے کی مسافت پر تھیں حضرت لوط وہاں چلے گئے اور اللہ نے ان کو پیغمبر بنا کر وہاں بھیج دیا۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ اور ہم ابراہیم کو اور لوط کو بچا کر اس زمین کی طرف لے گئے جس میں ہم نے دنیا جہان والوں کے لئے خیر و برکت رکھی تھی۔ برکت سے مراد ہے سرسبزی، باغات، درختوں اور پھلوں کی کثرت۔ منجملہ برکات کے یہ بھی ہے کہ بکثرت انبیاء کی بعثت اس سرزمین پر ہوئی۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے ارض مبارکہ کہنے کی یہ وجہ بیان کی کہ وہاں شیریں پانی کی کثرت ہے اور صخرۂ بیت المقدس کے نیچے سے ایک چشمہ جاری ہے۔

بغوی نے بروایت قتادہ بیان کیا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت کعبؓ سے فرمایا تم مدینہ میں منتقل کیوں نہیں ہو جاتے وہ تو رسول اللہ ﷺ کا مقام ہجرت ہے اور روضۂ پاک بھی وہیں ہے۔ کعب نے کہا امیر المؤمنین! میں نے اللہ کی کتاب (توریت) میں پڑھا ہے کہ ارض شام تمام زمین میں اللہ کا خزانہ ہے اور وہیں اللہ کے خاص بندوں کا خزانہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ آئندہ ہجرت ہوگی (لوگ وطن چھوڑ چھوڑ کر بھاگیں گے) پس بزرگ مرتبہ والے لوگ ابراہیم کے مقام ہجرت کی طرف چلے جائیں گے۔ دوسری روایت میں آیا ہے ابراہیم کے مقام ہجرت سے جو لوگ چمٹے رہیں گے وہ زمین کے تمام باشندوں میں برگزیدہ ہوں گے۔ اور (باقی) زمین پر برے لوگ رہ جائیں گے، ان کی زمینیں ان کو باہر نکال پھینکیں گی اللہ ان سے نفرت کرے گا بندروں اور سوروں کے ساتھ ایک آگ ان کو ہنکائے گی جہاں وہ رات کو قیام کریں گے، آگ بھی رات کو ان کو ساتھ رہے گی اور جہاں وہ دوپہر کو ٹھہریں گے آگ بھی دوپہر کو ان کے ساتھ ٹھہرے گی۔ رواہ ابوداؤد۔

حضرت زید بن ثابتؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شام کے لئے خوشی ہو ہم نے عرض کیا کس وجہ سے فرمایا، رحمت کے فرشتے اپنے پر پھیلائے اس پر سایہ فگن ہوں گے۔ رواہ احمد والترمذی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک آگ حضر موت (یمن) کی طرف سے نکلے گی یا یہ فرمایا کہ حضر موت سے ایک آگ لوگوں کو ہنکا کر لائے گی، ہم نے عرض کیا پھر حضور ہم کو کیا حکم دیتے ہیں فرمایا تمہارے اوپر شام (میں رہنا یا آجانا) لازم ہے۔ رواہ الترمذی۔

حضرت ابو حوالہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عنقریب ایسا ہوگا کہ تمہاری تین مجتمع فوجیں ہو جائیں گی ایک فوج شام میں، ایک فوج یمن میں اور ایک فوج عراق میں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر میں نے وہ زمانہ پالیا تو مجھے حکم دیجئے (میں اس وقت کیا کروں) فرمایا تیرے اوپر شام (میں رہنا یا آجانا) لازم ہے اللہ کی زمین میں شام کی سرزمین برگزیدہ ہے۔ برگزیدہ بندے ہی اس کی طرف آئیں گے اگر تم ایسا نہ کر سکو تو پھر یمن میں رہنا یا اہل یمن کا ساتھ دینا تم پر لازم ہے اللہ نے میرے لئے شام اور اہل شام کی ذمہ داری لی ہے۔ رواہ احمد وابوداؤد۔

شریح بن عبید کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ کے سامنے اہل شام کا ذکر آیا اور لوگوں نے کہا امیر المؤمنین ان پر لعنت کیجئے، فرمایا نہیں۔ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ابدال شام میں ہوں گے اور وہ چالیس آدمی ہوں گے جب ان میں سے کوئی مر جائے گا تو اس کے بدل میں اللہ کسی اور شخص کو مقرر فرما دے گا ان کی برکت سے بارشیں ہوں گی اور انہیں کی وجہ سے دشمنوں پر فتح عطا کی جائے گی اور انہیں کے سبب سے اہل شام کی طرف سے عذاب کا رخ پھیر دیا جائے گا۔ رواہ احمد۔

حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں نے اپنے سر کے نیچے سے نور کا ایک عمود نکلتا دیکھا، یہ ستون جگمگاتا رہا یہاں تک کہ اوپر اٹھنے کے بعد شام میں پہنچ کر ٹھہر گیا۔ رواہ البیہقی فی الدلائل۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ اور ہم نے اس کو عطا کیا اسحٰق اور اس پر مزید یعقوب۔ بعض علماء کا قول ہے کہ عَافِيَةً کی طرح نَافِلَةً بھی مصدر ہے اور گو لفظاً اس کا فعل پہلے مذکور نہیں مگر وَهَبْنَا کا معنی بھی عطا کرنے کے ہیں اس لئے یہ وَهَبْنَا کا مفعول مطلق ہے۔ مجاہد اور عطاء نے کہا نَافِلَةً کا معنی ہے عطیہ۔ اسحٰق اور یعقوب دونوں اللہ کے عطا کردہ تھے اس

صورت میں نَافِلَةً دونوں سے حال ہوگا۔ حسن اور ضحاک نے کہا نافلہ کا معنی ہے فضل مہربانی یعنی ہم نے اپنی مہربانی سے ابراہیم کو بیٹا (اسحق) اور پوتا (یعقوب) عطا کیا۔ اس صورت میں نَافِلَةً علت ہے (مفعول لہ) ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابی بن کعب، ابن زید اور قتادہ کا قول مروی ہے، کہ نَافِلَةً صرف یعقوب تھے، نَافِلَةً کا معنی ہے زائد۔ حضرت ابراہیم نے اللہ سے بیٹا مانگا تھا اور دعا کی تھی رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور اسحاق کا بیٹا عطا فرمادیا اور مزید اپنی طرف سے (بلا طلب) پوتا (یعقوب) بھی عطا کردیا۔ اس صورت میں نَافِلَةً یعقوبؑ سے حال ہوگا۔ اس کا قرینہ موجود ہے اس لئے عبارت میں کوئی کمزوری نہیں۔

وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ اور (ابراہیمؑ، لوطؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ میں سے) ہر ایک کو ہم نے صالحین میں سے کر دیا۔ یعنی غیر اللہ کے ساتھ لگاوٹ سے ان کے دلوں کو پاک صاف کردیا۔ برے اخلاق و اعمال سے ان کو شستہ رکھا، ہر زنگ کو ان کے نفسوں سے صاف کردیا اور پھر اعلیٰ اوصاف و اخلاق کی ان کے دلوں پر جلا کردی، گناہوں کی آلودگی سے ان کے بدنوں کو پاک رکھا۔ طاعت و صلاح میں ہر وقت مشغول رکھا، بگاڑ کہیں پیدا نہ ہونے دیا، نہ دل میں، نہ نفس میں، نہ جسمانی اعمال و اطوار میں۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا اور بنایا ہم نے ان کو بھلائیوں اور صحیح افکار و اعمال میں لوگوں کا پیشوا جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کو ہدایت کرتے تھے۔ ہمارے دین کا راستہ بتاتے تھے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝

اور ہم نے ان کے پاس حکم بھیجا نیک کام کرنے کا اور خصوصاً نماز کی پابندی کا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اور وہ ہماری ہی عبادت کرنے والے تھے۔

خیرات، یعنی وہ باتیں جو بذات خود بھی اچھی ہیں اور شریعت نے بھی ان کو اچھا قرار دیا ہے، اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ کا عطف فِعْلَ الْخَيْرٰتِ پر ہے۔ زکوٰۃ اور صلوٰۃ خصوصیت کے ساتھ اچھے اور اہم امور ہیں ان کا عطف عام فعل الخیرات پر ایسا ہی ہے جیسے اہمیت کی وجہ سے عام پر خاص کا عطف کردیا جاتا ہے۔ اصل کلام اس طرح تھا ہم نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ اچھے کام کریں اور کامل طور پر نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ۔ یعنی وہ موحد اور عبادت کرنے میں مخلص تھے۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ

اور ہم نے لوطؑ کو دیا حکم و علم (حکمت یا نبوت یا مقدمات کو فیصل کرنے کی قوت) اور ہم نے اس کو اس بستی سے جو گندی حرکات کرتی تھی بچالیا۔ علم سے مراد ہے اللہ کی ذات و صفات کا اور پیغمبرانہ اوصاف کا علم۔ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ یعنی بستی والے گندے کام کرتے تھے، خبائث سے مراد ہے لواطت اور غلے مارنا اور پرندوں سے کھیلنا وغیرہ۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝ بلاشبہ وہ بڑے بدکار نافرمان لوگ تھے۔ یہ جملہ سابق کلام کی علت ہے۔

وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اور ہم نے لوطؑ کو اپنی رحمت میں داخل کرلیا، کیونکہ وہ بلاشبہ نیکوں میں سے تھے۔

رحمت سے مراد ہے اہل رحمت یا جنت۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ عالم مثال میں بنظر کشف اللہ کی صفات بصورت دائرہ دکھائی دیتی ہوں اور یہ بھی نظر آتا ہو کہ صوفی اپنی حقیقت کے فناء اور صفات الٰہی کی ساتھ بقاء کے مرتبے میں داخل ہو رہا ہے۔ گویا نَجَّيْنٰهُ سے مراد یہ ہے کہ لوطؑ کو کثافت ذاتی سے ہم نے نکال دیا اور اَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے اپنی صفات کے دائرہ میں اس کو داخل کردیا الصّٰلِحِيْنَ یعنی وہ لوگ جن کے لئے پہلے سے ہی اللہ نے بھلائی مقدر کردی ہے۔

وَنُوْحًا اور نوحؑ کو اس کا عطف لُوْطًا پر ہے یعنی ہم نے نوحؑ کو حکم اور علم عطا کیا تھا۔

اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ جب کہ مذکورہ انبیاء سے پہلے انہوں نے اپنے رب کو پکارا تھا۔ یعنی قوم کو ہلاک کرنے کے لئے بددعا کی تھی۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ پس ہم نے ان کی دعا کو قبول کر لیا۔

فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ اور ہم نے ان کو اور ان کے اہل کو یعنی ان لوگوں کو۔

مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ جو ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سخت غم سے نجات دی۔ ابن عباسؓ نے فرمایا، ڈوبنے سے اور قوم کی جانب سے تکذیب سے نجات دی۔ حضرت نوحؑ کی عمر تمام انبیاء سے زیادہ ہوئی۔ اور سختیاں بھی آپ نے سب سے زیادہ برداشت کیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قوم والے حضرت نوح کو مارتے تھے اور اتنا مارتے تھے کہ اپنے خیال میں مردہ کر دیتے تھے پھر ایک نمدہ میں لپیٹ کر گھر میں ڈال دیتے تھے۔ لیکن دوسرے روز آپ پھر گھر سے برآمد ہو کر لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے۔

محمد بن اسحاق نے بیان کیا کہ عبید بن عمیر لیثی نے کہا مجھے اطلاع پہنچی ہے کہ لوگ حضرت نوحؑ کو پکڑ کر آپ کا گلا گھونٹتے کہ آپ بیہوش ہو جاتے پھر ہوش آتا تو کہتے میرے رب میری قوم کو بخش دے وہ ناواقف ہیں۔

وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا ہم نے نوحؑ کا بدلہ ان لوگوں سے جنہوں نے ہمارے احکام کو جھوٹا قرار دیا لے بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾ لیا، بلاشبہ وہ برے لوگ تھے سو ہم نے ان سب کو ڈبو دیا۔

وَنَصَرْنٰهُ اور ہم نے اس کی مدد کی، پس وہ غالب آ گیا اور نجات پائی۔ بِاٰيٰتِنَا یعنی ہماری ان آیات کی جو نوحؑ کی رسالت کو ثابت کر رہی تھیں۔ بیضاوی نے لکھا ہے اللہ نے ساری قوم نوح کو ہلاک کر دیا، کیوں کہ انہوں نے حق کی تکذیب بھی کی تھی اور عملی شر میں بھی ڈوبے ہوئے تھے۔ جس قوم کے اندر بھی یہ دونوں خرابیاں یکجا ہو گئیں، شاید اللہ نے اس ساری قوم کو برباد ہی کر دیا۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اور داؤدؑ و سلیمانؑ کا تذکرہ کیجئے جب دونوں ایک کھیت کے بارے میں مشورہ کرنے لگے۔

حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ اور اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ وہ کھیت انگور کی بیلوں کا تھا جس میں خوشے نکل آئے تھے، قتادہ نے کہا وہ غلے کا کھیت تھا۔

اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ جب کہ اس کھیت میں کچھ لوگوں کی بکریاں جا پڑی تھیں۔ اذ کا تعلق یحکمان سے ہے یعنی وہ دونوں اس وقت فیصلہ کر رہے تھے جب کچھ لوگوں کی بکریاں بغیر چرواہے کے کسی کے کھیت میں پھیل گئی تھیں اور انہوں نے رات کے وقت کھیت کو چرواہے کی غیر موجودگی میں چر لیا تھا۔ کذا فی القاموس۔ نہایہ میں ہے نَفَشَتِ السَّائِمَةُ چرنے والے جانوروں نے رات کے وقت چرواہے کی غیر موجودگی میں چر لیا۔ اگر دن میں بغیر چرواہے کے کسی کھیت یا محفوظ چراگاہ میں جا پڑیں اور چرنے لگیں وَهَمَلَتِ السَّائِمَةُ کہا جاتا ہے۔ نَفْش کا لغوی معنی ہے پھیل جانا دھنی ہوئی اون کو بھی اسی مناسبت سے عِهْنِ مَنْفُوْش کہا جاتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ۔

وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ اور ہم ان سب کے فیصلے سے واقف تھے۔

سب سے مراد ہیں داؤد، سلیمان اور فریقین مقدمہ۔ فراء نے کہا صرف حضرت داؤد، حضرت سلیمان مراد ہے جمع کا صیغہ بول کر تثنیہ دو فرد مراد ہو سکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا فَاِنْ كَانَ لَهٗ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ اگر میت کے چند بھائی ہوں تو اس کی ماں کا (کل مال کا) چھٹا حصہ ہوگا۔ باجماع علماء اِخْوَةٌ (جو جمع کا صیغہ ہے) سے مراد کم سے کم دو بھائی ہیں۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ پس ہم نے (صحیح) فیصلہ یا فتویٰ سلیمان کو سمجھا دیا، ان کی سمجھ میں ڈال دیا۔ اس جگہ کچھ کلام محذوف ہے، پورا کلام اس طرح تھا۔ ہمارے سمجھانے کے مطابق سلیمان نے فیصلہ کر دیا اور داؤد نے اپنا فیصلہ منسوخ کر کے

سلیمان کا فیصلہ جاری کر دیا۔

بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ اللہ نے داؤد کے لئے کتاب اللہ کی تلاوت بہت آسان کر دی تھی۔ گھوڑوں پر زینیں کسنے کا حکم دے کر وہ قرآن پڑھنا شروع کرتے تھے اور زینیں کسنے نہ پاتی تھیں کہ وہ پڑھ لیتے تھے اور داؤد صرف اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔

میں کہتا ہوں اس حدیث میں قرآن سے مراد زبور ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس اور قتادہ کا یہی قول بتایا ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ فیصلہ کرنے کے بعد اگر حاکم کی رائے بدل جائے تو حکم جاری کرنے سے پہلے وہ سابق فیصلہ کو منسوخ کر سکتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس، قتادہ اور زہری نے بیان کیا کہ دو آدمی حضرت داؤد کے پاس آئے، ایک کھیت کا مالک تھا اور دوسرا بکریوں کا۔ کھیت والے نے کہا اس کی بکریاں رات کو چھوٹ کر میرے کھیت میں پڑ گئیں اور سارا کھیت چر گئیں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ حضرت داؤدؑ نے فیصلہ کیا کہ کھیت کے عوض وہ بکریاں کھیت والے کو دے دی جائیں۔ حضرت داؤد کے پاس سے دونوں حضرت سلیمانؑ کے پاس آئے۔ حضرت سلیمانؑ نے پوچھا تم دونوں کے مقدمہ کا کیا فیصلہ ہوا جو فیصلہ حضرت داؤدؑ نے کیا تھا دونوں نے بیان کر دیا، حضرت سلیمانؑ نے فرمایا اگر تمہارا مقدمہ میرے سپرد کر دیا جاتا تو میرا فیصلہ کچھ اور ہی ہوتا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے یہ بھی کہا تھا کہ میرا فیصلہ دونوں کے لئے فائدہ بخش ہوتا۔ حضرت سلیمانؑ کے اس قول کی اطلاع حضرت داؤدؑ کو بھی ہو گئی۔ آپؑ نے سلیمانؑ کو بلوا کر فرمایا، تم فیصلہ کرو۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اپنی نبوت اور حق پدری کا واسطہ دے کر فرمایا، مجھے بتاؤ وہ کیا فیصلہ ہے جو فریقین کے لئے سود مند ہے۔ حضرت سلیمان نے کہا بکریاں کھیت والے کو دے دیجئے اور کھیت بکریوں کے مالک کے سپرد کر دیجئے۔ کھیت والا بکریوں کے دودھ، اون اور نسل سے اتنی مدت تک فائدہ اندوز ہوتا رہے جتنی مدت تک کھیت بکریوں والے کی سپردگی میں رہے۔ بکریوں کا مالک کھیت کو درست کر کے اس میں بیج بکھیر دے اور جب کھیتی تیار ہو کر اصلی حالت پر آجائے تو تیار کھیت، کھیت والے کو دیدے اور اپنی بکریاں واپس لے لے۔ حضرت داؤد نے فرمایا صحیح فیصلہ یہی ہے جو تم نے کیا پھر آپ نے یہ فیصلہ جاری کر دیا۔ روایت میں آیا ہے کہ فیصلہ کرنے کے وقت حضرت سلیمانؑ کی عمر گیارہ سال کی تھی۔

ابن ابی شیبہ نے المصنف میں اور ابن المنذر و ابن مردویہ نے بھی حضرت ابن عباس کی روایت سے بغوی کے اس بیان کی طرح قصہ نقل کیا ہے، بیضاوی نے لکھا ہے حضرت داؤدؑ کا فتویٰ امام ابو حنیفہؒ کے فتوئی کی طرح ہے جو مجرم غلام کے سلسلہ میں آپ نے دیا ہے اور حضرت سلیمانؑ کا فیصلہ امام شافعیؒ کے فتوے کی طرح ہے کہ مغصوب غلام اگر بھاگ جائے اور کوئی جنایت کر لے تو تاوان میں غلام سے کمائی کرائی جائے اور کمائی سے جب اصل حق ادا ہو جائے تو پھر غلام اصل مالک کو واپس کیا جائے۔

میں کہتا ہوں امام ابو حنیفہؒ فقط اس کے قائل نہیں کہ غلام کے آقا پر تاوان جنایت عائد کیا جائے گا اور عبد کو جنایت کے عوض میں صاحب حق کو دے دیا جائے گا بلکہ ان کے نزدیک تو غلام کا مالک اختیار رکھتا ہے خواہ جنایت عبد کا تاوان اپنے پاس سے ادا کرے یا غلام ہی کی ملکیت منتقل کر دے اور غلام کو ہی صاحب حق کی ملکیت میں دے دے۔ مطلب یہ کہ امام ابو حنیفہ کا فتویٰ حضرت داؤدؑ کے فیصلے کی طرح نہیں ہے جس میں بکریوں کی ملکیت سے محروم کر دیا گیا تھا، بلکہ امام کا فیصلہ اپنے اندر دونوں رخ رکھتا ہے غلام کو ہی تاوان میں دے دیا جائے یا غلام کا مالک اپنے پاس سے تاوان ادا کرے اور غلام کو اپنے ملکیت میں باقی رکھے۔

جصاص نے کہا تاوان ادا کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ انہوں نے بکریوں کو باندھ کر نہیں رکھا تھا۔ بعض اقوال میں آیا ہے کہ اسلام میں یہ حکم منسوخ ہے۔ بلکہ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا قول یہ ہے کہ اگر مویشی چھوٹ جائیں اور رات کو کسی کا نقصان کر دیں تو بقدر نقصان جانوروں کے مالک پر تاوان عائد ہو گا اور اگر چھوٹے ہوئے دن میں کسی کے کھیت وغیرہ کا نقصان

کردیں تو کوئی تاوان عائد نہیں ہوگا۔

میں کہتا ہوں شاید حضرت داؤدؑ کے زمانے میں تلف شدہ کھیتی کی قیمت چرنے والی بکریوں کے برابر ہوگی اسی لئے تو آپ نے کھیت والے کے حق میں ساری بکریوں کی ڈگری دے دی۔

عام طور پر رواج ہے کہ کھیت والا دن میں کھیتی کی رکھوالی کرتا ہے اور جانور بھی دن ہی میں چرتے ہیں اور شام کو گھر واپس آجاتے ہیں اس لئے دن میں کھیتی تلف ہوجانے کی ذمہ داری کھیتی کی حفاظت نہ کرنے والے پر ہے، اور رات میں کھیتی تلف کرنے کی ذمہ داری جانوروں کے مالک پر ہے کہ اس نے رات کو جانوروں کو باندھ کر نہیں رکھا۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک چھوٹے ہوئے جانوروں نے کسی کی کھیتی کو دن میں نقصان پہنچایا ہو یا رات میں، مالک مویشی پر کوئی تاوان نہیں پڑے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ اَلْعَجْمَاءُ جُرْحُهَا جُبَارٌ رواہ الشیخان فی الصحیحین واحمد واصحاب السنن من حدیث ابی ہریرۃؓ۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے امام محمدؒ نے فرمایا عجماء سے مراد ہیں چھوٹے ہوئے جانور یعنی اگر چھوٹے ہوئے جانور کسی کو زخمی کردیں تو اس کا کچھ معاوضہ نہیں۔ جمہور نے حرام بن سعد بن محیصہ کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت براء بن عازب کی اونٹنی نے کسی کے باغ (یا کھیت) میں داخل ہو کر کچھ نقصان کردیا۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے مقدمہ آیا تو آپ نے فیصلہ کیا دن میں کھیتوں کی حفاظت ان کے مالکوں کے ذمہ ہے اور رات کو جانوروں نے کچھ نقصان کیا ہے تو جانوروں کے مالک پر اس کا تاوان پڑے گا۔ رواہ مالک فی الموطا والشافعی واصحاب السنن الار بعۃ والدار قطنی وابن حبان والحاکم والبیہقی۔ امام شافعی نے فرمایا اسی حدیث سے ہم نے اپنے قول پر استدلال کیا ہے۔ یہ حدیث متصل ہے اور اس کے راوی معروف ہیں۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے اس حدیث کی روایت کا مدار زہری پر ہے اور زہری کے الفاظ میں دوسری سند کے لحاظ سے اختلاف ہے موطا کی روایت تو وہی ہے جو ذکر کردی گئی اور لیث از زہری کی روایت میں عن ابی محیصہ کا نام نہیں ہے اور معن بن عیسیٰ کی جو روایت عن مالک ہے اس میں عن جدہ محیصہ آیا ہے اور معمر عن الزہری کی روایت عن حرام عن ابیہ آیا ہے اور اس کا متابع کوئی نہیں۔ اخرجہ ابوداؤد وابن حبان۔ لیکن اوزاعی اور اسماعیل بن امیہ اور عبداللہ بن عیسیٰ نے جو زہری کی حدیث نقل کی ہے اس میں عن حرام عن البراء آیا ہے۔

میں کہتا ہوں ابن جوزی نے تحقیق التعلیق میں از طریق احمد اسی طرح بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے کہا حرام نے براء سے سماعت نہیں کی عبدالحق نے ابن حزم کے اتباع میں ایسا ہی کہا ہے۔ نسائی نے من طریق محمد ابن ابی حفصہ عن الزہری اس طرح بیان کیا، زہری نے کہا مجھ سے ابوامامہ بن سہل نے خبر دی کہ براء کی اونٹنی الخ۔

ابن ذئب کی روایت میں ہے کہ زہری نے کہا مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ براء کی اونٹنی الخ پس تینوں اماموں نے العجماء جرحہا جبار کے عموم کا ناقۃ البراء والی حدیث کو مخصص قرار دیا اور کہا العجماء جبار کا حکم بھی دن کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہم کہتے ہیں عام بھی خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے جب تک دونوں کا ایک وقت میں ہونا ظاہر نہ ہوجائے اس کو منسوخ قرار دیا جائے گا اور اگر اقتران زمانی یا تاخر زمانی کچھ بھی ثابت نہ ہو تو تعارض قائم رہے گا اور چونکہ حدیث العجماء جبار اور حدیث ناقۃ البراء کا نہ ایک زمانے میں ہونا ظاہر ہوا کہ عام کو خاص پر محمول کر سکیں، نہ تاخر و تقدم ثابت ہے کہ سابق کو منسوخ سمجھا جائے اس لئے دونوں میں تعارض باقی ہے پس شک کی حالت میں تاوان عائد ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ قاعدہ ہے کہ دو حدیثوں کا تعارض اگر دور نہ ہو سکے تو قیاس کی طرف رجوع کرنا لازم ہے اور قیاس چاہتا ہے کہ ضمان تاوان عائد نہ کیا جائے کیونکہ مویشیوں کے مالک کا کوئی قصور نہیں وہ موجود ہی نہ تھا مویشی آزاد تھے، نہ اس نے جانوروں کو چھوڑ دیا تھا، نہ ہنکایا تھا، نہ کھینچ کر لایا تھا، کسی موجب ضمان فعل کی اس کی طرف نسبت نہیں کی جاسکتی اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ اگر کسی نے کوئی جانور مسلمانوں کے راستہ میں چھوڑ دیا اور جانور نے کسی کو دکھ پہنچادیا تو تاوان چھوڑنے والے پر عائد ہوگا، کیونکہ جب تک وہ جانور اس راستہ پر چلتا رہے گا اس کی رفتار کی نسبت چھوڑنے والے کی طرف رہے گی ہاں اگر جانور کسی طرف کو مڑ گیا دائیں یا بائیں ہو گیا

ٹھہر گیا اور اس کے بعد کسی کو دکھ پہنچایا تو مالک کی طرف یہ فعل منسوب نہ ہوگا، راہ پر چھوڑنے کا حکم منقطع ہوگا۔

مسئلہ: اگر گھوڑے والا گھوڑے پر سوار ہو یا لگام پکڑے لئے جا رہا ہو یا پیچھے سے ہنکار رہا ہو اور گھوڑا کسی کو لات مار دے یا روند ڈالے یا سر مار دے یا کاٹ لے یا اندھا دھند چل پڑے یا کسی سے ٹکرا جائے یا کھڑا کھڑا کسی کو ٹکر مار دے اور وہ جگہ گھوڑے والے کی ملک ہو یا ٹھیکے وغیرہ کے ذریعہ سے اس کے قبضہ میں ہو تو سوائے اول الذکر صورت کے باقی کسی صورت میں گھوڑے والے پر تاوان عائد نہ ہوگا صرف پہلی صورت میں ضمان دینا پڑے گا کیونکہ سوار ہونے کی حالت میں اس کا بوجھ گھوڑے کی پشت پر پڑے گا ایسی حالت میں اگر گھوڑا کسی کو روند ڈالے گا تو گویا سوار بھی گھوڑے کے ساتھ روندنے میں شریک سمجھا جائے گا۔ پس اس حالت میں اس سوار کو مرتکب اتلاف قرار دیا جائے گا۔ باقی صورتوں میں ہم نقصان رسانی اور ایذاوہی کا سبب آخریں کہہ سکتے ہیں اور مسبب پر تاوان اس وقت عائد ہوگا جب اس کی طرف سے بالارادہ اس فعل کا ظہور ہو (اور خود وہ چاہتا ہو کہ گھوڑے سے کسی کو ضرر پہنچے) اور مذکورہ بالا صورتوں میں بالارادہ ایذا رسانی کا سبب پیدا کرنا ثابت نہیں لیکن اگر وہ جگہ گھوڑے کے مالک کی نہ مملوک ہو نہ مقبوض بلکہ اس کو وہاں چلنے کی اجازت ہو کھڑا رہنے کی اجازت نہ ہو جیسے عام شاہراہ یا چلنے اور ٹھہرنے دونوں کی اجازت ہو جیسے کوئی جنگل یا مویشیوں کا نخاسہ جہاں سے گزرنے اور ٹھہرنے دونوں کی اجازت ہوتی ہے اس حالت میں مذکورہ بالا تمام صورتوں میں تاوان عائد ہوگا، خواہ سوار ہو یا لگام پکڑے جا رہا ہو یا پیچھے سے ہنکار رہا ہو لیکن ان حالات میں بھی اگر گھوڑا کسی کو لات مار دے یا دم مار کر کچھ ضرر پہنچا دے تو گھوڑے والے پر کوئی تاوان نہ ہوگا کیونکہ عام راستہ میں سلامتی کے ساتھ دوسرے کو ضرر پہنچائے بغیر گزرنا ہر مسلمان کا حق ہے راستہ سب کا مشترکہ ہے راستہ سے فائدہ اٹھانا بھی ہر ایک کا حق ہے لیکن یہ اباحت اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ دوسرے کو ضرر نہ پہنچے مگر اسی حد تک سلامتی ضروری ہے اس حد تک گزرنے والے کے حدود اختیار میں ہو، سوار کے لئے یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو گھوڑے کے قدموں سے نہ روند ڈالے کسی کو روندنا حق سیر کا تقاضا نہیں۔ ہاں چلنے میں دم اور لات سے لوگوں کو محفوظ رکھنا سوار کے اختیار سے باہر ہے پس اگر چلتے چلتے گھوڑا سر راہ کسی کے لات مار دے یا دم سے کچھ ضرر پہنچا دے تو سوار کو شریک جرم نہیں قرار دیا جا سکتا صرف اس وقت سوار پر تاوان عائد ہوگا جب وہ مسلمانوں کے راستے میں گھوڑے کو کھڑا کر دے اور اس حالت میں گھوڑا کسی کے لات یا دم مار دے۔

امام مالک نے فرمایا اگر گھوڑے کے سوار یا لگام پکڑ کر چلانے والے یا ہنکانے والے کی طرف سے گھوڑے کو کچھ ترغیب نہ ہو یا گھوڑے کو وہ مارے نہیں تو مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی صورت میں گھوڑے والے پر کوئی تاوان نہیں ہوگا اس گھوڑے کو بھڑکی دیں یا ماریں اور کسی کو گھوڑے سے کچھ ضرر پہنچ جائے تو گھوڑے پر تاوان عائد ہوگا، العجماء جبار حدیث مبارک ہے جس میں عجماء کی ضرب کو بلا معاوضہ قرار دیا ہے۔

امام شافعی نے فرمایا جانور اپنے منہ یا ٹانگ یا دم سے اگر کسی کو کچھ دکھ پہنچا دے تو گھوڑے والے پر تاوان عائد ہوگا خواہ اس کی طرف سے کوئی سبب ضرر پیدا ہوا یا نہ پیدا ہوا ہو اور خواہ گھوڑے پر اس وقت سوار ہو یا ہنکا کرلے جا رہا ہو یا کچھ بھی نہ کرے صرف ساتھ ہو۔

امام احمد نے فرمایا اگر گھوڑے کا مالک گھوڑے پر سوار ہو اور گھوڑا اپنے منہ یا اگلی ٹانگوں سے کسی کو ضرر پہنچا دے تو مالک پر ضمان عائد ہوگا اور اگر لات مارنے سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو مالک پر کوئی تاوان نہ ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے الرجل جبار لات کا کوئی معاوضہ نہیں۔ رواہ الدار قطنی عن سعید بن المسیب مرسلاً۔ واللہ اعلم۔

فائدہ

مجاہد نے کہا حضرت سلیمانؑ کا فیصلہ صلح کے طور پر تھا اور حضرت داؤد کا فیصلہ حکم تھا اور صلح حکم سے بہتر ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں کا فیصلہ وحی پر مبنی تھا، لیکن حضرت سلیمان کا فیصلہ ناسخ تھا جس سے حضرت داؤد کا فیصلہ منسوخ ہو گیا یہ قول ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ انبیاء کے لئے اپنے اجتہاد سے کوئی حکم دینا جائز

نہیں۔ کیونکہ ان کے پاس وحی آتی ہے۔ ان کو اجتہاد کی ضرورت نہیں۔ اجتہاد میں تو غلطی ممکن ہے، اور انبیاء سے غلطی کا صدور ممکن نہیں۔ ظاہر ہے ... دونوں بزرگوں کا فیصلہ اجتہادی تھا۔ حضرت داؤدؑ کا اجتہاد غلط تھا اور حضرت سلیمانؑ کا صحیح۔ اللہ تعالیٰ نے سلیمانؑ کے فیصلہ کی تعریف فرمائی۔ انبیاء کے اجتہاد میں غلطی ہو سکتی ہے۔ مگر انبیاء اس پر قائم نہیں رہتے جب حق واضح ہو جاتا ہے تو وہ اپنے فیصلے سے رجوع کر لیتے ہیں۔

وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۔ اور ہم نے دونوں کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا۔

حسن نے کہا اگر آیت وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا نہ ہوتی تو حکام تباہ ہو جاتے لیکن اللہ نے اس آیت میں ہر اجتہادی فیصلہ کی تعریف فرمائی ہے۔

آیت وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مجتہد کا اجتہاد مبنی بر صواب ہوتا ہے (کسی کو مخطی نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اللہ نے اس آیت میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں کی تعریف فرمائی ہے)۔

لیکن ظاہر یہ کا یہ استدلال غلط ہے آیت سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بزرگوں کو اللہ نے قوت فیصلہ و علم عطا کی تھی دونوں فیصلوں کا صحیح ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ آیت فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کا فیصلہ صحیح تھا اور حضرت داؤدؑ کا فیصلہ اس کے خلاف تھا یعنی غلط۔

حضرت عمرو بن عاص کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا فرما رہے تھے جب حاکم اجتہاد کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرے اور فیصلے میں حق پر پہنچ جائے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہو گا اور اگر اجتہادی فیصلہ میں اس سے غلطی ہو جائے تب اس کے لئے اکہرا اجر ہے۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین واحمد واصحاب السنن الاربعۃ والترمذی عن ابی ہریرۃؓ۔

یہ حدیث صراحۃً بتا رہی ہے کہ مجتہد سے فیصلہ میں غلطی بھی ہو جاتی ہے اور کبھی اس کا فیصلہ حق بھی ہوتا ہے صواب و خطا یکجا جمع نہیں ہو سکتے یا فیصلہ صحیح ہو گا یا غلط، لیکن فیصلہ میں غلطی ہو جائے تب بھی اس کو ایک اجر ضرور ملے گا، غلطی ہو جانے کی بناء پر نہیں بلکہ فکری کوشش اور اجتہاد پر اس کو اکہرا اجر ملے گا۔ اجتہاد بجائے خود عبادت ہے طلب حق کی کوشش موجب اجر ہے اجتہاد کے بعد غلطی قابل تسامح ہے اور صحت نتیجہ کی صورت میں دو اجر ہوں گے ایک طلب حق کی کوشش کا اور دوسرا حق پر پہنچ جانے کا۔ واللہ اعلم۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا میں نے سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے دو عورتیں تھیں ہر ایک کا ایک ایک بچہ اس کے ساتھ تھا بھیڑیا آیا ایک بچہ کو لے گیا، ایک عورت نے دوسری سے کہا بھیڑیا تیرے بچے کو لے گیا میرا بچہ محفوظ ہے، دوسری نے اس کی تردید کی اور کہا تیرے بچے کو لے گیا میرا بچہ یہ ہے جو موجود ہے دونوں جھگڑا لے کر حضرت داؤدؑ کی خدمت میں حاضر ہوئیں آپ نے بڑی کو ڈگری دے دی اور چھوٹی ہار گئی اس کے بعد دونوں کا گزر حضرت سلیمانؑ کی طرف سے ہوا اور آپ سے تفصیل بیان کی۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا، میرے پاس چھری لے آؤ میں بچے کے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو بانٹ دوں گا یہ سنتے ہی چھوٹی بولی آپ پر اللہ کی رحمت ہو یہ بچہ بڑی کا ہی ہے اسی کو دے دیجئے۔ حضرت سلیمانؑ نے بچہ چھوٹی کو دلوا دیا۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۔ اور ہم نے داؤد کے ساتھ تابع کر دیا تھا پہاڑوں کو جو داؤدؑ کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے اور پرندوں کو بھی۔

کہا گیا ہے کہ داؤدؑ جب ذکر کرتے کرتے سست پڑ جاتے تھے اور بدن میں کچھ کسل آ جاتا تھا تو آپ کے ساتھ پہاڑ تسبیح پڑھنے لگتے تھے تاکہ پہاڑوں کی تسبیح سن کر داؤدؑ میں ذکر الٰہی کرنے کی تازہ چستی پیدا ہو جائے اور پرندے بھی آپ کے ساتھ تسبیح میں مشغول رہتے تھے۔ اَلطَّيْرَ کا عطف اَلْجِبَالَ پر ہے پرندوں کی تو پھر بھی ظاہری زبان ہوتی ہے وہ کچھ نہ کچھ بولتے ہی ہیں لیکن پہاڑوں کی کوئی زبان بظاہر نہیں ہوتی، پہاڑوں کا تسبیح خداوندی میں مشغول ہونا بہت ہی تعجب آفریں ہے اسی لئے

اَلْجِبَالَ کا ذکر اَلطَّیْرَ سے پہلے کیا۔

وہب نے کہا حضرت داؤد کی تسبیح کے جواب میں پہاڑ اللہ کی پاکی بیان کرتے تھے اور پرندوں کا بھی یہی حال تھا۔ قتادہ نے کہا یعنی جب داؤد نماز پڑھتے تھے تو پہاڑ بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا، حضرت داؤد درختوں اور پتھروں کی تسبیح کو سمجھتے تھے۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ یُسَبِّحْنَ سَبَاحَتْ سے ماخوذ ہے اور سباحت کا معنی ہے تیرنا چلنا، حضرت داؤد چلتے تھے تو پہاڑ بھی آپ کے ساتھ چلتے تھے۔

وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ اور ایسا کرنے والے ہم ہی تھے۔ یعنی داؤد کو علم و حکمت کی فہمائش اور پہاڑوں اور پرندوں کی تسخیر ہمارا فعل تھا۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور ہم نے اس کو زرہ بنانے کی صنعت تم لوگوں کے فائدے کے لئے سکھائی تاکہ وہ تم کو لڑائی میں ایک دوسرے کی زد سے محفوظ رکھے۔ تو کیا تم اب بھی شکر ادا نہ کرو گے۔

لَبُوْسٍ ہر پہننے والی چیز کو کہتے ہیں عرفاً اس کا استعمال اسلحہ کے لئے ہوتا ہے اس جگہ لوہے کی زرہ مراد ہے۔ قتادہ نے کہا حضرت داؤد سے پہلے زرہ سپاٹ ہوتی تھی، سب سے اول آپ نے جال دار زرہ بنائی اور کڑیاں جوڑ کر جھول کی شکل دی۔ حدیث صحیح پہلی گزر چکی ہے کہ حضرت داؤد اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔

لَكُمْ سے خطاب قریش کو ہے۔ لِتُحْصِنَكُمْ تاکہ وہ صنعت یا حلقہ دار زرہ تم کو دشمن کے حملے سے محفوظ رکھے۔ سدی نے کہا اسلحہ کی مار پڑنے سے تم کو محفوظ رکھے۔ فَهَلْ اَنْتُمْ پس اے اہل مکہ ہم نے جو دشمن سے محفوظ رہنے کا ذریعہ تمہارے لئے آسان کر دیا۔ کیا اس کا تم شکریہ ادا کرو گے۔ هَلْ اَنْتُمْ میں امر بصورت استفہام ہے۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ اور ہم نے سلیمان کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا، سلیمان کا عطف داؤد پر ہے اور اَلرِّیْحَ کا عطف اَلْجِبَالَ پر۔ حرف عاطف ایک ہی ہے۔ کیونکہ دونوں ایک ہی عامل کے مفعول ہے۔ بعض اہل تحقیق نے بیان کیا ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کا داؤد کے ساتھ تسبیح پڑھنا بامر داؤد نہ تھا بلکہ براہ راست اللہ کے حکم تسخیری کے ماتحت تھا اس لئے داؤد کے ساتھ لفظ مَعَ (ساتھ) ذکر کیا اور ہوا کی رفتار بامر سلیمان ہوتی تھی اس لئے لسیمان سلیمان کے لئے لام کے ساتھ فرمایا۔

عَاصِفَةً تیز، کہ تھوڑے وقت میں سلیمان کو لشکر سمیت دور لے جاتی تھی اللہ نے فرمایا ہے غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ شروع آدھے دن کی رفتار ہوا ایک مہینے کی مسافت کے برابر اور آخری آدھے دن کی رفتار ایک ماہ کی مسافت کے بقدر تھی۔ اتنی تیز رفتار کے باوجود ہوا کی چال نرم تھی جھکڑ نہ تھے خوشگوار تھی (زیروزبر کرنے والی نہ تھی) بعض لوگوں نے کہا ہوا کی رفتار حضرت سلیمان کی مرضی کے تابع تھی کبھی تند کبھی نرم۔

تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۚ سلیمان کے حکم سے ہوا اس زمین کی طرف چلتی جس میں ہم نے برکت عطا کی ہے۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اِلَى الْاَرْضِ میں اِلٰی بمعنی فی (میں) ہے یعنی ملک شام میں مراد یہ ہے کہ بحکم سلیمان ہوا آپ کو فرودگاہ شام سے اصل وطن کی طرف لے جاتی تھی۔ حضرت سلیمان وطن سے صبح کو چل کر ملک شام میں جا کر فروکش ہوتے تھے اور پچھلے دن میں ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر شام سے اصل وطن کی طرف لوٹ آتے تھے۔ بعض نے کہا اِلٰی اس جگہ اپنے اصلی معنی پر ہے۔

وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ اور (ازل میں ہی) ہم ہر چیز سے واقف تھے۔ یعنی ہماری ازلی مصلحت کا جو تقاضا ہے اور ہماری حکمت جو چاہتی ہے ہم اسی کے مطابق جو کچھ چاہتے ہیں کرتے ہیں چنانچہ ہوا وغیرہ کو سلیمان کے حکم کا تابع بنا دینے کی غرض یہ تھی کہ سلیمان اپنے رب کے سامنے اور جھک جائیں، وہب نے کہا حضرت سلیمان کی مجلس پر پرندے چھائے ہوئے ہوتے تھے، جن صف بستہ کھڑے ہوتے تھے اور اس شان کے ساتھ آپ جلوہ افروز ہوتے۔ حضرت سلیمان بڑے مرد مجاہد تھے

دنیا کے جس حصہ میں کسی بادشاہ کے ہونے کی آپ کو اطلاع ملتی آپ فوراً وہاں پہنچ کر اس فرماں روا کو اطاعت پر مجبور کر دیتے تھے۔ اہل روایت کا قول ہے کہ آپ جب کسی جہاد کا ارادہ کرتے تو آپ کے لیے پہلے تختے بصورت تخت بچھائے جاتے پھر اس پر خیمہ ڈیرہ قائم کیا جاتا پھر آپ اس پر آدمیوں کو جانوروں کو اور جنگی سامان کو چڑھواتے پھر حسب الحکم تند ہوا تختوں کے نیچے آجاتی اور سب کو اوپر اٹھاتی اور اوپر پہنچ کر نرم بن جاتی تھی۔ اتنی نرم رفتار ہوتی کہ کسی کھیتی کی طرف سے گزرتی تو اس کی پتی بھی نہ ہلتی۔ اس کی رفتار سے گرد وغبار بالکل نہ اڑتا اور نہ کسی پرندے کو تکلیف ہوتی، سبک سیر اتنی کہ ایک ماہ کی مسافت دن کے نصف اول میں اور ایک ماہ کی مسافت پچھلے دن میں طے کر لیتی تھی۔

وہب نے یہ بھی بیان کیا کہ دجلہ کے کسی ساحلی مقام پر ایک کتبہ تھا جس پر حضرت سلیمان کے کسی ساتھی نے لکھ دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ ساتھی جن تھا یا آدمی۔ "ہم یہاں اترے ہم رات کو یہاں نہیں رہے صبح اصطخر سے چلے تھے دوپہر کو یہاں قیلولہ کیا پچھلے دن میں انشاء اللہ یہاں سے چل دیں گے اور رات کو شام میں رہیں گے"۔

مقاتل نے بیان کیا کہ حضرت سلیمان کے لئے جنات نے سونے اور ریشم کے تاروں سے ایک فرش بنا تھا، جس کی لمبائی چوڑائی ایک ایک فرسخ تھی، اس فرش کے وسط میں حضرت کے لئے سنہری ممبر رکھا جاتا تھا جس پر آپ تشریف فرما ہوتے تھے اور ممبر کے اردگرد سونے چاندی کی کرسیاں رکھی جاتی تھیں۔ سونے کی کرسیوں پر اور علماء چاندی کی کرسیوں پر فروکش ہوتے تھے اوپر سے پرندے اپنے پر پھیلائے سایہ فگن ہوتے تاکہ دھوپ کسی پر نہ پڑے کرسیوں کے گرداگرد دوسرے آدمی ہوتے تھے اور آدمیوں کے پیچھے جنات، ہوا، اس فرش کو (اور فرش والوں کو) اوپر اٹھاتی تھی اور صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک ایک ایک ماہ کی مسافت تک لے جاتی تھی۔

سعید بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت سلیمان کے دربار میں چھ لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں اگلی قطاروں میں آدمی اور آدمیوں کے پیچھے جنات بیٹھتے تھے پرندے اوپر سے سایہ کئے ہوتے تھے اور ہوا ان سب کو اٹھاتی تھی۔

حسن کا بیان ہے کہ جب پیغمبر خدا سلیمان کی عصر کی نماز گھوڑوں کے معاینہ کی وجہ سے فوت ہو گئی تو آپ کو لوجہ اللہ غصہ آگیا اور آپ نے سب گھوڑوں کو قتل کرا دیا۔ پھر اللہ نے مقتول گھوڑوں کے عوض دوسرے بہتر گھوڑے عطا فرما دیئے، ہوا آپ کے حکم سے آپ کی مرضی کے مطابق تیزی کے ساتھ آپ کو اٹھا کر لے جاتی تھی صبح کو ایلیا سے چلتے تو قیلولہ (دوپہر کا قیام) اصطخر میں کرتے پھر پچھلے دن میں اصطخر سے چلتے تو شام بابل میں کرتے۔

ابن زید نے بیان کیا تختوں سے بنی ہوئی آپ کی ایک سواری تھی جس کے ایک ہزار پائے تھے ہر پایہ کھوکھلا تھا جس کے اندر ہزار خانے تھے آپ کے ساتھ انس وجن سوار ہوتے تھے ہر پایہ کے نیچے اٹھانے والے ایک ہزار جنات ہوتے تھے جو اس تخت کو اٹھائے ہوتے تھے، تخت اونچا ہو جاتا تو نرم ہوا آکر اس تخت کو اٹھا لیتی صبح کو چل کر آپ دوپہر کو ان لوگوں کے پاس قیام کرتے جو ایک ماہ کی مسافت کی دوری پر ہوتے تھے پھر شام ایسے لوگوں میں کرتے جن کی دوری ایک ماہ کی مسافت کے بقدر ہوتی۔ لوگوں کو پتہ بھی نہ چلتا کہ اچانک آپ لشکر سمیت آ پہنچتے۔

روایت میں آیا ہے کہ ایک بار حضرت سلیمان عراق سے صبح کو چلے مرو میں دوپہر کو پہنچے وہاں قیام کیا پھر بلخ میں عصر کی نماز پڑھی پھر بلخ سے روانہ ہو کر ترکستان میں داخل ہو گئے پھر ترکستان سے سرزمین چین تک پہنچ گئے ہوا کے کندھوں پر یہ راستہ طے کیا اور پرندے سر پر سایہ فگن رہے۔ آپ صبح کے دن میں ایک ماہ کی مسافت طے کر لیتے تھے اور شام کے دن میں بھی اتنی ہی دور پہنچ جاتے تھے، یہاں سے آپ نے مشرق کی طرف رخ کیا یہاں تک کہ قندھار پہنچ گئے پھر قندھار سے مکران اور کرمان پہنچے تو پھر یہاں سے گزر کر بلاد فارس میں پہنچے اور وہاں چند روز فروکش رہے پھر صبح کو یہاں سے روانہ ہو کر دوپہر کو کسکر پہنچے پھر شام تک ملک شام میں آگئے آپ کی اصل قرارگاہ شہر تدمر میں تھی شام سے عراق کی طرف روانہ ہونے سے پہلے آپ نے جنات کو حکم دیا تھا کہ ایک عمارت بنائیں چنانچہ جنات نے پتھر کی چٹانوں اور ستونوں اور سفید و زرد مرمر سے ایک عمارت تیار کی

تھی۔

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

اور کچھ شیاطین ایسے تھے جو سلیمان کے لئے (جواہر نکالنے کی غرض سے) سمندر میں غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے۔ اور ہم ہی ان کو سنبھالنے والے ہیں۔

اور کچھ جنات سمندروں میں غوطے مار کر آپ کے لئے جواہر نکال کر لاتے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے۔ جیسے اونچی اونچی عمارتیں اور مجسمے اور بڑے بڑے حوض اور ایک جگہ قائم رہنے والی دیگیں اور شہروں کی تعمیر اور عجیب عجیب نادر مصنوعات کی تخلیق وغیرہ۔

كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ کا یہ مطلب ہے کہ ہم جنات کی نگرانی رکھے ہوئے تھے کہ کہیں سلیمان کی اطاعت سے سرکشی نہ کرنے لگیں۔ زجاج نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نگرانی رکھتے تھے کہ کہیں بنائی ہوئی چیز کو تباہ نہ کر دیں۔

بغوی نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت سلیمان کسی جن کو کسی آدمی کے ساتھ کسی کام پر بھیجتے تو آدمی سے فرمادیتے جب اس کام سے یہ فارغ ہو جائے تو اس کو کسی اور کام پر لگا دینا ایسا نہ ہو کہ یہ کئے ہوئے کام کو برباد کر دے۔ جنات کی یہ عادت ہی تھی کہ جب کسی کام سے فارغ ہو جاتے اور دوسرے کام میں مشغول نہ ہوتے تو بنے ہوئے کام کو ہی تباہ کر دیتے۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اور ایوب کا تذکرہ کیجئے جب اس نے مصائب میں اپنے رب کو پکارا۔ اے رب مجھے دکھ لگ گیا ہے۔ نَادٰى یعنی دعا کی۔ وہب بن منبہ نے بیان کیا حضرت ایوب رومی تھے، آپ کا جدی نسب اس طرح تھا۔ ایوب بن اموص بن رازح بن روم بن عیص بن اسحاق بن ابراہیمؑ آپ کی والدہ حضرت لوط بن ہاران کی اولاد میں سے تھیں۔

آپ اللہ کے برگزیدہ بندے اور نبی تھے اللہ نے آپ کے لئے دنیا وسیع کر دی تھی، سرزمین شام میں ایک گھاٹی جس کے اندر میدانی زمین بھی تھی اور پہاڑی بھی آپ کی ملک تھی۔ اونٹ، گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، بکری، گھوڑے گدھے ہر قسم کے بکثرت جانور آپ کے پاس تھے پانچ جوڑ بیلوں کے کھیتی کرنے کے لئے بھی آپ کے پاس تھے۔ ہر جوڑ کا خادم ایک غلام تھا اور ہر غلام کے بیوی بچے بھی تھے۔ بیلوں کی ہر جٹ کا یعنی کھیتی کرنے اور ہل جوتنے وغیرہ کا سامان اٹھانے کے لئے ایک گدھی تھی اور ہر گدھی کے دو دو تین تین چار چار پانچ پانچ اور اس سے زیادہ بچے تھے اللہ نے آپ کو اہل وعیال لڑکے اور لڑکیاں بھی عطا کی تھیں۔ آپ بڑے نیک، پرہیزگار، غریبوں پر رحم کرنے والے، مسکینوں کو کھانا کھلانے والے، بیواؤں کی خبر گیری کرنے والے، یتیموں کی سرپرستی کرنے والے اور بڑے مہمان نواز تھے، مسافروں کو خرچ دے کر وطن تک پہنچا دیتے تھے، اللہ کی نعمتوں کا شکر اور اللہ کا حق ادا کرتے رہتے تھے اللہ نے شیطان مردود سے آپ کو محفوظ کر دیا تھا۔ ابلیس دوسرے مال داروں اور عزت یاب لوگوں کو اللہ کی یاد سے غافل بنا دیتا ہے لیکن آپ اس کی دسترس سے باہر تھے۔ آپ کے پاس تین (خاص) آدمی تھے جو آپ پر ایمان لائے تھے ایک یمنی تھا جس کا نام الیفن تھا اور دو آپ ہی کی بستی کے رہنے والے تھے ایک کا نام یلد اور دوسرے کا نام صافر تھا، یہ تینوں میانہ عمر کی آدمی تھے۔

اس زمانہ میں ابلیس کی رسائی آسمانوں پر تھی، آسمانوں میں جہاں چاہتا ٹھہر سکتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کے بعد چار آسمانوں پر جانے کے اسے ممانعت کر دی گئی پھر رسول اللہ ﷺ کی پیدائش پر باقی آسمانوں سے بھی اس کو روک دیا گیا۔

حضرت ایوب اللہ کا ذکر اور اس کی حمد کرتے رہتے تھے ایک بار جب آپ نے اللہ کا ذکر کیا اور حمد کی تو فرشتوں نے اس وقت مل کر آپ کے لئے دعائے رحمت کی، ابلیس نے فرشتوں کی دعا سن پائی۔ سن کر جل گیا اور فوراً آسمان پر چڑھ کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا اور اللہ سے التجا کی اور کہا الٰہی میں نے تیرے بندے ایوب کے معاملہ پر غور کیا، میں نے دیکھا کہ تو نے اپنے بندے کو نعمتوں سے نوازا ہے اور اس لئے اس نے تیرا شکر کیا، تو نے اس کو عافیت عطا کی اس لئے اس نے تیری حمد کی، تو نے جو کچھ اس

کو مرحمت کیا ہے اگر تو اس سے لے لے اور اس کو مصیبت میں مبتلا کر دے تو یہ مصیبت اس کو عبادت و حمد سے روک دے گی اور
وہ تیری طاعت سے نکل جائے گا۔ اللہ نے فرمایا جا میں نے اس کے مال پر تجھے دسترس عطا کر دی، دشمن خدا ابلیس یہ اختیار لے
کر آسمان سے زمین کی طرف آیا پھر خبیث جنات اور سرکش شیطانوں کو جمع کر کے کہنے لگا مجھے ایوب کے مال پر تسلط عطا کر دیا گیا
ہے اور یہ ایسی سخت مصیبت ہے جس پر بڑے بڑے لوگ صبر نہیں کر سکتے بتاؤ تمہارے اندر کیا طاقت ہے تم اپنی اپنی طاقتوں کی
تفصیل بتاؤ۔ ایک خبیث شیطان بولا مجھے ایسی قوت دی گئی ہے کہ اگر میں چاہوں تو آتشیں بگولہ بن جاؤں پھر جس چیز پر گزروں
اس کو جلا ڈالوں۔ ابلیس نے کہا اچھا تو جس وقت ایوب کے اونٹ اپنی چراگاہوں میں جمے بیٹھے ہوں تم اونٹوں کی طرف جاؤ اور
سب کو جلا ڈالو، یہ کہتے ہی لوگوں کو پتہ بھی نہ چلا اور ایک دم زمین کے نیچے سے ایک آتشیں بگولہ اٹھا اور جب اونٹوں کے پاس سے
گزرا تو ان کو اور چرواہوں کو جلا کر سوختہ کر دیا یہاں تک کہ سب اونٹوں کو جلا کر ختم کر دیا اس کے بعد ابلیس اونٹوں کے نگران کی
صورت بنا کر ایک اونٹ پر سوار ہو کر حضرت ایوب کے پاس پہنچا آپ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہنے لگا ایوب ایک آگ آئی
سب اونٹوں کو ہر طرف سے اس نے گھیرے میں لے لیا سب اونٹ اور ان کے چرواہے سوختہ ہو گئے۔ حضرت ایوب نے فرمایا
الحمد للہ جس نے دیئے تھے اسی نے لے لئے، میں تو ہمیشہ سے اپنی جان و مال کو فنا ہونے والا سمجھے ہوا ہوں، ابلیس بولا آپ کے
رب نے ان پر آسمان سے آگ بھیج دی جس سے سب جل گئے لوگ حیرت میں پڑ گئے اور ان کو بڑا تعجب ہوا کوئی کہنے لگا ایوب کسی
کی پوجا ہی نہیں کرتے تھے محض دھوکہ میں پڑے ہوئے تھے، بعض لوگ کہنے لگے ایوب خدا کی عبادت کرتے تھے خدا ہی نے یہ
آگ بھیجی تاکہ ایوب کے دشمن خوش ہوں اور دوستوں کو دکھ پہنچے کسی نے کہا اگر ایوب کے معبود میں طاقت ہوتی اور وہ حفاظت
کر سکتا تو ضرور اس کی کارسازی کرتا۔ حضرت ایوب نے یہ باتیں سن کر فرمایا الحمد للہ اسی نے مجھے دیا تھا اسی نے مجھ سے لے لیا ہر
حال میں وہ قابل حمد ہے۔ میں ماں کے پیٹ سے ننگا پیدا ہوا تھا اور ننگا ہی لوٹ کر مٹی میں جاؤں گا اور ننگا ہی اٹھ کر اللہ کی پاس جاؤں
گا۔ جب اللہ تجھے کوئی چیز عاریۃً دے دے تو تجھے اترانے کا حق نہیں ہے اور جب اپنی عاریت پر قبضہ کر لے تو تجھے جزع و فزع نہ
کرنا چاہئے اس چیز کا اللہ ہی زیادہ مستحق ہے اور وہی تیرا اصلی مالک ہے اور اے شخص اگر اللہ کو تیرے اندر کوئی بھلائی معلوم ہوتی تو
تو بھی شہید ہو جاتا اور ان روحوں کے ساتھ تیری روح بھی منتقل ہو جاتی، معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو تیری طرف سے شر ہی
معلوم ہوئی۔ اسی لئے آگ کے اندر سے اور شہیدوں کے گروہ سے تجھے نکال دیا۔ حضرت کی اس گفتگو سے ابلیس ذلیل و خوار ہو
کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور ان سے کہا اب تمہارے پاس کونسی طاقت ہے میں تو ایوب کے دل کو زخمی نہیں کر سکا ایک دیو
بولا میرے اندر ایسی قوت ہے کہ اگر آپ چاہیں تو میں ایسی چیخ ماروں کہ جو جاندار اس کو سنے اس کی جان نکل جائے، ابلیس نے
کہا تو تم بھیڑ بکریوں اور ان کے چرواہوں کو جا کر ختم کر دو حکم پا کر دیو فوراً چل دیا اور بھیڑ بکریوں کے درمیان پہنچ کر ایک چیخ ماری
جس سے تمام بکریاں اور ان کے چرواہے مر گئے اس کے بعد ابلیس چرواہوں کے داروغہ کے بھیس میں حضرت ایوب کے پاس
پہنچا آپ اس وقت بھی نماز پڑھ رہے تھے ابلیس نے پہنچ کر وہی بات کہی جو پہلے کہی تھی اور حضرت ایوب نے بھی پہلے کی طرح
جواب دیا ابلیس اپنے رفقاء کے پاس واپس چلا گیا اور بولا اب بتاؤ تمہارے پاس کیا طاقت ہے میں تو اب بھی ایوب کے دل کو زخمی
نہیں کر سکا۔ ایک خبیث جن کہنے لگا۔ اگر میں چاہوں تو آندھی بن سکتا ہوں جو ہر چیز کو اڑا کر لے جائے گی۔ ابلیس نے کہا تو
بیلوں اور کھیتوں کے پاس جا، خبیث جن چلا گیا، اور اچانک ایک طوفانی ہوا چلی اور ہر چیز کو اڑا کر لے گئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں
کچھ تھا ہی نہیں۔ اس کے بعد ابلیس کھیتی باڑی کے منیجر کی شکل بنا کر حضرت ایوب کے پاس آیا آپ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے
ابلیس نے وہی پہلے والی بات کی اور آپ نے بھی وہی سابق کا جواب دے دیا اور مصیبت پر صبر کرنے پر اپنے دل کو جما لیا آخر جب
آپ کے پاس کسی طرح کا مال نہ رہا اور ابلیس نے آپ کا سارا مال تباہ کر دیا تو آسمان پر پھر گیا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا الٰہی ایوب
جانتا ہے کہ جب آل و اولاد سے تو نے اس کو بہرہ اندوز کیا ہے تو مال بھی عنایت کر دے گا اس لئے مطمئن ہے کیا تو مجھے اس کی
اولاد پر تسلط عطا فرما دے گا یہ مصیبت ایسی ہے جس پر بڑے بڑے آدمیوں کے دل برقرار نہیں رہ سکتے۔ اللہ نے فرمایا جا میں نے

تجھے ایوب کی اولاد پر دسترس عطا کی۔ دشمن خدا چلا آیا حضرت ایوب کی اولاد ایک قصر کے اندر تھی ابلیس نے اس قصر کے درو دیوار کو جھنجھوڑ ڈالا..... دیواروں کو باہم ٹکرا دیا لکڑیاں اور پتھر اوپر سے پھینکے، یہاں تک کہ جب سب لوگوں کو خوب زخمی کر دیا تو محل کو اٹھا کر الٹ دیا، سب لوگ سر نگوں ہو کر گر پڑے اور ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد بچوں کے اتالیق کی شکل بنا کر حضرت ایوب کی خدمت میں پہنچا خود بھی اس وقت زخمی تھا چہرے پر خراشیں تھیں خون بہ رہا تھا جا کر واقعہ کی اطلاع دی اور کہا اگر آپ وہ منظر دیکھ لیتے جب کہ آپ کے بچے سخت اذیتوں میں مبتلا ہوئے تھے خون بہ رہا تھا اور دماغ بھی باہر نکلنے لگے تھے، پیٹ پھٹ گئے تھے، انتڑیاں بکھری پڑی تھیں اسی حالت میں قصر الٹ گیا اور سب لٹے ہو کر جاں بحق ہو گئے تو آپ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ ابلیس برابر اسی طرح کے دردناک الفاظ کہتا رہا اور حضرت ایوب سنتے رہے آخر آپ کے دل میں رقت پیدا ہوئی اور رونے لگے اور ایک مٹھی خاک اپنے سر پر ڈال لی اور کہا کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا، ابلیس نے اس بات کو غنیمت سمجھا اور ایوب کے بے صبری کو دیکھ کر فوراً آسمان پر چڑھ گیا ادھر حضرت ایوب نے اپنے الفاظ سے رجوع کر لیا اور توبہ و استغفار کی اور آپ کی توبہ و استغفار کو ملائکہ لے کر ابلیس کے پہنچنے سے پہلے ہی جا پہنچے اور بارگاہ الٰہی میں پیش کر دی اللہ تو پہلے ہی بخوبی واقف تھا ملائکہ کی پیشی بھی حسب الحکم ہو گئی ابلیس ذلیل ہو گیا اور کہنے لگا۔ الٰہی تو نے ایوب کو تندرستی دی ہے جسمانی اذیت سے محفوظ رکھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کی تندرستی ہے تو اللہ مال و اولاد اور عنایت کر دے گا اس لئے مال و اولاد کی ہلاکت کا اس پر اثر نہیں پڑا تو مجھے اس کے جسم پر تسلط عطا کر دے گا تو اس کا قدم ڈگمگا جائے گا۔ اللہ نے فرمایا جا میں نے ایوب کے جسم پر تجھے تسلط عطا کیا لیکن زبان اور دل پر تیرا تسلط نہیں ہے زبان و دل کی علاوہ باقی جسم کو تیرے زیر تسلط کر دیا گیا۔ اللہ نے ابلیس کو یہ تسلط صرف اس لئے عطا فرمایا تھا کہ ایوب کے ثواب میں اضافہ ہو صبر کرنے والوں کے لئے مثال ہو۔ ہر دکھ اور مصیبت پر صبر کرنے کی دوسروں کو تلقین ہو اور باامید ثواب ہر اذیت پر ان کو صبر ہو۔ اللہ کا دشمن اجازت پا کر فوراً آیا، ایوب اس وقت سجدے میں تھے سر اٹھانے نہ پائے تھے کہ ابلیس آ گیا اور چہرے کی طرف سے آ کر ناک کے سوراخ میں ایک پھونک ماری جس سے حضرت ایوب کا جسم آگ کی طرح بھڑکنے لگا اور سر کی چوٹی سے پاؤں کی نوک تک ایسے دمل نکل آئے جیسے بکری کی مینگنیں اور ان میں کھجلی پیدا ہو گئی حضرت ایوب نے ناخنوں سے اس کو کھجانا شروع کیا یہاں تک کہ سب ناخن گر گئے پھر کھردرے ٹاٹ سے کھجایا ٹاٹ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا پھر نوک دار کھردرے ٹھیکروں اور پتھروں سے کھجایا اور اتنا کھجایا کہ گوشت کٹنے لگا، بو دینے لگا، سڑ گیا۔ بستی والوں نے آپ کو بستی سے باہر نکال کر ایک گھورے پر جھونپڑی بنا کر اس میں ڈال دیا اور سب نے چھوڑ دیا صرف آپ کی بی بی رحمت بنت افرائیم بن یوسف بن یعقوب نے ساتھ دیا بعض نے رحمت کو حضرت یوسف ہی کی صاحبزادی کہا ہے، رحمت آپ کے پاس آتی رہیں اور آپ کی ضروریات فراہم کر کے لاتی رہیں جب حضرت کے تینوں رفقاء الیفن، بلدد اور صافر نے حضرت ایوب کی یہ ابتلائی حالت دیکھی تو وہ بھی کنارہ کش ہو گئے اور (شرعی جرم کرنے کی) آپ پر تہمت لگائی مگر آپ کے دین کو نہیں چھوڑا جب مصیبت بڑھ گئی تو ایک روز تینوں حضرت کے پاس آئے اور خوب سخت سست کہا اور کہنے لگے آپ کو اللہ کی طرف سے یہ گناہ کی سزا دی گئی اللہ سے توبہ کیجئے۔

راوی کا بیان ہے ایک نوجوان مومن بھی ان تینوں کے ساتھ تھا اس نے کہا اے عمر رسیدہ لوگو آپ لوگ اپنی عمروں کی بیشی کی وجہ سے کلام کرنے کے زیادہ مستحق ہو لیکن آپ لوگوں نے جو کچھ کہا خیال کیا اور جو بات کی اس سے زیادہ اچھا کلام بہترین رائے اور مناسب ترین بات بھی پیش کر سکتے تھے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت ایوب کا تم پر حق ہے، ذمہ داری ہے کیا تم کو معلوم ہے کہ تم نے کس کی توہین اور بے عزتی کی وہ کیسی شخصیت ہے جس پر تم نے عیب تھوپے اور نکتہ چینی کی کیا تم نہیں جانتے کہ وہ اللہ کا پیغمبر ہے اس وقت تمام اہل ارض سے برگزیدہ اور اللہ کا منتخب بندہ ہے پھر تم کو یہ بھی نہیں معلوم اور نہ اللہ نے تم کو بتایا ہے کہ جب سے ایوب کو پیغمبری ملی کبھی بھی اللہ نے اس کی کسی حرکت کو ناپسند کیا ہو یا جو عزت اس کو عطا فرمائی ہے اس کا کوئی حصہ چھین لیا ہو نہ یہ کہہ سکتے ہو کہ اس وقت سے جب سے تم اس کے ساتھ ہوئے ہو کبھی بھی آج تک اس نے اللہ

کے سلسلہ میں کوئی ناحق بات کہی ہو۔ جس دکھ اور تکلیف کو تم ایوب کے لئے اپنے خیال میں باعث تذلیل و تحقیر سمجھتے ہو وہ ایسا نہیں ہے اللہ اپنے پیغمبروں، صدیقوں، شہیدوں اور نیک لوگوں کو دکھ میں مبتلا کرتا چلا آیا ہے اس کی طرف سے یہ دکھ اور امتحان اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ اس طبقہ سے ناراض ہے نہ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کی نظر میں یہ لوگ ذلیل ہو گئے بلکہ یہ امر تو ان کے لئے مزید عزت افزائی اور فضیلت ہے۔

اور بالفرض اگر ایوب اللہ کے نزدیک اس مرتبہ پر نہیں بھی ہوں تب بھی وہ تمہارے بھائی تو ہیں، تم نے ان کے ساتھ رہ کر ان سے برادری کی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم ان کو پیغمبر نہیں مانتے تو دوست ہی سمجھو مدت تک تم ان کی ساتھ رہے ہو اور کسی دانش مند کے لئے جائز نہیں کہ اپنے دوست سے اس کی مصیبت کے وقت کنارہ کش ہو جائے یا اس کو لعنت و ملامت کرے وہ تو خود غم رسیدہ اور دکھی ہے اس پر نکتہ چینی کرنا اور نکتہ چینی بھی وہ جس کا علم عار دلانے والے کو نہیں کسی طرح درست نہیں۔ مناسب تو یہ ہے کہ اس سے ہمدردی کی جائے اس کے رونے میں شرکت کی جائے اس کے لئے دعائے مغفرت کی جائے اور جو تدبیریں اس کے معاملے کو درست کرنے والی ہیں وہ بتائی جائیں۔ دانش مند اور ہدایت یافتہ وہ شخص نہیں جو ان باتوں سے ناواقف ہو۔

سن رسیدہ بزرگو! اللہ کی عظمت و جلال کا مطالعہ اور موت کی یاد تمہاری زبانوں کو کاٹ دیتی ہے اور دلوں کو پارہ پارہ کر دیتی ہے کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو بڑے فصیح اللسان، بلیغ البیان، دانش مند اور عالم ہیں نہ گونگے ہیں نہ بیان سے عاجز اس کے باوجود اللہ کے خوف نے ان کو خاموش کر دیا ہے جب وہ اللہ کی عظمت کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی زبانیں ماسوا کے تذکرے سے کٹ جاتی ہیں، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں دل پارہ پارہ ہو جاتے ہیں اور ہوش و حواس پراں ہو جاتے ہیں اور یہ سب کچھ اللہ کی عظمت کو دیکھنے اور جلال الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے وقت ہوتا ہے لیکن جب ان کو ہوش آتا ہے اور استقامت حال نصیب ہوتی ہے تو اس وقت وہ اپنے پاکیزہ اعمال کے ساتھ اللہ کی طرف دوڑتے ہیں مگر اپنا شمار خطاداروں اور ظالموں کے ساتھ کرتے ہیں وہ خود ابرار اور گناہوں سے پاک ہوتے ہیں لیکن قصورداروں اور گناہ گاروں کے ساتھ ہوتے ہیں یہی لوگ بڑے دانش مند اور اصحاب قوت ہیں۔ حضرت ایوب نے اس نوجوان کی یہ تقریر سن کر فرمایا اللہ چھوٹے بڑے کے دل میں اپنی رحمت سے حکمت کی تخم پاشی کرتا ہے پھر دل میں پودا پیدا ہوتا ہے تو زبان پر اللہ اس کو ظاہر فرما دیتا ہے حکمت کا مدار نہ طول عمر اور بڑھاپے پر ہے نہ تجربے کی فراوانی پر اگر اللہ کسی کو بچپن میں ہی باحکمت بنا دیتا ہے تو اس کا مرتبہ دوسرے حکماء کے نزدیک کم نہیں ہوتا۔ اہل حکمت جانتے ہیں کہ نور عزت خداداد ہے اس کے بعد حضرت ایوب نے ساتھیوں کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اپنے رب کی طرف رخ کر کے فریاد و زاری میں مشغول ہوئے۔ عرض کیا اے میرے رب تو نے مجھے کس لئے پیدا کیا کاش تو نے مجھے پیدا نہ کیا ہوتا۔ اے کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ مجھ سے کونسی خطا ہو گئی اور میں نے کونسا ایسا کام کیا جس کی وجہ سے تو نے اپنا مبارک رخ میری طرف سے پھیر لیا، اگر میں نے کوئی گناہ کیا تو مجھے مار ڈالتا اور میرے آباؤ اجداد کے ساتھ مجھے ملا دیتا، موت ہی میرے لئے زیادہ مناسب تھی، کیا میں مسافروں کے لئے قیام گاہ اور مسکینوں کے لئے قرار گاہ نہیں بنا ہوا تھا، کیا میں یتیموں کا والی اور بیواؤں کا سرپرست نہیں تھا۔ الٰہی میں تیرا بندہ ہوں اگر تو مجھ سے بھلائی کرے گا تو تیرا احسان ہے اور اگر میرے ساتھ برائی کرے گا تو مجھے سزا دینے کا تجھے اختیار ہے، تو نے مجھے مصیبتوں کی آماج گاہ اور دکھوں کا نشانہ بنا دیا، مجھ پر ایسی مصیبت پڑی ہے کہ اگر تو پہاڑ پر ڈال دیتا تو وہ بھی نہ اٹھا سکتا، پھر میری کمزوری اس کو کیسے برداشت کر سکتی ہے تیرے قطعی حکم نے مجھے ذلیل کر دیا اور تیری ہی حکومت نے مجھے بدحال بنا دیا اور میرے جسم کو دبلا کر دیا۔ اگر میرا رب اپنی ہیبت کو نکال دے جو میرے دل میں ہے اور میری زبان کو رواں کر دے کہ میں منہ بھر کر بول سکوں، پھر یہ مناسب بھی ہو کہ بندہ اپنی طرف سے حجت پیش کر سکے تو امید ہے کہ جو مصیبت مجھ پر ہے اس سے مجھے بچاؤ عطا کر دے گا لیکن وہ تو مجھ سے بہت بالا و اعلیٰ ہے وہ مجھے دیکھتا ہے میں اسے نہیں دیکھتا وہ میری بات سنتا ہے میں اس کی آواز نہیں سنتا اس کی نظر عنایت میری طرف نہیں۔ نہ وہ مجھ پر

رحم کرتا ہے نہ مجھ سے قریب ہے نہ مجھے اپنے قریب کرتا ہے کہ میں اپنا عذر پیش کر سکوں اور اپنی براءت کی بات کر سکوں اور اپنا دفاع کر سکوں۔ حضرت ایوب اتنی ہی بات کرنے پائے تھے اور آپ کے ساتھی آپ کے پاس ہی بیٹھے تھے کہ یک دم ایک بادل چھا گیا ساتھیوں نے خیال کیا کہ اس کے اندر کوئی عذاب آیا، لیکن اس کے اندر سے آواز آئی اے ایوب! اللہ فرماتا ہے میں تیرے قریب ہوں اور ہمیشہ سے تیرے قریب ہی رہا، اٹھ اپنا عذر پیش کر اور اپنی براءت کی بات کر اور اپنی طرف سے دفاع کر اور کمر کس کر اٹھ کھڑا ہو اور اس مقام پر کھڑا ہو جس مقام پر کوئی طاقت ور کھڑا ہو کر دوسرے طاقتوں کا دفاع کرتا ہے اگر تجھ سے ہو سکے۔ مجھ سے وہی جھگڑا کر سکتا ہے جو مجھ جیسا ہو، اے ایوب تیرے نفس نے تجھے آرزومند بنا دیا ہے کہ تو اپنی قوت سے اپنے مقصد کو پہنچ جائے گا تو کہاں تھا جس روز میں نے زمین کو پیدا کیا، اور اس کی بنیاد پر اس کو قائم کیا، کیا تو میرے ساتھ زمین کے کناروں کو پھیلا رہا تھا کیا تو واقف ہے کہ میں نے کس اندازے سے اس کو بنایا، کس چیز پر اس کے اطراف کو قائم کیا کیا تیری اطاعت کر کے پانی نے زمین کو اٹھایا ہے کیا تیری حکمت سے زمین پانی کا سرپوش بنی ہوئی ہے تو اس روز کہاں تھا جب میں نے آسمان کو چھت کی شکل میں ہوا میں بلند کیا تھا نہ اوپر سے کوئی رسی ہے کہ آسمان اس سے بندھا لٹک رہا ہو، نہ نیچے سے ستون اس کو اٹھائے ہوئے ہیں کیا تو اپنی حکمت سے اس مقام تک پہنچ سکتا ہے کہ آسمان کے نور کو بہاوے یا ستاروں کو چلا دے کیا تیرے حکم سے رات و دن کا ادل بدل ہو رہا ہے۔ جس روز دریاؤں کے فوارے میں نے زمین سے نکالے تھے اور سمندروں کو ان کی حدود میں بند کیا تھا تو تو کہاں تھا کیا تیری قوت سے سمندروں کی لہریں ان کی حدود کے اندر روکی گئی ہیں یا مدت حمل ختم ہونے پر رحم کا منہ تو کھولتا ہے جب میں نے پانی کو خاک پر روکا تھا اور اونچے پہاڑ برپا کئے تھے، تو کہاں تھا کیا تجھے علم ہے کہ کس چیز پر میں نے پہاڑوں کو برپا کیا ہے یا کس توازن سے ان کو قائم کیا ہے کیا تیرے پاس ایسی کلائیاں ہیں جو ان کا بوجھ اٹھا سکیں۔ کیا تو جانتا ہے کہ جو پانی میں آسمان سے اتارتا ہوں وہ کہاں سے آتا ہے کس چیز سے بادل پیدا ہوتا ہے۔ برف کا خزانہ کہاں ہے، اولوں کے پہاڑ کہاں ہیں، دن کے اندر رات کا خزانہ کہاں ہے اور رات میں دن کا خزانہ کہاں رہتا ہے اور ہواؤں کا خزانہ کہاں ہیں، درخت کس زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ کس نے انسان کے جوف سینہ یا پیٹ یا سر میں عقل پیدا کی اور کس نے کانوں اور آنکھوں کے یہ شگاف بنائے، فرشتے کس کے اقتدار کے مطیع ہیں اور کس نے اپنی قہاری طاقت سے سب طاقتوروں کو مغلوب کر رکھا ہے اور کس نے اپنی حکمت سے رزق کی تقسیم کی ہے۔ اللہ نے اسی طرح کے کلام میں اپنی آثار قدرت کا بکثرت اظہار فرمایا۔

ایوب نے عرض کیا، الٰہی جو تفصیل تو نے بیان فرمائی اس کو سمجھنے اور جواب دینے سے میری حالت اور میرا مرتبہ حقیر ہے میری زبان گنگ ہو گئی میری عقل و دانش کند ہو گئی اور میری قوت کمزور پڑ گئی۔ اے میرے معبود! میں جانتا ہوں کہ جو کچھ تو نے بیان فرمایا وہ تیرے ہی دست قدرت کی کارگری اور تیری ہی حکمت کی تدبیر کا نتیجہ ہے بلکہ تیری تدبیر، حکمت و صنعت اور قدرت اس سے بھی بڑی ہے کوئی چیز تجھے بے بس نہیں کر سکتی کوئی چیز تجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ میرے معبود، مجھ پر دکھ ایسے پڑے کہ میں بے قابو ہو کر بول پڑا مصیبت نے ہی میری زبان چلا دی۔ کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا اور ایسی بات اپنے رب کی شان میں نہ کہتا جو میرے رب کی ناراضگی کا باعث ہوتی، کاش اس سے پہلے ہی سخت ترین دکھ سے پیدا ہونے والے غم کی وجہ سے میں مر چکا ہوتا میں نے جو کچھ زبان سے نکالا وہ اس لئے نکالا کہ تو میری معذرت قبول فرمالے اور خاموش رہا تو اس لئے کہ تجھے مجھ پر رحم آ جائے۔ میری زبان سے غلطی سے ایک بات نکل گئی دوبارہ ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا ہے اور دانتوں کے نیچے زبان دبا لی ہے اور چہرے پر خاک مل لی ہے۔ آج میں تیرے عذاب سے تیری ہی پناہ چاہتا ہوں، سخت دکھ سے تیرے ہی جوار رحمت کا خواستگار ہوں مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ میں تیری سزا سے محفوظ رہنے کے لئے تجھ سے ہی فریاد کرتا ہوں میری فریادرسی فرما، میں تیری ہی مدد کا طلبگار ہوں میری مدد کر میں تجھی پر بھروسہ رکھتا ہوں میرا کام پورا فرما دے میں تیرے ہی ذریعہ سے بچاؤ کا خواہاں ہوں مجھے اپنی حفاظت میں لے لے، میں تجھ سے اپنے قصور کی معافی چاہتا ہوں مجھے معاف فرما دے میں آئندہ ہرگز کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جو تیری مرضی کے خلاف ہو۔ اللہ نے ایوب

سے فرمایا تیرے بارے میں میرا علم (پہلے ہی) نافذ ہو چکا تھا اور میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے میں نے تیرا قصور معاف کیا تیرے اہل و عیال اور مال کی واپسی کا حکم دے دیا بلکہ جتنا تیرے پاس تھا اتنا ہی مزید تجھے دے دیا تاکہ پیچھے آنے والوں کے لئے قدرت کی نشانی مصیبت زدہ لوگوں کے لئے عبرت اور صبر کرنے والوں کے لئے باعث عزت ہو جائے اپنی ایڑی زمین پر مار دیکھ یہ ٹھنڈا پینے کا اور نہانے کا پانی ہے، اسی میں تیری شفا ہے۔ اپنے ساتھیوں کی طرف سے قربانی پیش کر اور ان کے لئے دعاء مغفرت کر انہوں نے تیرے متعلق میری نافرمانی کی ہے یعنی تیرے متعلق برا خیال قائم کیا اور تجھے چھوڑ کر چلے گئے۔

حسب الحکم ایوب نے زمین پر اپنی ایڑی ماری فوراً ایک چشمہ پھوٹ نکلا، ایوب نے اس میں گھس کر غسل کیا اور فوراً ہی اللہ نے سارے دکھ دور کر دیئے آپ چشمہ سے نکل کر آ کر بیٹھ گئے اتنے میں سامنے سے آپ کی بی بی آ گئی اور ایوب جہاں پہلے پڑے تھے وہاں آپ کو تلاش کرنے لگی اور جگہ خالی پا کر متحیر دیوانی ہو کر ادھر ادھر ڈھونڈنے لگی آخر ایک آدمی کو بیٹھا دیکھ کر حضرت ایوب سے ہی پوچھنے لگی اللہ کے بندے تم کو اس بیمار کا کچھ پتہ ہے جو یہاں پڑا ہوا تھا ایوب نے جواب دیا جی ہاں (میں اس کو پہچانتا ہوں) نہ پہچاننے کی کوئی وجہ نہیں یہ کہہ کر آپ مسکرا دیئے اور فرمایا وہ میں ہی تو ہوں ہنسنے سے بی بی نے پہچان لیا اور دوڑ کر گلے لگ گئی۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں عبداللہ بن عباس کی جان ہے بی بی ایوب کے گلے سے اس وقت تک لپٹی رہی کہ سارے مویشی اور اولاد جو فنا ہو چکی تھی دوبارہ زندہ ہو کر ان کے سامنے سے گزر گئی۔ اسی کا تذکرہ ہے آیت ذیل میں۔

وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ اور یاد کرو ایوب کا واقعہ جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ اے میرے رب مجھے دکھ لگ گیا ہے۔

ضُرٌّ حالت کا خراب ہونا، جسمانی ہو یا مالی یا عزت کی بربادی۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے ضَرٌّ (بالفتح) اور ضُرٌّ (بالضم) مصدر ہے اور ضُر (بالضم) اسم بھی ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے۔ ضَر (بالفتح) کا استعمال ہر دکھ کیلئے عام ہے بدنی ہو یا مالی اور ضُر (بالضم) کا استعمال صرف بدنی دکھ کیلئے ہوتا ہے جیسے کوئی بیماری یا بدن کی لاغری کمزوری۔

حضرت ایوبؑ کتنی مدت دکھ میں مبتلا رہے، کب دعا کی اور کیوں کی۔

اس سلسلہ میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ زہری نے حضرت انسؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ ایوب اٹھارہ برس دکھ میں مبتلا رہے۔ وہب بن منبہ نے کہا پورے تین سال مبتلا رہے ایک دن بھی زائد نہیں ہوا، کعب احبار کے قول میں سات سال کی مدت مذکور ہے۔ بعض اقوال میں آیا ہے کہ مدت مرض سات سال سات ماہ اور سات دن ہوئی۔ حسن بصری نے کہا ایوب سات سال اور چند ماہ بنی اسرائیل کے گھورے پڑے رہے آپ کے بدن میں کیڑے رینگتے تھے، سوائے بی بی رحمت کے کوئی پاس بھی نہیں جاتا تھا صرف رحمت آپ کے ساتھ جمی رہیں آپ کے لئے کھانا لاتی تھیں اور جب ایوب اللہ کی حمد کرتے تھے تو بی بی بھی حمد میں شریک ہوتی تھیں۔ اس حالت میں بھی ایوب ذکر خدا میں مشغول رہتے تھے، ابلیس یہ بات دیکھ کر چیخ پڑا اور اطراف زمین سے اپنے تمام لاؤ لشکر کو بلا کر اپنے پاس جمع کر کے کہنے لگا مجھے تو اس بندے نے عاجز کر دیا ہے میں نے نہ اس کا مال چھوڑا نہ اولاد اس حالت میں بھی یہ صبر کرتا رہا بلکہ پہلے سے زیادہ اس نے صبر کا اظہار کیا پھر مجھے اس کے بدن میں بھی اختیار مل گیا تو میں نے اس کے سارے بدن کو پھوڑا بنا کر چھوڑ دیا کہ یہ گھورے پر پڑا رہتا ہے اور سوائے اس کی بیوی کے اور کوئی اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتا ہے مگر اس حالت میں بھی اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اب میں تم سے فریاد کرتا ہوں تم ہی میری مدد کرو اب میں کیا کروں ابلیس کے ساتھیوں نے کہا وہ تدبیر کیا ہوئی جس کی وجہ سے آپ نے گزشتہ لوگوں کو برباد کر کے چھوڑا۔ ابلیس نے کہا وہ ساری تدبیریں بے کار گئیں مجھے کچھ اور مشورہ دو، ساتھیوں نے کہا آدم تک آپ کی رسائی کیسے ہوئی تھی کہ آپ نے اس کو جنت سے نکلوایا۔ ابلیس نے کہا میں نے اس کی عورت کا ذریعہ اختیار کیا تھا، ساتھیوں نے

کہا تو اب بھی ایوب کے سلسلہ میں اس کی عورت کے ذریعہ سے کچھ تدبیر کیجئے ایوب بیوی کے خلاف نہیں کر سکے گا اور بیوی کے علاوہ کوئی اور اس کے پاس جاتا نہیں ہے۔ ابلیس نے کہا تمہارا مشورہ ٹھیک ہے اس کے بعد ابلیس حضرت ایوب کی بیوی کے پاس پہنچا اور مرد کی شکل میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور دریافت کیا اللہ کی بندی تیرا شوہر کہاں ہے بیوی نے کہا وہ دیکھ تو ہیں جو اپنے پھوڑوں کو کھجا رہے ہیں اور ان کے بدن کے اندر کیڑے رینگ رہے ہیں، شیطان نے بی بی کے منہ سے یہ باتیں سنی تو اس کو امید ہو چلی اور اس نے خیال کیا کہ شاید یہ الفاظ بے صبری کے ہوں اور میں اس عورت کو مزید درد مند بنا کر بے صبر بنا سکوں چنانچہ اغوا کے طور پر بی بی کو راحتوں کا وہ دور یاد دلایا جس سے وہ گزر چکی تھیں مویشیوں کا اور مال کا تذکرہ ایوب کے گزشتہ شباب کا ذکر کیا اور موجودہ دکھ اور تکلیف کا بھی بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ اب یہ دکھ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

حسن کی روایت میں ہے ان تذکروں کو سن کر بی بی چیخ پڑی، اس کی چیخ سن کر ابلیس سمجھ گیا کہ اب اس عورت کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور تدبیر کا کامیاب ہو جانا ممکن ہے چنانچہ اس نے ایک بکری کا بچہ بی بی کو لا کر دیا اور کہا ایوب کو چاہئے کہ اس بچے کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دے اس طرح وہ تندرست ہو جائے گا۔ بی بی حضرت ایوب کی طرف لوٹی اور دور سے ہی چیختی ہوئی آئی ایوب کب تک آپ کا رب آپ کو دکھ دیتا رہے گا۔ مال کہاں گیا، اولاد کہاں گئی، دوست کہاں گئے، آپ کا خوبصورت رنگ کیا ہوا آپ کا حسین جسم کس طرف چلا گیا۔ بکری کے اس بچہ کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیجئے یہ دکھ جاتا رہے گا آپ آرام سے ہو جائیں گے، حضرت ایوب نے فرمایا، دشمن خدا تیرے پاس جا پہنچا اور تیرے اندر اس نے پھونک مار دی، تیرا برا ہو یہ تو بتا کہ جس مال مویشی اولاد اور صحت پر تو رو رہی ہے وہ دی کس نے تھی۔ بی بی نے کہا اللہ نے۔ ایوب نے کہا اور کتنے زمانے تک ہم مزے اڑاتے رہے۔ بی بی نے کہا اسی برس تک۔ ایوب نے کہا اب کتنے زمانے سے ہم پر یہ مصیبت پڑی ہے، بی بی نے کہا سات برس اور چند مہینوں سے۔ ایوب نے کہا تو کیا یہ تیری انصاف کی بات ہو گی اگر تو اتنی برس تک مصیبت نہ جھیلے جس طرح اسی برس تک ہم راحت سے بہرہ اندوز رہے اگر اللہ نے مجھے شفا دے دی تو خدا کی قسم میں تیرے سو تازیانے ماروں گا تو مجھے مشورہ دے رہی ہے کہ میں اللہ کے سوا دوسروں کے نام پر ذبح کروں تو جو کھانا پینا لے کر آئی ہے مجھ پر حرام ہے اور آئندہ بھی جو کچھ تو لے کر آئے گی اس کو چکھنا بھی میرے لئے حرام ہے میرے پاس سے تو الگ ہو جا مجھے صورت نہ دکھا۔ غرض ایوب نے بی بی کو نکال دیا اور وہ چلی گئی، اس کے بعد جب ایوب نے دیکھا کہ اب تو میرے پاس نہ کچھ کھانے کو ہے نہ پینے کو نہ میرا کوئی دوست ہے تو سجدہ میں گر پڑے اور دعا کی اے میرے رب مجھے دکھ لگ گیا ہے۔

وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾ اور تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ حضرت ایوب نے عرض مدعا نہیں کیا بلکہ پہلے اپنی قابل رحم حالت کا اظہار کیا اور پھر اللہ کے ارحم الراحمین ہونے کا۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ پھر ہم نے اس کی دعا قبول کی۔ اور فرمایا تیری دعا قبول کر لی گئی اب سجدہ سے سر اٹھا۔

فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ اور جو کچھ اس کو دکھ تھا ہم نے دور کر دیا۔ حضرت ایوب کو حکم دیا گیا زمین پر ایڑی مارو۔ ایوب نے حکم کی تعمیل کی فوراً پانی کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا، حسب الحکم، آپ نے اس میں غسل کیا غسل کرتے ہی ہر ظاہری بیماری جاتی رہی اور حسن و شباب لوٹ آیا اور چالیس قدم چلے پھر دوبارہ ایڑی مارنے کا حکم ہوا آپ نے حکم کی تعمیل کی تو ایک اور چشمہ پھوٹ نکلا جس کا پانی ٹھنڈا تھا، حکم ہوا اس میں سے پانی لے کر پیو، جونہی آپ نے وہ پانی پیا تمام اندرونی بیماریاں بھی دفع ہو گئیں اور مکمل ترین تندرست، حسین، جوان مردوں کی طرح ہو گئے اس کے بعد آپ نے لباس پہنا اور دائیں بائیں گردن موڑ کر دیکھا تو وہ تمام مال و اولاد جو پہلے ان کے پاس تھی سب موجود پائی بلکہ اللہ نے اس کو دوگنا کر دیا۔ دولت کی کثرت اتنی ہو گئی کہ جس پانی سے آپ غسل کر رہے تھے اس کی چھینٹیں جب سینہ پر پڑیں تو وہ سونے کی ٹڈیاں بن گئیں اور حضرت ایوب ان کو پکڑنے کے لئے ہاتھ مارنے لگے، اللہ نے وحی بھیجی ایوب کیا میں نے تجھے غنی نہیں بنا دیا ہے، آپ نے عرض کیا بے شک تو نے مجھے غنی بنا دیا، لیکن یہ تو تیری مزید عنایت ہے اور مزید رحمت سے کون سیر ہو سکتا ہے۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ایوب برہنہ غسل کر رہے تھے کہ سونے کی ٹڈیاں آپ کے اوپر گرنے لگیں آپ ان کو کپڑے میں بھرنے لگے، ندا آئی ایوب کیا میں نے تجھ کو اس سے بے نیاز نہیں کر دیا ہے تیرے پاس تو بہت مال ہے تجھے سونے کی ٹڈیاں پکڑنے کی کیا ضرورت ہے ایوب نے کہا تیری عظمت کی قسم تو نے مجھے غنی ضرور بنا دیا ہے لیکن تیری طرف سے نازل ہونے والی برکت سے تو میں بے نیاز نہیں ہوں۔

حسن کا بیان ہے تندرست ہونے کے بعد حضرت ایوبؑ ایک اونچی جگہ پر جا بیٹھے ادھر بیوی نے اپنے دل میں کہا اگر ایوبؑ نے مجھے نکال بھی دیا ہے پھر بھی میں کس کے بھروسہ پر اس کو چھوڑ سکتی ہوں یوں وہ بھوکا مر جائے گا اور اس کو درندے کھا جائیں گے، یہ سوچ کر بیوی لوٹ آئی تو وہاں نہ وہ گھورا ملا نہ گزشتہ حالت کا نشان۔ سب چیزیں بدل گئی تھیں جہاں پہلے گھورا تھا۔ بے چاری چکر کاٹنے اور رونے لگی، یہ سب واقعہ ایوب کی نظر کے سامنے ہو رہا تھا اور چونکہ آپ ایک اچھا لباس پہنے تھے اس لئے وہ بی بی آپ کے پاس آکر پوچھنے سے ڈر رہی تھی حضرت ایوب نے خود ہی اس کو بلایا اور دریافت کیا اللہ کی بندی تیرا کیا مقصد ہے، بی بی رونے لگی اور کہا یہاں گھورے پر ایک بیمار پڑا تھا مجھے اس کی تلاش ہے معلوم نہیں وہ مر گیا یا کیا واقعہ اس کو پیش آیا حضرت نے پوچھا وہ تیرا کون تھا بی بی نے رو کر کہا وہ میرا شوہر تھا۔ حضرت نے کہا اگر تو اس کو دیکھ لے تو پہچان لے گی، بیوی نے کہا کوئی بھی ایسا نہیں جس نے اس کو دیکھا ہو اور پہچان نہ سکے، پھر ڈرتے ڈرتے وہ آپ کو تکنے لگی اور کہا جب وہ تندرست تھا تو نقشہ میں آپ کے ساتھ بہت مشابہ تھا۔ حضرت نے فرمایا میں ہی ایوب ہوں جس کو تو نے ابلیس کے نام پر قربانی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن میں نے اللہ کا حکم مانا اور شیطان کا کہنا نہ مانا۔ میں نے اللہ سے دعا کی اس نے مجھے وہ سب چیزیں لوٹا کر دے دیں جو تیری نظر کے سامنے ہیں۔

وہب کا بیان ہے ایوب برسوں دکھ میں رہے اور ابلیس پر غالب آئے اور شیطان ان پر بالکل قابو نہ پا سکا تو ایک گھوڑے پر سوار ہو کر حضرت ایوب کی بیوی کے راستہ میں آکھڑا ہوا ظاہری شکل آدمی کی بنائی تھی لیکن عجیب ہیئت تھی دوسرے آدمیوں سے جسم، قد اور حسن کے لحاظ سے بالکل ممتاز تھا اور گھوڑے کی جسامت نظر فریبی اور اعضاء کی مکمل ساخت بھی دوسرے گھوڑوں سے اعلیٰ تھی، جب حضرت ایوب کی بیوی ادھر سے گزری تو شیطان نے اس سے کہا کیا تم اس دکھی ایوب کی بیوی ہو۔ بیوی نے کہا ہاں، شیطان نے کہا کیا تم مجھے پہچانتی ہو بیوی نے کہا نہیں، شیطان نے کہا میں زمین کا دیوتا ہوں میں نے ہی ایوب کا یہ حال کر رکھا ہے کیونکہ اس نے مجھے چھوڑ کر آسمان کے خدا کی پوجا کی تھی اور مجھے ناراض کر دیا تھا اب بھی اگر وہ مجھے ایک سجدہ بھی کر لے تو میں نے ایوب کا جو مال و اولاد لے لیا ہے وہ تم دونوں کو لوٹا دوں گا وہ سب چیزیں میرے پاس موجود ہیں، یہ کہہ کر شیطان نے وادی کے اندر عورت کو تمام وہ جانور دکھا دیئے جو مر چکے تھے۔ وہب کا بیان ہے میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ابلیس نے زوجہ ایوب سے یہ بھی کہا کہ اگر تیرا آدمی بغیر بسم اللہ کے کھانا کھائے گا تو اس کو تندرست کر دیا جائے گا اور جس مرض میں وہ مبتلا ہے وہ دکھ دور کر دیا جائے گا۔

بعض کتابوں میں آیا ہے کہ ابلیس نے عورت سے کہا تھا مجھے ایک سجدہ کر لے میں تیرا مال و اولاد واپس کر دوں گا اور تیرے شوہر کو بھلا چنگا بنا دوں گا۔ عورت نے واپس آکر حضرت ایوب کو اس بات کی اطلاع دی، حضرت ایوب نے فرمایا وہ دشمن خدا تیرے پاس دین سے بہکانے کے لئے آ پہنچا، پھر آپ نے قسم کھائی کہ اگر اللہ مجھے تندرست کر دے گا تو میں سو تازیانے تیرے ماروں گا۔ جب آپ نے دیکھا کہ ابلیس کو اب یہ خیال ہو چلا ہے۔ کہ آپ کی بیوی اس کو سجدہ کر لے گی اور اس نے بیوی کو اور مجھ کو کفر کی دعوت دینے کی جرأت کی ہے اس وقت آپ نے دعا کی رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ چونکہ آپ کی بی بی رحمت نے مصیبت میں آپ کا ساتھ دیا اور صبر کیا اس لئے اللہ نے اس پر رحمت فرمائی اور اس کے لئے حکم میں تخفیف کر دی اور حضرت ایوب کو قسم پوری کرنے کی یہ تدبیر بتا دی کہ سو شاخوں کا ایک گٹھا لے کر ایک دم رحمت کے مار دو اس طرح تمہاری قسم پوری ہو جائے گی حضرت ایوب نے حکم کی تعمیل کی چھوٹی چھوٹی سو شاخوں کا ایک گٹھا بنا کر بیوی کے ایک مرتبہ مار دیا۔

بعض روایت میں آیا ہے کہ ابلیس ایک صندوقچہ میں دوائیں بھر کر طبیب کی ہیئت بنا کر حضرت ایوب کی بیوی کے راستہ میں آگھڑا ہوا۔ بی بی ادھر سے گزری اور طبیب کو دیکھا تو اس سے کہا میرا ایک بیمار ہے کیا تم اس کا علاج کر دو گے۔ ابلیس نے کہا ہاں علاج کر دوں گا اور اس کے سوا اور کسی معاوضہ کا طلب گار بھی نہیں ہوں گا کہ جب میں اس کو تندرست کر دوں تو وہ اتنا کہہ دے کہ تم نے مجھے صحت مند کر دیا، بیوی نے جا کر حضرت ایوبؑ سے اس بات کا تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا وہ ابلیس ہے جس نے تجھے فریب دیا ہے، میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر اللہ نے مجھے شفا عطا فرما دی تو میں تیری سو کھچیاں ماروں گا۔

وہب وغیرہ کا بیان ہے کہ ایوب کی بیوی کچھ محنت مزدوری کر کے ایوب کے لئے کھانا لے آتی تھی جب ایوب کا دکھ اور بڑھ گیا تو لوگوں نے آپ کی بیوی کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور ایک روز تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ کسی نے اس کو کام پر لگایا ہی نہیں دن بھر اس نے کام کی تلاش کی مگر کوئی کام نہیں ملا مجبوراً اس نے اپنے سر کے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر ایک روٹی کے عوض اس کو بیچ ڈالا۔ روٹی لے کر ایوب کے پاس آئی تو آپ نے پوچھا سر کی لٹ کیا ہوئی۔ بی بی نے واقعہ بیان کر دیا اس وقت آپ نے کہا۔ مَسَّنِيَ الضُّرُّ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے جب زخموں کے کیڑے آپ کے دل اور زبان کی طرف جانے لگے تھے، آپ کو اندیشہ ہوا کہ اگر ایسا ہو گیا تو میں اللہ کے ذکر و فکر سے بھی رہ جاؤں۔

حبیب بن ثابت نے کہا جب تین باتیں حضرت ایوب کے سامنے آگئیں اس وقت مجبوراً آپ نے مَسَّنِيَ الضُّرُّ کہا۔ (۱) حضرت ایوب کی بیماری کی اطلاع پا کر آپ کے دو دوست آئے اور دیکھا کہ آپ کی آنکھیں جاتی رہی ہیں اور عام حال بھی برا ہے، کہنے لگے اگر اللہ کے ہاں تمہارا کچھ بھی مرتبہ ہوتا تو یہ دکھ تم کو نہ پہنچتا۔ (۲) بیوی نے آپ کے لئے کھانا تلاش کیا لیکن قیمت موجود نہ ہونے کی وجہ سے میسر نہ آیا مجبوراً اپنا ایک گیسو کاٹ کر (فروخت کر کے اس کی قیمت سے) کھانا لے کر آئی اور آپ کو کھلایا۔ (۳) ابلیس نے کہا تھا کہ میں ایوب کا علاج کر دوں گا، شرط یہ ہے کہ شفاء پانے کے بعد وہ یہ اقرار کر لے کہ تو نے مجھے تندرست کر دیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابلیس نے حضرت ایوب کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ شاید بیوی نے حرام زنا کیا اور گیسو کاٹ دیا، اس وسوسہ کے پیدا ہونے پر آپ کے لئے صبر کرنا مشکل ہو گیا اور بیوی کو بلا کر قسم کھا کہ میں تیرے سو تازیانے ماروں گا اور پھر دعا کی۔

مَسَّنِيَ الضُّرُّ کا مطلب بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ دشمنوں کی شماتت کا مجھے دکھ لگ گیا ہے بعض روایت میں آیا ہے کہ تندرست ہو جانے کے بعد جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ مصیبت کے زمانے میں سب سے بڑھ کر تکلیف دہ چیز آپ کے لئے کیا تھی فرمایا میرے دکھ پر دشمنوں کا خوش ہونا۔

بعض اقوال میں آیا ہے کہ ایک کیڑا ران سے نیچے گر گیا آپ نے اس کو اٹھا کر پھر اس کی جگہ ران میں رکھ دیا اور فرمایا کیا مجھے اللہ نے تیری غذا بنایا ہے۔ اس وقت کیڑے نے ایسا کاٹا کہ جتنے کیڑوں نے اس سے پہلے کاٹا تھا سب کی تکلیف سے اس کیڑے کے کاٹنے کی تکلیف بڑھ گئی اور آپ نے بے ساختہ مَسَّنِيَ الضُّرُّ کہا۔

ایک شبہ

اللہ نے تو ایوبؑ کو صابر کے خطاب سے سرفراز فرمایا، حالانکہ اپنے دکھ کا شکوہ کیا اور بے صبری کا مظاہرہ کیا أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ بھی کہا اور مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ بھی فرمایا۔

ازالہ

یہ شکایت نہ تھی دعا تھی کیونکہ اللہ نے اس دعا کے سلسلہ میں فرمایا فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ہم نے اس کی دعا قبول کی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ جزع اور بے صبری تو مخلوق سے بیماری کی شکایت کرنے کی صورت میں ہو سکتی ہے، اللہ سے بیماری کے

اظہار کا نام جزع اور بے صبری نہیں۔ حضرت یعقوب نے فرمایا تھا۔ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ میں اللہ سے اپنے اندرونی اندوہ و غم کا شکوہ کرتا ہوں۔

سفیان بن عیینہ کا قول ہے جو شخص فیصلہ خداوندی پر راضی ہو اور لوگوں سے اپنے دکھ کا اظہار کرے تو یہ بے صبری اور جزع نہیں ہے بلکہ اپنی حالت کا اظہار ہے جیسا کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیماری کے زمانہ میں جبرئیل آئے اور پوچھا آپ اپنے کو کیسا پاتے ہیں یعنی آپ کو اپنی حالت کیسی محسوس ہوتی ہے، مزاج کیسا ہے حضور ﷺ نے فرمایا میں اپنے کو مغموم اور بے چین پاتا ہوں۔ میں کہتا ہوں ابن جوزی نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جبرئیلؑ نے آ کر کہا اللہ آپ کو سلام فرماتا ہے اور دریافت فرماتا ہے آپ کا کیا حال ہے۔ الحدیث۔

جب حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مزاج پرسی کے جواب میں کہا ہائے میرا سر تو حضور ﷺ نے بھی اپنے درد سر کی شکایت کی اور فرمایا تم کو ہی درد سر کی شکایت نہیں میں بھی کہتا ہوں ہائے میرا سر یعنی میرے سر میں بھی درد ہے۔ ابن اسحاق اور امام احمد نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ بقیع سے واپس آ کر رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اس وقت آپ کے سر میں درد ہو رہا تھا اور مجھے بھی سر کا دکھ تھا یعنی درد سر تھا میں نے کہا ہائے سر فرمایا تم ہی نہیں میں بھی کہتا ہوں آہ میرا سر۔ الحدیث۔

وَاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ اور ہم نے اس کو عطا کیے اس کے بیوی بچے اور اتنے ہی اور بھی۔

کیا مرے ہوئے بچے زندہ کر دیئے گئے یا دوسری اولاد عطا کی گئی

یہ مسئلہ اختلافی ہے حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، قتادہ، حسن اور اکثر مفسرین کا قول ہے کہ اللہ نے بعینہ وہی مرے ہوئے اہل و عیال زندہ کر دیئے تھے اور اتنے ہی اور بھی عطا فرما دیئے تھے۔ ظاہر آیت اسی تفسیر پر دلالت کر رہی ہے، حسن کا قول ہے کہ اتنے ہی مویشی اور اولاد انہی مویشی اور اولاد کی نسل سے پیدا کر دئے جن کو مرنے کے بعد اللہ نے زندہ کیا تھا، اس مطلب کی تائید حضرت ابن عباس کے اس قول سے ہوتی ہے جو بروایت ضحاک آیا ہے کہ اللہ نے اس بیوی کو دوبارہ جوان کر دیا اور اس کے بطن سے اس کے بعد چھبیس لڑکے پیدا ہوئے۔ وہب نے کہا سات لڑکیاں اور تین لڑکے پیدا ہوئے، ابن یسار نے کہا حضرت ایوب کے سات لڑکے اور سات لڑکیاں ہوئیں۔

حضرت انسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حضرت ایوب کے دو خرمن تھے ایک گیہوں کا دوسرا جو کا۔ اللہ نے دو بدلیاں بھیجیں ایک بدلی نے ایک خرمن پر سونے کی بارش کی اور دوسری بدلی نے دوسرے خرمن پر چاندی بہادی۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ایوب کے پاس ایک فرشتہ آیا اور اس نے کہا اللہ نے آپ کو آپ کے صبر کی وجہ سے سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ اپنے خرمن کو باہر نکل کر دیکھو حسب الحکم آپ باہر نکلے اللہ نے آپ کے خرمن پر سونے کی ٹڈیاں بھیج دیں، ایک ٹڈی جو اڑی تو ایوب نے اس کا پیچھا کیا اور پکڑ کر واپس لے آئے، فرشتے نے کہا جو کچھ ٹڈیاں خرمن کے اندر ہیں کیا وہ آپ کے لئے کافی نہیں تھیں، حضرت ایوب نے کہا یہ تو میرے رب کی برکتوں میں سے ایک برکت ہے اور میں اپنے رب کی نوازشوں سے سیر نہیں ہو سکتا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جو مویشی اور اہل و عیال مر چکے تھے اللہ نے ان کو دوبارہ زندہ نہیں کیا بلکہ ان جیسے دوسرے عطا فرما دیئے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ حضرت ایوب سے کہا گیا کہ تیری اولاد آخرت میں تجھے ملے گی اب اگر تو چاہتا ہے تو ہم اس دنیا میں تیرے پاس بھیج دیں اور اگر تیری خواہش ہو تو وہ اولاد آخرت میں تیرے لئے رکھ دیں اور ان کی مثل ویسی ہی اولاد تجھے دنیا میں دے دیں۔ حضرت ایوب نے آخری شق کو پسند کیا کہ مرنے والی اولاد تو آخرت میں عطا کر دی جائے اور ان کی مثل دوسری اولاد دنیا میں مل جائے۔ اس روایت کے بموجب آیت کا مطلب اس طرح ہوگا۔ ہم نے ایوب کو اس کی مر جانے والی اولاد تو آخرت میں عطا کرنے کے لئے رکھ لی اور انہی کی طرح دوسری اولاد دنیا میں مرحمت فرما دی۔ آیت میں اہل سے مراد ہے اولاد۔

رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَذِكۡرٰى لِلۡعٰبِدِيۡنَ (۸۴) (ہم نے ایوب کو اس کی اولاد عطا کی) اپنی رحمت کی وجہ سے اور (دوسرے) عبادت گزاروں کو نصیحت کرنے کے لئے۔

وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِدۡرِيۡسَ وَذَا الۡكِفۡلِ ؕ اور اسمٰعیل (بن ابراہیم) کو اور ادریس (یعنی اخنوخ) اور ذوالکفل کو۔ ذوالکفل کون تھے پیغمبر تھے یا نہ تھے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ عطاء کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر کے پاس وحی آئی کہ آپ کے انتقال کا وقت قریب آگیا ہے بنی اسرائیل کے سامنے اپنی حکومت رکھیے اور جو شخص اس بات کی ذمہ داری لے کہ وہ رات میں نمازیں پڑھے گا...... سستی نہیں کرے گا اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھے گا، کسل نہیں کرے گا اور لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرے گا اور اس کو غصہ نہیں آئے گا اس کو حکومت سپرد کر دیجئے۔ پیغمبر نے بنی اسرائیل کے سامنے معاملہ رکھا، مجلس میں سے ایک جوان اٹھا اور عرض کیا میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں اس جوان نے ذمہ داری قبول بھی کرلی اور اس کو پورا بھی کیا اور اللہ نے بھی اس کی قدر افزائی کی اور اس کو نبوت سے سرفراز فرمادیا اسی جوان کا نام ذوالکفل ہوا۔

مجاہد نے کہا جب الیسع پیغمبر بوڑھے ہوگئے تو انہوں نے کسی کو اپنی جگہ مقرر کرنا چاہا لیکن یہ طے کرلیا کہ اپنی زندگی میں کسی کو اپنا پورا کام سپرد کر کے دیکھ لوں کہ وہ لوگوں کا انتظام کیسا کرتا ہے چنانچہ آپ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا جو شخص میری تین باتیں پوری کرنے کی ذمہ داری لے گا میں اپنا کام اس کے سپرد کر دوں گا۔

(۱) ...... ہمیشہ دن کو روزہ رکھے۔

(۲) ...... رات کو نمازیں پڑھے۔

(۳) ...... اور لوگوں کے معاملات طے کرنے میں غصہ نہ کرے۔

یہ سن کر ایک شخص جو دیکھنے میں حقیر سا معلوم ہوتا تھا کھڑا ہوا اور اس نے کہا میں ایسا کر سکتا ہوں۔ حضرت الیسع نے اس کو قبول نہیں کیا پھر دوسرے روز بھی یہی اعلان کیا اس وقت بھی سب لوگ خاموش رہے صرف وہی جوان کھڑا ہوا اور اس نے کہا میں ایسا کر سکتا ہوں آخر الیسع نے اس کو اپنا جانشین بنا دیا۔ جب یہ خلیفہ اپنی خواب گاہ میں قیلولہ کرنے کے لئے پہنچا اور دن رات میں وہی وقت اس کے سونے کا تھا فقط قیلولہ کے وقت ہی وہ ایک نیند لے لیتا تھا۔ اچانک ایک کمزور بوڑھے کی شکل میں ابلیس آپہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ خلیفہ نے پوچھا کون ہے، ابلیس نے جواب دیا ایک بہت بوڑھا مظلوم۔ خلیفہ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا، بوڑھے نے کہا میری اور میری قوم کے درمیان کچھ جھگڑا ہے۔ انہوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور یہ یہ حرکتیں کی ہیں۔ بوڑھے نے اپنی بات کو اتنا طول دیا کہ قیلولہ کا وقت جاتا رہا اور پچھلا دن آگیا، خلیفہ نے کہا شام کو جب میں جاؤں گا تو تیرا حق دلوا دوں گا، ابلیس چلا گیا اور خلیفہ پچھلے دن میں جب اپنی مجلس میں پہنچا تو اس بوڑھے کو تلاش کرنے کے لئے ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا لیکن وہ کہیں نہیں دکھائی دیا۔ دوسرے دن صبح کو بھی جب خلیفہ نے لوگوں کے مقدمات طے کرنے کے لئے اجلاس کیا تب بھی بوڑھے کو تلاش کیا لیکن وہ نظر نہ آیا، اجلاس کے بعد قیلولہ کرنے کے لئے جب اپنی خواب گاہ میں پہنچا تو بوڑھے نے دروازہ کھٹکھٹایا خلیفہ نے دروازہ کھول دیا، بوڑھا آگیا، خلیفہ نے کہا میں نے تجھ سے نہیں کہہ دیا تھا کہ جب اجلاس کروں اس وقت آنا، بوڑھے نے کہا وہ بہت برے لوگ ہیں، جب آپ اجلاس میں بیٹھے تھے اور ان کو معلوم ہوگیا۔ تو انہوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ ہم تجھے تیرا حق دے دیں گے اور جب آپ اجلاس سے اٹھ گئے تو انہوں نے ادائے حق سے انکار کر دیا۔ خلیفہ نے کہا اب تو جا پھر جس وقت میں پچھلے دن میں اجلاس کروں تو میرے پاس آنا اس گفتگو میں اس دوپہر کا آرام بھی خلیفہ کا جاتا رہا اور پچھلے دن میں جب وہ مجلس میں لوٹے تو بوڑھے کو ادھر ادھر دیکھنے لگے لیکن اس کو نہ پایا پھر اونگھ سے مغلوب ہوگئے تو تیسری دوپہر کو خلیفہ نے گھر والے خادم کو حکم دیا کہ کسی کو دروازے کے قریب آنے کی بھی اجازت نہ دینا تاکہ میں سو جاؤں میرے اوپر نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔ غرض جب سونے کا وقت آیا تو وہ بوڑھا آپہنچا مگر خادم نے اجازت نہیں دی، بوڑھا بے بس ہوگیا اسی اثناء میں اس کو کمرے کا روشن دان نظر آیا فوراً کود کر اس کے اندر داخل ہوگیا اور اندر پہنچ گیا اور اندر سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا تاکہ خلیفہ بیدار ہو جائے

خلیفہ بیدار ہو گیا اور خادم کو آواز دے کر کہا اے شخص کیا میں نے تجھے حکم نہیں دیا تھا کہ کوئی شخص دروازے پر نہ آئے، خادم نے کہا میری طرف سے تو کوئی آیا نہیں ہے آپ خود دیکھ لیجئے کہ یہ شخص کس طرف سے آیا ہے خلیفہ نے اٹھ کر دروازہ کو دیکھا تو اس کو مقفل پایا لیکن وہ شخص کمرے کے اندر موجود تھا وہ کہنے لگا کیا آپ یہاں سوتے رہیں گے ایسی حالت میں کہ اہل معاملہ دروازہ پر موجود ہوں۔ اب خلیفہ نے اس کو پہچانا اور کہا اے خدا کے دشمن تو ہے ابلیس نے کہا ہاں آپ نے مجھے عاجز کر دیا اور میں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ محض غصہ دلانے کے لئے تھا لیکن اللہ نے آپ کو مجھ سے محفوظ رکھا اسی خلیفہ کو ذوالکفل کہا گیا کیونکہ انہوں نے ایک کام کا ذمہ لیا تھا اور اس ذمہ کو پورا بھی کر دیا۔

بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ ابلیس ذوالکفل کے پاس آیا ہے اور کہنے لگا میرا ایک قرض دار ہے جو ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہے آپ میرے ساتھ ذرا اٹھ کر چلیے اور میرا حق وصول کرا دیجئے آپ اس کے ساتھ اٹھ کر چل دیئے لیکن ابلیس بازار میں پہنچ کر ذوالکفل سے علیحدہ ہو گیا اور آپ کو تنہا چھوڑ کر چل دیا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ابلیس نے حضرت ذوالکفل سے معذرت کی اور کہا میرا مدعا علیہ مجھ سے بھاگ گیا۔

بعض اہل روایت نے کہا کہ ذوالکفل وہ شخص تھا جس نے مرتے دم تک ہر رات کو سو رکعت پڑھنے کا عہد کیا تھا اور اس عہد کو پورا کیا۔ بعض علماء نے کہا کہ ذوالکفل نبی تھے۔ عبارت قرآنی کی رفتار سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے لیکن کون سے نبی تھے اس کی تعیین نہیں کی جا سکتی۔ بعض نے ذوالکفل زکریا کو ہی قرار دیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا ذوالکفل نبی نہیں تھے ایک نیک آدمی تھے۔

كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ان میں سے ہر ایک مصائب پر اور مشقت اطاعت پر صبر کرنے والوں میں سے تھا۔ خواہشات نفس اور گناہوں سے نفس کی باگ روکنے والوں میں سے تھا۔

وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔ رحمت سے مراد ہے نبوت، جنت اور مراتب قرب۔

اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ بلاشبہ وہ اہل صلاح میں سے تھے یعنی ان لوگوں میں سے تھے جن کو بگاڑ اور خرابی کی ہر کدورت سے بچا لیا گیا تھا۔

وَذَا النُّوْنِ اور ذوالنون مچھلی والے کو یاد کرو۔ ذوالنون سے مراد حضرت یونس بن متی ہیں، جن کو صاحب الحوت بھی کہا گیا ہے۔

اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا جس وقت وہ انتہائی غصے میں چل دیا تھا۔

حسب روایت عوفی حضرت ابن عباس کا قول ہے اور ضحاک نے بھی یہی کہا ہے کہ حضرت یونس اپنی قوم کے ساتھ فلسطین میں رہتے تھے، کسی بادشاہ نے ان پر حملہ کیا اور ساڑھے نو قبیلوں کو قید کر کے لے گیا صرف ڈھائی قبیلے باقی رہ گئے۔ اللہ نے شعیا نبی کے پاس وحی بھیجی کہ تم حزقیا بادشاہ کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ کسی طاقتور نبی کو دشمنوں کے پاس بھیج کر بنی اسرائیل کو قید سے رہا کرائے۔ میں دشمنوں کے دلوں میں بنی اسرائیل کو رہا کرنے کا خیال پیدا کر دوں گا۔ شعیا نبی شاہ حزقیا کے پاس گئے اور پیام پہنچایا۔ حزقیا کی سلطنت میں پانچ پیغمبر تھے۔ حضرت شعیا سے اس نے پوچھا آپ کی کیا رائے ہے کس کو بھیجوں۔ حضرت شعیا نے کہا یونس کو وہ طاقتور بھی ہے اور امانتدار بھی۔ بادشاہ نے کہا نہیں یونس نے کہا کیا مجھے اللہ نے نامزد کیا ہے۔ بادشاہ نے کہا نہیں یونس نے کہا تو میرے سوا یہاں دوسرے طاقتور پیغمبر ہیں کسی اور کو بھیج دو لوگوں نے آپ کی بات نہیں مانی اور جانے پر اصرار کیا، یونس پیغمبر بادشاہ اور قوم سے ناراض ہو کر غصہ کی حالت میں (کسی طرف کو) چل دیئے اور بحر روم پر پہنچ کر کشتی میں سوار ہو گئے۔

عروہ بن زبیر اور سعید بن جبیر اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یونس اپنی قوم کو چھوڑ کر اللہ سے ناراض ہو کر چل

دیئے تھے اور خدا سے ناراضگی کا سبب یہ تھا کہ یونس نے حسب حکم خدا قوم کو عذاب سے ڈرایا تھا اور عذاب کا وقت مقرر کر دیا تھا لیکن جب قوم یونس نے علامات عذاب دیکھ کر توبہ و استغفار کیا تو اللہ نے عذاب ٹال دیا، یونس کو اس پر ناگواری ہوئی ان کو خیال ہوا کہ اب لوگ مجھے جھوٹا قرار دیں گے۔ شرم کے مارے قوم کو چھوڑ کر چل دیئے ان کو کیا معلوم تھا کہ عذاب ٹل جانے کی وجہ کیا ہوئی، آپ کی ناراضگی صرف اس سبب سے ہوئی کہ آپ کا جھوٹا ہونا قوم کی نظر میں محقق ہو گیا آپ کو اندیشہ ہوا کہ آئندہ لوگ مجھے جھوٹا کہیں گے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت یونس کی قوم کا دستور تھا کہ جھوٹے کو قتل کر دیا کرتے تھے حضرت یونس کو بھی عذاب ٹل جانے کی وجہ سے یہی اندیشہ ہوا کہ عذاب موعود نہیں آیا اب لوگ مجھے قتل کر ڈالیں گے۔

مُغَاضِبًا (باب مفاعلہ) اس جگہ اشتراک طرفین کے لئے نہیں ہے بلکہ مُسَافَرَت اور مُعَاقَبَت کی طرح ثلاثی مجرد کے معنی میں ہے یعنی مُغَاضِبًا کا معنی ہے غَضْبَان۔

حسن نے کہا اللہ سے حضرت یونس کی ناراضگی کا سبب یہ تھا کہ اللہ نے یونس کو حکم دیا کہ فوراً جاؤ اور ان کو ہمارے عذاب سے ڈراؤ اور دعوت ایمان دو، یونس نے درخواست کی کہ مجھے روانگی کی تیاری کرنے کی مہلت دی جائے، جواب ملا، معاملہ اس سے بھی جلدی کا ہے، فوراً چلے جاؤ۔

یونس نے درخواست کی مجھے جوتے پہن لینے کی تو اجازت دے دی جائے، لیکن اللہ کی طرف سے اتنی بھی مہلت نہیں ملی اور فطری طور پر آپ کے اندر قوت حلم کی کمی تھی اس لئے روانہ تو ہو گئے مگر غصہ کی حالت میں۔ وہب نے کہا یونس نیک آدمی تھے۔ پھر جب آپ پر نبوت کا بار ڈالا گیا تو آپ دب گئے اور بھاگ نکلے اسی لئے اللہ نے آپ کو اولوالعزم پیغمبروں کی فہرست سے خارج کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا آپ اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کیجئے مچھلی والے کی طرح نہ ہو جایئے۔

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ پس یونس کا یہ خیال ہوا کہ ہم اس پر بندش کی تنگی نہیں کریں گے۔ قدرت کے معنی اس جگہ تنگی کرنے کے ہیں۔ یہی معنی دوسری آیت میں بھی آئے ہیں۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اللہ جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کا تنگ کرنا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ عطاء اور کثیر علماء کا تفسیری قول یہی ہے۔

لیکن مجاہد، ضحاک، کلبی اور عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول یہ ہے کہ قدر کا معنی ہے فیصلہ الٰہی یعنی یونس کا خیال ہوا کہ ہم اس کو سزا دینے کا فیصلہ نہیں کریں گے۔ تَقْدِیْر اور قَدْر ہم معنی ہیں اللہ نے فرمایا ہے نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ۔

بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ یونس نے خیال کیا کہ ہم اس کے معاملے میں اپنی قدرت سے کام نہیں لیں گے۔

بعض نے کہا آیت کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ یونس کے حال کو اس شخص کے حال سے تشبیہ دی جو اللہ کے حکم کا انتظار کئے بغیر اپنی قوم کو ذلت کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا ہو اور اس نے خیال کر لیا ہو کہ ہم اس پر قابو نہیں رکھتے۔

ابن زید نے کہا جملہ سوالیہ ہے حرف استفہام محذوف ہے اور استفہام انکاری و توبیخی ہے یعنی کیا یونس نے یہ خیال کر لیا کہ ہم اس پر قابو نہیں پائیں گے۔

بعض نے کہا یہ ظن (غالب خیال) نہ تھا بلکہ ایک شیطانی وسوسہ تھا یونس کے وہم میں یہ بات گزری تھی چونکہ پیغمبروں کے لئے ایسا وہم بھی ظن کا حکم رکھتا ہے، مترجم) اس لئے بطور مبالغہ اس کو ظن قرار دیا۔

حسن نے کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ یونسؑ سے جب گناہ سرزد ہو گیا اور وہ اللہ سے ناراض ہو کر چل دیئے تو شیطان نے ان کو راہ حق سے پھسلا دینا چاہا، یہاں تک کہ انہوں نے خیال کر لیا کہ میں خدا کے قبضے سے نکل جاؤں۔ لیکن ان کی گزشتہ نیکیاں اور عبادت گزاریاں تھیں اس لئے اللہ نے نہ چاہا کہ ان کو شیطان کے لئے چھوڑ دیا جائے، بلکہ مچھلی کے پیٹ میں ان کو ڈال دیا وہاں وہ

چالیس شبانہ روز رہے، عطاء کا قول ہے کہ سات روز رہے۔ بعض کا خیال ہے تین روز رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مچھلی اپنی پیٹ میں ان کو چھ ہزار سال کی مسافت پر لے گئی۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ساتویں زمین کی حدود تک لے گئی پھر آپ نے اپنے رب سے توبہ کی۔

فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ پھر وہ پکارا تاریکیوں میں یعنی سخت ترین تہ بہ تہ تاریکی میں، شدید ترین تاریکی کو متعدد تاریکیاں قرار دیا۔ یا متعدد تاریکیوں سے مراد ہیں رات کی تاریکی سمندر کی تاریکی، اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکی۔ سیاق کلام بتا رہا ہے کہ کچھ عبارت یہاں محذوف ہے۔ یعنی ناراض ہو کر غصے کی حالت میں یونس چل دیئے اور سمندر پر پہنچ کر ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ پھر کشتی کے اندر قرعہ اندازی کی گئی (کہ کس کی نحوست کی وجہ سے کشتی اڑ کر کھڑی ہو گئی ہے اور چکر کاٹ رہی ہے) تو یونس کا نام نکلا پھر ان کو سمندر میں پھینک دیا گیا یا انہوں نے خود اپنے کو سمندر میں ڈال دیا اور فوراً مچھلی نے ان کو منہ میں لے کر نگل لیا پھر انہوں نے پکارا۔

اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے بے شک میں اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں سے ہوں۔ یعنی میں تیری اجازت کے بغیر قوم کو چھوڑ کر چل دیا اور انتظام نہیں کیا حقیقت میں یہ میں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔

بغوی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ اللہ نے مچھلی کو حکم دیا یونسؑ کو پکڑ لے لیکن اس کے خراش نہ آئے نہ کوئی ہڈی ٹوٹے، حسب الحکم مچھلی نے آپ کو لے لیا اور اپنے مقام پر نیچے لے گئی جب سمندر کی تہ میں لے کر پہنچی تو یونس نے تسبیح (سبحان اللہ کہنے) کی آواز سنی، دل میں خیال کیا یہ کیسی آواز ہے اللہ نے وحی بھیجی یہ آواز سمندری جانوروں کی تسبیح کرنے کی ہے، یہ جان کر آپ نے بھی مچھلی کے پیٹ کے اندر ہی تسبیح کرنی شروع کر دی۔ ملائکہ نے تسبیح یونسؑ کی آواز سنی تو عرض کیا اے ہمارے رب ہم نے ایک عجیب زمین میں ایک ضعیف آواز سنی۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ فرشتوں نے کہا آواز تو جانی پہچانی ہے اور زمین انجان ہے۔ اللہ نے فرمایا یہ ہمارے بندے یونسؑ کی آواز ہے جس نے میری نافرمانی کی تھی۔ میں نے اس کو مچھلی کے پیٹ میں قید کر دیا فرشتوں نے کہا کیا یہ وہی نیک بندہ ہے جس کی طرف سے روزانہ کوئی نیک عمل تیری طرف چڑھایا جاتا تھا۔ اللہ نے فرمایا ہاں اس وقت ملائکہ نے یونسؑ کے لئے شفاعت کی اور اللہ نے مچھلی کو حکم دیا کہ یونسؑ کو اگل دے۔ مچھلی نے کنارے پر آکر یونسؑ کو اگل دیا، اسی کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے، فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ پھر ہم نے اس کی دعا قبول فرمائی اور اس کو غم سے نجات دے دی۔ یعنی گناہ کے غم سے اور مچھلی کا لقمہ بن جانے کے غم سے۔

وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اور اسی کی طرح ہم مومنوں کو نجات دیتے ہیں بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ وہ ہم کو پکاریں اور ہم سے فریاد کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مچھلی کے پیٹ کے اندر ذوالنون نے اپنے رب کو پکارا تھا ان کی دعا تھی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اس دعا کے ساتھ جو مسلمان کسی معاملہ میں اپنے رب کو پکارے گا اللہ اس کی دعا ضرور قبول فرمائے گا۔ رواہ احمد والترمذی والحاکم وصححہ من حدیث سعد بن وقاص۔ حاکم کی ایک روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتا دوں کہ اگر تم میں سے کسی پر کوئی دکھ یا مصیبت آپڑے اور وہ اس چیز کے ذریعہ سے اللہ سے دعا کرے تو اللہ ضرور اس کی مصیبت دور کر دے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ضرور ارشاد فرمایئے۔ فرمایا وہ ذوالنون کی دعا ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

ابن جریر کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے اللہ کا وہ نام کہ جس کے ذریعہ سے اگر اس سے دعا کی جائے تو وہ قبول فرما لیتا ہے اور اگر اس سے کچھ مانگا جاتا ہے تو عطا فرما دیتا ہے (ذوالنون کی دعا یعنی) لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ہے۔

سورۂ آل عمران کے آغاز میں ہم نے ذکر کردیا ہے کہ اللہ کا اسم اعظم تہلیل یعنی نفی و اثبات ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ کا درجہ بہت اونچا ہے (یعنی ضمیر غائب و حاضر کا ذکر صراحۃً لفظ اللہ کو ذکر کرنے سے افضل ہے) کیونکہ لفظ اللہ اگرچہ ذات پر دلالت کرتا ہے لیکن اس کے اندر صفات کمالیہ کا لحاظ ضرور ہوتا ہے اور اللہ اس ذات کا نام ہے جو تمام صفات کمالیہ کو جامع ہے اور ضمیریں خالص ذات پر دلالت کرتی ہیں، پھر ضمیروں میں بھی خطاب کی ضمیر کا درجہ غائب کی ضمیر سے اعلیٰ ہے کیونکہ خطاب کے اندر کامل ظہور ہوتا ہے (جس میں شرک کی احتمالی بو بھی باقی نہیں رہتی اور غائب کے ضمیر میں ابہام ہوتا ہے۔ مترجم)۔

حضرت یونسؑ کو کب پیغمبر بنایا گیا

بغوی نے لکھا ہے کہ سعید بن جبیرؒ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول منقول ہے کہ مچھلی کے پیٹ سے رہائی کے بعد حضرت یونسؑ کو پیغمبر بنایا گیا کیونکہ سورۃ الصافات میں پہلے فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ کے بعد وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ آیا ہے (اور ترتیب ذکر ترتیب واقعہ پر دلالت کرتی ہے معلوم ہوا کہ پہلے مچھلی نے حضرت یونس کو خشک زمین پر اگلا، پھر اللہ نے ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آدمیوں کی ہدایت کے لئے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا مترجم)۔

(حضرت مفسرؒ نے فرمایا) میں کہتا ہوں یہ استدلال کمزور ہے کیونکہ دو واقعوں کے درمیان واو عطف کو لانا ترتیب واقعات پر دلالت نہیں کرتا صرف اتنی بات بتاتا ہے کہ دونوں واقعے ہوئے، کون پہلے ہوا واو عاطفہ سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے علماء کہتے ہیں کہ آپ کی رسالت مچھلی کے نگلنے اور اگلنے سے پہلے ہی تھی کیونکہ اللہ نے فرمایا وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ اور یونس پیغمبروں میں تھے جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ گئے تھے۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا اور یاد کرو زکریا کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اے میرے رب مجھے اکیلا نہ چھوڑ یعنی بغیر اولاد کے نہ رکھ اولاد کو میرا جانشین بنادے۔

وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ اور سب وارثوں سے بہتر آپ ہی ہیں۔

یعنی مخلوق کے فنا ہونے کے بعد اللہ ہی باقی رہنے والا ہے اور سب سے اعلیٰ و بالا ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ پس ہم نے اس کی دعا قبول کی اور بیٹا عطا کیا جس کا نام یحییٰ تھا اور اس کی بی بی کو ٹھیک کر دیا، یعنی پہلے وہ بانجھ تھی اللہ نے اس کا بانجھ پن دور کردیا۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ بے شک وہ تمام پیغمبر نیکیوں کی طرف تیزی سے بڑھتے تھے اور امید و خوف کے ساتھ ہم کو پکارتے تھے۔ رغبت سے مراد ہے ملاقات خداوندی کی رغبت، قرب الٰہی کی رغبت یا ثواب کی رغبت اور امید قبولیت یا طاعت کی رغبت۔ امام احمد نسائی حاکم اور بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز کے اندر میری آنکھ کی ٹھنڈک بنادی گئی ہے۔ خوف سے مراد ہے اللہ سے جدا ہونے کا خوف یا گناہ کا خوف یا عذاب کا خوف۔

وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾ یعنی وہ ہمارے ڈر سے دعا کرنے والے تھے۔

مجاہد نے کہا دل میں جمے ہوئے ڈر کو خشوع کہا جاتا ہے چونکہ اللہ کی عظمت کو وہ پورے طور پر جانتے تھے اس لئے عظمت الٰہی کا خوف ان کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا۔ قتادہ نے آیت کا ترجمہ کیا وہ ہمارے حکم کے انتہائی تابعدار تھے (یعنی ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے اور ہمارے حکم کی اطاعت عاجزی کے ساتھ کرنے والے تھے۔ مترجم)

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا اور اس عورت کو یاد کرو جس نے اپنی شرم گاہ کو (حلال اور حرام دونوں سے محفوظ رکھا (اس سے مراد مریم بنت عمران ہیں جو دوشیزہ اور پاک دامن تھیں۔ مترجم)

فَنَفَخْنَا پھر ہم نے پھونکا یعنی ہمارے حکم سے جبرئیل نے پھونک ماری۔

فِيهَا اس کے اندر یعنی مریم کے گریبان کے اندر جبرئیل نے پھونک ماری اور یہ پھونک مریم کے جسم کے اندر پہنچ گئی اور اس پھونک سے اللہ نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو پیدا کر دیا۔

مِنْ رُّوْحِنَا اپنی روح سے یعنی اس روح سے جو ہمارے حکم سے ہے۔ اضافت کی وجہ سے مضاف کی عظمت کا اظہار مقصود ہے یا روح سے مراد ہیں عیسیٰ اور مِنْ رُّوْحِنَا میں مِنْ زائد ہے (اور رُّوْحِنَا مفعول کے قائم مقام ہے۔ مترجم)۔ یا رُّوْحِنَا سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی مِنْ جِهَةِ رُّوْحِنَا اور اس سے مراد ہیں حضرت جبرئیل۔

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾ اور ہم نے اس عورت کو اس کے بیٹے کو (یعنی ان کے قصے اور واقعہ کو) جہان والوں کے لئے (یعنی انسانوں کے لئے۔ مترجم۔) نشانی بنا دیا۔ جو ہماری قدرت کی ہمہ گیری پر دلالت کر رہی ہے کہ ہم بغیر باپ کے اولاد پیدا کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ بے شک یہ یعنی توحید کو ماننے اور تمام انبیاء پر ان کے زمانے میں ایمان لانے والوں کی ملت) تمہاری ملت ہے (یعنی تم سب کی ملت ایک ہی ہے۔ مترجم۔) اے انسانو! تم سب پر لازم ہے کہ اسی ملت کو اختیار کرو اور اس پر قائم رہو۔ یہ ایک ہی ملت ہے انبیاء کی ملتوں میں کوئی اختلاف نہیں اور دوسرے لوگوں کی ملتوں کا اس کے ساتھ اشتراک نہیں صرف اسی کا اتباع معتبر ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا تو اس کا دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

لفظ اُمَّةٌ اُمٌّ سے ماخوذ ہے باب نصر، اُمٌّ کا معنی ہے قصد کرنا جو جماعت ایک مقصد پر متفق ہو یا دین و سنت پر متفق ہو، اس کو امت کہا جاتا ہے۔ کذا فی القاموس۔ دین اور سنت ہی ساری جماعت کا مقصود ہے اس لئے اس پوری جماعت کو امت کہا جاتا ہے۔

وَّاَنَا رَبُّكُمْ اور میں ہی تم سب کا رب ہوں۔ یعنی میرے سوا تمہارا کوئی رب نہیں ہے۔

فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ سو میری عبادت کرو، کسی اور کی نہ کرو۔

وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ اور انہوں نے آپس میں اپنے کام یعنی دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ہر فرقہ ہماری طرف لوٹ کر آنے والا ہے۔ ع ۱۸

امر سے مراد ہے دین۔ تَقَطَّعُوْٓا اگرچہ باب تفعل ہے لیکن باب تفعیل مراد ہے یعنی انہوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقے فرقے بن گئے۔ ایک دوسرے پر لعنت کرنے لگے باوجودیکہ ان کے لئے اس کا جواز نہ تھا۔ ہمارے پاس لوٹ کر آنے سے یہ مراد ہے کہ ہم ان کو سزا و جزا دیں گے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ پھر جو شخص کچھ بھی نیکیاں مومن ہونے کی حالت میں کرے گا اس کی کوشش کی ناقدری نہیں ہوگی۔

مومن ہونے کی شرط اس لئے لگائی کہ اعمال کا ثواب پانے کی شرط ایمان ہے (بغیر ایمان کے کوئی نیکی ثواب آخرت کے قابل نہیں۔ مترجم) ایمان سے مراد ہے اللہ پر اس کے پیغمبروں پر اور پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعتوں پر ایمان رکھنا اور سب کو سچا ماننا۔

کفران سے مراد ہے ثواب نہ ملنا اور نیکی کا برباد چلا جانا جس طرح اللہ کی طرف سے بندے کی طاعت کی شکرگزاری کا معنی ہے ثواب عطا کرنا اسی طرح ناشکری کا معنی ہے ثواب نہ دینا۔

وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾ اور ہم بلاشبہ اس کے عمل اور کوشش کو لکھ رکھنے والے ہیں یعنی فرشتے اعمال ناموں میں ان کے اعمال درج کر لیتے ہیں اور اللہ ان کو اعمال ناموں میں قائم رکھتا ہے۔

وَحَرٰمٌ عَلٰي قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ اور ہم جن بستیوں کو عذاب سے یا موت

سے فنا کر چکے ان کے لئے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ دنیا میں لوٹ کر آئیں۔

حرام ہے یعنی ناممکن ہے تصور میں بھی نہیں لایا جاسکتا۔ اَهْلَكْنٰهَا یعنی جس کو ہلاک کرنے کا ہم نے حکم دے دیا، جس کو تباہ کر دیا، ہلاکت سے مراد ہے کفر یعنی جس بستی کو ہم نے کافر پایا اس کی نیکیوں کا اکارت نہ جانا ناممکن ہے، ہم اس کے نیک اعمال کو ضرور ضائع کر دیں گے یا حرام کا یہ مطلب ہے کہ اس بستی کا توبہ کرنا ناممکن ہے یا دنیا میں دوبارہ زندہ ہونا ناممکن ہے یا سزا کے لئے ان کا قیامت کی دن زندہ کر کے نہ اٹھایا جانا ناممکن ہے۔ اس مطلب پر اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ کلام سابق کی علت ہوگی یعنی یہ غیر ممکن ہونا اس لئے ہے کہ ان کا توبہ کرنا اور ہماری طرف رجوع کرنا اور گزشتہ کفر کی ایمان لا کر تلافی کرنا ہو نہیں سکتا یا حرام خبر مقدم ہے اور اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ مبتدا مؤخر مطلب یہ ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا اس بستی کا لوٹ کر مقام حساب اور مکان سزا تک نہ پہنچنا ناممکن ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے تشریحی مطلب اس طرح بیان فرمایا کہ جس بستی کو ہم نے تباہ کر دیا اس کا دنیا میں واپس لوٹنا ممکن نہیں اس مطلب پر لَا يَرْجِعُوْنَ میں لا زائد ہوگا۔

بہر صورت مطلب کچھ بھی ہو آیت میں کافروں کے لئے وعید عذاب اور اہل ایمان کے لئے وعدہ ثواب ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (۹۶) یہاں تک کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ انتہائی کثرت کی وجہ سے ہر بلندی یعنی پہاڑ اور ٹیلہ سے نکلتے معلوم ہوں گے۔

وَهُمْ اور وہ یعنی یاجوج ماجوج۔ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ ہر ابھار اور ہر ٹیلہ کی آڑ سے۔ يَنْسِلُوْنَ پھیل پڑیں گے یاجوج اور ماجوج دو قبیلوں کے نام ہیں۔ حضرت نواس بن سمعان کی حدیث سورۂ کہف کی آیت۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا کی تفسیر میں ہم نے نقل کر دی ہے، اس حدیث میں آیا ہے کہ اللہ یاجوج ماجوج کو بھیج دے گا اور وہ ہر ٹیلہ کی آڑ سے پھیل پڑیں گے۔

ہر ٹیلہ کی آڑ سے پھیل پڑنے کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا کہ یاجوج ماجوج کے مسکن پہاڑوں سے پرے ہوں گے اور وہ پہاڑوں سے نیچے اتریں گے۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک وَهُمْ کی ضمیر انسانوں کی طرف راجع ہوگی اور حَدَبٍ سے مراد ہوگی یعنی لوگ قبروں سے جلد جلد تیزی کے ساتھ نکل آئیں گے۔ مجاہد کی قرأت میں تو حَدَبٍ کی جگہ جَدَثٍ آیا ہے اور جدث کا معنی ہے قبر۔ اسی مضمون کو دوسری آیت میں بیان کیا ہے فرمایا ہے فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ۔

حضرت حذیفہ بن اسد غفاری کا بیان ہے ہم لوگ کچھ باہم بات چیت کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ بر آمد ہو گئے اور فرمایا کس چیز کا تذکرہ کر رہے ہو۔ ہم نے عرض کیا ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ فرمایا جب تک قیامت سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھو گے، قیامت بپا نہ ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے دخان دھوئیں کا خروج دجال کا، دابۃ الارض کا مغرب کی طرف سے طلوع آفتاب کا، نزول عیسیٰ بن مریم کا، خروج یاجوج ماجوج کا تین مقامات پر زمین کے دھنسنے کا۔ ایک مشرق میں دوسرا مغرب میں تیسرا جزیرۃ العرب میں اور آخر میں یمن سے ایک آگ کے بر آمد ہونے کا، جو لوگوں کو ہنکا کر میدان حشر کی طرف لے جائے گی کا ذکر فرمایا۔

دوسری روایت میں ہے کہ ایک آگ قعر عدن سے نکل کر لوگوں کو ہنکا کر میدان حشر کی طرف لے جائے گی۔ ایک اور روایت کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نے دسویں چیز اس ہوا کو قرار دیا جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔ رواہ مسلم۔

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ اور سچا وعدہ قریب ہو جائے گا۔ یعنی روز قیامت واؤ عاطفہ ہے اور اس کا عطف فُتِحَتْ پر ہے۔ لیکن فراء اور علماء کی ایک جماعت نے واؤ کو زائد کہا ہے اور اِقْتَرَبَ کو شرط کی جزا قرار دیا ہے۔ یعنی جب یاجوج و ماجوج کو کھول دیا جائے گا اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے اور پھیل جائیں گے تو اس وقت قیامت قریب آجائے گی۔ ایک اور

آیت میں واؤ زائد آیا ہے اور مابعد واؤ جزاء شرط ہے فرمایا ہے فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ وَنَادَيْنَاهُ پھر جب دونوں نے مان لیا اور ابراہیم نے اسمٰعیلؑ کو پیشانی کے بل لٹا دیا تو ہم نے اس کو پکارا۔ اس مطلب کے ثبوت کے لئے حضرت حذیفہ کی حدیث کو پیش کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر کسی آدمی نے بچھیرا پالا ہو گا۔ خروج یاجوج وماجوج کے بعد تو بچھیرا سواری کے قابل نہ ہو گا کہ قیامت بپا ہو جائے گی۔ علماء نے اس قول کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ واؤ زائد ہو اور مابعد واؤ جزا ہو ایسا نہیں ہوتا۔

فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ تو اس وقت اچانک کافروں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ شخص بصرہ اس کی آنکھ کھل گئی یا اس نے اپنی آنکھ کھول دی۔ اَبْصَار سے مراد ہیں پپوٹے پلکیں اور اِذَا مفاجاتیہ بمعنی اچانک، ناگہاں، یکدم ہے یعنی ہولناکی کی وجہ سے کافر نظر گھما نہ سکیں گے۔ حیران ہو کر رہ جائیں گے۔

يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾ کہیں گے ہائے ہماری تباہی ہم اس دن کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے بلکہ ہم خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔ یعنی اس دن کو حق نہیں جانتے تھے۔

إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ یعنی ہم اپنے نفسوں پر خود ظلم کرنے والے تھے ہم نے خود اپنے غور و فکر کو بیکار رکھا تھا یا نا قابل معبودیت کو معبود بنا رکھا تھا۔ (ظلم کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو بے محل رکھنا اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرنا، عبادت کا بے محل استعمال ہے اسی لئے اس کو ظلم قرار دیا۔ مترجم۔)

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ بلاشبہ تم اور جس چیز کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہے یا سب جہنم میں پھینکے جاؤ گے۔

مَا تَعْبُدُونَ سے مراد بے عقل بت ہیں۔ اور سامری کا بنایا ہوا بچھڑا اور ان جیسی دوسری بے جان چیزیں ہیں۔

جو چیزیں جاندار اور ذی عقل ہیں اگر لوگوں نے ان کو معبود بنا لیا ہو اور وہ اپنی پوجا کرانے پر راضی ہوں جیسے شیاطین اور انسانوں میں سے فرعون نمرود وغیرہ تو وہ بھی مَا تَعْبُدُونَ کے حکم میں داخل ہیں، ان کو بھی جہنم کا ایندھن بنایا جائے گا (کیونکہ باوجود ذی عقل ہونے کے انہوں نے عقل کا صحیح استعمال نہیں کیا اور باوجود مخلوق عاجز ہونے کے خالق اور قادر مطلق کے مقام پر پہنچنے کے مدعی بن بیٹھے، اس لئے وہ بھی بے عقل چیزوں کی طرح ہو گئے ان کو ذی عقل مخلوق میں شمار کرنا ہی غلط ہے۔ مترجم۔) باقی وہ مقدس عقلمند ہستیاں جو کسی سے اپنی عبادت کرانی نہیں چاہتے اور نہ وہ اپنے کو معبود کہنے پر راضی تھے نہ اس حرکت کو پسند کرتے تھے وہ مَا تَعْبُدُونَ کے حکم سے خارج ہیں۔ (جیسے حضرت عیسیٰؑ یا حضرت عزیرؑ یا ملائکہ وغیرہ) کوئی کسی دوسرے کا گناہ اپنے اوپر نہیں اٹھا سکتا۔ اس تفصیل و توضیح کی ضرورت اس لئے پڑی کہ اکثر محققین لغت کے نزدیک مَا کا لفظ عام ہے۔ ذی عقل اور غیر ذی عقل دونوں کو شامل ہے، اس لئے مراد کی تعیین ضروری ہے، بیضاوی نے اس جگہ ایک حدیث نقل کی ہے کہ ابن زبعری نے یہ آیت سن کر دریافت کیا کیا یہ حکم ہمارے ہی معبودوں کے لئے مخصوص ہے اَوْلِكُلِّ مَنْ عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یا ان تمام لوگوں کا بھی یہی حکم جن کی پوجا اللہ کے سوا کی گئی ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا بَلْ لِكُلِّ مَنْ عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر اس شخص کا یہی حکم ہے جس کی عبادت اللہ کے سوا کی گئی ہے (اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ آیت میں لفظ مَا ذی عقل کو بھی شامل ہے اسی لئے ابن زبعری کو دریافت کرنے کی ضرورت پڑی اور حضور ﷺ کے جواب سے بھی اس کی تائید ہو گئی کہ آپ نے ذی عقل باطل معبودوں کو آیت کے حکم میں داخل قرار دے دیا۔ مترجم)

ابوداؤد وابن منذر، ابن مردویہ اور طبرانی نے دوسری سند سے یہ حدیث بروایت ابن عباس بیان کی ہے۔

اگر لفظ مَا کو بے جان، بے عقل مخلوق کے ساتھ مخصوص قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ پھر وہ مقدس ہستیاں جو اپنے کو معبود قرار دیئے جانے کو پسند نہیں کرتی تھیں آیت کے حکم میں داخل نہیں ہوں گی۔

حَصَبُ جَهَنَّمَ وہ چیز جو جہنم میں پھینکی جائے اور اس سے جہنم کی آگ کو بھڑکایا جائے۔ حَصَبَہٗ اس پر پتھر برسائے۔ حَصْبَاء، پتھریاں، سنگ ریزے۔ کذا قال الضحاک۔

مجاہد اور قتادہ نے کہ یمنی زبان میں حَصَبْ جلائی جانے والی لکڑیوں کو کہا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا یہ حبشی زبان کا لفظ ہے، جس کا معنی ہے جلائی جانے والی لکڑیاں اید ھن۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی قرأت میں حَصَب کی جگہ لفظ حَطَبُ اید ھن آیا ہے۔

اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ تم اس پر (خصوصیت کے ساتھ) اترنے والے ہو (اتروگے) لَهَا میں لام بجائے علیٰ خصوصیت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ خطاب مشرکوں کو ہے اور ان کے ذیل میں ان کے معبود بھی داخل ہیں یعنی تم اپنے معبودوں سمیت جہنم میں اتروگے۔

لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ اگر تمہارے یہ معبود حقیقت میں معبود ہوتے تو جہنم میں نہ اترتے۔ یعنی جہنم میں سب کو داخل کرنے کے بعد کفار سے بطور توبیخ کہا جائے گا کہ اگر یہ معبود حقیقت میں ہوتے تو جہنم میں نہ اترتے۔

وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ اور (عابد و معبود) سب جہنم کے اندر ہمیشہ رہیں گے۔

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ ان کے لئے جہنم کے اندر کراہٹ ہوگی۔ زفیر کراہٹ تنفس کی شدت۔

وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ اور وہاں وہ اپنے غل شور میں کسی کی کوئی بات نہیں سنیں گے ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود کی روایت نقل کی ہے کہ جب دوزخ کے اندر حبس دوام کے جہنمی رہ جائیں گے تو ان کو لوہے کے صندوقوں میں بند کر کے لوہے کی کیلیں ٹھونک دی جائیں گی پھر ان صندوقوں کو دوسرے آہنی صندوقوں میں بند کر دیا جائے گا اور لوہے کی میخیں ٹھونک دی جائیں گی پھر ان صندوقوں کو جہنم کے نچلے حصہ میں پھینک دیا جائے گا اور ہر ایک یہی خیال کرے گا کہ میرے سوا کسی کو عذاب نہیں دیا جا رہا ہے یعنی کوئی کسی کی آواز نہیں سنے گا یہ بیان کرنے کے بعد حضرت ابن مسعود نے آیت مذکورہ تلاوت فرمائی۔

بغوی نے لوہے کے صندوقوں اور لوہے کی کیلوں کی جگہ آگ کے صندوقوں اور آگ کے کیلوں کا لفظ نقل کیا ہے باقی حدیث حسب سابق ہے۔

حاکم وغیرہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ نازل ہوئی تو مشرکوں نے کہا پوجا تو اللہ کے سوا عیسیٰؑ اور عزیر اور ملائکہ کی بھی کی جاتی ہے پھر یہ بھی جہنمی قرار پائیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی مقدر ہو چکی ہے وہ اس دوزخ سے دور رکھے جائیں گے۔

اَلْحُسْنٰى یعنی اچھا مرتبہ، درجہ قرب یا اچھی خصلت یعنی سعادت یا اللہ کی طرف سے طاعت کی توفیق یا جنت کی بشارت۔ حضرت جنید نے آیت مذکورہ کی تشریح میں فرمایا جن کو ابتداء میں ہماری عنایت حاصل ہو گئی انتہا میں ان کو ولایت نصیب ہو گئی۔

ابن مردویہ نے اور المختار میں ضیاء نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ عبداللہ ابن الزبعری نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا محمد ﷺ تم دعویٰ کرتے ہو کہ اللہ نے تم پر اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ نازل کیا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا ہاں ابن الزبعری نے کہا پھر پوجا تو چاند، سورج، ملائکہ اور عزیر کی بھی کی جاتی ہے۔ یہ سب بھی ہمارے معبودوں کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ اس پر آیت اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى اور آیت وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا ..... خَصِمُوْنَ تک نازل ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور سرداران قریش حطیم میں موجود تھے اور کعبہ کے گرداگرد ۳۶۰ بت نصب تھے نضر بن حارث گفتگو کرنے کو آگے بڑھا، رسول اللہ ﷺ نے اس سے کلام کیا، یہاں تک کہ اس کو خاموش کر دیا پھر آپ نے

اس کو اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ سے آیات پڑھ کر سنائیں، پھر آپ اٹھ کھڑے ہوئے اتنے میں سامنے ابن الزبعری آ گیا، ولید بن مغیرہ نے اس سے رسول اللہ ﷺ کی بات نقل کر دی۔ ابن الزبعری نے رسول اللہ ﷺ کی طرف رخ کر کے کہا کیا آپ کہتے ہیں اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں۔ ابن الزبعری نے کہا کیا یہودی عزیر کی اور عیسائی مسیح اور بنی الیح ملائکہ کی پوجا نہیں کرتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا نہیں وہ عزیر مسیح وغیرہ کو نہیں پوجتے بلکہ شیطانوں کی پوجا کرتے ہیں اس پر آیت اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى نازل ہوئی اور ابن الزبعری کے حق میں اللہ نے نازل فرمایا مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ۔ واحدی نے بھی حضرت ابن عباس کی روایت سے بغوی کے بیان کی طرح واقعہ نقل کیا ہے۔

اصول فقہ کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن الزبعری سے فرمایا تم اپنی قوم کی زبان سے بھی کتنے ناواقف ہو، تم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ما کا استعمال بے عقل چیزوں کے لئے ہوتا ہے، کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی یہ تفصیل مذکور نہیں ہے۔

بعض اہل علم نے بیان کیا ہے کہ اس آیت میں اِنَّ بمعنی استثناء ہے یعنی اِلَّا الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى۔ یہ تاویل دو وجوہ سے غلط ہے۔ (۱) اِنَّ بمعنی استثناء عربی میں نہیں آتا۔ (۲) اگرچہ بعض لوگ استثناء منفصل کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن عام طور پر استثناء کا استعمال اتصال کی صورت میں ہوتا ہے اور نزول آیت کا جو سبب ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ انفصال پر دلالت کر رہا ہے اس لئے اکثر علماء کے نزدیک یہ آیت سابق آیت کے عموم کی مخصص ہے یعنی اس آیت میں سابق آیت سے استثناء نہیں ہے بلکہ اس کے عموم کی تخصیص ہے۔ مترجم۔ اور مستقل کلام خواہ متراخی ہو اور دیر کے بعد کہا گیا ہو لیکن اس سے پچھلے کلام کی تخصیص ہو سکتی ہے۔ حضرت ابن عباس کا یہی مسلک ہے عام صحابہ کا قول اس کے خلاف ہے وہ تخصیص کے لئے اتصال زمانی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ مترجم۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک وہ مستقل کلام جو پہلے سے متراخی ہو یعنی دونوں کا وقت ایک نہ ہو پہلے کلام کا ناسخ ہو سکتا ہے مخصص نہیں ہو سکتا اور نسخ کا قول اس جگہ ممکن نہیں کلام خبری میں نسخ جاری نہیں ہوتا (کسی حکم یا ممانعت کو منسوخ کیا جا سکتا ہے خبر کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا خبر کو منسوخ کیا جائے تو پہلے کلام کی تکذیب ہو جائے گی مترجم) اس لئے کہنا پڑے گا کہ یہ جدید کلام ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے کلام سے مجازی معنی مراد ہے۔

ابو داؤد اور ابن ابی حاتم اور ثعلبی اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیروں میں بیان کیا ہے کہ حضرت علی نے ایک بار خطبہ دیا اور یہ آیت تلاوت فرمائی پھر فرمایا میں ان میں سے ہوں اور ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ اور سعدؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ اور ابو عبیدہ بن جراحؓ بھی ان میں سے ہیں اس کے بعد نماز کی اقامت ہوئی تو آپ کھڑے ہو گئے اور چادر کھینچتے ہوئے (چلتے ہوئے) فرماتے گئے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ　　وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے یعنی جہنم سے اتنی دور رکھے جائیں گے کہ اس کی آہٹ بھی ان کو سنائی نہیں دے گی۔

وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۝　　اور وہ اپنی جی چاہی مرغوب طبع چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

فِيْهَا کو خٰلِدُوْنَ سے مقدم ذکر کرنا اختصاص اور اہمیت کو ظاہر کر رہا ہے۔ صوفیہ صافیہ کی ذات خداوندی کے سوا کوئی اور خواہش ہی نہیں ہوتی اس لئے ہر وقت وہ وصل کی حالت میں دیدار خداوندی کے استغراق میں رہیں گے لیکن یہ وصل اور استغراق ناقابل بیان کیفیت کا حامل ہو گا زمان و مکان اور ہیئت و شکل کی قیود سے خالی اور جہت و امتداد و مسافت سے پاک اسی لئے اس کو بلا کیف کہا جاتا ہے۔ مترجم۔

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ　　ان کو بڑی گھبراہٹ غمگین نہ بنائے گی۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فزعِ اکبر سے مراد صور کا اخیر نفخہ دوبارہ صور پھونکنا ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس کی نفخہ اخیرہ سے مراد وہ نفخہ ہے جو دنیا کے اختتام پر ہوگا یعنی نفخہ اولیٰ جس سے دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مترجم بعض نے کہا نفخہ سے بیہوشی مراد ہے مگر میرے قول میں اور اس قول میں تضاد نہیں ہے کیونکہ پہلے صور ہی کی آواز سے سب گھبرا جائیں گے بیہوش ہو جائیں گے۔ مترجم۔ مر جائیں گے۔ قرطبی نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر احادیث میں صرف دو مرتبہ صور پھونکے جانے کا ذکر ہے ایک نفخہ صعق یعنی نفخہ موت، دوسرا نفخہ بعث جس کی وجہ سے سب زندہ ہو کر اٹھ جائیں گے ابن عربی نے کہا نفخات تین ہوں گے۔ (۱) نفخہ فزع (۲) نفخہ صعق (۳) نفخہ بعث۔ حضرت مفسرؒ نے فرمایا میرے نزدیک یہی زیادہ صحیح ہے۔

ابن جریر نے تفسیر میں، طبرانی نے مطولات میں، ابو یعلیٰ نے مسند میں، بیہقی نے البعث میں ابو موسیٰ مدینی نے المطولات میں علی بن معبد نے کتاب الطاعة والعصیان میں ابو الشیخ نے کتاب العظمة میں اور عبد بن حمید نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ایک طویل مرفوع حدیث نقل کی ہے اس حدیث میں ہے کہ صور میں تین بار پھونکا جائے گا (۱) نفخہ فزع (۲) نفخہ صعق (۳) نفخہ قیام۔ حدیث میں فزع کی جو تشریح آئی ہے ہم سورۃ النمل میں اس کو بیان کریں گے۔

حسن نے کہا فزع اکبر اس وقت ہوگا جب لوگوں کو دوزخ کی طرف لے جانے کا حکم دیا جائے گا۔ ابن جریج نے کہا فزع اکبر اس وقت ہوگا جب موت کو ذبح کر دیا جائے گا اور ندا آئے گی اے دوزخ والو دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے اور موت بھی نہیں آئے گی۔ سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا یہ وہ وقت ہوگا جب دوزخ کو اوپر سے سر بند کر دیا جائے گا اور دوزخ کا سرپوش اس وقت بند کیا جائے گا جب اس کے اندر سے ان لوگوں کو نکالا جا چکا ہوگا جن کو اللہ نکالنا چاہے گا۔

وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے، یعنی وہ جب قبروں سے نکل کر جنت کی طرف جائیں گے تو جنت کے دروازوں پر فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور مبارک باد دیتے ہوئے کہیں گے۔

هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۱۰۳﴾ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ یعنی یہ اسی ثواب کا دن ہے جس کا آسمانی کتابوں میں اور پیغمبروں کی زبانی تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ وہ دن بھی یاد کرنے کے قابل ہے جس روز نفخہ اولیٰ کے وقت ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے مضمون کا کاغذ لپیٹ لیا جاتا ہے۔ طَيّ نَشْر کی ضد ہے یعنی لپیٹنا کرنا۔ سجل کاغذ۔ مُسَاجَلة (باب مفاعلت) مُكَاتَبَت باہم مل کر لکھنا۔ یعنی ہم آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیں گے، جس طرح کاغذ کو لکھنے کے لئے تہ کیا جاتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ جس طرح لکھے جانے والے مضمون کے لئے کاغذ کو تہ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس مجاہد اور اکثر اہل علم نے یہ مطلب بیان کیا۔ جس طرح لکھے ہوئے کثیر مضامین کی وجہ سے کاغذ کو لپیٹ دیا جاتا ہے۔

سدی نے کہا سجل اس فرشتہ کا نام ہے جو بندوں کے اعمال لکھا کرتا ہے اور لِلْكُتُبِ میں لام زائد ہے۔ جیسے رَدِفَ لَكُمْ میں لام زائد آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح سجل فرشتہ اعمال ناموں کو لپیٹ دیتا ہے اسی طرح ہم آسمانوں کو لپیٹ دیں گے یہ بھی کہا گیا ہے کہ سجل رسول اللہ ﷺ کا ایک کاتب تھا۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے میثاق نامہ یا تحریری معاہدہ کو کتب السجل کہتے ہیں اس کی جمع سجلات آتی ہے اور حبشی زبان میں کاتب کو بھی کہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے ایک کاتب کا نام بھی سجل تھا اور ایک فرشتہ کا نام بھی سِجِل بمعنی کتاب آتا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ سِجِل اس پتھر کو کہتے تھے جس پر کچھ تحریر کیا جاتا تھا پھر ہر اس چیز کو سجل کہنے لگے جس پر کچھ لکھا جائے خواہ کاغذ ہو جھلی ہو ہڈی ہو یا کچھ اور ہو۔ مترجم۔

كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ ؕ جس طرح ہم نے شروع میں ابتداء تخلیق کی تھی اسی طرح آسانی سے ہم اس کو دوبارہ پیدا کر دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان کی ابتدائی تخلیق ہم نے اپنی قدرت کاملہ سے کی ہے اسی طرح اس کو دوبارہ بھی ہم لوٹا کر لے آئیں گے، قدرت قدیمہ کے اندر انسان کی دونوں تخلیقیں داخل ہیں اور دونوں ممکن ہیں اور ہر ممکن احاطہ، قدرت میں داخل ہے یعنی تخلیق میں تعدد ہوگا۔ انسان وہی ہوگا بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ جس طرح ابتدائی تخلیق ہماری قدرت سے خارج نہیں ہم نے پیدا کر دیا اسی طرح دوبارہ تخلیق بھی ہماری قدرت میں داخل ہے ہم دوبارہ بھی پیدا کر دیں گے، یعنی دوسری تخلیق بھی اسی طرح ممکن ہے جس طرح پہلی تخلیق ممکن تھی۔ اس صورت میں دوسری تخلیق اول تخلیق کی طرح ممکن ہوگی لیکن مخلوق الگ الگ ہوگی۔ دوسری بار پیدا کیا ہوا انسان پہلی مرتبہ پیدا کئے ہوئے انسان کی طرح ہوگا بعینہ وہی نہ ہوگا اس کے مثل ہوگا۔ صحیح بات یہ ہے کہ دوبارہ پیدا کیا ہوا انسان بعینہ وہی انسان ہوگا جس کو پہلی مرتبہ پیدا کیا گیا تھا، مشابہت صرف تخلیق یا احوال و اوصاف میں ہوگی شخصیت اور ذات ایک ہی ہوگی۔

شیخین نے صحیحین میں ترمذی نے جامع میں، حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور فرمایا لوگو! تم لوگ برہنہ بدن غیر مختون برہنہ پاؤں قبروں سے اٹھ کر اللہ کی طرف پیدل لے جائے جاؤ گے پھر آپ نے آیت كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا، سب سے پہلے حضرت ابراہیم کو لباس پہنایا جائے گا۔

وَعۡدًا ہم نے پختہ وعدہ کر لیا۔ وعدا مفعول مطلق ہے جو فعل محذوف کو پختہ کر رہا ہے۔

عَلَيۡنَا ؕ اس کو پورا کرنا ہم پر مثل لازم کے ہے اللہ پر کوئی چیز لازم نہیں لیکن اس نے وعدہ پختہ کر لیا ہے اور اللہ کا وعدہ پورا ہونا لازم ہے، اللہ کے وعدے کے خلاف ہونا محال ہے اس لئے اس کے وعدے کی وفا اس پر گویا لازم ہے۔ مترجم۔

اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيۡنَ ﴿۱۰۴﴾ ہم ضرور (دوبارہ تخلیق) کرنے والے ہیں۔ یہ جملہ تاکید یہ ہے وعدے کی مزید تاکید ہے۔

وَلَقَدۡ كَتَبۡنَا فِى الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّكۡرِ اور ہم نے لوح محفوظ میں لکھنے کے بعد سب آسمانی کتابوں میں لکھ دیا ہے۔

سعید بن جبیر اور مجاہد نے کہا زبور سے مراد تمام کتب الٰہیہ ہیں اور ذکر سے مراد ہے لوح محفوظ۔ یعنی لوح محفوظ میں لکھنے کے بعد ہم نے اپنی تمام نازل کردہ کتابوں میں لکھ دیا ہے۔

شعبی نے کہا زبور سے مراد زبور داؤد ہے جو حضرت داؤد پر اتاری گئی تھی اور ذکر سے مراد ہے توریت حضرت ابن عباس اور ضحاک کا قول ہے کہ زبور سے مراد توریت ہے اور ذکر سے مراد ہیں وہ تمام آسمانی کتابیں جو توریت کے بعد اتاری گئیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ زبور سے مراد زبور داؤد ہے اور ذکر سے مراد ہے قرآن۔ موخر الذکر دونوں قولوں پر بعد الذکر میں لفظ بعد بمعنی قبل ہوگا، یعنی ذکر سے پہلے۔

اَنَّ الۡاَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾ کہ زمین کے یعنی جنت کی زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔

الۡاَرۡضَ سے مراد ہے جنت کی زمین۔ اسی مضمون کو آیت وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک سوال کیا گنہگار مومن جو فاسق ہوتے ہیں صالح نہیں ہوتے جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔

جواب: سزا پانے یا اللہ کی طرف سے گناہ معاف ہو جانے کے بعد وہ پاک ہو جائیں گے اور صالحین کے حکم میں داخل ہو جائیں گے اور صالحین کے ساتھ ان کو ملا دیا جائے گا۔

مجاہد نے کہا صالحین سے مراد امت محمدیہ ہے کیونکہ ان ہی کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ

صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ۔

بعض لوگوں کے نزدیک اَلْاَرْضَ سے مراد ہے ارض مقدس اور عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ سے مراد ہیں وہ لوگ جن کو زمین کے پوربی اور پچھمی حصوں میں کمزور اور حقیر سمجھا جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اَلْاَرْضَ سے مراد ہے کافروں کی سرزمین مراد یہ ہے کہ کافروں کی زمین کو مسلمان فتح کریں گے گویا یہ اللہ کی طرف سے پیشین گوئی اور فیصلہ قطعی ہے کہ دین اسلام غالب آئے گا اور مسلمانوں کو کافروں پر غلبہ حاصل ہوگا۔ میں کہتا ہوں اس وقت الارض سے مراد تمام روئے زمین ہوگا۔ امام احمد راوی ہیں کہ حضرت مقدادؓ نے بیان کیا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ روئے زمین پر تمام مکان خواہ مٹی کے بنے ہوئے ہوں یا اونی کمبلوں کی جگیاں ہوں کوئی مکان بھی ایسا نہ رہے گا جس کے اندر اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کردے یعنی ہر گھر میں اسلام داخل ہو جائے گا عزت والے کی عزت کے ساتھ یا ذلیل کی ذلت کے ساتھ۔ یعنی اللہ ان کو یا شرف باسلام کردے گا اور وہ عزت یاب ہو جائیں گے یا کافر ہی رہیں گے اور ان کو مجبوری اسلام کا غلبہ تسلیم کرنا اور ذلیل ہونا پڑے گا۔ حضرت مقداد نے فرمایا، میں کہتا ہوں اس وقت سارا دین اللہ ہی کا ہوگا یعنی سب پر اسلام ہی غالب ہو جائے گا۔ مترجم۔

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا بے شک اس میں جنت تک پہنچانے کا پورا سامان ہے۔

فِيْ هٰذَا یعنی قرآن میں خبریں نصیحتیں اور وعدہ وعید مذکور ہیں سب میں۔ لَبَلٰغًا یعنی جنت میں داخل ہونے کا پورا سامان ہے پورا قرآن جنت کا توشہ ہے جیسے مسافر کے لئے زادِ راہ منزل تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یا بَلٰغًا سے مراد ہے ذریعہ کامیابی۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس سے نصیحت اندوز ہوگا وہ اپنی آرزو کو پہنچ جائے گا۔

لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ عبادت کرنے والے لوگوں کے لئے یعنی ان مومنوں کے لئے جو صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا، عابدین سے مراد ہیں علماء یا کل اہل عالم۔ کعب احبار نے کہا امت اسلام مراد ہے جو پنجوقتہ نماز پڑھتی اور رمضان کے روزے رکھتی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اے محمد ﷺ ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر رحمت کی وجہ سے جہان والوں پر یا رحمت بنا کر جہان والوں کے لئے یعنی انس و جن کے لئے۔ پہلے ترجمہ پر رحمۃ مفعول لہ ہوگا یعنی تم کو رسول بنا کر ہم نے اس وجہ سے بھیجا کہ ہم انس و جن پر رحم کرنا چاہتے تھے پس تم کو ہم نے ہادی بنا کر بھیجا تاکہ لوگ تمہارے بتائے ہوئے راستے پر چلیں دوسرے ترجمہ پر رحمۃ کہ سے حال ہوگا یعنی ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر اس حالت میں کہ تم سب کے لئے سبب رحمت ہو۔ حاکم نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے اور ابن سعد و حکیم نے ابو صالح کی روایت سے مرسل حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں اللہ کی طرف سے فرستادہ رحمت ہوں۔ بخاری نے تاریخ میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے کہ مجھے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے عذاب بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

اس جملہ کا عطف اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا پر ہے کیونکہ قرآن جب جنت کا زادِ راہ ہے تو جس رسول پر قرآن کا نزول ہوا اس کا مبعوث ہونا رحمت ہو گیا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ میری نبوت اور پیام نبوت لوگوں کو سعادت مند بنا دینے کا سبب ہے اور معاش و معاد کی درستی کا کفیل ہے اب جو شخص اس کو قبول نہیں کرتا اور رحمت کے زیر سایہ آنے سے انکار کرتا ہے وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے میری نبوت کی رحمت ہونے میں کوئی کمی نہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ کافروں کے لئے دنیا میں رحمت تھے کہ آپ کی وجہ سے دنیا میں ان پر عذاب نہیں آیا، صورت مسخ ہونے، زمین میں دھنسائے جانے اور بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے عذاب سے مامون ہو گئے۔ (خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ بر قول ابن عباس کافروں کے لئے بھی دنیا میں رحمت تھے اور بر تفسیر اول کافروں کا مبتلاء عذاب ہونا خود ساختہ اور خود آوردہ ہے انہوں نے رحمت کے زیر سایہ آنے سے خود انکار کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے رحمت ہونے میں کوئی کمی نہیں تھی۔

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ میرے پاس یہی

وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک معبود ہے۔ آیت میں حصر اضافی ہے قرآن کے اندر تو احکام کی تعلیم بھی ہے، اقوام پارینہ اور گزشتہ پیغمبروں کے قصے بھی ہیں وعدو وعید بھی ہے جنت ودوزخ حساب وکتاب اور عقیدہ قیامت کے لازم ہونے کا ذکر بھی ہے اللہ کی صفات کمالیہ کا اظہار بھی ہے اور دوسرے مباحث علمی و عملی بھی اور مبدء ومعاد سے تعلق رکھنے والے سارے مسائل کا بیان بھی ہے پھر یہ کہنا کہ میرے پاس صرف ایک کو معبود ماننے کی وحی آتی ہے بظاہر غلط ہے لیکن اگر حصر کو اضافی کہا جائے تو کلام صحیح ہو جائے گا کیونکہ (مترجم) وحی کی اصلی غرض اظہار توحید ہی ہے (نبوت، کتاب، شریعت، انبیاء کا تذکرہ، قیامت پر عقیدہ، جنت ودوزخ اور حساب وکتاب کی تشریح سب اسی کی شاخیں اور اسی پر مبنی ہیں) اس لئے توحید کا اعلان واقرار ہی گویا جوہر وحی ہے۔ اور صرف یہی پیام بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے۔

یا یوں کہا جائے کہ اللہ کی عبادت کے معاملے میں جو وحی آتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ معبود فقط ایک ہے (اس صورت میں حصر حقیقی ہوگا مگر مقید بامر عبادت۔ مترجم)

ایک شبہ

جب توحید حاصل وحی ہے تو توحید کا ثبوت وحی پر موقوف ہوا اور وحی کی بنا عقیدۂ توحید پر ہے اگر توحید کو نہ مانا جائے تو پھر نہ نبوت کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ وحی کی۔ یہ کھلا ہوا دور ہے۔

ازالہ: توحید کا ثبوت نقلی بھی ہے جو سننے پر موقوف ہے کیونکہ رسالت کا مدار مرسل پر ہے۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ پس کیا تم اطاعت کرنے والے ہو۔ یعنی توحید کو مانو اور خالص عبادت اللہ ہی کی کرو اور وحی کا جیسا تقاضا ہے اس کو پورا کرو۔ اور اللہ کی رحمت حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ پھر بھی اگر یہ لوگ سرتابی کریں تو بطور تکمیل حجت آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو نہایت صاف اطلاع کر چکا ہوں۔ یعنی اگر وہ اسلام سے روگرداں ہو جائیں اور اتمام حجت کے بعد بھی توحید کو ماننے سے گریز کریں تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں نے تم سب کو برابر وہ وحی پہنچا دی اور وہ اطلاع دے دی جو مجھے ملی تھی۔ اٰذَنْتُكُمْ یعنی میں نے وحی اور رسالت کی اطلاع دے دی یا اس بات کی اطلاع دے دی کہ میری تم سے مصالحت نہیں ہو سکتی۔

عَلٰى سَوَآءٍ کا یہ مطلب ہے کہ میں نے وحی کی کوئی بات کسی سے پوشیدہ نہیں رکھی، سب کو برابر اطلاع دے دی۔ اس سے فرقہ باطنیہ اور شیعہ کے اس قول کی تردید مستفاد ہوتی ہے کہ ائمہ اپنے خاص ساتھیوں کو احکام شرع بالکل پوشیدہ طور پر سکھاتے تھے اور کہتے تھے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یا عَلٰى سَوَآءٍ کا یہ مطلب ہے کہ ہم اور تم دونوں اس معاملہ میں برابر ہیں جو کچھ مجھے علم تھا اس سے تم کو بھی واقف کر دیا، یا جنگ کے معاملہ میں ہم دونوں برابر ہیں۔ میں تم کو فریب نہیں دیتا تم جنگ کی تیاری کر لو۔ ہم آپس میں دشمن ہیں یا یہ مطلب ہے کہ علی الاعلان میں نے تم کو اطلاع دے دی۔

بعض نے سَوَآءٍ کا ترجمہ کیا ہے سیدھا راست، استقامت رائے یعنی میں عدل اور استقامت رائے پر دلیل کی روشنی میں قائم ہوں اور تم کو میں نے اس کی اطلاع برہان کے ساتھ دے دی۔

وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اور مجھے نہیں معلوم کہ جس چیز (یعنی مسلمانوں کی فتح اور تسلط یا حشر اور عذاب قیامت) سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا دور۔ یعنی ہوگا ضرور اس کی ہونے میں شک نہیں، لیکن کب ہوگا یہ مجھے معلوم نہیں۔

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ بے شک اللہ کو تمہاری پکار کر کہی ہوئی بات کی بھی خبر ہے اور جو بات تم دل میں چھپائے رکھتے ہو اس کی بھی خبر ہے یعنی علانیہ جو اسلام پر طعن کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہے اور مسلمانوں سے دشمنی اور کینہ جو تم دلوں میں چھپائے ہوئے ہو اس کو بھی اللہ جانتا ہے، یقیناً وہ تم کو اس کی سزا دے گا، یہ جملہ معترضہ ہے اس سے نفاق پر زجر اور اخلاص کی ترغیب دینی مقصود ہے۔

وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۱۱۱﴾ اور میں نہیں جانتا کہ کیا مصلحت ہے، شاید وہ تاخیر عذاب تمہارے لئے صورۃً امتحان ہو اور ایک وقت یعنی موت تک فائدہ پہنچانا مقصود ہو۔ یعنی باوجود یہ کہ اللہ تمہارے ظاہر و باطن سے واقف ہے پھر بھی تم کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا اس تاخیر کی وجہ مجھے معلوم نہیں شاید یہ تاخیر عذاب تمہارے لئے ڈھیل ہو جو تمہارے لئے مزید فتنہ میں پھنس جانے کی موجب ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ شاید یہ تاخیر عذاب تمہاری آزمائش ہو کہ تم نصیحت اندوز ہوتے ہو یا نہیں۔

وَمَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ کا یہ مطلب ہے کہ تاخیر عذاب اللہ کی طرف سے تھوڑے وقت اور قلیل مدت کے لئے ایک حقیر بہرہ اندوزی اور فائدہ ہے۔ قضاء الٰہی میں پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے کہ تم کو اتنی مدت تک باقی رکھا جائے گا اس لئے فیصلہ شدہ مدت تک تمہاری بقاء ضروری ہے۔

جلال الدین محلی نے لکھا ہے کہ لَعَلَّ اظہار امید کے لئے آتا ہے اور فتنہ سے امید کی وابستگی غیر مناسب ہے اس لئے فتنہ کے مقابل مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ کو ذکر کیا۔

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ رسول ﷺ نے کہا اے رب میرے اور کفار کے درمیان تو انصاف کا فیصلہ کر دے ظاہر ہے کہ انصاف کا فیصلہ یہی ہوگا کہ کفار کو عذاب میں مبتلا کیا جائے اور مومنوں کو عذاب سے محفوظ رکھا جائے۔

وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اور ہمارا رب بڑا مہربان ہے جس سے ان باتوں کے مقابلے میں مدد کی درخواست کی جاتی ہے جو تم بنایا کرتے ہو۔

الرَّحْمٰنُ مخلوق پر بہت رحم کرنے والا۔ صیغہ مبالغہ ہے۔

الْمُسْتَعَانُ وہ ذات جس سے یا جس کی مدد طلب کی جائے۔

عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ یعنی تمہارے جھوٹے غلط بیان کے خلاف کہ فتح کافروں کی ہوگی اور اسلام کا جھنڈا چند ہی روز سربلند رہے گا پھر گرا دیا جائے گا اور اگر کافروں پر عذاب نازل ہونے کی دھمکیاں سچی ہوتیں تو اب تک عذاب آگیا ہوتا۔ اللہ نے اپنے رسول کریم کی یہ دعا قبول کر لی، جنگ بدر کے دن کافروں کی کمر توڑ دی اور مسلمانوں کو فتح عنایت فرما دی۔

یا عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ تم جو بیان کرتے ہو کہ اللہ صاحب اولاد اور محمد ﷺ ساحر ہیں اور قرآن مجید ایک طرح کی شاعری ہے وغیرہ۔ ان تمام خرافات کے خلاف ہمارا رب رحمٰن ہمارا مددگار ہے ہم اس سے ہی مدد کے خواستگار ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

الحمدللہ سورۂ انبیاء کی تفسیر ۲۵ رجمادی الثانیہ ۱۲۰۳ھ کو بروز دوشنبہ ختم ہو گئی۔ اس کے بعد انشاء اللہ سورۂ الحج کی تفسیر آئے گی۔ الحمدللہ و شکرلہ تفسیر مظہری سورۂ انبیاء کا ترجمہ بعونہ تعالیٰ ۱۲ رربیع الاول ۱۴۰۳ھ کو بروز پنجشنبہ ختم ہوا۔

فَالْحَمْدُ لَهٗ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا